

103

# حیات امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ



گذشتہ ربع صدی کی سیاسی اور مذہبی تحریکات کے

پسے منظر میں

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ سید عطار اللہ شاہ بخاری

کی پہلی مکتبے اور مستند

سوانح حیات



جملہ حقوق محفوظ ہیں

(اس کتاب کی کوئی عبارت بینرنا شراور مصنف کی اجازت کے نقل کر کے شائع نہ کی جائے)

✓ ۲۹۶۹۹۲۳

ع ۸۱ ج

۱۸۹۹۵

خالہ سعید جانباہ

مکتبہ تبصرہ لاہور

ثنائی پریس لاہور

نومبر ۱۹۶۹ء

ایک ہزار (۱۰۰۰)

ناشر

پبلشر

طابع

بار اول

تعداد

قیمت: — ۱۳ روپے ۵۰ پیسے

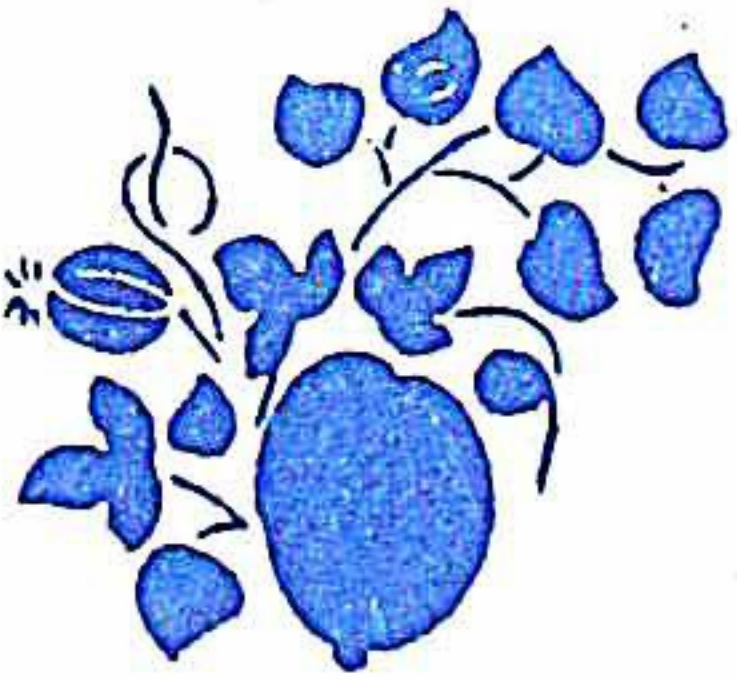
”مکتبہ تبصرہ“ گلشن کالونی، شاد باغ، لاہور



# اس عظیم ماں کے نام

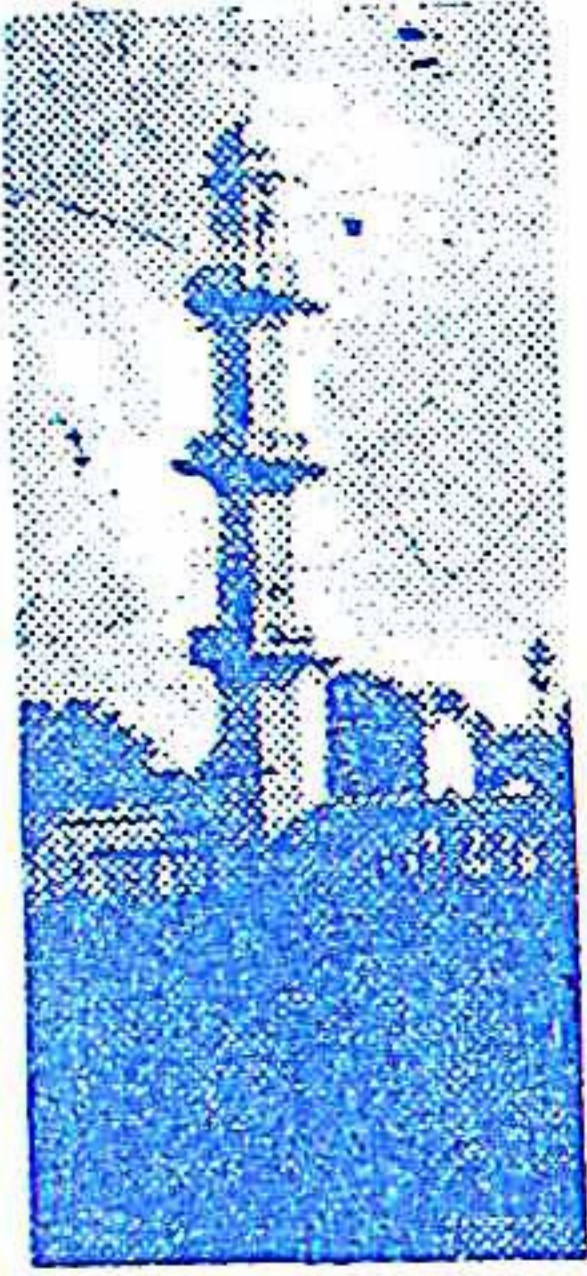


جس کی کوکھ نے ایشیا میں ایک ایسے  
خطیب کو جنم دیا، جس کی لکڑی سے برطانوی  
سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا



حج







# فہرست

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۳۷	جلینوالہ باغ		باب اول
۳۸	احساسِ اُجبر آیا	۹	۱۸۹۱ء تا ۱۹۲۱ء
۳۹	آغازِ سفر	۱۱	امیر شریعت
۴۰	پہلی سیاسی تقریر	۱۲	گھرانہ
۴۱	ترکِ موالات	۱۶	نہال
۴۲	لاہور خلافت کمیٹی	۱۷	سید ضیاء الدین
۴۳	مرزا بشیر الدین محمود سے پہلی ہنگامہ	۱۸	شادی
۴۴	آزاد ہائی سکول گجرات	۱۹	فاطمہ اندرابی
۴۸	تحریکِ ہجرت	۲۱	والدہ کی وفات
۵۳	پہلی گرفتاری اور سزا	۲۳	بچپن
۴۰	امرتسر میں ہسپتال	۲۳	قرأت
۴۲	مقدمہ کی سماعت	۲۴	امرتسر میں
۴۴	فردِ جسم	۲۴	ناگڑیاں
"	فیصلہ مقدمہ	"	شادی
۷۴	امرتسر جیل سے روانگی	۲۷	دوبارہ امرتسر میں
	باب دوم	۲۹	امامت
۷۹	۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۰ء	۳۰	غیر اسلامی رسمیں
۸۰	لاہور سنٹرل جیل	۳۳	جلینوالہ باغ کا حادثہ
"	معافی کی درخواست	۳۴	خدمتِ خلق
۸۳	آزاد ہائی سکول کا خاتمہ	"	مارشل لا



ب

154	امروہہ میں جمعیت علمائے ہند کا اجلاس	۸۳	تحریک ترک موالات کا خاتمہ
140	وارنٹ گرفتاری	۸۴	تحریک خلافت کا حشر
143	قاتلانہ حملہ	۸۵	تحریک شدھی
145	گرفتاری	۸۶	پہلا ہندو مسلم فساد
	باب سوم	۸۷	جیل سے رہائی
146	۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء	۸۹	شدھی کا عملی پہلو
"	ڈم ڈم جیل	۹۳	تحریک قبہ
148	رستم زماں سے ملاقات	۹۴	ایک سوال
150	رہائی	"	جواب
151	مجلس احرار کی تشکیل نو	۹۸	مرزاہیت کے خلاف فتویٰ
"	گاندھی جی سے ملاقات	۱۰۰	پنجاب کے پیروں سے ٹکر
152	میٹنگن کالج کا حادثہ	۱۰۱	سپاس نامہ
153	تحریک کشمیر	۱۱۱	تحریک شاتم رسول
155	وفد کی روانگی	۱۱۳	شاتم رسول واجب قتل ہے
154	امیر شریعت کی گرفتاری	۱۱۴	شاہ جی کا موقف
156	بورڈ شل جیل لاہور	۱۱۶	تیسری گرفتاری
159	ایک ماں کا ایثار	۱۱۸	سوامی شردھانند کا قتل
180	جیل سے رہائی اور سکھوں سے ٹکراؤ	۱۱۹	تجزیرات ہند میں ترمیم
183	امیر شریعت کو زہر دیا گیا	۱۲۰	نہرو رپورٹ
185	پنڈت کرپا رام برہمچاری	۱۲۲	چیدر پہلو ان کا مقدمہ
189	قادیان کانفرنس	۱۲۶	پیر کرم شاہ
193	گرفتاری	۱۳۰	۱۹۲۹ء
192	ایک دلچسپ واقعہ	۱۳۱	شاتم رسول کا قتل عام
194	مجنوب کی دعا	۱۳۵	ایک خوفناک دھماکہ
196	مقدمہ کی روئیداد	۱۳۶	خلیفہ قادیان کا خطبہ
"	جمعتہ الوداع	۱۴۰	ڈیرہ غازی خاں
199	فرد جرم	۱۴۳	ایک واقعہ
200	تحریری بیان	۱۴۴	ہتھکڑی
208	فیصلہ	۱۴۵	ملتان کا محرم
"	سیشن کورٹ میں اپیل	۱۴۹	شارد اہل
209	اپیل کا فیصلہ	۱۵۱	مجلس افسر کی صدارت
		۱۵۲	نمکین ستیہ گرہ
		۱۵۴	امیر شریعت کا اعزاز



۳۳۵	رہائی کے بعد	۲۲۲	تقریر امرتسر
۳۳۷	حضرت رائے پوری سے وابستگی	۲۲۴	زلزلہ کوئٹہ
۳۳۹	قانون کی شکست	۲۲۶	مسجد شاہ چراغ
۳۴۲	حکومت الہیہ	۲۳۰	قتل کی سازش
۳۴۴	مولانا گل شیر کی شہادت	۲۳۵	قاتل سے ملاقات
۳۴۸	تحریک پاکستان	۲۳۷	تحریک مدح صحابہ کی ابتدا
۳۵۰	قائد اعظم سے ملاقات کی خواہش	۲۳۹	قادیان میں نماز جمعہ
۳۵۲	قرار داد مجلس احرار	۲۴۱	سینما کی تعمیر
۳۶۰	دہلی کا آخری اجلاس	۲۴۷	تبلیغ اسلام
۳۶۷	امیر شریعت کشمیر میں	۲۵۱	ڈسکہ میں انتخابی معرکہ
۳۶۸	عبوری حکومت میں احرار کو	۲۵۵	حضرت مدنی سے اختلاف
۳۷۰	شمولیت کی دعوت	۲۵۸	تحریک مدح صحابہ کا دوڑ ثانی
۳۷۰	کشمیر سے واپسی	۲۶۳	قتل کی سازش کا الزام
۳۷۴	۱۹۴۷ء	۲۶۵	ضلع میانوالی کا دورہ
۳۷۶	تقسیم پنجاب کی مخالفت	۲۶۶	گرفٹاری
۳۸۲	عطاء اللہ شاہ شہید کر دیے گئے	۲۶۷	مجلس احرار کی قرار داد
۳۸۶	خان گڑھ میں قیام		باب چہارم
۳۸۹	بچی کی وفات		۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۰ء
"	پاکستان ۱۹۴۸ء	۲۷۱	ابتدائی کارروائی
۳۹۵	نفاذ شریعت کانفرنس	۲۸۸	لدھارام کی تلاش
۳۹۶	ملتان میں قیام	"	ہائی کورٹ میں
۳۹۷	۱۹۴۹ء	۲۹۰	لدھارام
"	مجلس احرار کا آخری اجلاس	۲۹۱	عدالت میں
۴۰۶	سیاسیات سے علیحدگی	۲۹۳	لدھارام کا بیان
	باب پنجم	۲۹۸	جرح کی اجازت
۴۱۱	۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۱ء	۳۰۰	نوٹ بک جلا دی گئی
"	استحکام پاکستان	۳۰۳	عدالت سے تحفظ کی درخواست
۴۱۵	مسلم لیگ کی غلطی	۳۰۶	تحقیق رجسٹر
۴۱۶	والد صاحب کا انتقال	۳۰۸	لکڑی کا بکس
۴۲۱	ایک اہم انکشاف	۳۱۸	خودکشی کا ارادہ
۴۲۳	بیٹی کی شادی	۳۲۵	گرفٹاری اور رہائی
۴۲۴	جہیز	۳۳۰	دوسرا مقدمہ



۵۲۰	ایک غلط خبر	۴۲۶	تخریب ختم نبوت
۵۲۱	مقدمات کی واپسی	۴۳۲	مجلس عمل کا قیام
۵۲۳	مولانا ظفر علی خاں	۴۳۸	راست اقدام
۵۲۵	حضرت لاہوری کا فتویٰ	۴۴۲	گرفاری
۵۲۹	پولیس کی نگرانی	۴۴۸	کراچی جیل
۵۳۱	ضیحح النسب	۴۵۲	حکام کے پیغامات
۵۳۵	شیعہ سنی فساد	۴۵۳	سکھر جیل
۵۳۹	ڈاک پرسنسر	۴۵۵	خوراک
۵۴۰	مجلس احرار کا اجراء	۴۵۷	محمد علی بوگرہ کی آمد
"	صدر سکندر مرزا کی خواہش	۴۵۹	بھوپت ڈاکو
۵۴۱	مجلس احرار کا اجلاس	۴۶۱	لاہور سنٹرل جیل
۵۴۲	فوجی انقلاب	۴۶۳	موقف اور اعتماد
۵۴۳	احباب کی محفلیں	۴۶۵	سکھر جیل کا تذکرہ
۵۵۲	لندن آنے کی دعوت	۴۶۹	اسیران مارشل لاء
۵۵۴	اراضی کی پیشکش	۴۷۰	داستان پارینہ
۵۵۵	دعائے صحت کے لیے	۴۷۸	آخری سازش
۵۵۷	شعرو شاعری	۴۸۱	نئے سفر کا آغاز
۵۵۹	ایک نامہ نگار سے	۴۸۴	مجلس تحفظ ختم نبوت کی صدارت
۵۶۱	فالج کا دوسرا بڑا حملہ	۴۸۵	مبلغین کو وصیت
"	فالج کا آخری حملہ	۴۸۶	ذیابیطس اور فالج
۵۶۲	ماہنامہ تبصرہ کا "بخاری نمبر"	۴۸۸	حج بیت اللہ کی دعوت
۵۶۴	نشر ہسپتال	۴۸۹	روحانی صدمہ
۵۶۸	دعائے صحت	۴۹۱	۱۹۵۵ء
۵۷۲	پھر لاہور میں	۴۹۳	ڈسٹرکٹ جج کیسبل پور
۵۷۳	نماز	۴۹۴	رہائی کے بعد پہلی تقریر
۵۷۵	انتقال	۵۰۶	وصیت
۵۷۶	موت کی خبر	"	سیاسی انتقام
"	جنازہ	۵۰۹	رہائی
۵۷۸	آخری آرام گاہ	۵۱۱	مخلوط انتخاب
۵۸۲	اخبارات	۵۱۲	لاہور میں آمد
۵۸۸	تعزیت	۵۱۸	حفیظ جان دھری
۵۹۳	لباس، خوراک اور عادات	۵۱۹	مولانا حبیب الرحمن کا انتقال



## ابتدایہ

۱۹۳۰ء کا زمانہ ہندوستان میں ان سیاسی سرگرمیوں کا ابتدائی سال تھا جو آگے چل کر غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف پُرامن بغاوت کے حالات کو جنم دینے کا باعث بنیں اس سے پہلے ۱۹۲۹ء کے ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کے جلو میں دریا تے راوی کے کنارے آل انڈیا کانگریس نے برطانوی سامراج سے مکمل گلو خلاصی کے لئے اپنی تاریخی قرارداد منظور کی۔ ورنہ پیشتر ازیں درجہ نوا ابادیات کی خواہش تک تمام جدوجہد مرکوز تھیں، شہید اشفاق اللہ بسمل کا یہ شعر اُس دور کی نشاندہی کرتا ہے

مجھ کو بل جائے چہکنے کے لئے شاخ میری  
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیبا در ہے

تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کے بعد ہاتھ تاننا گاندھی کی قیادت میں غیر ملکی حکومت کے خلاف حصولِ آزادی کے لئے برصغیر کی یہ دوسری بڑی تحریک کی تیاری تھی غلاموں کے جذبات اُبھر کر بغاوت کے موڑ پر آن پہنچے تھے۔ ہندوستان کا ہر مرکزی شہر اس تحریک کا کیمپ قرار دیا جا چکا تھا، یہ نمکین ستیہ گرہ کی تحریک تھی۔ اس سلسلہ میں



گوجرانوالہ میں مولانا ظفر علی خاں کی صدارت میں ستیہ گره کانفرنس منعقد ہوئی، ان دنوں میری عمر اٹھارہ انیس سال کے آس پاس تھی۔ گونگلام دیس کے نوجوان کے لیے زندگی یہ سن عقل و شعور سے عاری ہوتا ہے، تاہم فرنگی حکمرانوں کے خلاف میرے جذبات اس سال نوجوان اور بالغ ہو چکے تھے، اور انہیں تناؤں کے سہارے میں امرتسر سے پیدل گوجرانوالہ پہنچا۔

اس کانفرنس کا آخری اجتماع تھا کہ ہر شام پنڈال میں خاص قسم کی ہماہمی چہروں پر رونق، دلوں میں مسرتوں کا طوفان موجزن تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کیے آئے۔ خوبصورت خدو خال کے ساتھ سرخ و سپید چہرے پر سیاہ وارھی، گھٹیلہ جسم، بوٹا ساقد، نیم آستین والا گاڑھے کا کرتہ، ٹخنوں سے ادنیٰ شرعی قسم کا کھدر کا پاجامہ سر پر گول دیو بند طرز کی ٹوپی، پاؤں میں دیسی ساخت کا چپل، یہ تھے سید عطاء اللہ شاہ بخاری پنڈال سے باہر کثیر ہجوم نے ان کا استقبال کیا، گوجرانوالہ کی زمین نے ان کے قدم چومے، آسمان نے بلائیں لیں، فضاؤں نے بہاروں کی بارش کر دی، عوام کی نگاہیں فرش راہ ہوئیں، دس و دماغ نے ہم آہنگ ہو کر ہندوستان کے بہادر سپوت کا خیر مقدم کیا، وہ جیسے جیسے اپنی قیام گاہ کے قریب پہنچتے گئے، چاند ستاروں کے ہجوم میں ان کی رہنمائی کرتا رہا۔ میں اس اچھوت کی طرح جسے مندر کے دروازے پر کھڑے بھگوان کی مورتی دیکھنے کی اجازت تو ہے لیکن قریب جا کر ان کے چرن نہیں چھوس سکتا، دُور سے شاہ جی کو دیکھتا رہا۔

یہ تھی حضرت امیر شریعت<sup>7</sup> سے میری پہلی ملاقات!

”اوسے ایہہ کالا کلوتر اکتھوں نے آندا ای عابزہ؟“



یہ کالا سیاہ کہاں سے لے آئے عاجز!

اے کالا لڑے گاتے آپے ای پتہ لگ جائے گا۔

یہ کالا جب ڈسے گا تو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

امر تسریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں بیٹھے خواجہ عبد الرحیم عاجز اور

حضرت امیر شریعتؒ کے درمیان میرے متعلق یہ مختصر گفتگو تھی۔

مولانا عبد الرحمن نکووری کا سالانہ اجتماع تھا، یہ حضرات اس میں شمولیت کے

لیے نکووری ضلع جالندھر جا رہے تھے۔ یہ دوسرا موقعہ تھا کہ میں حضرت امیر شریعتؒ کو

قریب سے دیکھ رہا تھا، اس سفر میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی سے بھی ملنے کا موقعہ

یلا۔ چار دن کی یہ ہمراہی زندگی بھر کا ساتھ بن گئی۔

اخلاص و محبت کا پیکر، زندہ دلی کا مجسمہ، مسکراہٹوں کا انبار، انجمن ہزار

داستان لیے جب وہ حلقہ احباب میں رونق افروز ہوا، تو میرے مستقبل کی ساری

کائنات اُس کے تابع ہو کر رہ گئی۔ اس طرح دنوں سے ہفتے، مہینے اور سال گزرنے

لگے۔ پھر جنائیں بھی گواہ ہیں کہ وفاؤں میں کبھی دراڑ نہیں آئی۔ ان راستوں میں

پھول اور کانٹے ایک ساتھ ملے، اندھیرے اُجالوں سے بھی گزر ہوا، تو ایک دوسرے

کا ہاتھ نہیں چھوٹا۔ جیل اور ریل کے طویل سفر مشترک اثاثہ نجات بنے رہے۔ مقاصد

کی ہم آہنگی نے ان واقعات پر سے تین سال گزار دیے۔

اس وادی پر خاز سے چوب پہلے پہل میرا گزرنے ہوا، تو بچپنا جوانی کی ابتدائی

سرحدوں پر چھوڑ کر جا چکا تھا، اور اگست ۱۹۶۱ء میں حضرت امیر شریعتؒ (رحمۃ اللہ علیہ)

جب اس جہان سے رخصت ہوئے، تو میرا قدم بڑھاپے کی دہلیز پر تھا۔ حالات کی



ایک لمبی لکیر گزار کر جب رہنما کے بغیر مقاصد حیات کی راہوں میں اُترنا پڑا، تو اس بازار میں میرا قلم میرے ساتھ تھا۔ یہ ستمبر ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے کہ حضرت امیر شریعتؒ کی سوانح حیات اپنے قلم کے تعاون سے تاریخ کے دامن میں محفوظ کرنے کی سعی کی۔ یہ دستاویز مکمل کرنے میں آٹھ سال بیت گئے، تلاش و جستجوس ہفت آٹھ واقعات میں کن لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے پڑے، یہ کہانی اس قدر طویل ہے کہ اس کے لیے پھر ایک کہانی کی ضرورت ہے۔

ستمبر ۱۹۶۱ء میں جب کتاب ہذا کا آغاز کیا، اور بہت سی منزلیں طے کر لیں تو فروری ۱۹۶۲ء میں دفتر تحفظ ختم نبوت لاہور سے تمام مسودہ چوری کر لیا گیا۔

سبب ایک دفعہ موتی اُگلنے کے بعد بازیچہ اطفال بن جاتا ہے۔ اسی طرح قلم سے ایک بار بجلی ہوتی عبارت اگر ضائع ہو جائے، تو دوبارہ اس میں وہ جان نہیں آتی۔ مسودہ کیا کھویا، میرا دل کھو گیا۔ آئندہ ہمیشہ ہارے ہوئے جواریے کی طرح بیکار ہو کر بیٹھ گئیں، خیالات کی متبع عمارت ڈھیر ہو کر وہ گئی۔ عزم و ارادے کی پامالی چور کو دُعائیں دینے لگی۔ اس طرح ایک سال بیت گیا، کہ میرے عزیز دوست ملک محمد رفیق مالک مکتبہ ادبستان نجف روزنامہ کوہستان لاہور کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے تو انہیں اپنے پرانے دھندے کو از سر نو شروع کرنے کا خیال آیا، اور انہوں نے مجھے حضرت امیر شریعتؒ کی سوانح حیات مرتب کرنے کی دعوت دی، جسے میں نے بغیر کسی کاروباری معاہدے کے قبول کر لیا۔ گری ہوئی عمارت کی نیو پھر سے اٹھانی پڑی، اور نئی تاریخ کے اوراق کھنگالنے میں مصروف ہو گیا۔

قریباً دو سو صفحات کی کتاب ہو چکی تھی کہ اچانک ایک روز ملک محمد رفیق نے



معذرت کے ساتھ کتاب کی اشاعتی ذمہ داریوں سے انکار کر دیا، اس کے لیے  
 انہوں نے خانگی پریشانیوں کا عذر تراشا۔ حقیقت اور افسانے کے درمیان کس قدر  
 فاصلہ ہے، یہ انداز دینے نہیں کر سکا، بہر حال مسودہ چوری ہونے کے بعد یہ دوسرا  
 موڑ آیا کہ بحیثیت مصنف مجھے پھر مایوسی اور نامرادی کا سامنا کرنا پڑا۔

جاسوسی اور دوسرے فحاشی لٹریچر کی بہتات نے صاف ذہنوں کے مصنفین  
 اور پبلشرز کو اپنی راہوں سے دُور کر دیا ہے، اور اس پر کاغذ کی گرانی کوہ بہا لہ سے  
 کہیں زیادہ بوجھل ہو کر گری ہے، جس کے نتیجے میں پاکستان میں ایسی کٹب کا  
 فقدان ہوتا جا رہا ہے، جس کی انسانیت کو خواہش ہے۔

ایسے وقت میں رفیق ملک کا "حیات امیر نثر لیت" کی اشاعت سے انکار میرے  
 ارادوں کی موت کے ہموزن تھا، لیکن اس لاش پر ماتم کرنے کی بجائے میں نے کشتی  
 کو اپنے آنسوؤں کے طوفان میں چھوڑ دیا، اور بٹاروں کی تلاش میں ایک تپواری کے سہارے  
 چلتا رہا، اور اکثر دفعہ ساحل پر پہنچ کر بھی مایوسی ہوئی۔

اقتدارِ زرا انسان کے دل و دماغ پر جب قابض ہو جاتا ہے تو اصولِ ادبیت  
 ریت کے گھر وندے کی طرح گر جاتے ہیں۔ میں نے اس کتاب کی اشاعت  
 کے لیے ایسے دروازوں پر دستک دی، جہاں دولت کی حسد وانی سے انسان  
 ابلیس کے بھی پر کترنا ہے، لیکن میری صدا، صدا بصر ثابت ہوئی۔ اور انہیں دنوں

۵ باغباں نے آگ دی جب آئینا نے کو میرے  
 جن پہ تنکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے  
 یہ آگ پھر ایسی بھڑکی کہ سارا گھر جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔



انہیں حالات میں آٹھ برس گزر گئے، اور اُس مردِ درویش کی کہانی جس نے  
 بڑے صغیر کے کروڑوں انسانوں کی کہانی کو جلا بخشتی تھی، بے رنگ و روغن پڑی رہی، آخر  
 بہار آئی اور نخلِ نو میدی سے ایسے پھول نکلے، کہ بے آب و گیاہ سرزمین کے کانٹوں  
 نے لالہ زار کو نثر مندہ کر دیا۔

یہ درست ہے کہ اکثر دانشوروں نے حضرت امیرِ شریعتؒ کو حنا سراجِ تحسین  
 پیش کیا۔ ملک بھر کے اخبارات و رسائل نے اُن کی سیاسی اور مذہبی زندگی پر تسلیم  
 اٹھایا۔ تاہم اُن کی مکمل زندگی کے ادھورے نقشِ مستقبل کے مؤرخ کو بچد مایوس  
 کرتے رہے۔

برطانیہ ایسی سلطنت کے پرچم کی دھجیاں بکھیرنے والے انسان کی زندگی کے حالات و  
 واقعات کو اُس کی بعض طبعی کمزوریوں تک محدود کر دینا اُس کی کروڑوں خوبیوں سے  
 نا انصافی ہے۔ اگرچہ زندگی میں اُس کے سیاسی اور مذہبی حریفوں نے اُس کے راستے  
 میں کاٹے بکھیرے، اور اُس کی راہیں مسدود کرنے سے گریز نہیں کیا، تو بعد از مرگ  
 دوست نما دشمنوں نے بھی کمی نہیں کی۔

لا ریب کتاب ہذا میں مجھ سے امیرِ شریعتؒ کی تمام زندگی کا احاطہ نہیں ہو سکا  
 اُن کی داستانِ حیات صحراؤں سے صحرا چمن تک بکھری پڑی ہے، بلبل سے کرگسوں  
 تک کو اُن کی کہانی یاد ہے، شمشیر و سناں کے تیز دھاروں سے چل کر غزل کے  
 مطلع و مقطع تک کے اصول و ضوابط ان سے آشنا ہیں۔ ایسے انسان کی کہانی  
 کاغذ کے دامن میں کیوں کر محیط ہو سکتی ہے۔ اور پھر ماضیِ قریب کے معماروں نے  
 اس راہ کے تمام مسافروں کے نقوش اس بڑی طرح مٹاتے ہیں کہ بادِ سموم کو بھی



ہدایت کر دی کہ ایسے کسی نشان کو باقی نہ رہنے دے جس سے ماضی کے واقعات  
 نمایاں ہو سکیں۔ ایسے میں حقیقت اور افسانے کے مابین امتیاز کے لیے جن دو درجے  
 بنگا ہوں کی ضرورت تھی، میرا وجود ہمیشہ اُس سے نہیں رہا۔ اس کے باوجود امیر نثر لیت کی  
 بہتر سالہ زندگی کے تاریک اور روشن پہلو اُجاگر کرنے میں میری عمر کے آٹھ برس صرف  
 ہوئے۔ اس راستے میں میں نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے، اُس کی نشاندہی کے  
 لیے میں تاریخ کا مٹھن ہوں گا، تاکہ دوسرے اڈیشن میں اس کی تصحیح ہو سکے۔

یہ حقیقت ہے، کہ کتاب ہذا کی ترتیب میں میری یادداشتوں نے میرا بڑی حد تک  
 ساتھ دیا۔ تاہم میں اُن مصنفوں کا شکر گزار ہوں جن کی تصانیف نے میری اکثر ہنماٹی کی۔

ان میں

”رئیس الاحرار“ ————— کے مصنف مولانا عزیز الرحمن لدھیانوی

”تحریک مدح صحابہ“ ————— کے مصنف مولانا مظہر علی اظہر

”مارشل لاء سے مارشل لاء تک“ ————— کے مصنف سید نور احمد

”رپورٹ تحقیقاتی عدالت“ ————— از مسٹر جسٹس محمد منیر

فسادات ۱۹۵۳ء“ ————— مسٹر جسٹس ایم آر کیانی

(جانبا ز مرزا)



و  
لی  
م  
کے  
کا  
ہے  
تضمیمہ  
کے  
پیشہ



## امیر شریعت

خالق کی ہر تخلیق میں کوئی نہ کوئی مصلحت کار فرما ہوتی ہے۔ انسانی وجود ہو یا حیوانی ڈھانچہ، نگاہِ بخاندِ فطرت کے یہ حسین شامہکار کائنات کے لیل و نہار میں آرائش کیے ہوئے ہیں۔

ایک اگر نسیمِ سحری اور بادِ سموم کے درمیان شکوہ بھیل کر اپنی زندگی کا مظاہرہ کرتا ہے تو دوسرا فکرِ معاش، عشقِ تباہ اور عجمِ روزگار کے تارِ عنکبوت کے الجھاؤ میں الجھا ہوا ہے اور یہی اگلے کی زندگی ہے۔ موت دونوں کی منزل ہے۔ کچھ فاصلے پر چل کر دونوں دم توڑ دیں گے۔ زندگی دونوں سے وفا نہیں کرتی۔ لیکن حواسِ خمسہ کی سرحدوں سے آگے دونوں کی ذمہ داریاں تقسیم ہو جاتی ہیں۔

اگر انسان کا ضمیر زندہ ہے اور اس کا اُسیبہ فطرت ٹوٹ نہیں گیا، تو لحد سے جہد تک کی تمام ذمہ داریوں کی تصویر صاف دکھائی دے گی۔ اُسے اپنے راستے کے پھول اور کانٹوں میں کوئی الجھاؤ نظر نہیں آئے گا۔ وہ مستقبل



پر اپنے سر ہی کف پا ہو جو دپائے گا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری پہلے ایسے ہی زندہ جاوید لوگوں میں شمار ہوتے  
ہیں۔ وہ آرائش کائنات میں ایسے چراغ کی طرح روشن رہے جس کی تو میں آسمان  
کے ستاروں نے اپنی راہیں تلاش کیں اور گم کردہ راہ انسانوں نے انہیں راہ  
انسانیت کا سنگ میل جاننا۔

وہ حریت و مساوات کی جنس گراں گباراٹھائے زندگی کے بازاروں میں  
دبلیں صدی تک لوگوں کو ہر موڑ پر بلاتے رہے۔ انہوں نے گورنمنٹوں میں برسوں  
اڈائیں دیں لیکن علامہ رگوں کے منہ پر خون کو اپنی گرم گفتاری سے حرکت میں نہ  
لا سکے۔

اگر وہ پہاڑوں کو پکارتے تو شاید وہ خاک راہ بن کر ان کے دامن  
سے لپٹ جاتے۔ اگر ستاروں کو آواز دیتے تو یقیناً وہ اپنی قندیلیں زمین کے  
سوا لے کر دیتے۔ مگر آہ! بخاری نے ان دروازوں پر دستک دی جو  
کے دل خون سے تہی، آنکھیں بینائی سے محروم اور کان صدائے حق سے  
نا آشنا تھے۔

فرنگی قمارخانوں کی دیواروں پر کھڑے ہو کر اس نے مجازی نے  
میں وہ گیت چھیڑا کہ صراحی و جام نکرا کر رہ گئے اور ساتی اپنے سواں بکھو بیٹھا  
وہ ایک ایسا قافلہ سالار تھا کہ راستے کا گرو وغبار بھی جس سے اس کی منزل  
اوجھل نہ کر سکا۔ وہ اپنے پیچھے جو نقش پا چھوڑ گیا مستقبل کے مسافروں کے  
لیے ان میں کئی منزلیں پوشیدہ ہیں۔



زندگی اور موت کے درمیان جب تک کشمکش جاری ہے نظام کائنات جب تک متحرک ہے، زمین اور آسمان کے درمیان جب تک بہار و خزاں کی آمد و رفت جاری و ساری ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

سال ۱۸۹۱ء کے ییل و بہار پر فرنگی حکمرانوں کی جلوہ آفرینیاں ہنوز جنم لے رہی تھیں۔ ہندوستان کے در و دیوار ۱۸۵۷ء کے غیر ملکی تشدد کی صدائے بازگشت سے کبھی کبھار کپکپی محسوس کرنے لگتے تھے۔ غلامی کی زنجیریں سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔ ہندوستان کا بخت اقتدار فرنگی کے روبرو نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

وقت نے ہمیشہ بخت کا ساتھ دیا ہے۔ زمانہ شاہی عروج کے جلو میں چلنے کا عادی ہے۔ غلام ہندوستان سے وقت اور بخت دونوں روٹ چکے تھے۔ منطیہ سلطنت کے آفتاب کو غروب ہوئے ۳۴ برس بیت چکے تھے کہ پٹنہ ضلع بہار کی سرزمین پر ربیع الاول ۱۳۱۰ھ (مطابق ۱۸۹۹ء) چاند رات جمعہ کے دن نور کے تڑپ کے میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام دوھیال کی طرف سے عطاء اللہ اور نہال کی جانب سے شرف الدین احمد رکھا گیا۔

خدا کے سوا اس راز سے کون آشنا تھا کہ ایک ماں اپنی کوکھ سے آج جس بچے کو جنم دے رہی ہے وہ خون اور گوشت کا بوٹھرا نہیں بلکہ مستقبل کے ہندوستان کی پیشانی کا ایک جمجمہ ہے جس کی روشنی سے حکمرانوں کی آنکھیں چندھیلا جائیں گی اور نیا نئے انسانیت میں وہ اپنے وقت کا عظیم خطیب ہوگا!



سیاسی لحاظ سے ۱۸۹۱ء کا سال بڑا اہم سال تھا۔ اسی سن میں بعض اور لوگ بھی عدم سے وجود میں آئے جنہوں نے آگے چل کر تاریخ اومیت کو اپنے خون سے جلا بخشی۔ جنون شوق سے عقل و خرد کی راہیں ہموار کیں تاکہ اپنے والوں کے لیے راستے کے نشیب و فراز پر ان کا ہر نقش پائسنگ میل بن کر رہ جائے۔

اس سلسلے میں یوگوسلاویہ کے صدر جوزف بروز ٹیٹو، فرانس کے جنرل چارلس ڈیگال، جاپان کے شاہی خاندان کے شہزادہ گینوئی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نظام فطرت کی بوقلمونیاں دیکھیے کہ ایک ہی وقت، ایک ہی موسم اور ایک ہی سال میں ماں کی کوکھ سے دھرتی کی پیٹھ پر آنے والے یہ چاروں بچے کائنات کے بناؤ سنگار میں کس طرح مسروف رہے۔

آخر الذکر یورپ میں پیدا ہوئے۔ راج سنگاسن پر بیٹھ کر لوگوں پر حکومت کرتے رہے لیکن اول الذکر نے ایشیا کی گود میں جنم لے کر عوام کے دلوں پر حکمرانی کی۔

## گھڑانا

تاریخ جن لوگوں کو اپنی تکمیل کے لیے منتخب کرتی ہے۔ لازم نہیں کہ ان کی نسبت کسی اونچے اور اعلیٰ خاندان سے ہو، بلکہ ماضی بعید میں جن لوگوں نے تاریخ کے صفحات پر اپنے نقش چھوڑے ہیں ان کے آبا و اجداد



ووقت کے حاکمانہ وقار نے کبھی نظر التفات سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ انہیں  
 جھونپڑیوں میں پرورش پانے والوں نے جب محلات پر کمندیں ڈالیں تو شاہی  
 تاج ان کے قدم چومنے لگا۔ اور فرماں روائی ان کی عمائیں اٹھائے پھری۔  
 سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا جو روحانی دنیا میں  
 رشد و ہدایت کا صدیوں محور رہا۔ انسانی زلیست نے فخر و مباحثات کے  
 سینکڑوں صنم خانے ویران کر کے انہی سے خانوں سے اپنی آنکھوں کے ڈولے  
 سرخ کیے۔ ان کے لوط گھراتے قدم انہیں آستانہ مراد تک لے آئے یہیں  
 سے انسانیت اپنی منزل کے لیے سفر شروع کرتی ہے۔

اس صدی کے مشہور کشمیری مؤرخ منشی محمد الدین فوق اپنی تصنیف "تاریخ  
 کشمیر" کے دوسرے حصہ میں رقم طراز ہیں کہ:-

"حضرت امام حسن مجتبیٰ کی چوبیسویں اور حضرت شیخ سید محی الدین  
 عبدالقادر جیلانیؒ کی تیرھویں پشت سے ایک بزرگ سید  
 عبدالغفار بخاریؒ مشہور قاضی خاں تھا ہی بخارا سے اپنے والد  
 سید محمد بخاری کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے۔ اسلامی حکومت  
 کا زمانہ تھا۔ عہدہ درس و قضا پر فائز ہوئے۔ سرنگر میں اب  
 بھی آپ کی قبر مزار بڑھ شاہ میں دیوار سے متصل شمال کی جانب  
 موجود ہے۔"

سید عبدالغفارؒ کی اولاد کشمیر کے علاوہ پنجاب کے اضلاع  
 گجرات اور امرتسر میں بھی اکثر پھیلی اور اب بھی موجود ہے۔



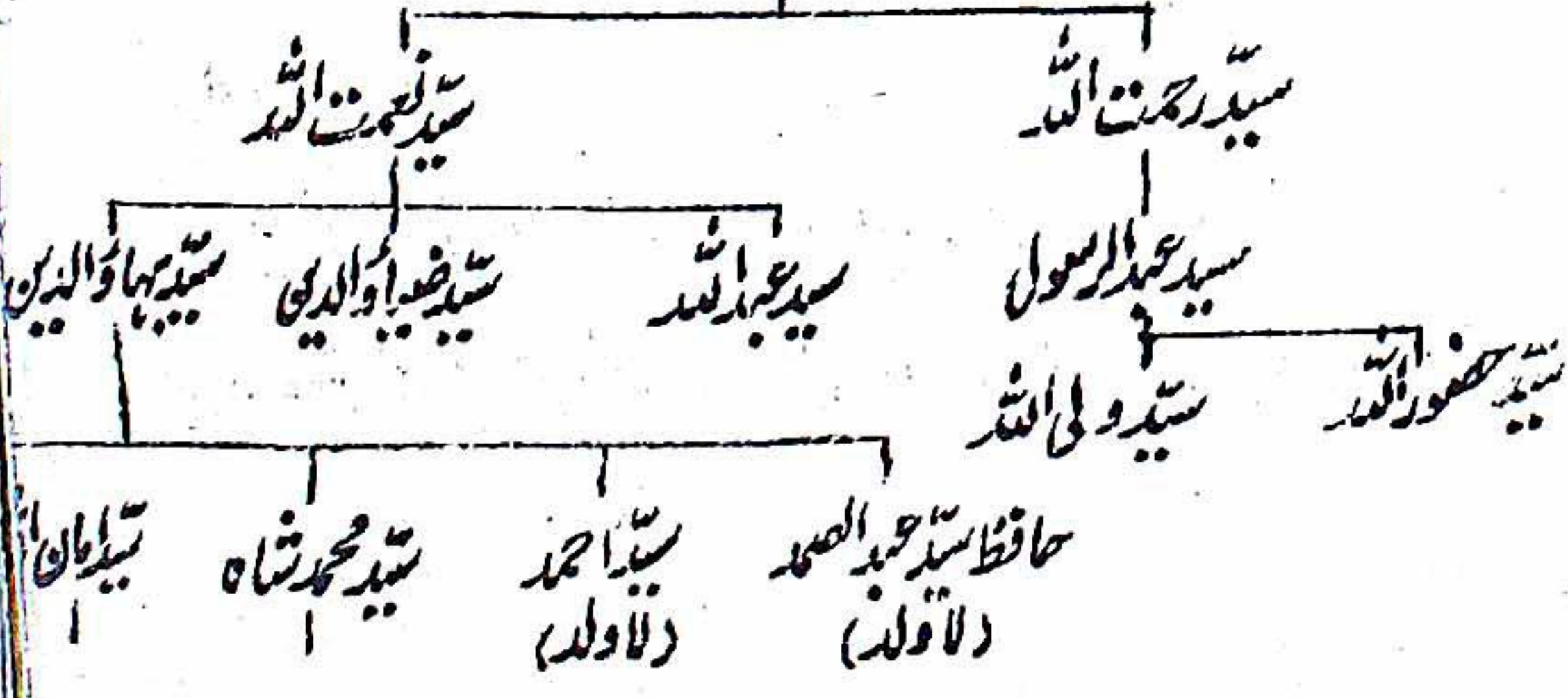
انہی کی اولاد سے ساتویں پشت میں سید عبدالرسول جو کہ  
 سید رحمت اللہ کے بیٹے تھے ایک خدار سیدہ بزرگ گزریے  
 ہیں۔ ان کا تقویٰ یہاں تک تھا کہ مرنے کا اندھ اور مرغ صرف  
 اس لیے نہیں کھاتے تھے کہ یہ وارثوں کا لوگوں کے گھروں  
 میں بھی جا کر کھا لیا کرتے ہیں۔ اسی زمانے میں شاہ عبدالرحمان  
 (جو رحمان شاہ کے نام سے ایک مشہور مجذوب گزرے ہیں)  
 کے اشارے سے سید عبدالرسول نے اپنے دونوں بیٹوں سید  
 حضور اللہ اور سید ولی اللہ کو دستکاری اور عوام کی خدمت کے  
 لیے وقف کر دیا تھا۔

اس سلسلے میں آگے چل کر تاریخ اقوام کشمیر کے مصنف بشیرہ نسب کو یوں  
 ترتیب دیتے ہیں :- حضرت امام حسن مجتبیٰ

سید محمد بخاری (چوبیسویں پشت) حضرت محی الدین سید عبدالقادر جیلانی  
 (تیرہویں پشت)

سید عبدالغفار بخاری

جو تھی پشت  
 سید عطا اللہ شاہ اول





سید محمد شاہ

سید امان اللہ

سید میر شاہ یوسف شاہ مصطفیٰ شاہ سید حسن شاہ سید فضل شاہ سید نظام شاہ  
سید محی الدین (بلا اولاد زینہ) سید عبد الحمید سید فیض اللہ (بلا اولاد زینہ) سید عبد الوحید  
سید محمد اسلمجان

سید نور شاہ سید پیر شاہ سید عبد الغنی سید سعید شاہ سید حسام الدین  
سید ضیاء الدین (لا ولد) سید محمد اسحاق سید محمد امجد سید محمد امجد  
حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

سید عبدالرسول کے والد سید رحمت اللہ کے دوسرے بھائی کا نام سید  
نعمت اللہ تھا۔ رحمت اللہ اور نعمت اللہ کے والد سید عطاء اللہ شاہ اول حضرت  
سید عبدالغفار بخاری کی چوتھی پشت سے ہیں۔  
سید عبدالرسول کے چچا سید نعمت اللہ کے چار فرزند تھے جن میں سے  
سید عبداللہ اور سید ضیاء الدین لا ولد تھے۔ تیسرے لڑکے سید بہاؤ الدین تھے  
جن کے چار بیٹے تھے۔ ان کے دو بیٹوں سید محمد شاہ اور سید امان اللہ کے ماں اولاد  
تھی۔

سید امان اللہ کے چھ بیٹے ہیں جن میں دو اولاد زینہ سے محروم رہے  
چار اولاد زینہ سے سرفراز کیے گئے۔ سید محمد شاہ کے پانچ لڑکے تھے سید  
پیر شاہ لا ولد تھے اور سید حسام الدین کے ماں عمر بھر زینہ اولاد نہ ہوئی باقی  
تین صاحب اولاد تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری سید نور شاہ کے پوتے اور  
سید ضیاء الدین کے فرزند تھے۔



اس طرح سے یہ خاندان اب تک پاکستان کے اکثر علاقوں میں پھیل چھوڑ  
 رہا ہے۔ لوگ انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

## نہال

لاریب لاریبی کا سلسلہ نسب دھبیال سے شروع ہوتا ہے، لیکن  
 عالی نسب ہونے کے لیے اس قدر سزا و صوری معلوم ہوتی ہے۔  
 ماں کی کوکھ میں اولاد بھی بھی صحیح پرورش پائے گی جب ماں کا اپنا  
 شون شریف النفس والدین کی بنیاد پر ہوگا۔ ورنہ ایک طرفہ نیکی کے نتائج اکثر  
 غیر صالح رہتے ہیں۔

بلاشبہ سید عطاء اللہ شاہ کی عالی نسبی جس کے باعث ان کے دھبیال  
 کی قبائلی زندگی ہمیشہ روشن رہی قدر سے گہری معلوم ہوتی اگر اس میں نہال  
 کا بیونہ برابر کا نہ ہوتا۔ چنانچہ سید عطاء اللہ شاہ کی والدہ محترمہ سیدہ فاطمہ اندرابی  
 بنت مولانا حکیم ساقی سید احمد اندرابی کا نسب نامہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ  
 اللہ علیہ سے ملتا ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کو روحانی دنیا میں بلند مقام حاصل ہے ان  
 کی نواسی سید عطاء اللہ شاہ کی نانی اماں تھیں۔

## سید ضیاء الدین

ہنوز پندرہ کی اقتدار کا سورج طلوع ہونے چند ساعتیں گزر ہی تھیں، ابھی



حالات نے وفا کے دامن کو گم نہیں دی تھی، دلوں کے تالے سچا بی کھو جانے پر بھی زنگ آلود نہیں ہوئے تھے کہ سید عطاء اللہ شاہ کے والد سید ضیاء الدین اپنے نایا سید پیر شاہ صاحب بخاری اور چچا حافظ سید حمید شاہ صاحب بخاری کے ساتھ لٹمنے کی سوداگری کرنے اپنے گاؤں ناگڑیاں ضلع گجرات سے بہار کے مشہور شہر ٹپنہ میں اکثر سبایا کرتے تھے۔

سہ ماہی دلوں پر اٹھارہ انیس سال کے پیٹے میں تھے۔ انہیں قرآن کریم پڑھنے اور سنانے کا اس قدر شوق تھا کہ ایک دفعہ محلہ چوک بازار دہلی میں ملک عنبر کی مسجد میں رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں شبینہ کے روز نماز عشاء کے وقت پتہ چلا کہ آج تین حافظ باہم مل کر قرآن کریم ختم کریں گے تو غصہ میں کہا: "یہ کیا حرکت ہے، ایک ہی آدمی کو قرآن کریم ختم کرنا چاہیے؟" امن پر دوسرے حافظ نے طنزاً کہا: "تو پھر یہ کام آپ ہی کریں!"

"بہت اچھا۔" یہ کہہ کر مسجد سے چلے آئے۔ گھر آئے تو چہرے پر تغیر کے آثار دیکھ کر سید حمید شاہ نے فرمایا: "کیا بات ہے حافظا جی۔؟" کچھ کھوٹے کھوٹے سے دکھائی دیتے ہو۔ اس پر مسجی کا سارا واقعہ کہہ دیا۔ سید شاہ نے فرمایا: "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ اللہ کا نام لے کر شروع کر دینا۔" چنانچہ رات جب قرآن کریم پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو پہلی رکعت میں پچیس پارے ختم کر دیئے۔ اسی طرح مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دادا مولانا محمد رحمت اللہ کا بیان ہے کہ:-



۱۸۵۶ء کے بعد ایک نڈت میں نے پٹنہ دکنکا کے کٹا سے  
 مسجد میں گزار دی۔ ان دنوں حافظ ضیاء الدین کی عمر انیس سال  
 تھی اور انہوں نے ایک رات مجھے ایک ہی رکعت میں  
 سارا قرآن کریم سنایا۔

## شادی

نیک سیدوں کا یہ خاندان ایک عرصہ پٹنہ میں رہ کر اس قدر مقبول ہوا  
 کہ نہ صرف کاروبار میں برکت اور رحمت ہوتی، دنیاوی قربت واری کی خواہشیں  
 بھی پروان چڑھنے لگیں۔ پٹنہ کے متمول اہل دین و ارض صاحب فکر حکیم حافظ  
 سید احمد اندرابی نے سب سے اکثر خاندانی تعلقات استوار ہو چکے تھے اپنی  
 دختر نیک انور حضرت حافظ سیدہ فاطمہ اندرابی کی شادی حافظ سید ضیاء الدین  
 سے کر دی۔

## فاطمہ اندرابی

۱۸۵۶ء میں فرنگی سامراج کے ماتحتوں دلی کا جو سہاگ اہڑا اگر  
 جہا کی بہریں آج تاریخ کے اوراق اگل دیں اور لال قلعے کی دیواریں ان خوبی  
 حادثات کی گرہ کشائی کریں تو ماضی کی ایک ایک لکیر ابھر کر سامنے آجائے  
 — شرافت اور تمدن کی بوہنہ لاشیں وہلی کی شاہراہوں پر شرم و حیا کی بھیک  
 مانگ رہی تھیں، آگ کے شعلوں میں لپٹی ہوئی عمارت غیر ملکی حکمرانوں کے ظلم و



جوڑ میں رنگ بھرد ہی تھیں، گلیاں اور بازار خاندانوں کے بے خانماں ہونے پر ماتم کٹاں تھے۔

اس پُر آشوب دور میں اُبڑے ہوئے گھروں میں ایک گھرا تا حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی نواسی کا بھی تھا، جو وہلی سے صوبہ بہار کے شہر بیٹنہ میں سجا کر آباد ہوا۔ سیدہ فاطمہ اندرابیؑ اسی گھر کی نیک سیرت بیٹی تھیں۔

## والدہ کی وقت

انسانی ارادے و لوں میں جنم لیتے ہیں، ذہنوں میں پرورش پاتے ہیں اور عمل کی دنیا میں اکثر و بیشتر مات کھا جاتے ہیں۔ یہیں سے قدرت اور انسان کے درمیان سدِ فاصل قائم ہوتی ہے۔ اگر عزم انسانی کا ثبات کی تسخیر کے نقشے سوچتا ہے تو خالق کائنات ہر نقشے کو نقش فریاد ہی بنا دیتے ہیں کہ آدمی کے تصورات کا ہیولی پانی پانی ہو کر رہ جاتا ہے۔ والدین اولاد کے مستقبل کے لیے جو خاک کے ترتیب دیتے ہیں۔ کبھی تو وہ ریت کے گھر وندے ثابت ہوتے ہیں اور کبھی ان پر تاج شاہی کے گل بوٹے کھاتے ہیں۔

سید عطا اللہ شاہ بخاری بچپن کی چوٹھی بہار میں سے گزرا ہے تھے کہ ان کی والدہ محترمہ کو داعی اجل کا پیام آگیا اور وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ گو آغوش پدری میں ماں کا پیار جلوہ فگن نہیں تھا تاہم شفقتِ والد نے انہیں اس



احسان سے دُور رکھا۔

بغیر ماں کے بچنے کی زندگی اُس پتے کی طرح ہوتی ہے جو شاخ سے ٹوٹ کر کبھی تو بادِ مہبوم کی جھولی میں جا گرتا ہے اور کبھی نسیمِ سحرگاہی اُسے اپنے پالنے میں سنبھال لیتی ہے تاہم شاخ سے محروم زندگی تلخ کامیوں میں بسر ہوتی ہے۔

بن ماں کے بچے باپ کی تربیت کے سہارے پروان چڑھنے لگا۔  
۱۸۵۶ء کی صدائے بازگشت سے کبھی کبھار فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا  
لیکن شادِ عظیم آبادی کے نغمے فضا کا رخ موڑ دیتے۔ ان دنوں پٹنہ میں حضرت  
شادِ عظیم آبادی کا چراغ جل رہا تھا۔ شعر و ادب کی ساری روئیتیں اُن کے وجود  
کے گرد سمٹ کر رہ گئی تھیں۔

سید علی محمد شاد جو آگے چل کر شادِ عظیم آبادی کے نام سے معروف  
ہوئے جنوری ۱۸۲۶ء کو پٹنہ کے محلہ پورب دروازہ میں پیدا ہوئے اور جنوری  
۱۹۲۶ء کو انتقال کر گئے۔

محلہ پورب دروازہ سید عطا اللہ شاہ بخاری کے محلہ کے برابر میں تھا۔  
پڑوسی اور سید ہونے کے باعث شادِ عظیم آبادی کا بچپن اکثر شاہ جی کی زانی  
اماں کے ہاں گزرتا۔ چونکہ یہ گھرانہ بھی پٹنہ میں علم و ادب کا مرکز تھا اس لئے شاد  
عظیم آبادی نے بھی اس صحبت سے کافی فیض پایا۔ چنانچہ زبان کی نوک پلک اور  
شعر کہنے کا سلیقہ اسی گھر کا مرہونِ منت ہے۔

شادِ عظیم آبادی کی عمر اور شاعری اپنی جوانی کی سرحدیں عبور کر چکی تھی



کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو جھوٹے سے نکال کر اُن کی گود میں ڈال دیا گیا اور مستقبل کا خطیب اعظم وقت کے عظیم شاعر کی جھولی میں شعرِ ادب کے کھلونوں سے کھیتا رہا۔

## بچپن

بچہ خواہ انسان کا ہو یا حیوان کا حادثات و خصائل میں ترازو کے ایک ہی تولیے پر ہے۔ انبیاء جنسِ دوسری بات ہے مگر شوخی دونوں کے خمیر میں ایک سی ہے۔ شرارت دونوں کی گھٹی میں ہے اور پھر جو بچہ یتیم ہو، عزیز و اقارب کا پیار اُس کے بگاڑ میں خاصا معاون ہوتا ہے۔

والدہ کی موت کے بعد شاہ جی کو ماں کا پیار اور اُن کی ذمہ داریاں صرف والد کے پیار میں تلاش کرنی پڑیں۔ چنانچہ باپ نے فرزند کے گرو پیار محبت کا ایک ایسا حصار تعمیر کیا جس میں علم و دین کی تکمیل ہو سکے۔ یاد رہے کہ اس وقت میں انگریزی تعلیم مذہب سے لگاؤ رکھنے والے لوگوں کے نزدیک اخلاقی طور پر مجرم سمجھی جاتی تھی۔ نیز شرفار کے ماں بچوں کی ابتدائی تعلیم گھروں میں تکمیل پاتی تھی۔ چونکہ عربی اور فارسی خود شاہ جی کے اپنے گھر کی تعلیم تھی۔

نانا اور نانی معلم بنے، باپ نے نگرانی کی اور پھر شاہ جی کی ادبی محفلوں نے اس سونے کے بکھار میں سہاگے کا کام کیا۔

والد صاحب کا شوق تھا کہ بیٹا اُن کی طرح حافظِ قرآن ہو۔ چنانچہ کارڈیا کے علاوہ وقت کا اکثر حصہ شاہ جی کو قرآن پڑھانے میں صرف کرتے۔ اس کا



۱۸۹۹۵

نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ جی کو قرآن سے عشق ہو گیا اور وہ ہمہ وقت کتاب اللہ کو سینے سے لگا سٹے رکھتے۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت جلالی تھی۔ لہذا ان کے خوف اور قرآن سے لگاؤ کے درمیان کھیل کود کے لیے وقت نکالنا "کارے دارو" تھا تاہم گھر میں ماموں ہم عمر تھے۔ دونوں کی ملی جھلت سے یہ مشغل بھی جاری رہتا۔ شاہ صاحب خود فرمایا کرتے تھے کہ :-

"مجھے پتنگ اڑانے کا بہت شوق تھا۔ قرآن کریم اور دوسری تعلیم سے ذرا فرصت ملی اور والد صاحب کہیں کام کے لیے گھر سے نکلے تو ماموں کو ساتھ کیا اور جھٹ سے چھت پر جا پڑھے۔ پتنگ کا مشغل شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ آمنے سامنے

پہنچ لڑ رہے ہیں اور دونوں طرف سے ڈور پلائی جا رہی ہے کہ اتنے میں والد صاحب تشریف لے آئے۔ بس پھر کیا وہیں ہاتھ سے ڈور توڑ کر نیچے بھاگ آئے۔ اب ایک طرف پتنگ کٹی جا رہی ہے اور دوسری طرف بد مقابل شکست کی آوازیں لگا رہے ہیں۔ مگر ہو بھی کیا سکتا تھا، انکھیں پتنگ کی طرف، کان و شمنوں کی آوازوں پر اور دل میں یہ خوف کہ کہیں آبانے نہ دیکھ لیا ہو اور اگر کہیں پتہ چل گیا تو پھر جو پٹائی ہوگی وہ خدا ہی جانتا ہے۔"

بہر حال تعلیم کے ساتھ ساتھ چھٹپنے کی روایتی شونیاں بھی اپنا کام



کرتی رہیں۔

## قرابت

جنون مشوق اگر نورو کا پاسبان ہو تو ناخن تدبیر دل کی گرہ کشائی میں سمٹاؤ  
کرتے ہیں۔ شاہ جی کو کتاب اللہ وراثت میں ملی تھی۔ نہال کا گھرانہ دین مبین  
سے نا آشنا نہیں تھا۔ والدہ محترمہ قرآن کی حافظہ، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا  
سینہ بھی اس خزینے سے مالا مال تو پھر بیبا اس دولت سے کیوں کر تہی دامی  
رہ سکتا تھا۔ دو سال میں قرآن کریم اذہر کر لیا۔ چنانچہ خود شاہ صاحب فرماتے ہیں:-  
میں اکثر ظہر اور عصر کے درمیان قرآن کریم ختم کر لیا کرتا تھا۔

ان دنوں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اٹھارہ سال کے پلٹے میں تھے۔  
محمد عمر عاصم نامی کویت کا ایک شخص جو سلطان عبدالحمید والٹے ترکیہ کے بچوں  
کو قرآن کریم پڑھانے پر مامور تھا، سلطان کی اس سے قدرے ناراضگی ہو گئی  
اور وہ ترکیہ چھوڑ کر ہندوستان کی سیاحت کے لیے نکل آیا۔ سیر و تفریح کیلئے  
دورانِ جرب وہ پٹنہ آیا تو یہاں کی آب و ہوا نے اُسے متاثر کیا اور ایک مدت  
وہ یہیں رہا۔ قدرت نے اُس کے گلے میں رس اور آواز میں سوز عنایت کیا تھا  
وہ جب کبھی موع میں آکر قرآن کریم پڑھتا تو غیر مسلم بھی مسجد کے گرد جمع ہو جاتے۔  
سب شاہ جی کو اخذ فن میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ اکثر محمد عمر عاصم کے  
لہجے میں قرآن کریم پڑھتے اور پھر گھر میں اس کی مشق کرتے۔ چنانچہ ایک دن شاہ جی  
قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے کہ محمد عمر عاصم کا گزرا اس راستے سے ہوا



تو وہ شاہ جی کی آواز اور اپنا ہی لہجہ سن کر بہت متاثر ہوئے۔ اسی شام محمد عمر  
عاصم نے حضرت شاہ جی کے والد سے درخواست کی کہ آپ اس بچے کو  
میرے پاس بھیج دیا کریں۔

فنِ قرأت میں عربی زبان کے تلفظ اور آواز کے زیر و بم کو ایک ساتھ  
چلنا ہوتا ہے لیکن اکثر قاری قرأت کے سفر پر ایک کوچھے چھوڑ جاتے ہیں۔  
شاہ جی کو فنِ قرأت کی یہ معراج حاصل رہی کہ قرآن کریم تلاوت کرتے وقت  
ان راہوں سے حرم و احتیاط سے گزرتے۔ حجازی لہجے میں ان کے گلے کی  
حلاوت ان کا پورا ساتھ دیتی اور یہی وجہ تھی کہ جب وہ قرآن پڑھتے تو یوں  
معلوم دیتا جیسے آسمان سے ابھی نازل ہوا ہے۔ چنانچہ اکثر واقعات ہیں  
کہ غیر مسلم ان کے جلسے میں صرف قرآن کریم سننے جایا کرتے تھے۔ اسی طرح  
کئی خانہ اہل مسلمان ہوئے۔

## امرتسریں

سال ۱۹۱۲ء یورپ اور ایشیائی قوموں کی ہلاکت آفرینیوں کی تیاریوں  
میں مصروف تھا۔ بنی نوع انسان کی تباہی کے نشانات ابھر رہے تھے۔ یورپ  
کے سیاسی دانشوروں کے غلط فیصلوں نے براعظم کو مرگ و زلیلت کے  
دور اپنے پر لاکھڑا کیا تھا۔ جرمنی اور برطانیہ کی جنگ ایک تہذیب اور ایک  
ضرورت کی لڑائی تھی۔ آگ اور موت کے اس کھیل میں برطانوی استعمار اقوام  
ایشیا کو استعمال کرنے کے نقشے بنا چکا تھا۔ غلام قوموں کے مردہ ضمیر پر کڑے



ہو کر پہلی جنگ عظیم لڑنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ شاہ جی والد کی اجازت  
یے بغیر گھر سے نکل کر طے ہوئے۔

سر پر بھاری قسم کی ریشمی سبز بگڑھی، ریشمی اچکن، رنگ پانچے کی شلوار  
اور بھاری طرز کی سُرخ رنگ کی جوتی پہنے اور چھوٹا سا لہجے کا ٹرنک اٹھائے  
دن کے چار بجے ہل بازار امرتسر میں سید میر اسد اللہ شاہ بخاری کی دکان پر پہنچے  
یہ بزرگ شاہ جی کے قرابت داروں میں سے تھے۔ ان دنوں شاہ جی کی عمر قریباً  
اکیس برس کے پٹھے میں تھی۔

میر اسد اللہ ہے۔ میں حافظ ضیاء الدین کا بیٹا ہوں اور چٹہ سے  
اُن کی اجازت کے بغیر آیا ہوں؟

اس ضمن میں شاہ جی کا اپنا بیان ہے کہ:-

میں گھر سے نکل کر کچھ مدت بتا دس چنے والی مسجد کے زیر سایہ  
جیاں شکر اللہ کے پاس ٹھہرا۔ یہ صاحب پاندھی کے مدنی  
کوٹنے کا وصفا کرتے تھے اور پہلوانی بھی۔ اُن کی صحبت کا  
یہ اثر ہوا کہ میں نے ورزش کرنی اور ڈنٹ پلینے شروع کر دیے  
اور یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا۔

میر اسد اللہ بخاری کے برادر نسبتی سید پیر شاہ بخاری جو رشتہ میں شاہ جی  
کے والد کے چچا تھے، انہیں دینی تعلیم کے لئے مولانا بہاؤ الحق قاسمی کے  
والد حضرت مولانا مفتی غلام مصطفیٰ قاسمی کے ہاں چھوڑ آئے۔ مفتی غلام مصطفیٰ  
قاسمی ان دنوں کھڑاں گہاراں کی مسجد کے خطیب اور مدرسہ حضرت الحق میں مدرس



تھے۔ ان کا شمار اپنے علم اور تقویٰ کے اعتبار سے امرتسر میں اس دور کے ممتاز علما میں ہوتا تھا۔

شاہ جی نے ۱۹۱۴ء تک اس دور کی گاہ میں صرف دو نوحہ اور فقہ کی کتابوں کی تعلیم مکمل کی۔

## ناگڑیاں

گجرات سے قریباً پندرہ میل کشمیر سے ملحق پہاڑ کے دامن میں یہ مختصر سی تاریخی بستی جہار ابرہہ اشوک کے دور میں "ناگنی" کے نام سے مشہور تھی۔ تاریخ کا دامن اس سے آگے نہیں ہے کہ یہ بستی کس نے آباد کی اور اس کا نام کیوں کر بگڑا لیکن تاریخ کی گرہ کشانی سے اس قدر پتہ چلتا ہے کہ ۶ مارچ ۱۸۴۴ء میں جب جہار ابرہہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے کشمیر کا سودا کیا تو وہاں کے چند مسلمان گھرانے کشمیر سے یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ سیدوں کا یہ گھرانہ بھی انہی میں شمار ہوتا ہے۔ جن کے ہاں آگے چل کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے جنم لیا۔ یہ لوگ ہنوز اس گاؤں کی سرزمین کو اپنے نیک اور پاک وجود سے قبروں میں آرام کرنے کے باوجود منور کیے ہوئے ہیں۔

شفقت پوری بیٹے کی جدائی کو زیادہ دیر گوارا نہ کر سکی اور ۱۹۱۴ء کو حافظ ضیاء الدین اپنے بیٹے کو امرتسر سے ناگڑیاں لے گئے۔

## شادی

۱۹۱۴ء کا سال پہلی جنگ عظیم کا ابتدائی سال ہے۔ اس سن میں یورپ



کی تہذیب قوموں نے ایک دوسرے کے گریبانوں سے کھیلنے کی مشق ستم ایجا  
کی تھی اور انہی دنوں تہذیب مغرب عریاں ہو کر ایشیا اور وسط ایشیا کے آزاد  
رسم و رواج کے گرد خلائی کا حصار تعمیر کرنے کو سامنے اکھڑی ہوئی تھی۔

۱۸۵۶ء کے بعد گولام ہندوستان کا نہ تو کوئی تمدن رہا تھا اور نہ تہذیب  
کے پاس ایسا کوئی پیر ہی تھا جس سے گمشدہ تہذیب کی نشان دہی ہوتی۔ لیکن کھینچی  
ہوئی قندیلیں ابھی ایسی روشنی دے رہی تھیں جن کے جلو میں چند حدی حواں کھائی  
دیتے تھے، جو ویران صوراؤں میں حجازی نے پر تہذیب کہنے کے گیت لاپ  
رہے تھے۔ اسی دور میں شاہ جی کی شادی کی رسم سید میر مرتضیٰ شاہ صاحب  
کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ سید میر مرتضیٰ شاہ صاحب سید ضیاء الدین کے  
علم زاد بھائی تھے۔

بہاوتی کھیتوں کے کنارے قدیم وضع کے دیہاتی کنوؤں نے سید  
زادے کی تقریب سعید پر خوشی سے دفین بجائیں۔ گاؤں کے پیر بارانیوں پر  
اپنے دامن سے ہوا کر رہے تھے۔ بڑی بوڑھیوں نے دعاؤں کے ساتھ  
سہاگ کے گیت گائے۔ دیہات کی اٹھارہ دہیزائیں اس آئینے میں اپنے مستقبل  
کی تصویریں دیکھنے لگیں۔ گاؤں کے گھیلے جوان جذبات کی پگڑیوں پر سفر کرتے  
ہوئے اس شادی میں شریک ہوئے۔ ان ساوہ اور اسلامی رسم و رواج کو دیہات  
کی ساوگی نے اور پھلا بخش دی۔ جسے دیکھ کر تہذیب مشرق زریب مسکراتی رہی۔

**دوبارہ امرتسر میں**

۱۹۱۵ء کی گزشتہ سال کی طرح یورپ کی بڑی لڑائی کا دوسرا سال تھا



حکوم تو میں یوڈپ کی مانتھا پائی میں اپنی غلامی کی زنجیریں پھینکتے ہوئی دیکھ رہی تھی  
 اس کی میں شاہ جی شادی کی رسم سے فارغ ہو کر نصاب تعلیم مکمل کرتے پھر امرتسر  
 آپہنچے۔۔۔ یاد رہے اسی زمانے میں شاہ جی نے اپنی روحانی تربیت کے  
 لئے حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گویا ہ شریف کے ماتھے میں لاکھ دیا تھا۔

شباب کے دن اور جوانی کی بہاریں۔۔۔ آدمی کی عمر جب ان دونوں  
 کے درمیان سے گزرتی ہے تو راستے کی ہر شے دعوت دیتی ہے۔ نیکی  
 اپنی طرف کھینچتی ہے تو بڑائی اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ اس کھینچا تانی میں کبھی  
 برائی کا دامن تار تار ہو جاتا ہے اور کبھی نیکی اپنی کم مائیگی کا ماتم کرتی ہے لیکن جسم  
 میں اگر روح سعید ہو تو برائی کو شکست سے دینا بڑی بات نہیں ہوتی مگر نیکی  
 کے حصول میں عمر کے اس موڑ سے گزرتا بڑا کڑوا کھونٹ ہے جسے بہت کم  
 حلق قبول کرتے ہیں۔

یہی کشمکش کے دن تھے جب شاہ جی کو از دو واجی بندھنوں میں باندھ  
 دیا گیا۔ نیز حالات نے تاکید بھی کر دی کہ "دامن ترکن ہیشیا رہا ش"۔ لہذا اس  
 سال جب دوبارہ شاہ جی امرتسر آئے تو چہرے پر سبزے کا آواز تھا۔ جسم  
 اگرچہ اکہرا تھا مگر مضبوط، رنگ گندھی، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی چکھوڑا انگلیں اور  
 ان سب پر پانچ فٹ چھ پانچ فٹ نے وہ بہادر لگا رکھی تھی کہ سر پوز لطف دراز لیے  
 حسن و شباب کا یہ خوبصورت نگار تھی راہوں سے گزرتا اپنی جہک چھوڑتا سمجھاتا  
 چہرے کے لوگ انہیں "حافظ جی" کہہ کر پکارتے تھے۔

حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کے درمیں میں دوبارہ شامل ہو کر دیکھو



بسوں کی تکمیل شروع کر دی۔ استاد اور شاگرد کے مابین محبت کا ایسا رشتہ قائم ہوا  
 کہ استاد نے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مولانا قاسمی جمعہ شاہ جی سے پرچوں یا  
 کرتے تاکہ انہیں تقریر کے اہم پیغام سے آگاہی ہوتی رہے۔ وہ حقیقت یہی  
 وہ دن ہیں جب مستقبل کا خلیب اعظم فن خطابت کی ابتدائی منزلوں میں داخل ہوا۔  
 جب کئی پھول بن کر اپنی پتیاں بکھرتی رہے تو باغ کے گل بوٹے ہی اس  
 کی جھک سے معطر نہیں ہوتے بلکہ نسیم سحر محی اپنی جھولیاں بھر کر اڑوس پڑوس میں  
 اپنا رنگ جماتی پھرتی ہے۔

شاہ جی کے قرآن کو پیم پڑھنے کا انداز جب عام ہوا تو شہر کے گلی محلوں  
 میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ لوگ انہیں شبیوں پر بلانے لگے۔ گھروں سے نکل کر  
 یہ آواز گلی کوچوں اور پھر بازار تک آئی۔ دل سے نکلی دیر جاناں تک پہنچی۔  
 آخر وقت آیا کہ مسجد کے ارد گرد کے لوگوں نے مولانا غلام مصطفیٰ  
 کو مجبور کیا کہ شاہ جی کو کھٹے میدان میں تقریر کرنے کی اجازت دیں۔ چنانچہ پہلی  
 تقریر اندرون گلوالی دروازہ بازار کھاراں میں ہوئی۔ دوسری تقریر کے لئے سید  
 گلاب شاہ نامی شخص جو مولانا غلام مصطفیٰ کے مقتدی تھے، شاہ جی کو امرتسر کی  
 نواحی جی سلطان ونڈ لے گئے۔ اس طرح سے یہ کئی کئی پھول بنا اور اس کی جھک  
 نے ساری فضا کو معطر کر دیا۔

امامت

جنگہت باد بہاری نے چمن بر دوش ہو کر لائے گل سے سرگوشیاں کیں اور



صحن چمن سے بوٹے لالہ و گل اڑا کر لے گئی۔ شبنم کے آنسو چہیتے رہے۔ نسیم  
 صبح گاہی سر پیٹ کر رہ گئی۔ گل بوٹوں نے لاکھ حصار کیے مگر بوٹے گل اسیروں  
 ہو سکی۔ کوچہ جیل خانہ کے عوام اپنی مسجد کے لئے پیہم اصرار کے ساتھ مولانا  
 غلام مصطفیٰ سے شاہ جی کو لے گئے۔ یہ ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے۔

لال بازار کے وسط سے شروع ہو کر کوچہ جیل خانہ رام باغ پولیس خانہ  
 کے سامنے جا ختم ہوتا ہے۔ دوسری طرف میوہ منڈی کی پشت اس کی ہمسایہ  
 تھی۔ اس طرف رام باغ کا بازار بھی اس کے سامنے تھا۔ اس قدر وسیع آبادی  
 کو مسجد کی تنگ وامنی پر ہمیشہ گلدہا۔ لیکن شاہ جی کے خطیب منتخب ہونے پر  
 مسجد کی وسعتیں اور مسدود ہو گئیں۔ یہ زمانہ لاسکی کا نہیں تھا اور نہ آلہ بکبر الصوت کا  
 رواج تھا لیکن شاہ جی کی آواز دل اور کانوں کو مطمئن کرتی رہی گو نمازیوں نے  
 مکان کی چھتوں تک کو اپنی ضرورت کے لیے اپنا لیا تھا۔

استاد کا اصرار تھا کہ سبق یہاں آکر پڑھا کریں لیکن کوچہ جیل خانہ اور بازار  
 کپھاراں کے درمیان کا فاصلہ طے کرنے میں خاصی وقت رہتی۔ کچھ دنوں تو یہ  
 سلسلہ رہا آخر استاد محترم کی اجازت سے شاہ جی نے لال بازار کی مسجد خیر الدین  
 میں مولانا نور احمد اور مفتی محمد حسن سے پڑھنا شروع کر دیا۔ مولانا نور احمد سے قرآن  
 کی تفسیر اور مفتی محمد حسن سے مشکوٰۃ شریف کا سبق لیتے رہے۔

غیر اسلامی زمین

انسانی حرکات سے انہما نیت کی قدریں جس بڑی طرح ہلاک ہوئی ہیں



زمانہ کے موجودہ چلن کے پاس اس کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ وقت جیسے جیسے اپنا سفر طے کر رہا ہے ان گینڈنڈیوں پر کانٹے ہی کانٹے بکھرتے چلے جا رہے ہیں اس میں زیادہ مجرم وہ ہیں جن پر اسلام کا بیبل چسپاں ہے۔ مذہب کا ماضی جس قدر شفاف ہے مسلمان کا کردار اتنا ہی گدلا اور واقدار ہے۔ تاریخ کا سینہ ان زخموں سے اٹا پڑا ہے۔

صراطِ مستقیم سے مٹھو کر کھانے کے بعد مسلمان جن غلط راستوں پر گامزن ہوا ان میں اسلام سے انحراف کی راہ اُسے زیادہ پسند آئی۔ سماج کے غلط رسوم و رواج اس راستے کے خوبصورت پھول تھے جن سے مسلمان نے اپنی جھولیاں بھریں لیکن بعد میں انہی پھولوں نے کانٹے بن کر اس کے سارے کردار کو زخمی کر دیا۔ ۱۹۱۹ء سے پیشتر کا امرتسر خلاف اسلام رسوم کی آماج گاہ تھا۔ گھر کے ہر طاقچے میں رسم و رواج کے بت نصب تھے۔ برادری میں برتری حاصل کرنے کی دوڑ و دوپ میں مصروف مسلمان نے اپنا اثاثہ حیات واؤپر لگا دیا تھا۔ کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو اُس کے ختنوں پر گھوڑی اور باسما آتا لازمی تھا کیونکہ برادری میں زید نے ایسا کیا تھا۔ گرہ اس کی منتخل ہے یا نہیں لیکن سنت کے اس موقع پر خلاف سنت حرکات لازمی تھیں

اگر کسی کے ہاں موت واقع ہو جائے تو میت کے آخری مقام پر پہنچنے سے پہلے ماتم پر سی کرنے والے عزیزوں کی خاطر واری برادری کا ضروری قانون تھا اور یہ سلسلہ چاروں تک جاری رہتا۔ جہلاہ کی ان جماعتوں کے باعث ملاؤں کے ہاں چالیس روز تک گھی کے چراغ جلتے۔



حدت پر وہ ہو جائے۔ بچے قسیم رہ جائیں لیکن رسومات کے آئین میں  
سقم نہیں آنا چاہئے۔ مرنے والے کے کفن و دفن پر خیر ہو اور وہ داسہا برادری  
چٹ کر جائے گویا گھر کا ایک فرد کیا مراد گھر مر گیا۔

حد سے ہند تک کے درمیان ایک اور عبادت گزار رہتا ہے جسے بیاب  
شادی کا نام دیا جاتا ہے بلاشبہ ابن آدم کے لیے یہ منزل ضروری ہے لیکن یہ  
کہاں ضروری ہے کہ ایسے موقع پر برادری میں تاک رکھنے کے لئے آدمی خاک  
ہو جائے مگر امرتسر کے مسلمان نے زمانہ سازی کے لئے اس تقریب پر اپنی  
چادر سے زیادہ پاؤں پھیلائے۔ چند سالوں کے بعد قرعہ لی ہوئی رقم کے سود  
در سو وہیں مسلمانوں امرتسر کی بیشتر جائیداد غیر مسلموں کے قبضے میں چلی گئی۔ ان حالات  
نے مسلمانوں کو ملکیت سے محروم کر کے یا وہ ہندو کا کرایہ دار بنا دیا یا پھل نہیں  
شہر سے باہر کی طرف رخ کرنا پڑتا۔ اس طرح امرتسر پر ہندو کا قبضہ ہوا چلا گیا  
پہلو میں دل اگا رکھنے والے مسلمان کے لیے خلاء کے انور نے کے سوا  
اور تھا ہی کیا۔ انہی دنوں شاہ جی نے کوچہ جیل خانہ کی مسجد سے ٹھل کر محلہ وار  
تقریروں کا آغاز کیا۔ بیچ رسوم پر یہ پہلی بیٹھا تھی جو مسجد کے ایک درویش نے  
کی جس کے پاس زبان اور قرآن کی قوت کے سوا کسی طاقت نہیں تھی کہ وہ مسلمان  
کو غارت گری کے راستوں پر چلنے سے منع کرتا۔

وہ دل بھرا سا تذہ سے جو پڑھتے شام ہوتے ہی کسی نہ کسی محلہ میں وعظ  
کی صورت میں سنا آتے۔ ان دنوں مولانا شہارشد کا امرتسر یہ خاص اثر تھا۔ لیکن  
مخصوص عقیدت کی بنا پر وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو شاہ جی کے طرز تکلم نے کی۔



علم محض پڑھائی سے نہیں طلب اور خدمت سے ملتا ہے۔ شاہ جی کا علم اگرچہ ہندو خام تھا لیکن اساتذہ کی محبت اور کتاب اللہ کی برکت سے وہ جہانوں میں عالم اور عالموں میں عزت کی نظروں سے دیکھے جانے لگے۔ امرتسر کے در دیوار انہیں سننے اور دیکھنے کو چشم براہ رہتے۔ قبیح رسموں کے خلاف جہاں نے شاہ جی کو وہ احترام دیا کہ جس محلے میں وہ وعظ فرماتے انسانوں کے سمندر اُٹھ اُٹھتے۔

اس طرح شہر کے اندر ایک نئی تحریک نے جنم لیا۔ رسم و رواج کے محرک اور علماء سوء کے درمیان راہ و رسم بٹھسنے لگی۔ مذہب کے گرو حصار کی نئی استوار ہونے والی دیوار کو گرانے پر روز و شب مشورے ہونے لگے اور شاہ جی کے خلاف ایک ایسے گروہ کی تنظیم ہوئی جس کے رزق کا انحصار جھوٹ کے پورا رخ روشن کرنا اور کذب کو حقیقت ظاہر کرنا تھا۔

یہ تحریک ابھی اپنے پر پرزے نکال رہی تھی کہ یورپ کے سیاسی اُفق پر پہلی جنگ عظیم میں جو دیوں کے ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخیاں دکھائی دیں

## جلیانوالہ شاہ کا حادثہ

۱۹۱۴ء کی لڑائی کے ختم ہوتے ہی اتحادی طاقتیں فتح و نصرت کے علم لئے سمندر کی چھاتی پر رقص و سرود میں کھو گئیں۔ اس عورت میں وہ یہ معمولی گھٹیں کہ انہوں نے غلام ہندوستان کے ساتھ کسی رشتہ اتحاد کو گروہ دی تھی، کسی وعدہ کی وفائیں کے ذمے تھے۔



۱۴ اگست ۱۹۱۸ء کو برطانوی حکمرانوں نے ایک اعلان کیا کہ ہندوستان کو آئندہ فوجی کمیشن میں اعلیٰ عہدے دیتے جائیں گے حالانکہ جنگ کے اختتام پر ہندوستان کو ذمے دار گورنمنٹ دینے جانے کا وعدہ تھا۔ اس آئینہ میں ہندوستان کو اپنے حکمرانوں کی نیت صاف دکھائی دی اور ان کا شہرہ نکھر کر سامنے آگیا۔ چنانچہ وہ زنجیر ٹوٹ گئی جس سے برطانوی سامراج نے اپنے غلاموں کو باندھ رکھا تھا۔

ہندوستان کی پریشانی قومیں پھر سے منٹھ ہوئیں اور انہیں اپنے مقدر کا ازبر نو جائزہ لینا پڑا۔ دسمبر ۱۹۱۸ء کو مولوی اے کے، فضل حق کی زیر صدارت دہلی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں استقبالیہ کی صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے کی۔ گو ڈاکٹر صاحب کا خطبہ استقبالیہ حکومت نے ضبط کر لیا لیکن اس اجلاس میں مطالبہ کیا گیا کہ ۱۹۱۴ء میں ہندوستان کے انگریزوں سے وفاداری کا عہد پوری ذمہ داری سے نبھایا ہے۔ لہذا برطانوی حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے وعدوں کی روشنی میں ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دیں۔ اس قرارداد کی تائید میں مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا عبدالباری فرنگی محل (لکھنؤ)، مولانا آزاد سجانی (لکھنؤ)، مولانا ثناء اللہ امرتسری نے تقریریں کیں۔ اس طرح پورے ملک میں انگریز حکمرانوں کے خلاف وعدہ شکنی کی آگ بھڑک اٹھی۔ انڈین یورپ ترکوں سے صلح کے بعد بھی برطانوی دانشوروں نے ایسا ہی سلوک کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محکوم و سہاکم کے درمیان دلوں کی بھٹیاں اس قدر شعلہ فشاں ہوئیں کہ ہندوستان کا امن و دوچار محفل بن کر رہ گیا۔



حادثات و واقعات کی مسلسل کرٹیاں کچھ اس ترتیب سے پیہم ہوئیں کہ  
 ایوانِ افرنگ کی دیواریں اسی سلسل میں جکڑی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔  
 انزائنگلینڈ کی سپریم کورٹ کے جج مسٹر ایس، اے، ٹی رولٹ کی زیرِ کمان  
 ایک کمیٹی نے جو برطانیہ کے یہودی وزیرِ اعظم مسٹر لارڈ ہارج نے مقرر کی تھی۔  
 اپنی دانست میں بغیر تحقیق کے ہندوستان پر تشدد اور دہشت انگیزی کے ایسے  
 الزامات تراشے کہ جنہوں نے جلتی پر تیل چھڑکا دیا۔ مسٹر رولٹ کی یہی رپورٹ ماضی  
 کی سیاسی تاریخ میں رولٹ ایکٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اس رپورٹ کے  
 نتیجے میں ہندوستان نے ایک نئی سیاسی کرٹ لی اور کانگریس کی باگ ڈور جو پہلے  
 مسٹر تنک راج گوکھلے کے ماتحتوں میں تھی مہاتما گاندھی کے سپرد کر دی گئی۔ یہ  
 پہلا موقع تھا کہ مہاتما گاندھی ہندوستانی سیاست میں براہِ راست دخل دے  
 تھے۔ انہوں نے آتے ہی رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاجاً ۱۱ اپریل ۱۹۱۹ء  
 کو ہندوستان بھر میں ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر اریہ سماجی رہنما مسٹر شرما  
 جیسے کٹر ہندو نے دہلی کی جامع مسجد میں ہندو مسلم اتحاد پر تقریر کی اور امرتسر میں  
 ہندو مسلمانوں نے ایک برتن میں پانی پیسا۔ یہ رام نو می کے تہوار کا دن تھا۔  
 دو مختلف قوموں کے درمیان انگریز کی نفرت نے ایسا صیلا لگایا کہ فرنگی  
 سامراج کا وفار کھلنے کی طرح ٹوٹ کر رہ گیا۔ ہڑتال جاری تھی مگر انگریز راج کا  
 تشدد شہر بھر میں اپنا کام کرتا رہا۔ اس ظلم و جور کے خلاف شہریوں کا ایک جلوس  
 ڈیپٹی کمشنر امرتسر کی کوٹھی پر جاتے ہوئے جب ریلوے کے بڑے پل پر سے  
 گزرا تو انگریز سپاہیوں نے بغیر وارننگ دیئے اس ہجوم پر گولی چلا دی جس کے



نتیجے میں چھ ہندوستانی شہید ہوئے۔

## خدمتِ خلق

شاہ جی اس زمانے میں حصولِ تعلیم کو پربہیل خانہ کی امامت اور خلافِ شرع رسوم کے خلاف جہاد میں مصروف تھے۔ فرنگی تشدد کے شہداء کی لاشیں موقعِ فاروات سے اٹھا کر کال بازار خیر الدین کی مسجد میں لائی گئیں تو شاہ جی نے ان سب کو غسل دیا، کفن پہنائے۔ مسلمانوں کا جنازہ پڑھایا اور تمام لاشوں کو خود مسجد سے رخصت کیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ شاہ جی نے غیر ارادی طور پر خدمتِ خلق سے مرنے والوں کی تجہیز و تکفین کی۔ اتنے سے کام نے شاہ جی کا نام غیر مسلموں کے دلوں میں نقش کر دیا۔ حالانکہ ان دنوں وہ سیاسیات سے قطعاً نا آشنا تھے۔ انہیں صرف یہی دماغ تھی کہ امر نسرا کا مسلمان فضول رسم و رواج سے باز رہے لیکن ان کی اتنی بھادروی نے انہیں کافی شہرت دی۔ اپنے اوپر لائے انہیں احترام کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

## مارشل لاء

امر نسرا کے عوام انگریز ساءراج کے خلاف اپنا امن برباد کر چکے تھے دلوں کی سنگتی ہوئی بھٹیوں کے الاڈ اس قدر روشن ہو چکے تھے کہ خلائی کی زنجی صاف پھیلتی دکھائی دے رہی تھیں۔ بنگوں اور دوسری سرکاری عمارات کی چلی



ہوئی خاک سے بغاوت کی بوچھل رہی تھی۔

۱۰ اپریل کو طلوع ہونے والے آفتاب نے امرتسر کو ماتمی لباس میں دیکھا۔ ڈاکٹر سیف الدین کھلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس واقعے کے بعد فلائوں پر آٹاؤں کا تشدد اور نکمرا۔ شہر پر فوج نے قبضہ کر لیا اور مارشل لاء کا اعلان کر دیا گیا۔ امرتسر کے شب و روز فوجی آٹمی کے تحت سفر کرنے لگے۔ شہر میں گورکھا سپاہیوں کا راج تھا۔ ہر موڑ پر ٹکلی باز صدمی گئی۔ صرف ہندوستانی ہونے کے جرم میں بید زنی کی سزائیں عام دی جانے لگیں۔ ہیرا پتھر کو پیٹ کے بل چلنے پر مجبور کیا جانے لگا۔ ان واقعات نے خوف و ہراس کو جنم دیا۔ بازار اور گلیاں ویران صحرا کی طرح نظر آنے لگیں۔ گھروں کے دوازوں اور کھڑکیوں پر جالوں نے دین بسیرے بنا لیے۔ اس جہود کو کبھی کبھار فوجی سپاہیوں کے بوٹوں کی ٹاپ توڑتی تھی لیکن دلوں پر مجبور و بدستور رہا۔

## بلیاؤں کا بارش

۱۳ اپریل کا دن تاریخ کے دامن میں ایسی گمراہی سے چمکا ہے کہ یہ گمراہی حب بھی کھولی جائے گی۔ ناگروہ گناہ انسانوں کا خون اپنے تامل پر سُکراتا نظر آئے۔

مرحوم پنجاب میں یکم بسا کھ دیہاتی حوام کی خوشیوں کا دن ہوتا تھا۔ اس تہوار پر گاؤں کے جیالے جوان کندھوں پر لاکھیاں ایسے رنگارنگ لباس پہنے دیہاتی گیت گاتے امرتسر کی سڑکوں پر سے گزرتے تو شہری حوام کو بھی اپنی بولیوں میں



شمال کر لیتے : ماجھے واجھٹ پنجاب کے صحت مند حسن کا ہر اول دستہ تھا۔  
 بیاس اور دریائے ستلج کے پانی نے ملی کر اس کی پرورش میں رنگ بھریا تھا۔  
 ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کا یہی دن تھا جب وہ بہاتی اور مٹھری لوگ اپنے رہنماؤں کی  
 گرفتاری کے خلاف احتجاجاً جلیانوالہ باغ میں جمع ہوئے تو جنرل ڈائر نے  
 اچانک ان پر گولی چلا دی۔ اس کے نتیجے میں پانسو سے زائد بے گناہ ہندوستانی  
 شہید ہوئے اور زخمیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

۶ اپریل کو جس کہانی کا آغاز ہوا تھا ۱۳ اپریل کو جب مکمل ہوئی تو تاریخ  
 اور انسائپٹ کے سینے پر گہرا گھاؤ چھوڑ گئی۔ اب جب کبھی یہ زخم رستے ہیں تو  
 انسانوں کے دل اور تاریخ کے ادراک فرنگی حکمرانوں کے لیے نفیر کیسے بغیر  
 نہیں رہتے۔

## احساس ابھرایا

چوٹ کھایا ہوا دل جب سنبھالا لیتا ہے تو وارثہ انتقام کی راہیں تلاش  
 کرتا ہے۔ کرو لاکھ اڑے اٹے مگر جنوں اپنا کام کر جاتا ہے۔ جلیانوالہ باغ  
 کا حادثہ اہل دل پر جاو سموم کی طرح گزر گیا جس سے وہ سانپ کی طرح بل کھا  
 کر رہ گئے مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ درد گھاؤ بنتا چلا گیا۔

شاہ جی انہی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۱۹ اپریل کو جن ہاتھوں نے شہدائے  
 وطن کو گھن پہنائے تھے وہی ہاتھ حکمرانوں کے لئے گھن سینے کی تیاری میں  
 لگ گئے۔ شاہ جی ان واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ سیکے بید چنگاری



ہوا کی منتظر تھی۔ ۵  
ذرا غم ہو تو یہ مٹی بہت زرد نیز ہے ساقی

## احسن از سفر

پہلی جنگ عظیم میں ہندوستان سے کیے گئے وعدوں سے انحراف کے بعد انگریز حکمرانوں نے ترکوں سے بھی عہد وفا توڑ دیا۔ اس کی صداٹے باز گشت جب ہندوستانی بھینچا تو مسلمان خلافت کے مسئلہ کو مذہب کی بنیاد پر سوچنے لگے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں مؤتمر اسلامی کے عنوان سے مسلمان رہنا جمع ہوئے۔ ان کے علاوہ بہاؤ شاہ کاندھی اور سوامی شرادھانند کو بھی دعوت دی گئی۔ اس اجلاس میں ترک موالات اور سوشلی مال کے بائیکاٹ کی تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی (رحمۃ اللہ علیہ) پنجاب میں پہلے عالم دین تھے جنہوں نے تحریک خلافت کو ہوا دی اور محلہ وار تقریروں سے عوام پر یہ مسئلہ روشن کیا۔

✓ شاہ جی ان دنوں صرف مذہبی واعظ تھے لیکن کبھی کبھار ان کی مدد بخیر سیراہ مولانا داؤد غزنوی سے ہو جاتی۔ یہاں تک کہ مولانا داؤد غزنوی کسی جگہ تقریر کرنے تو دوسرے دن شاہ جی اسی جگہ جلسہ کر کے ان کی ترویج دیتے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ مولانا داؤد غزنوی نے شاہ جی کو دعوت دی کہ یا تو مجھے اپنے مکان پر بلائیں یا میرے مکان پر تشریف لائیں۔ میں آپ سے مسئلہ خلافت پر گفتگو کرنا چاہتا



ہوں۔ آخر مولانا داؤد غزنوی خود شاہ جی کے دولت کدہ پر پہلی کو گئے اور شہزاد  
عثمانیہ کا خاتمہ ترکوں سے انگریزوں کی عہد شکنی اور عالم اسلام پر فرنگی حکمرانوں  
کی چیرہ دستیوں کو اس انداز سے بیان کیا کہ انور شاہ جی مولانا داؤد غزنوی  
کے ہم آہنگ ہو گئے۔ اس گفتگو کے بعد شاہ جی نے روزانہ اخباروں کا مطالعہ  
شروع کر دیا۔ جس سے حالات اور واضح ہو کر سامنے آ گئے۔

پھر کیا تھا، اچھینے کو ٹھیس گننے کی دیر تھی، وہ ساری مستی بہہ نکلا۔ بزم  
مشفق جس کی منتظر تھی وہ افسانہ نماں بچٹ گیا جس کی راکھ اندھ ہی اندھ سلگ رہی  
تھی۔ وہ لاوا بہ نکلا جو فرنگی سامراج کو تنکے کی طرح بہا کر لے گیا۔

## پہلی سیاسی تقریر

بسن و فنہ فرد کی بُرائی پر ہی قوم کو لے ڈوبتی ہے۔ جہنم ڈاٹر کی حرکت  
نے صرف جلیا نوالہ باغ کو ہی بے گناہوں کے خون سے رنگین نہیں کیا بلکہ یہ  
پھینٹے اقوام یورپ کے دلوں تک بھی پہنچے جس سے ان کی نگاہیں انسانیت  
کے بدبرہ ہمیشہ شرمندہ رہیں گی۔ اس زخم پر مرہم کے لیے یورپین جراثیموں نے  
نسخہ تجویز کیا کہ تمام ہندوستانی رہنماؤں کو جیلوں سے راکھ دیا اور ساتھ ہی ہندو  
کو آزادی کی چوٹی قسط دینے کا اعلان کیا۔ ان اصلاحات کا نمایاں پہلو یہ تھا  
کہ صوبوں کی عنان حکومت ہندوستانی وزیروں کو سونپ دی جائے گی مگر مالیات  
کا محکمہ انگریز گورنروں کے پاس رہے گا۔

اس برطانوی تجویز پر غور کرنے کے لئے دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس کا



سالانہ اجلاس امرتسر میں پنڈت موقی لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ علی براہون  
 بھی رہا ہو کر سیدھے امرتسر پہنچے۔ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بھی اسی موقع پر امرتسر  
 میں حکیم محمد جمل خاں (رحمۃ اللہ علیہ) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ خلافت کانفرنس  
 بھی اپنی تاریخوں پر امرتسر (گولی باغ) میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں منعقد ہوئی  
 جس میں پہلی دفعہ شاہ جی نے سیاسی تقریر کی۔ اور حاضرین کو اس قدر متاثر کیا کہ  
 خلافت کمیٹی کے لیے دس لاکھ روپے کے چنارے کی اپیل کی۔ مولانا محمد علی  
 جوہر نے پہلی مرتبہ اس اجتماع میں شاہ جی کو سنا اور دیکھا تو قافلہ میں سے ساتھی  
 کی شرکت پر خوش ہوئے اور ساتھی بھی ایسا کہ نہ صرف سالانہ کارواں رشک کرنے  
 لگے بلکہ غبار کارواں نے بھی قدم لیے اور خوش آمدید کہی۔ ✓

## ترک موالات

✓ ۱۹۲۰ء کا سال حریت پسند عوام کے لئے سجد و سجد کا اہم سال تھا۔ اس  
 سال مٹی میں کانگریس نے اپنے بنارس سیشن میں برطانوی سامراج سے ترک موالات  
 کا فیصلہ کیا۔ اسی ہیقتے ناگپور میں مسلم لیگ نے بھی ترک موالات کی قرارداد منظور  
 کر کے کانگریس اور خلافت کمیٹی کی تائید کی۔ اس قرارداد کی مزید تشریح جب کلکتہ  
 کانگریس کے سیشن میں فروری ۱۹۲۱ء میں ہوا تو مولانا ابوالکلام آزاد  
 اور مولانا شوکت علی کے سوا ساری ورکنگ کمیٹی گاندھی جی کے خلاف ہو گئی۔  
 کانگریس کے کھیلے اجلاس میں مولانا آزاد نے قرارداد کے حق میں تقریر کی  
 تو شاہ جی اس اجلاس میں موجود تھے۔ وہ تقریر سے بے حد متاثر ہوئے اور آخر



میں جب انہوں نے قرار واو کے مؤید کے طور پر تقریر کی تو سارا ہال ترکِ مواصلات کے حق میں ہو گیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ شاہ جی اور گاندھی جی ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ اس تحریک کے نتیجے میں بچوں نے سکول، نوجوانوں نے کالج اور وکلاء نے عدالتوں میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ ولایتی مال کے بائیکاٹ کی تحریک زور پکڑ گئی۔

## لاہور خلافت کمیٹی

ان دنوں سارے ملک میں خلافت کمیٹیاں قائم کی جا رہی تھیں۔ لاہور کے اعتدال پسندوں نے بھی خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد اقبال (جو ان دنوں سر نہیں بیٹھے) اور میاں محمد شفیع (جو بعد میں سر شفیع کے نام سے مشہور ہوئے) دونوں بالترتیب صدر اور سکریٹری منتخب ہوئے۔

اس زمانہ میں جنرل سر مائیکل ایڈ وارڈ پشاور کے گورنر تھے۔ ان کے اشارے پر لاہور کے ڈپٹی کمشنر نے دونوں کو بلا کر کچھ کہا سنا تو دوسرے دن یہ خلافت کمیٹی نوٹ دی گئی۔

ان دنوں شاہ جی کے جذبات اور انگریز کاتشد و دونوں شباب پر تھے دونوں کے ٹکراؤ نے نوجوانوں کے ماتحت فرنگی سامراج کے گریبان تک پہنچا دیئے۔ حکیم عبدالحمید عتیقی اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ:-

جب پہلے کی خلافت کمیٹی انگریز حاکموں کے خوف سے دم توڑ گئی تو میں امرتسر میں مولانا ثناء اللہ کے ہاں پہنچا۔ عرض حال



کیا تو انہوں نے شاہ جی کو میرے ساتھ لاہور جانے کا حکم دیا؟  
 شاہ جی لاہور پہنچے تو لاہور ان سے نا آشنا تھا۔ موچی دروازے  
 کے شمال کی جانب باغ میں دن کے گیارہ بجے جلسے کا اعلان کیا گیا۔ یہ وقت  
 پر باغ میں موسم سرما کے باعث اوباش قسم کے لوگ دھوپ تاپ رہے  
 تھے لیکن جلسہ کے شائق بہت کم تھے۔ کوئی ایسیج کا انتظام نہیں تھا۔ تین چار سو  
 کے قریب حاضر تھے۔ شاہ جی نے ایک گھنٹہ تک صرف قرآن کریم پڑھا اور ظہر  
 تک تقریر کی۔ نماز کے بعد دوبارہ جلسہ کا اعلان کیا گیا۔ اب کے حاضر پہلے  
 سے زیادہ تھے۔ اس جلسے میں فیروز کار سے والا یہی شخص بعد میں مہیاں فیروزین احمد  
 کے نام سے مشہور ہوا، کہیں سے ایک کرسی اور میز اٹھالایا۔ یہ اجلاس عصر کی نماز  
 کے لیے ملتوی کیا گیا اور جب دوبارہ جلسہ شروع ہوا تو حاضر پانچ ہزار کے  
 قریب تھے۔ شاہ جی قرآن حکیم کی آیات پڑھتے اور ساتھ ساتھ ان کی تفسیر بیان  
 کرتے جاتے اور لوگ سمجھنے کہ اس طرح بیٹھے تھے جیسے کسی نے سحر چھونک دیا ہو۔  
 مولانا سید حبیب (روزنامہ سیاست کے مالک و مدیر) اس اجلاس میں شریک  
 تھے۔ یہ اجلاس مغرب اور عشاء کی نماز کے لیے ملتوی ہوا۔  
 اب نانہ کی خوشبو لاہور کی گلیوں اور بازاروں میں پھیل چکی تھی۔ ایک نے  
 سنا دوسرے کو سنا یا، کوئی ڈنڈے والا پیر آیا ہوا ہے۔ شاہ جی اس زمانہ  
 میں اپنے ماتھے میں ایک موٹا سا ڈنڈا رکھتے تھے اور ایک مدت تک اسی نام  
 سے مشہور ہے۔

”وہ قرآن پڑھتا ہے تو ایسا معلوم دیتا ہے جیسے اچھی آسمان سے



نازل ہو رہا ہے۔ اس کی آواز میں سیادو ہے۔ آج اُس نے سارے لاہور کو  
پاگل کر دیا ہے۔

پھر کیا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد جو اجلاس ہوا۔ اُس میں بیس ہزار سے  
زائد لوگوں نے شرکت کی۔ شاہ جی نے صبح تین بجے تک عوام سے خطاب کیا  
اور آخر میں کہا:

”کون ہے جو کہتا ہے لاہور میں خلافت کمیٹی نہیں بن سکتی۔ میں بتاتا ہوں  
کس مائی کے لالی میں ہمت ہے کہ اس کو توڑ کر دکھائے۔“

اسی اجلاس میں سید حبیب کو خلافت کمیٹی لاہور کا صدر اور مہیاں  
فیروز دین احمد کو جنرل سیکریٹری منتخب کیا۔ نیز چندے کی اپیل کی تو لوگوں نے  
دل کھول کر روپیہ دیا۔ عورتوں نے اپنے زیورات نکال کر بھج دیئے۔ آخر  
شاہ جی کو اعلان کرنا پڑا کہ آپ اور روپیہ نہ دیں۔ کل صبح جب خلافت کمیٹی کا  
دفتر قائم ہو جائے گا تو آپ اس روپیہ کی رسید بھی لے لیں اور دوسرا روپیہ  
جو دیں اُس کی بھی۔

چنانچہ وہی دروازہ کے باہر میاں سراج دین پر اسچہ کے مکان میں خلافت  
کمیٹی کا دفتر قائم ہوا اور مدت تک یہی دفتر رہا۔

**مرزا بشیر الدین محمود سے پہلی ملکر**

حکومت سے ترک موالات کی تحریک نے سارے ہندوستان کو اپنے  
گرو جمع کر لیا تھا۔ بچے، جوان، بوڑھے اور مستورات غیر ملکی غلامی سے نجات کے



لئے ایثار و قربانی کے تمام ارادوں سے مسلح ہو کر حالات سے مقابلے کے لیے تیار تھے۔ گرفتار ہونے والے رہنماؤں سے جیل نہانے کی وسعتیں تنگ ہو چکی تھیں۔ فرنگی سامراج اپنے اقتدار کے ڈھیلے ہوئے ستورج کا تماشا کر رہا تھا کہ قادیانی مذہب کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود انگریزوں سے اپنی جنس و قادیاری کا بھاؤ بڑھانے اور انگلستان کی منڈلیوں میں اس سووسے کو مزید جلا دینے کے لیے ہندوستان کے اتحاد میں زہر گھولنے کو آموجود ہوئے۔

اگر یہ سماجی لیڈروں کے خلاف اسلام کی آڑ میں جھگڑا مول لیا اور ساتھ ہی مسلمانوں سے انتقامی لڑائی بھی چھیڑ دی۔ قادیانیوں نے یہ حرکت ایسے موڑ پر کی جب حکمرانوں کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ قریب تھا کہ یہ آگ پھیل کر اتحاد آزادی وطن کو راگھ کر ڈالے کہ شاہ جی نے اگے بڑھ کر اپنے آپ کو اس آگ میں جھونک دیا۔

✓ ۱۹۲۵ء کے وسط کی بات ہے کہ بندے ماترم طال امرتسر میں ان کے گیارہ بجے مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے جلسے کا اعلان کیا اور شہر کے مسلمانوں کو شمولیت کی دعوت دی۔ عوام کے ساتھ شاہ جی بھی اس اجتماع میں شامل ہوئے جلسے کے گرد مرزائیوں نے انتظام کا پورا جہاں پھیلا رکھا تھا۔ سی، آئی، ڈی اتھلی امور سے لیس تھی۔

مرزا بشیر الدین محمود نے تقریر کے دوران کسی حدیث کے الفاظ غلط پڑھ دیئے۔ اس پر شاہ جی نے مجمع سے اٹھ کر بشیر الدین محمود کو حدیث کے الفاظ غلط پڑھنے پر ٹوکا لیکن مرزائی لیڈر اپنی ضد پر اڑا رہا اور شاہ جی اپنے موقف پر قائم



رہے۔ یہ جھگڑا آدائی تقریباً بیس منٹ تک جاری رہی تو مرزا یوں نے پولیس کو طلب کر لیا۔ اس پر شاہ جی نے عوام سے کہا کہ جس قدر مسلمان جلسہ میں ہوں وہ مال سے باہر آسکیں۔ چنانچہ مرزا یوں کے سوا مسلمان شاہ جی کے حکم کی تعمیل میں مال سے باہر نکل آئے۔ باہر شاہ جی نے مرزا یوں کے خلاف تقریر شروع کر دی۔ اس پر بشیر الدین محمود کو اپنی پارٹی سمیت مال کے عقبی دروازہ سے پولیس کی حفاظت میں نکلنا پڑا لیکن شاہ جی بدستور بازار میں تقریر کرتے رہے۔

اس ایک ہلکی سی حقیقت کا اثر یہ ہوا کہ مرزا یوں کے منصوبے ختم ہو گئے اور ان کے حوصلے اس قدر لپٹ ہوئے کہ تحریک نرک موالات کے وران مرزا یوں کا نام بھی سننے میں نہ آیا اور نہ ہی ملک کے سیاسی حالات اس قسم کی تحریکات کی اجازت دینے تھے۔

خلافت اور ترک موالات کی مشترک ایجنٹس نے سارے ہندوستان کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایک کر دیا تھا۔ غیر ملکی قانون اپنی ساری قوت کے باوجود کمزور اور بیکار سمجھا جانے لگا۔ اسی زمانہ میں ۲۲ مئی ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا زبیر گل، مالٹا سے واپس آئے اور ہندوستان پہنچ گئے۔ ان کی رہائی سے تحریکات آزادی وطن کو مزید تقریب ملی۔ خلافت کمیٹی کی شاخیں ہر شہر اور قصبہ میں قائم ہونے لگیں۔

## ازاد ہائی سکول گجرات

ایران مالٹا وطن واپس پہنچ کر اپنے اپنے مقاصد میں مصروف ہو گئے



حضرت مدنی تحریک خلافت میں شامل ہو گئے اور حضرت شیخ الہند کو  
 جمعیتہ العلماء نے ہند نے اپنا صدر منتخب کر لیا۔ اپنی دونوں مولانا محمد علی جوہر نے  
 دہلی میں جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی جس کے تحت ملک کے اکثر شہروں میں تعلیمی دستگاہیں  
 قائم ہوئیں۔ جس میں وہ نیچے داخل ہوئے جنہوں نے تحریک ترک موالات کے  
 سلسلے میں سرکاری سکول چھوڑے تھے۔

شاہ جی نے گجرات میں آزاد مائٹی سکول کی بنیاد رکھی جس کا افتتاح مولانا  
 ابوالکلام آزاد نے کیا۔ چوہدری فیض محمد ایم اے، میڈیا سٹر اور ملک نصر اللہ خاں  
 عزیز سیکنڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔

آزاد مائٹی سکول کی تمام تر ذمہ داری شاہ جی پر تھی۔ وہ ضلع گجرات میں  
 خلافت کمیٹیوں قائم کرتے اور آزاد مائٹی سکول کے سے روپیہ فراہم کرتے  
 تھے۔ شاہ جی کو ضلع بھر میں اس قدر مقبولیت ہوئی کہ ۱۳۰۰ خلافت کمیٹیاں اسی  
 ایک ضلع میں قائم ہوئیں۔ بیس ہزار کے قریب طلباء کی حاضری تھی۔ عورتوں نے  
 اپنے زیور اور مردوں نے اثاثہ حیات تک ان کے قدموں میں پھیر کر دیا۔  
 شب و روز کی محنت اور شاہ جی کی تقریروں نے ضلع بھر کے مرد  
 زن کو متادوں کی طرح ان کے گرد جمع کر دیا۔ ضلع گجرات کا دلچسپ شہر گنود  
 ویسپ سنگھ جس نے عیسائیت چھوڑ کر سکھ مذہب اختیار کر لیا تھا، لباس  
 تبدیل کر کے شاہ جی کی ہر تقریر میں شامل ہوتا۔ آخر اسے حکومت نے مجبور  
 کیا کہ وہ شاہ جی کو گرفتار کر لے لیکن اس نے ہمیشہ پہلو تھپی کہا اس کی رائے تھی  
 کہ عطا اللہ شاہ بخاری نے ضلع گجرات کے عوام پر سجادو کر رکھا ہے۔ وہ انہی



کے دل و دماغ پر قابض ہے۔ اگر اُسے ان دنوں گرفتار کیا گیا تو ضلع بھکر میں حکومت کے خلاف بغاوت پھیل جانے کا ڈر ہے۔

ضلع گجرات باقی ہندوستان کی طرح بغاوت کی منگنی ہوئی آگ کو ہوا دے رہا تھا۔ آزاد وطن سکول کے طلباء کے دلوں میں انگریز حکمرانوں کے خلاف نفرت کی تخم ریزی اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی تھی۔ اس دوران میں شاہ جی کھنجر پنجاب کے دوسرے اضلاع میں جاتے رہے لیکن گجرات ان کی سرگرمیوں کا محور تھا جس کے باعث ہزاروں طلباء نے تعلیم حاصل کی اور گجرات کے عوام آزادی وطن کے لئے کھنجر پر دوش ہو کر میدان کارزار میں نکل کھڑے ہوئے۔

## تحریک ہجرت

جیسے جیسے دن گزرتے گئے تحریک خلافت اور ترک موالات کے منہ زور گھوڑے برطانوی سامراج کا نظم و نسق روندتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ انگریزی راج کے تشدد نے وقت اور حالات میں ایسا ہر گھونلا کہ

۱۹۴۵ء میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فتویٰ کہ  
 "انگریزی حکام اگر ان مسلمانوں کے کسی معاہدے کو توڑ  
 ڈالیں یعنی نماز یا جماعت یا جائزہ شرعی رسومات یا مسجد کی  
 تعمیر یا اعادہ حج یا اصلاحی قانون میں دخل انداز ہوں تو پھر ان  
 سے جہاد فرض ہو جائے گا لیکن اگر جہاد ناقابل عمل ہو، تو پھر  
 ہر وہی دار مسلمان پر ہجرت لازم آتی ہے۔"



علمائے ہند کی آنکھوں میں تیرنے لگا۔ چنانچہ مولانا عبدالباری دہلوی نے فرنگیوں کو قتل کرنے کے لیے اپریل ۱۹۲۰ء کو فتویٰ دیا کہ

”فرنگی حکومت نے اپنی مسلمان رعایا سے جو وعدے کیے تھے وہ ان سے منحرف ہو چکی ہے۔ نیز ہندوستان کی نہتی رعایا پر ان کا تشدد بڑھ کر مذہب میں بے جا مداخلت کرنے لگا ہے۔ بدیں حالات ہندوستان و دارالحرب ہو چکا ہے۔ لہذا مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے کسی ایسے ملک میں چلے جائیں جہاں کی قدریں اسلام سے ملتی ہوں۔“

اس فتویٰ کا نتائج ہونا تھا کہ والے افغانستان تھامی امان اللہ خاں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ افغانستان ہندوستانی مہاجرین کو اپنے ماں پناہ دینے کے لیے تیار ہے۔

خلافت اور ترک موالات ایسی تحریکات کی موجودگی میں ہجرت کی تحریک نے علماء اور دوسرے رہنماؤں کو پریشان کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر عثمان احمد انصاری ان دنوں لندن میں ہندوستانی وفد کی قیادت کر رہے تھے۔ مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کھلو اور خود ہاتھ کا ندھی تحریک ہجرت کو آزادی وطن کے لئے مہتر خیال کر رہے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ آزادی کی لڑائی ملک کے اندر بیٹھ کر لڑی جانی چاہئے وطن چھوڑ کر چلے جانا مفید نہیں۔ دوسری طرف علمائے فرنگی محل اور شاہ جی



تحریک ہجرت کو کامیاب کرنے میں سرگرم عمل تھے۔ پنجاب میں مولانا مولانا بخش  
خطیب جامع مسجد راولپنڈی، مولانا احمد علی لاہوری، عزیز ہندی، خان عبدالغفار  
خان، علامہ حسین میر کاشمیری، اقبال شیدائی اور دوسرے رہنما عوام کو ہجرت  
کی دعوت دے رہے تھے۔

انہی دنوں ترکیہ، جرمنی اور روس کے فوجی جرنیل، خاڑی، اٹلی، آسٹریا سے  
افغانستان میں گفتگو کر رہے تھے کہ اگر ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف وہاں  
کے عوام بغاوت کریں تو ان کی فوجی امداد کی بجائے تاکہ ہندوستان انگریزی  
تسلط سے آزاد ہو جائے۔

اس مشورے کے پس منظر میں عبید اللہ سندھی کا ہاتھ تھا جو پہلی جنگ  
عظیم کے شروع میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے حکم پر افغانستان چلے گئے  
تھے۔

اس تحریک کی موجودگی میں برطانوی حکومت نے ہجرت کی تحریک کو  
خلافت اور ترک موالات سے زیادہ خطرناک سمجھا اور اس کی روک تھام میں  
جیلے پھانسی لگائے۔ چنانچہ کئی قسم کے لوگ اس تحریک کے راستے کے  
روٹے سے ہٹے۔ ان میں لاہور کے مولوی عبدالرحمن اور عبدالرحمن نامی شامل تھے۔  
جنہوں نے پیر ملکی حکومت کی جاسوسی کی اور ہجرت کے رہنماؤں پر بد اعتمادی  
کا اظہار کیا۔ بعد میں یہ دونوں خود فرنگی کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے۔  
تحریک ہجرت خوفناک قسم کے دو گروہوں کے درمیان چلنے لگی۔  
اول وہ جو دیانت واری سے اس تحریک کو آزادی وطن کے لیے غیر مفید



سمجھتے تھے :- دوسرے وہ جنہیں حکومت وقت کی خرید کر وہ جنس کہا جاسکتا ہے۔ اس گروہ کے پاس وراثت اول الذکر گروہ سے مستعار لیے ہوئے تھے۔  
یا پھر جن کی پشت پر رائج الوقت سکے کی جھنکار تھی۔

✓ علمائے فزنگی محل کے فتویٰ اور شاہ جی کی آواز کو اپنوں اور پریوں کے درمیان سے گزر کر عوام تک پہنچانا مشکل ہو رہا تھا۔ ناہم مٹھی جون کے مہینوں میں ہجرت کی تقریب اپنے جون پر تھی۔ لوگ گھرا اور سامانی چھوڑ کر اللہ کے راستے پر وطن عزیز کے لیے ہجرت کر کے افغانستان پہنچ رہے تھے۔ مولانا احمد علی لاہوری (رحمۃ اللہ علیہ) عزیز ہندی، خان عبدالغفار خاں اور ان کے ساتھ ہزاروں مسلمان کابل پہنچ چکے تھے کہ ۱۱ جولائی ۱۹۲۰ء کو کراچی خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں مولانا حسین احمد مدنی نے ذیل کی قرارداد پیش کی :-

حکومت برطانیہ کی فوج میں ملازمت کرنا، کسی کو بھرتی کرانا، کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین کرنا اور ہر قسم کی دوسری اعانت کو ناشرع و حرام ہے۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ یہ بات ہر مسلمان فوجی تک پہنچا دے۔

یہ قرارداد منظور ہونے ہی انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ شعلہ فشاں ہوئی۔ رہنماؤں کی گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ کراچی کا مشہور مقدمہ چلا یا گیا جس میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچو شامل تھے۔ اس مقدمہ میں رہنماؤں کو دو دو، تین تین برس کی سزائیں ہوئیں۔ اس وقت تک چالیس ہزار کے قریب مسلمان افغانستان سما چکے تھے



اور دوسری طرف ہندوستان کے جبل خانے عوام اور لیڈروں سے بھر چکے تھے۔  
 ملک کے اندر افراتفری کا عالم تھا۔ انگریزی قانون اپنی عاقبت کے لیے ہر  
 طرح سے ہو کر غلاموں کے مقابلے پر صرف آ رہا ہو چکا تھا۔

وہ ہے کی زنجیریں، بندوقوں کی سنگینیں، جبل خانوں کی کوٹھڑیاں، عدالتوں  
 کے کھڑے اور پھانسی کے رستے سب کے سب اپنے اپنے کام میں مصروف  
 تھے۔ غلام اور آقاؤں کے درمیان جنگ کے بادل اس تیزی کے ساتھ برسے کہ  
 سارا ملک لہو سے واخدار ہو گیا۔ آسمان اور زمین کے درمیان خون بے گناہ کی  
 لیکر چھین گئی جس کے دونوں جانب قانون فرنگی کے نیچر توپتے نظر آنے لگے۔  
 داعی اور رعایا کے مابین اعتماد کی ساری گرہیں ٹھٹھکی پڑ گئیں۔ قریب تھا کہ غلاموں  
 کے ماتھے آقاؤں کے گریبان نوحہ ڈالتے اور تار گریبان کی دھجھیاں اڑ کر ایوان  
 فرنگی پر برقی بن کر گرتیں کہ فرنگی دانشوروں نے نئی نیچ پر سود چنا شروع کیا اور تحریک  
 ہجرت کی موت کے اسباب پر فکر و نظر کی طرح ڈالی۔

جیسے کہ اوپر بیان کیا گیا افغانستان ان دنوں ایک ایسی بساط تھی جس پر  
 مختلف حکومتوں کے مہرے کام کر رہے تھے ہر کھلاڑی اپنے واؤپر تھا۔  
 ترکیہ، جو مئی اور روس، برطانیہ کے خلاف ایک محاذ پر جمع تھے۔ گوریلانیہ  
 کے ماتھے اپنی رعایا پر ماتھے رہے تھے لیکن اس کی نگاہیں اور کان افغانستان کے  
 پہاڑوں پر مرکوز تھے جس کے دامن میں اس کی موت کیلئے مشورے ہو رہے تھے۔  
 غازی امان اللہ نے ہندوستانی تہاجروں کو جس جذبے کے تحت دعوت  
 دی تھی بلاشبہ وہ جذبہ ایک محبتِ ملتِ مسلمان بادشاہ کا جذبہ تھا جس میں خلوص کی



سینکڑوں بہاریں جلوہ فرما تھیں لیکن افغانستان کے اقتصادی اور سیاسی حالات چالیس ہزار ہاجروں کے بوجھ کے متحمل نہیں تھے۔ انگلستان ان واقعات و حالات سے نا آشنا نہیں تھا۔ افغانستان کی اس کمزور اور ریتی و یوار کا سہارا لے کر اُس نے کابل کو ایک ایسی نظر سے دیکھا کہ نمازی امان اللہ اپنے عزم کی سیڑھیوں سے پھسلتا دکھائی دیا۔

”اگر وایے افغانستان چاہے تو اُس کا تمام ملک پابندیوں سے آزاد کر دیا جائے گا بشرطیکہ انگریزوں کے خلاف افغانستان سے غیر ملکی اڈے ختم کر دیے جائیں اور ہندوستانی ہاجروں کو واپس کر دیا جائے۔“

افغانستان نے بغیر کسی تردد کے ۲۰ جون ۱۹۲۰ء میں انگریزوں کی یہ دونوں شرطیں منظور کر لیں۔ اگرچہ اس مسودے کی تصدیق انگلستان نے ۲۲ نومبر ۱۹۲۲ء کو دی لیکن حالات کی اہم نکھیں جون ۱۹۲۰ء سے سُرخ ہونی شروع ہو چکی تھیں۔ جنی ہاجروں کی آمد پر افغانستان فرس راہ تھا آج اُن ہاجروں کے لیے کابل کے بام و در، کوچہ و بازار اپنا دامن سکھڑ رہے تھے۔ کل جن پہاڑوں نے پھول برسائے تھے آج انہیں پتھر اڑ کر نامشکل نہیں ہو رہا تھا۔ افغانستان کے دل و نگاہ میں کل کے مہمان آج کے مجرم تھے۔

افغانستان کے حکمران اور عوام کے بگڑے ہوئے نیور دیکھ کر جرمنی اور اور ترکیہ کے نمائندوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ وہ اپنے ہی بنائے ہوئے نقشوں کو روندتے ہوئے اپنی چھوڑی ہوئی راہوں پر بلٹ گئے۔ مولانا عبد اللہ



مشدھی خود غازی امان اللہ کے تعاون سے روس پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔  
 ان حالات میں تحریک ہجرت کے رہنماؤں کو اپنے ماضی پر غور کرنا پڑا  
 قدم روکنے پڑے، راستے کی تحکات مخصوص ہونے لگی۔ حالات مشر مندہ کر  
 رہے تھے۔

اس مسافر کی محرومی دل کا اندازہ کون کر سکتا ہے جسے منزل پر پہنچ کر بھی  
 منزل نہ ملے۔ وہ نگاہیں کتنی بد نصیب ہیں جنہیں آستانہ یار پر جا کر بھی ویدلہ کی  
 سعادت سے محروم رہنا پڑے۔

شاہ جی اور دوسرے زعمائے ملت جنہیں تحریک ہجرت کا نھنراہ کہا جا سکتا  
 تھا، تحریک کی ناکامی اور چالیس ہزار مہاجر مسلمانوں کی کابل سے نامراد واپسی  
 پر سکون دل کھو بیٹھے۔ دوستوں کے رگے اور دشمنوں کے غصے نے شاہ جی کو  
 دل برداشتہ کر دیا۔ اور وہ اپنی تمام سرگرمیاں چھوڑ کر پھر آزاد ہائی سکول کی  
 دیکھ بھال کے لئے ہجرت واپس چلے گئے۔

## پہلی گرفتاری اور سزا

تحریک ہجرت کی ناکامی کے بعد خلافت اور ترک موالات کی ہنگامہ  
 آریٹوں میں پھیر سے توانائی پیدا ہونے لگی۔ انگریز بھی افغانستان کے خوف  
 سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ ۵ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں مہاتما گاندھی کی  
 رہنمائی میں بدیشی مال کا بائیکاٹ اور فوج میں بھرتی کے حرام کے تحت جٹانوی  
 حکومت کے خلاف عام لڑائی کا اعلان کر دیا گیا۔



ہندوستان کی ان دونوں تحریکوں میں انگریزوں کو اپنی موت و کھائی دینے لگی۔  
 ہر شہر میں روزانہ ڈھیروں کے ڈھیر لٹھیاں کپڑے بازاروں میں نذر آتش  
 ہونے لگے۔ ہندو مسلمان عورتیں اپنا قیمتی لباس خوشی سے جھلانے کے لیے  
 رضا کاروں کے سپرد کر دیتیں۔ سروگرم کپڑوں کو اپنے ہاتھ سے آگ لگاتے۔  
 بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک نے انگلستان کی عورتوں اور کارخانوں  
 کو متاثر کر دیا۔ یورپین مال سے ایشیا کی منڈیاں خالی ہو گئیں۔ روزانہ ہزاروں  
 رضا کار گرفتار ہونے لگے۔

سال ۱۹۲۰ء کی عمر اسی ہالا کار میں تمام ہوئی۔ اس سال کے غروب ہونے  
 والے آفتاب کی کرنیں شفق کی سرخیوں پر ایک ایسا عنوان چھوڑ گئیں جس سے ظلم و جبر  
 کی سینکڑوں کہانیاں مرتب ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی اس سال کی سب سے بڑی کہانی  
 ہے کہ افسانہ ہائے جرم و سزا کے رنگ و روغن کو کائنات کے وامپ میں محفوظ  
 کر لیا۔ تاریخ کے اوراق پر نشان ہو کر بھی اس سال کے واقعات کو ضائع نہیں کر سکتے۔  
 ۱۹۲۱ء کے شروع میں آزاد ملی سکول میں پھر سے بہار آگئی۔ شاہ جی نے  
 دوسری جدوجہد سمیٹ کر سکول کی طرف توجہ دی۔ دلوں کے دروازوں پر از سر نو  
 دھک لگ کر عوام باہر نکلے۔ حالات پر خوف و ہراس کا عالم تھا۔ حکومت نے  
 شاہ جی کی سیاسی سرگرمیوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ سکول کی نگرانی بھی شروع کر  
 دی تھی۔ بظاہر سکول کی عمارت تعلیم تک محدود تھی لیکن حکومت کو ہر طالب علم کا بستہ  
 خلافت کمیٹی کا دفتر معلوم ہوتا تھا۔

شاہ جی کی شخصیت اب امرتسر اور گجرات سے نکل کر راوی اور پنجاب



کی لہروں پر تیرنے لگی۔ بیاس اور ستلج کی موجوں نے انہیں اپنے کندھوں پر اٹھایا  
پنجاب کی آب و ہوا نے شاہ جی کے مزاج میں نکھار پیدا کیا۔ چول کی خوشبو نے  
چمن سے نکل کر گیسوئے یار کو بھی بہا کر فری کر دیا۔

دہلی سے انگ کے کنارے تک شاہ جی کے چہرے ہونے لگے۔ دل  
و نظر کے استرام نے دوستوں کے حلقے کو وسعت دی۔ انہی دنوں شاہ جی  
کا سیاسی مزاج بھی پختہ ہوا اور ان کی تقریروں میں مذہب کے ساتھ برطانوی مزاج  
پر کھلی تنقید ہونے لگی۔ غلامی کا احساس جوان ہو کر ساروں سے منقاد ہوا۔

خلافت اور ترک موالات کی تحریکات کے باعث انگریزوں کے  
خلاف ہندوستان میں نفرت پھیل چکی تھی۔ انگریزوں کی فوج میں بھرتی کو شرعاً حرام  
قرار دیا جا چکا تھا۔ گجرات چونکہ افواج فرنگی کا مرکز تھا اس کی حفاظت سلطنت  
برطانیہ کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ لہذا شاہ جی کو باغی قرار دے کر ان کی  
سرکاری نگرانی میں میل و نہار کی نمیز اٹھادی گئی۔ انگریزی قانون شکاری کتے کی  
طرح ان کے نقش پا کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔

پنجاب خلافت کانفرنس منعقدہ ۱۸ مارچ ۱۹۲۱ء راولپنڈی میں شاہ جی  
کے تقریر کی جو ۲۰ مارچ کے زمیندار میں شائع ہوئی۔ یہ شاہ جی کی پہلی تقریر تھی  
جو اخبارات میں شائع ہوئی۔

”برادران ملت! میں آج تقریر کرنے کے لیے نہیں آیا تھا،  
بلکہ آپ کی طرح سننے والوں میں سے تھا۔ سخت ہی تھرا اور نصیب  
کا مقام ہے کہ کوماٹ کے جب پوچھ تو اس جلسہ میں شریک ہوں



اور باشندگان راولپنڈی جلسے میں دکھائی نہ دیں۔ کیا ان ہی میں  
 نور ایمان زیادہ ہے؟ کیا وہی قرآن کریم پر عمل پیرا ہیں؟ میں دیکھ  
 رہا ہوں کہ عدالتوں میں تو اترا بول رہا ہے۔ وکالت پیشہ اصحاب  
 اپنی وکالت کیوں ترک کرنے لگے۔ دراصل وہاں کے باشندوں  
 نے عدالتوں کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وکالت پیشہ  
 اصحاب کو اپنی وکالت ترک کرنی پڑی۔ اللہ اور اس کے رسول  
 صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنو۔ بدستی چھوڑو۔ جن کے صدقے میں  
 تمہیں آرام تھا وہ بے آرام ہیں۔ جن کی وجہ سے تم عیش و عشرت  
 کرتے تھے وہ آج کل نہایت کمپرسی کی حالت میں ہیں لیکن تم  
 ہو کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ تم ہی کوئی تجویز بناؤ کہ ہم تمہارے  
 قائل ہو جائیں۔

ترکوں نے خلافت اسلامیہ کے لئے اپنا تن من و جان سب  
 کچھ قربان کر دیا لیکن تم ہندوستانیوں پر قرآن اور کعبہ حسرت بھجھا  
 ہو گا۔ فرشتے ترکوں کو ذبح کرنے کے لیے آسمانوں سے نہیں  
 اتر رہے۔ حرمین شریف کے اہل محافظوں کو اگر قتل کیا تو تم نے  
 ہندوستان میں سب سے بڑا مرکز راولپنڈی کا ضلع ہے جس  
 نے انگریزی فوج میں بھرتی دی۔ جنگی قرضے میں تم نے اپنا سب  
 کچھ دے دیا۔ اسے تم میں تو اتنی غیرت بھی نہیں۔ اگر تمہاری  
 ریٹ کیوں کو یورپین مانگیں تو تم ان کو بھی دینے میں آمادہ تھے۔ اب



بھی تم مسطفیٰ کمال کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو۔ سفید خداؤں  
 سے ڈرتے ہو۔ جس کعبہ کی طرف تم منہ کر کے نماز پڑھتے ہو،  
 اسی پر ہاتھ صاف کرتے ہو۔ اسے تم میں تو شتمہ بھر بھی غیرت  
 نہیں۔ تم تماشا دیکھتے ہو گے کہ ابوالکلام آزاد، محمد علی، شوکت علی  
 جیل چلے جائیں تو کام بند ہو جائے گا۔ اسے آزادی کس چیز کا  
 نام ہے، قید کس چیز کا نام ہے۔ قید اور آزادی میں کیا فرق ہے؟  
 اگر ہمارا گھر آزاد ہے تو ہم آزاد ہیں۔ اگر وہ آزاد نہیں تو کچھ بھی  
 نہیں۔ کیا ترک مرٹ جائیں گے تو مکہ اور مدینہ کو بچا لو گے؟ کیا  
 کالا غلاف جس میں اس وقت سوراخ ہے اسے بچا لو گے؟  
 اسے دیکھو! ترکوں کا جو بچہ پیدا ہونا تھا وہ سو میں شریفین پر  
 بھینٹ پڑھا دیا کرتے تھے۔

میں تم سے ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں ہم انشاء اللہ ضرور کامیاب  
 ہوں گے۔ (اس پر اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے)

تمہارے لیے سکھ اپنی جہانیں دے رہے ہیں۔ غیر نو جوانی  
 کر رہے ہیں لیکن تم ہو کہ شادمانی کر رہے ہو۔ تم کہتے ہو محمد علی نہیں  
 آئے، شوکت علی نہیں آئے، صدر صاحب نہیں آئے۔ اسے  
 سنو اور غور سے سنو! کہ اللہ ہمارا صدر ہے اور قرآن کریم ہمارا  
 دستور العمل ہے۔ تمہارا قافلہ بہت دور جا چکا ہے اور تم پھر  
 اس قافلے کو واپس لا رہے ہو جہاں سے چلا ہے۔ تم اللہ کی مدد



نہ کریں گے۔ اللہ تم پر عذاب نازل کرے گا۔ تمہارا دل پتھر کا  
 ٹکڑا ہے گوشت کا لو ٹھٹھا نہیں۔ اگر تم ان باتوں سے منحرف  
 ہو تو نیا خدا بنا لو، نیا قرآن لے آؤ۔ تم اللہ اکبر کے نعرے  
 لگاتے ہو تو میرے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ تمہارے نعرے  
 بے روح ہیں۔

مولوی ظفر علی خاں، مولانا فاضل، مولوی نقی اللہ کے لیے  
 تم نے کیا کیا؟ تم نے ان سے کوئی سہا سہا روی کی؟ تمہارے  
 مولوی تو سی آئی ڈی کے اندر موجود ہیں۔ تم نے ہی ان تک  
 اطلاعیں بھجوائیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں دیکھ لیتا کہ انگلستان یا  
 آئر لینڈ کے لوگ اس قسم کی اطلاعوں کے پہنچانے میں کہاں  
 تک کامیاب ہوتے ہیں۔

تم نے مولانا محمود الحسن کے کہنے پر عمل کیا؟ اس بزرگ  
 کے اقوال کا اتباع کہاں تک کیا؟ ارے مسلمانو! تمہاری اس  
 حالت پر مجھے افسوس آتا ہے اور حسرت بھی۔ مجھے سیال شریف  
 کے پیر ضیاء الدین سے پچھلے دنوں ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس نیک  
 بخت بزرگ نے اپنے مریدوں نے نام یہ حکم صادر فرمایا  
 ہے کہ جو شخص میری حلقہ مریدی میں رہنا چاہتا ہے اس کے  
 لیے لازم ہے کہ وہ افواج یا گورنمنٹ انگلیشیہ کا نوکری ترک  
 کرے، ورنہ وہ میرا مرید نہ ہوگا۔



انتخابات کے ذریعے عوام میں ابھی اس تقریر کے چرچے ہو ہی رہے تھے کہ ۲۵ مارچ کو نماز جمعہ کے بعد امرتسر خلافت کمیٹی کے جلسہ عام میں جو خیرالین کی مسجد میں ہوا شاہ جی نے دوسری تقریر کی۔ اس تقریر کے بعد حکومت نے شاہ جی کو مزید تحصیل دینا نامناسب سمجھ کر ۲۶ مارچ ۱۹۲۱ کو رات کو دو تین بجے کے درمیان کوچہ موہر کنڈاں کو موں ڈیوڑھی امرتسر سے دفعہ ۱۲۲ الف کے تحت گرفتار کر لیا۔

شاہ جی ان دنوں گجرات سے اپنی ہمیشہ کی شادی کے سلسلے میں امرتسر آئے ہوئے تھے۔

## امرتسر میں ہڑتال

طلوع آفتاب سے پیشتر سارے شہر میں شاہ جی کی گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دکانیں کھلنے سے پہلے بند ہونے لگیں۔ گلی کوچوں نے ماتمی لباس پہن لیا۔ گھروں میں جلتے ہوئے چولہوں کی آگ سرور کی گئی۔ یہاں تک کہ سارا شہر امد کہ یہاں آن پہنچا۔ حکومت برطانیہ مردہ باد! سید عطا اللہ شاہ بخاری زندہ باد! کے یہیم نعروں نے پولیس افسروں کو مجبور کر دیا کہ وہ عوام کی مرضی دریافت کریں۔ ہم شاہ صاحب سے ملنا چاہتے ہیں یا انہیں ہمارے سامنے لاؤ! ہجوم کا یہ مطالبہ افسران بالائیک پہنچا۔ انہوں نے پایا کہ ہجوم اپنے چند آدمی منتخب

لے شاہ جی کی یہ ہمیشہ باپ کی طرف سے حقیقی اور والدہ کی طرف سے سویلی تھی لیکن شاہ جی ان سے ہمیشہ حقیقی بہن کا سا پیار کرتے رہے



کرے۔ چنانچہ ہندوہ مسلمان کو توالی کے اندر حوالات میں شاہ جی سے ملنے گئے۔ واپسی پر اُن کا بیان ہے کہ "یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شیر کچھار میں تھل رہا ہے۔ انہیں اپنی گرفتاری کا ذرہ برابر خوف نہیں۔ پھر اسی طرح سُرخ اور آنکھیں اسی طرح مسکرا رہی ہیں۔ زبان پر قرآن کریم کی آیات جاری ہیں۔"

نیز وفد نے کہا ہم نے ضمانت کے لیے عرض کیا تو ناراض ہو کر فرمانے لگے، "آپ نے مجھے بزدل یا وطن کا خدار سمجھا ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا اگر آپ نے ایسا کیا تو میں کو توالی سے باہر آتے ہی وہی کچھ کروں گا جس کی پاداش میں یہاں لایا گیا ہوں۔"

پھر شاہ جی کے والد ملنے آئے تو دیکھا سورہ یوسف کی تلاوت کر رہے ہیں۔ حوالات کے آس پاس پولیس افسروں کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں والد صاحب کو دیکھ کر شاہ جی نے "السلام علیکم" کہا۔ والد صاحب نے جواب میں "علیکم السلام" کے بعد کہا،

"میں اس دن کا منتظر تھا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں استقامت دے۔ آمین!"

پھر شاہ جی نے کہا،  
 "ابا جی! میں آپ کی دعائیں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہتا ہوں اور بس!"  
 گرفتاری کی خبر جب دوسرے شہروں میں پہنچی تو ہر جگہ برطانوی حکومت کے خلاف جلسے ہوئے۔ شاہ جی کو سچی گوئی کی پاداش میں گرفتاری پر مبارک باد کی قرار دی منظور کی گئیں۔

تخریقاتِ آزادی وطن کے جلتے ہوئے اداؤں میں شاہ جی کی گرفتاری نے



ایسا مثل چھڑکا کہ اس آگ کے شعلے ایوانِ فرنگی تک جا پہنچے جس سے غلامی کی زنجیریں ٹھنڈے گھس گھس۔ ان دنوں شاہ جی کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔

## مقدمہ کی سماعت

۲ اپریل ۱۹۲۱ء پہلی دفعہ شاہ جی کو مسٹر ایف اے کانر (F.A. Cannor) ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ کچھری میں عوام کی اس قیادت بھیر تھی کہ باقی عدالتوں کو اپنا کام جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ دس بجے سے قریب بعد شاہ جی کو پولیس کی لاری میں کچھری لایا گیا۔ شاہ جی کو دیکھتے ہی عوام نے برطانوی راج مرہ باد کے نعروں لگائے۔ انتظام کے لئے گورکھا فوج کا دستہ پہلے سے متعین تھا لیکن ان دنوں عوام کے جذبات فوج اور پولیس کے روبرو سے بے نیاز تھے۔ عدالت کا کمرہ دکھار اور دوسرے معززین سے بھرا ہوا تھا۔ مجسٹریٹ شاہ جی سے مخاطب ہو کر آپ نے ۲۵ مارچ کو خیر الدین کی مسجد میں تقریر کی تھی؟

شاہ جی نے وہاں بھی قرآن کریم پڑھا تھا اور یہاں بھی قرآن کریم کی ایک آیت پڑھا ہوں۔

مجسٹریٹ۔ آپ کچھ کہہ کر دے ہیں۔

شاہ جی۔ جس نے وہاں میرا قرآن نوٹ کیا ہے وہی لکھے۔ اگر یہاں درست نہیں نوٹ کر سکتے تو وہاں کس نے درست نوٹ کیا ہوگا۔ میں لکھتا نہیں جا تھا پڑھتا جا تھا ہوں۔



محض ٹریٹ، آپ کا بیان؟

شاہ جی۔ میرا بیان وہی ہے۔

سرکاری وکیل نے استغاثہ پڑھ کر سنایا۔

”مولوی عطا اللہ صاحب ایک ذی عزت آدمی ہیں۔ آپ کے والد

بھی ذی عزت آدمی ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ جو لفظ میرے منہ سے نکلتے ہیں ان کا

اثر ہوگا۔ ان کو علم تھا کہ ایسی تقریروں کا کیا اثر ہوتا ہے۔

پہلے بھی ان کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایسی تقریروں سے منع کیا تھا۔

یہ تقریر جو انہوں نے جمعہ کے دن کی رخط کی صورت میں تھی۔ قرآن شریف کی آیت

میں انہوں نے اپنی سیاسی خواہش کو پورا کرنا چاہا تھا۔ انہوں نے جو کچھ کہا اس

سے الٹی لوگوں کے دلوں میں جو سننے والے تھے بڑے خیالات پیدا ہونے

کا احتمال ہے۔

انہوں نے مسجد میں قسم کھا کر کہا کہ نکتہ مضطرہ پر گولیاں چلائی گئیں۔ اس

طرح ان لوگوں کے دلوں میں مذہبی نفرت اور جوش پیدا کیا گیا۔

انہوں نے کہا کہ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی اور وہ بطور راشن کے سپاہیوں

کو دی گئیں۔ دس دس آدمیوں کو ایک عورت دی گئی اور ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں

کے دلوں میں عورت کی عزت و حرمت بہت بڑی ہے۔

انہوں نے کہا جو روپیہ لڑائی کے لیے ہم سے لیا گیا تھا اس سے

گولیاں خریدی گئیں اور ہمارے اپنے بھائی ان سے مارے گئے۔

یہ ایسی تقریر تھی جو بے علم لوگوں پر جن کو واقفیت نہ ہو ان پر بڑا اثر پیدا



کہہ سکتی تھی اور گورنمنٹ کے خلاف تھی۔

جب وعظ کے طور پر جمعہ میں یہ لفظ کہہ رہے تھے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مبالغہ قابل معافی اور جھوٹ بولنا واجب اور جائز ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ وہ کس قسم کے آدمیوں کو سنار ہے ہیں۔ ایسی بات سن کر وہ فساد کرنے لگتے ہیں جس سے غل و غیرہ کا احتمال ہے۔

لہذا حسب ذیل امور اس تقریر میں جو جم تحت ۱۲۴ و تعزیرات ہند عائد ہوتے ہیں۔

۱۔ فرعون اور حکومت کے مابین مقابلہ کیا گیا۔ یہ کہ انگریز چاہتے ہیں کہ کل دنیا کو عیسائی بنائیں "انگریز" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ یہ برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کے لیے استعمال کیا گیا ہے کیونکہ لارڈ کچنز وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ موسیٰ اور فرعون کا ذکر کیا گیا۔ موسیٰ نے فرعون کی سلطنت کو تباہ کر دیا تھا۔ وہ بچوں کو قتل کرتا تھا۔ یہ حکومت طریقہ تعلیم سے وہی بات کہتی ہے۔

۳۔ پولیس والے نو نو روپے لے کر اپنے بھائیوں کے گلے کاٹتے ہیں۔ فرعون کے مجرم بھی تھے لیکن انہیں تنخواہ زیادہ ملتی تھی۔ موسیٰ نے ایک شخص کو مارا۔ خدا کو غصہ پسند ہے۔ شرخ رنگ، شرخ چہرے، شرخ کپڑے بھی خدا پسند کرتا ہے۔ میری تعلیم بھی یہی بتاتی ہے کہ شرخ کپڑے ہوں اور میں حسین کی گود میں چلا جاؤں۔

۴۔ ہمارے بھائی برطانوی فوج میں بھرتی ہو کر مدینہ منورہ گئے اور











دفعہ ۱۲۴ و تعزیرات ہند ایک وعظ کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے، جو اس نے شیخ  
 خیر الدین کی مسجد واقع ہالی بازار امرتسر بروز جمعہ مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۲۱ء کو کثیر التعداد  
 جماعت کے سامنے بیان کیا تھا۔ استغاثہ کا بیان ہے کہ اس وعظ سے اس  
 حکومت کے خلاف جو پروئے قانون قائم ہے، نفرت اور حقارت پھیلنے کا  
 احتمال ہے۔

یہ استغاثہ حکومت کی منظوری لینے کے بعد دائر کیا گیا ہے۔ استغاثہ  
 کے دس گواہوں نے یہ وعظ سنا۔ ان میں سے ایک غلام محی الدین ہیڈ کانسٹیبل گواہ  
 استغاثہ نمبرم تھا جو وعظ سننے کے بعد کو توالمی پہنچا اور اس نے وعظ کے نوٹ  
 تیار کر کے اپنے حکام کے پاس بھیجے۔ وعظ کا ترجمہ مختصر درج ذیل ہے :-

الف — ہندوستان کی موجودہ حکومت کا مقابلہ فرعون سے کیا گیا اور  
 مسٹر گاندھی کی مثال موسیٰ سے دی گئی۔ فرعون کی سلطنت برطانیہ کی نسبت بڑی  
 اور طاقتور تھی۔ فرعون منجموں سے صلاح اور مشورے کیا کرتا تھا اور انگریز ڈاکٹروں  
 سے مشورے لیتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر اتنا کہہ دے کہ فلان جگہ رہنا صحت کے لیے مضر  
 ہے تو انگریز اس جگہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ خدا انگلستان میں کوئی ایسا ڈاکٹر پیدا کر دے  
 جو ہندوستانیوں سے تین چار لاکھ روپیہ لے کر انگریزوں کو یہ مشورہ دے کہ ہندوستان  
 کی آب و ہوا ان کے لیے ٹھیک نہیں۔

ب — فرعون تو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ کائنات کا خدا ہے اور انگریز  
 یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں امن و امان پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ تمام  
 نسل انسانی کو عیسائی بنایا جائے۔



۴۔۔۔ ان انگریزوں کے صلاح کار لارڈ سہارج، مکشنر، گورنر اور اسی

طرح کے دوسرے لوگ ہیں

۵۔۔۔ فرعون کے منجھوں نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک لڑکا پیدا ہوگا

جو فرعون کی سلطنت کو تباہ کر دے گا۔ اس پر فرعون نے موسیٰ کو تباہ کرنے کے

لیے یہ تجویز سوچی کہ جو لڑکا پیدا ہو اُسے مار ڈالا جائے۔ فرعون نے یورپ و ہندوستان

کی انگریزی حکومت سے مراد نے اخلاق کو تباہ کرنے اور غلام بنانے والے

نظامِ تعلیم سے ہندوستانیوں کی قومی روح اور مذہبی سرگرمی کو برباد کر دیا۔ نتیجہ

ہوا کہ ہمارے بھائیوں نے نو نو روپے کی ذیلی تنخواہ پر فوج میں بھرتی ہو کر نیک اور

مدینہ میں نیرنمانہ کعبہ میں اپنے ہی بھائیوں کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کیا لیکن جب

حج کا سوال پیدا ہوا تو مفلسی اور ناداری کا عند پیش کرتے ہیں۔

لڑکیوں کے لیے سکول کھول رکھے ہیں۔ یہ سیاہ فتنیں شیطان کی نائیاں ہیں۔

مضید لباس میں دیہات کی لڑکیوں کو انگوڑ کھلاتی ہیں اور لڑکیوں کی چائے پلاتی ہیں اور

پیسٹ کی پیسٹ میں لاکر گھر کے کام کاج کے ناقابل بنا دیتی ہیں۔ یہاں کی ابتدائی تعلیم

اور کالج کی پڑھائی انسان کو غلام بنا دیتی ہے۔ یورپ کا فرعون ہندوستانی عورتوں

کو ذلیل کرنا چاہتا ہے تاکہ ان کی اولاد غلام بنی رہے۔

المیشیا میں ہماری عزت و حرمت کو اس طرح ذلیل کیا گیا کہ ایک ایک مسلمان

عورت دل دل سپا ہیوں کو راجھی کی طرح تقسیم کی گئی۔

۶۔۔۔ فرعون کو خبر نہ تھی کہ وہ بچہ جس کی تباہی کو اُس نے اپنا مقصد

قرار دے رکھا ہے خود اسی کے شاہی محل میں پرورش پائے گا۔ اور اُس کی آمدگی



نوچے گا۔ اسی طرح ہماگاندھی بھی برطانوی ہند میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی۔  
یہیں کے تعلیمی اعزازات حاصل کیے۔ اب انگریزوں کو ہی برباد کرنے پر کمر بستہ  
ہیں۔۔۔!

ن۔۔۔ فرعون نے سی آئی ٹی کی مدد سے ایک ایسی دایہ تلاش کی جسے  
شیر خوار موسیٰ نے پسند کیا۔ موجودہ سی آئی ٹی کے آدمی نور و پے کی ذیل رقم کے  
لیے اپنے ہی بھائیوں کا گلہ کاٹتے ہیں۔ خدا کرے ان کے نامتوں میں جت نام ہو  
جائے۔ قیامت کے دن ان کا سیاہ نامہ اعمال ان کی گردنوں میں ٹھکایا جائیگا  
داس موقع پر لازم نے پولیس کے ان سفید پوش آدمیوں کی طرف اشارہ کیا، جو  
اس وقت مجمع میں موجود تھے، اگر یہ لوگ اس قسم کا کام چھوڑ دیں تو انگریزوں کو  
یہی کام خود کرنا پڑے۔

س۔۔۔ جب موسیٰ جوان ہوئے تو انہوں نے ایک مصری کو جو شہادت  
میں مار ڈالا۔ خدا ایسے جلال کو پسند کرتا ہے۔ خدا فرخ رنگ، فرخ کپڑے، فرخ  
چہرے اور فرخ گو زبان پر خوش ہوتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ میں بھی اپنے کپڑوں پر  
فرخ چھینٹے دیکھوں تاکہ مجھے جنت الفردوس میں جگہ ملے۔  
لزم کے وعظ میں مندرجہ ذیل اشارات بھی تھے:-

ا۔۔۔ بزموں نے چالیس سال تک جنگ کی تیاری کر کے بالآخر شکست  
کھائی۔ کاش! انگریزوں کو بھی کسی کے نامتوں شکست کھانی پڑے۔ ہندوستانی  
بزموں کی طرح جنگ کی تیاری نہیں کر سکتے۔ اس لیے انہیں چاہئے کہ ناک و صوفی  
کا طرز عمل اختیار کریں۔ انگریز شہد کی نگھیوں کی مانند ہیں۔ ان پر کوئی چیز نہ بھینکو



ورنہ یہ لکھیاں کاٹنے دوڑیں گی۔ اگر تمہارے سپہرے پر بیٹھ جائیں تو انہیں ہٹا سکتے ہو اور وہ ایک کو مار بھی سکتے ہو۔ لیکن یہ بڑی طاقتور ہوتی ہیں۔ انسان کا خون پی لیتی ہیں۔ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ انہیں عدم تعاون اور ہڑتال کی دھوٹی دو۔ بس پھر یہ اپنا بورہ بستر باندھ کر بیٹھی سے روانہ ہو جائیں گے اور ہم کہیں گے غرقنا آل فرعون۔

۲۔ اگر ہندوستانی صرف کھدر کا کپڑا پہننا شروع کریں تو انگریزوں کا دیوالہ نکل جائے۔

۳۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں کے بچے اب تک انجمن اسلامیہ کے سکول میں جاتے ہیں حالانکہ اس انجمن نے سرایہ جنگ میں پچھتر ہزار روپیہ دیا تھا تاکہ اس روپے سے گولیاں خریدی جائیں جو کہ مسلمانوں ہی کے سینے چھلنی کریں۔

۴۔ انگریزوں نے ہر ممکن طریق سے ہندوستانیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے فوج میں بھرتی کر لیے گئے تاکہ مارے جائیں۔ بعض جلیانوالہ باغ میں ذبح کر دیے گئے۔ بعض مارشل لاء میں قید کر دیئے گئے اور پھانسی پر لٹکائے گئے جو باقی رہ گئے ان کا مال و متاع سرایہ جنگ کے لیے لوٹ لیا گیا اور انہیں آفلاس کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔

۵۔ جب سے قانون اقتناع مجالس پانچابانہ نافذ ہوا ہے صرف مسجد ہی ایک مقام امن ہے۔ لہذا عوام کو چاہئے کہ مسجدوں کی مرمت کے لیے دل کھول کر چنڈہ دیں۔



یہ اقتباسات کافی ہوں گے میرے روبرو ملزم نے بیان کیا ہے کہ اُس نے محض قرآن کریم پڑھا ہے۔ ملزم نے کوئی جواب استغاثہ اس بنا پر پیش نہیں کیا کہ وہ عدم تعاون کا پابند ہے۔

فیصلہ کے لیے پہلا سوال یہ ہے کہ آیا ملزم نے یہ وعظ کہا تھا جو اُس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ گواہان استغاثہ نے جو کچھ سنا اُس کو بالحد کے ساتھ بیان کرنے میں اُن کا کوئی مقصد نہیں اور جس طریق میں اُنہوں نے اپنے بیانات دیے ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دانستہ ایک ناگوار فرض انجام دے رہے ہیں۔ گواہ استغاثہ نمبر ۱ مولوی نور احمد جو ملزم کا ہم پیشہ مولوی بھی ہے حتی الامکان ملزم کو مدد دینے کی کوشش کی اور اس واقعہ پر از خود رو دیا کہ سامعین کی جماعت دوران وعظ جوش سے بھری ہوئی معلوم نہ ہوتی تھی لیکن یہ امر خارج از بحث ہے کیونکہ جرم زیرِ غور یہ نہیں کہ تقریر کا اثر کیا ہوا بلکہ سوال یہ ہے کہ الفاظ سے کس قسم کا جذبہ پیدا کرنا مقصود تھا۔ گواہ مذکور اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ سامعین مولوی عطا اللہ کا وعظ توجہ سے سن رہے تھے۔ ملزم نے قرآن کریم سے چند آیات پڑھیں اور حاضرین مسجد کو اُس کی تشریح اور تفسیر کر کے سنائی۔ گواہ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وعظ کا مضمون فرعون اور موسیٰ سے متعلق تھا نیز ملزم نے کہا تھا کہ جہانما گاندھی کا نام بھی موسیٰ کی طرح سے شروع ہوتا ہے گواہ نے تسلیم کیا کہ ملزم نے حکومت کا مقابلہ شہد کی مکھیوں سے کیا تھا۔ گواہ نے سوویشی دھونی کے الفاظ بھی سنے ہیں۔ اس کے علاوہ گواہ مذکور نے ڈاکٹروں کی رشوت کے متعلق بھی کچھ سنا تھا۔ گواہ نے یہ خود بیان کیا ہے کہ اُس نے



کوئی ایسی بات نہیں سنی جس سے بد نظمی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ لیکن ساتھ ہی گواہ نے بیان کیا کہ وہ ملحق کمرے میں پھیلنے کی طرف بیٹھا تھا اور وعظ کے پہلے حصے میں موجود نہ تھا۔ سب سے آخر میں وہ کہتا ہے میں بیمار ہوں اور مجھے طاقتِ سماعت ہے۔ اس کا بیان دورانِ تحقیقاتِ اول درجہ کے محسوسات نے قلم بند کیا تھا وہ کہتا ہے میں انگریزوں کا لفظ زبان پر نہیں لایا ہوں۔ جیسے کہ بیان مذکور میں درج ہے وہ بیان صحیح ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس بیان میں گواہ نے کہا کہ ملزم نے فرعون کے ہمراہیوں کی عزت قانی کا تذکرہ کیا مگر چونکہ گواہ مولوی ہے یہ قدرتی بات ہے کہ اُسے اس قسم کی شہادتِ خلافِ مرضی دینی پڑی ہو اور ممکن ہے اُسے ڈرا یا دھمکا یا بھی گیا ہو۔ چونکہ وہ وعظ میں موجود تھا، استغاثہ نے مناسب نہیں سمجھا کہ اُسے شہادت میں پیش نہ کرے۔ شہادت دیتے ہوئے اُسے جو روحانی کوفت ہوئی وہ بھی اس طرزِ عمل اور اس بات سے بخوبی ظاہر تھی کہ اُس نے کئی مرتبہ برقاب کے جوڑے پئے اور گواہوں کے کپڑے میں ایک خادم بھی ساتھ رکھا۔ یہ حالت نیز گواہ کا یہ عذر کہ میری سماعت میں فرق ہے۔ میں بیمار ہوں اور مسجد میں دیر سے پہنچا تھا، بہت کچھ معنی خیز ہیں۔

میں بلا تامل اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملزم نے اسی طرح وعظ کیا جس طرح سے نقشہ سجات ای، بی، بی اور سی میں درج ہے اور گواہانِ استغاثہ نمبر ۲ سے وک تک نے بیان کیا۔ پس یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا تصفیہ طلب امر یہ ہے کہ ملزم نے جو کلمات کہے وہ باغیانہ ہیں یا نہیں؟ ان سے نفرت و تحقارت کے جذبات پھیلتے ہیں یا نہیں؟ ان سے



اُس حکومت کے خلاف جو برائے آئین برطانیہ ہند میں قائم ہو چکی ہے بددلی پھیلتی ہے "یا نہیں؟ وہ جذبات نفرت و حقارت جو برانگیختہ کیے گئے بغیر حکومت پر معقول نکتہ چینی کی حد میں آسکتے ہیں یا نہیں؟ فرعون کے ماکھوں پوتوں کے اتلاف کا جو مقابلہ حکومت کے مروجہ طرز تعلیم کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے بظاہر حکومت کی حقارت مقصود ہے۔ پھر اس کا یہ کہنا کہ انجمن نے سرمایہ جنگ میں جو چندہ دیا تھا اُس سے گولی یا بارود خرید کر ہمارے بھائیوں کو ہلاک کیا گیا اور مقامات متقدّمہ کی بے حوصلگی کی گئی۔ اُس غلط بیانی اور دروغ بانی کی مثال ہے جو اس شخص نے مذہب کی اڑ میں منبر سے تلقین کی تاکہ حکومت کے خلاف نفرت اور بددلی پھیلائی جائے۔ اس طرح وہ اپنے مسلمان سامعین سے استدعا کرتا ہے جن کے نزدیک عورت کی عزت اور حرمت سب چیزوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اُس غلط بیانی سے کام لیتا ہے کہ ہندوستانی عورتوں کے اخلاق بگڑتے جا رہے ہیں تاکہ اُن کی اولاد حلقہ بگوش عیسائیت ہو۔

نیروہ کہتا ہے کہ مسلمان عورتیں شہوت رانی کے لیے سپاہیوں کو ہتھیاری جاتی ہیں۔ سامعین میں زیادہ تر جاہل لوگ تو اس کا یہی مطلب سمجھیں گے کہ حکومت نے نہایت ہی مذموم کارروائی کی ہے اور چونکہ ملزم یہ باتیں وعظ میں کہہ دیا تھا اس لئے وہ یہ عذر بھی پیش نہیں کر سکتا کہ مبالغہ قابل عفو اور دروغ بیانی سبازہ ہوتی ہے۔ پولیس کے متعلق بھی اس کے الفاظ عیاں طور پر ایسے ہیں جن سے پولیس کے دلوں میں حکومت کی طرف سے بددلی پھیل سکتی ہے اور اس کا اثر خود غلام محمد الدین بیٹا کانسٹیبل نے محسوس کیا ہے۔ پھر اُس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش



کی کہ حکومت ہر ممکن ذرائع سے ہندوستانیوں کا استیصال چاہتی ہے یعنی ان کو مروانہ کے لئے فوج میں بھرتی کرتی ہے۔ جلیانوالہ باغ میں کشت و خون گرم کرتی ہے۔ آڈیشن لاء کے تحت قید کرتی ہے، پھانسیاں دیتی ہے اور روپیہ پیسے سے محروم کرتی ہے۔

یہ باتیں بھی صریحاً غلط بیان کی گئی ہیں جن سے حکومت کے خلاف نفرت اور بددلی پیدا کرنا اور سامعین کو عمل کے لیے ابھارنا مقصود ہے۔

مسٹر گاندھی اور موسیٰ کے تقابل سے متعلق اس شرمناک اشارے کی بابت کچھ لکھنا غیر ضروری ہے جس سے اُس نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسٹر گاندھی کس طرح حکومت کو دوق اور پریشانی کر رہا ہے۔ یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کی حکومت کا تختہ الٹ دیا موسیٰ کا ایک مصری کو مار ڈالنا اور سُرخ رنگ کا حوالہ دینا صحاف طور پر خونریزی اور اشتعال انگیزی کی طرف اشارہ ہے اور اس کے وعظ کے دوسرے مضمون کی طرح یہ باتیں بھی اس نلک کی موجودہ حکومت کے خلاف کہی گئی ہیں۔ اس کی یاد دہانی کہ انگریزوں کو جرمنوں کی طرح شکست ہو اور ان وقتنا آئی فرعون کی بددعا جو بقول ملزم کے اُس وقت زبان پر لائی جائے جس وقت انگریز ساحل ہند سے روانہ ہوں گے، حقارت اور بددلی کی حقیقی مثالیں ہیں جو اُس نے سامعین کے دلوں میں پیدا کیں۔

ملزم کا اپنے برادران وین کو یہ ملامت کرنا کہ جب جج کے لیے کہا جاتا ہے تو غربت کا عذر پیش کرتے ہو جانے لاکہ ملزم نے خود جج نہیں کیا۔



اپنے بھائیوں کے ساتھ خلوص کی ایک اور مثال دی ہے۔ اس کا  
 مرمت مسجد کے لیے چندے کی درخواست کرنا جس میں وہ خود وعظ کر رہا تھا۔  
 اور یہ کہنا کہ قانون مجاہد باغیانہ کی وجہ سے مسجد بھی ایک پناہ کی جگہ رہ گئی ہے۔  
 ظاہر کرتا ہے کہ وہ قرآن شریف کی تعلیمات کو سیاسی اعتراض کے لئے برتا رہا  
 ہے اور یہی نیت اس کی اس کے وعظ سے مترشح ہوتی ہے۔ تخیل کو خواہ کتنی  
 ہی وسعت کیوں نہ دیں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ملزم کا وعظ محض سوراخ کے حصول  
 کی خواہش پر مبنی تھا اور نہ ملزم نے خود اس کی طرف اشارہ کیا۔

چنانچہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ملزم نے جو تقریر کی ہے اس سے ایک  
 ایسی حکومت کے خلاف جو برطانوی ہند میں بروئے قانون قائم ہو چکی ہے  
 نفرت و حقارت اور بددلی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وعظ مذکور حکومت  
 یا کسی سرکاری افسر کے خاص فعل یا کاروائی کے خلاف نہ تھا بلکہ اس کے ذریعے  
 سے کوشش کی گئی تھی کہ لوگوں کے دلوں میں اس نظام تکمیلی کے خلاف نفرت  
 پیدا کی جائے جس کے ماتحت وہ رہتے ہیں اور اُسے بدل دیا جائے۔

موجودہ نازک سعادت میں مذہب کے نام سے ایک غیر تعلیم یافتہ  
 اور اشتعال انگیز مجمع کے سامنے کوئی تقریر کرنا ایسا ہے کہ اس سے کبھی  
 مجموعی دلوں میں ایسی تلخی پیدا ہو سکتی ہے اور ایسے جذبات برانگیخت ہو سکتے ہیں  
 کہ لوگ فوراً عملی کاروائی شروع کر دیں۔

سامعین میں سے اگر کوئی شخص ملزم کا وعظ سنتے کے بعد باہر آتا اور  
 پہلا انگریز جو اسے ملتا اس پر وہ سر بازار حملہ کر دیتا تو یہ امر چنداں باعث تعجب نہ تھا



میں بلا حائل ملزم کو زیر دفعہ ۱۲۲ و تعزیرات ہند مجرم قرار دینا ہوں  
 جون ۱۹۲۰ء میں اُسے تیندہ ہو چکی ہے۔ اس لئے وہ اس قسم کی تعزیر کرنے کے  
 نتائج و عواقب اور سزا سے بخوبی آگاہ تھا۔ قانون کی رو سے زیادہ سے زیادہ  
 سزا جس دوام عبور دریا سے شروع کی ہو سکتی ہے لیکن میں ملزم کو تین سال قید با  
 کی سزا دینا ہوں جس میں تین ماہ کی قید تنہائی ہوگی۔

دستخط ایف اے کلاٹر

۸ اپریل ۱۹۲۱ء  
 ایڈیشن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ  
 عدالت کا فیصلہ سننے کے بعد شاہ جی نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے  
 فی البدیہ کہا۔

دار کے سنی دار کو قید کہ سالہ ملے  
 نائے مشکل آساں ہوتے ہوتے رہ گئی  
 کمرہ عدالت سے باہر نکلے تو ہجوم میں سے اکثر اصحاب کے رونے کی  
 آواز آئی۔ سننے میں آگے کہا،  
 "کون بزدل اور ماہی ہے؟ تعلق بنجاری سے اور رونا عورتوں کی طرح۔"  
 پگھے کہیں کے!"

اس کے بعد السلام علیکم کیا اور پولیس کی لاری میں سوار ہو گئے۔

امر تیسری جیل سے روانگی

"۸ اپریل کو حسب دستور ڈسٹرکٹ جیل امرتسر سے شاہ جی کو لاہور منتقلی



جیل میں تبدیلی کا حکم ملا۔ یہ کام چھپنیں اور دوسرے حکام نے بڑی رازداری سے  
 کرنا چاہا لیکن نہ جانے اہل شہر کو کس طرح پتہ چل گیا کہ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ  
 ریلوے اسٹیشن پر شاہ جی کی آمد سے پہلے پہنچ گئے۔  
 گھاڑی چلنے میں کچھ منٹ باقی تھے کہ پولیس کی بھاری معیت میں شاہ جی  
 کو اسٹیشن پر لایا گیا۔ پاؤں میں لوسے کی پٹریاں، ہاتھوں میں مستحکم ٹی۔ اس حالت  
 میں یہ مرد دریش جب اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا تو پچھتر بجی ابدیدہ ہو گئے۔  
 برطانوی سامراج کا مجرم، وطن کا سپاہی، قرآن کا مبلغ، آزاد ملی وطن کے جوڑم ہیں  
 اہم ہی زنجیروں میں جکڑا ہوا پر زرد رنگین (Prisoner Wagon) کی طرف یہ کہتے  
 ہوئے بڑھ چلے۔

عشق اپنے مجرموں کو پا رہ جو لالے چلا  
 انٹر سینکڑوں انسانوں نے آنسوؤں کے ڈال، دل کی دعائیں اور حسبتاً  
 اللہ و نعتاً انوکھلی کہہ کر تین سال کے لیے اپنے سے جدا کیا۔  
 گھاڑی نے منزل کی طرف سفر شروع کیا تو شاہ جی نے کھڑکی سے باہر  
 منہ نکال کر کہا۔

دو دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں  
 خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں







فرنگی عہدِ اقتدار کی داستان حقیقت کے اس قدر قریب ہے کہ واقعات  
 کسی بھی زمانے کے مؤرخ کے لیے الجھاؤ پیدا نہیں کرتے۔ آئینہ ہر تصویر کو  
 وقت کے چوکھٹے میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔ ماضی کی راہوں سے گزرنے  
 والا ہر مسافر اپنے پاؤں کی ٹھوکریں نہ جانے کس قدر نشانِ پائیے ہوئے ہے  
 کہ جن پر زمانے کی بے اعتنائیوں کا گھر ثبت ہے۔ زمانہ اپنے قلم سے بھی  
 کہانیوں کو رقم کر رہا ہے۔ غروبِ آفتاب کی ہر شام انہیں شخص کی سرخیوں سے  
 طحا نیتنی چلی جا رہی ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ ہر کہانی کو اپنے عنوان کے  
 لیے کسی عطا اللہ کے خون کی ضرورت ہوگی لیکن مستقبل کا دامن نہیں ہوگا۔

ماضی نے جس عطا اللہ کو جنم دیا تھا۔ اپنے اور پائے نامراج نے  
 اسے اسی طرح روند ڈالا کہ شاید نصف صدی کے بعد دلوں سے اس کی یاد  
 محو ہو جائے۔ لیکن رات کے بعد دن طلوع ہوتا ہے یا جس طرح خزان کے  
 بعد بہار جنم لیتی ہے۔ بھولے ہوئے دلوں کو اسی طرح عطا اللہ کے کارنامے



آزادی وطن کے لئے اُن کی مساعی جمیدہ تبلیغ دین میں اُن کے مصائب کو  
اُجاگر کرنا پڑے گا۔ ورنہ زمانے کو اپنی تہی و آسنی پر تاحشر مگر رہے گا۔

## لاہور سنٹرل جیل

قویں اپنے راہنماؤں کی یادگاریں قائم کرتی ہیں زمانہ جن پر گرو و عباد  
طوال دیتا ہے۔ وہ انہیں تلاش کرنے میں کھوج جاتی ہیں لیکن عہدِ رواں کے نن اُساہی  
لاکھوں نے بنے بنائے نشان مٹا دیئے۔ لاہور سنٹرل جیل بھی ایک ایسا ہی  
نشان تھا۔ اس جیل کی ایک ایک اینٹ پر نظامی کے خلاف لڑنے والوں  
کے نام ثبت تھے۔ اس جیل کی ہر کوٹھڑی امیرانِ فرنگ سے واقف تھی۔  
اس جیل کے پھانسی کے تختے شہیدانِ وطن کے خون سے ہر صبح ناشتہ کرتے  
رہے ہیں۔ ان چشم دید گواہوں کو مٹانے میں وقت کے عجلانہ فیصلے نے  
بڑی جانبداری سے کام لیا ہے۔ کاش وہ حالات کا انتظار کرتا۔

شاہ جی کو اس جیل کی گورنارڈ میں رکھا گیا۔ یہ وارڈ سیاسی قیدیوں کے  
لئے مخصوص تھی۔ اس دور میں سیاسی قیدیوں کے لیے کوئی امتیازی کلاس متعین نہیں  
تھی تاہم دو قسم کے قیدیوں کو امتیاز حاصل تھا۔ اول جو انکم ٹیکس گزار تھے جو سرے  
سٹوڈنٹس لیگ میں شاہ جی پہلے سیاسی قیدی تھے جنہیں شہرت کی بنا پر کلاس دی گئی۔

## معافی کی درخواست

شاہ جی کو لاہور سنٹرل جیل میں آئے ہوئے دو ہفتے ہوئے تھے کہ



اچانک ایک دلو انہیں جیل کے دفتر میں بلا کر ان کے سامنے انگریزی میں لکھی ہوئی ایک درخواست پیش کی جس میں درج تھا کہ اگر اس دفعہ حکومت مجھے معاف کر دے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ میری کوئی حرکت ایسی نہیں ہوگی جس سے حکومت کو کسی قسم کی شکایت پیدا ہو۔

اس درخواست کے نتیجے میں کسی کا نام درج نہیں تھا اور نہ شخص پر کسی کا نام مل سکا۔ شاہ جی نے اس درخواست کا ترجمہ کر کے اسے سپرنٹنڈنٹ کے ماتھے سے لیا اور ہزار ٹکڑے کر کے اپنے پاؤں تلے روندنا اور تین دفعہ اس پر کھنوکا بچھرنے کی حالت میں واپس چلے گئے۔ اس واقعہ کے مختصر سے دنوں بعد شاہ جی کو میاںوالی ڈسٹرکٹ جیل میں تہہ پہلی کر دیا گیا۔ اس دور میں اور آج بھی میاںوالی جیل عادی مجرموں کے لئے مخصوص ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اور موسم گرمی کی پیش کی بنا پر یہ جیل پنجاب کا "کالا پانی" کہلاتی ہے۔ تزکیہ موالات اور تحریک خلافت کے قیدیوں کے لیے یہی جیل مناسب سمجھی گئی۔ چنانچہ ہندوستان بھر کے سیاسی رہنماؤں کو آہستہ آہستہ اسی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جن میں یہ نام قابل ذکر ہیں:

۱۔ مولانا محمد داؤد غزنوی ۲۔ مولانا احمد سعید دہلوی ۳۔ مولانا قاضی محمد پانی پتی ۴۔ صوفی محمد اقبال ۵۔ اختر علی خاں (زمیندار لاہور) ۶۔ عبدالحمید ساک داؤد پیر روزنامہ انقلاب لاہور ۷۔ مولانا عبدالقدوس چوڑھی (اے روپا) ۸۔ مولانا سعید حبیب داؤد پیر روزنامہ سیاست لاہور ۹۔ پنڈت نیکی رام شرمہ ۱۰۔ ڈاکٹر ستیہ پال ۱۱۔ لالہ نزلوک چند محروم ۱۲۔ ویش بندھو واس گپتا داؤد پیر روزنامہ تیج دہلی ۱۳۔ بابا گرو ت سنگھ ۱۴۔ سردار منگل سنگھ ۱۵۔ سردار



سر دول سنگھ کو لیشر (لاہور) ۱۶۔ بابا کھڑک سنگھ (سیالکوٹ) ۱۷۔ سوانی  
 شروہت (دہلی) ۱۸۔ غنشی احمد دین (امر تسر) ۱۹۔ خواجہ عبدالرحیم عاجز امر تسر  
 ۲۰۔ راجہ غلام قادر (وزیر آباد) یہ وہ لوگ ہیں جو آگے چل کر صحافت اور ملکی  
 سیاسیات میں غیر ملکی حکمرانوں کے باغی اور متحدہ ہندوستان کے رہنما بنے۔  
 جیل خانے کے شب و روز باہر کی دنیا سے مختلف ہوتے ہیں۔ گھربار  
 اور اولاد سے لائق ہو کر قیدی یہاں رہ کر اپنی دنیا آپ آباد کرتا ہے۔  
 خیالات میں پھینپنا اور جذبات میں جوانی لوٹ آتی ہے۔ اونچی دیواروں کے  
 سائے میں رہنے والے سیاسی قیدی بہار و خزاں کے موسم کو اپنے ماحول میں  
 آپ ڈھالتے ہیں۔ بلاشبہ میانوالی جیل کا ہر سیاسی قیدی اپنے اندر جوہر قابل کا  
 خزانہ لیے بیٹھا تھا۔ لیکن آزادی وطن کی پاداش میں برطانوی سامراج کا باغی قرار  
 دیئے جانے پر اس کا جسم قید تھا۔ تاہم روح کی اقامتگی اسی طرح آزاد تھی جس  
 کی سوچ اور فکر میں کوئی دیوار یا لوسہ کا دروازہ حائل نہیں تھا۔

اسیرانِ افرنگ جنہیں راجِ الوقت قانون نے اپنا دشمن قرار دے کر  
 تین تین برس، دو دو برس اور ایک ایک برس کنے لیے یہاں ڈال دیا تھا قفس  
 کی قلیوں میں بیٹھ کر شاخ گل کی بہاروں کے گیت الاپنے شروع کیے چنانچہ  
 مشاعرے، توالیاں، جلسے اور عملی بحثوں کا آغاز ہوا۔ اگر ان لوگوں کے وجود سے  
 جیل کے باہر فرنگی حکمران پریشان تھے تو جیل کے اندر حکام جیل اور دوسرے  
 قیدی عاجز اچکے تھے۔ آخر میانوالی ڈسٹرکٹ جیل کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر رام جی  
 داس اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ چوہدری فرید احمد کو اپنی سخت گیر پالیسی کو تبدیل کرنا

لے مولانا ظفر علی خاں کے چچا تھے۔



پڑا اور زباغیوں کا یہ گروہ اپنے ساتھ دوسرے قیدیوں کو بھی خراب کر دینا۔  
 شاہ جی ان ہنگامہ آرائیوں کے باوجود جیل میں بھی اپنے تبلیغی مشن سے  
 غافل نہیں رہے۔ راجہ غلام قادر، اختر علی شاہ، ہنسی احمد دین، خواجہ عبدالرحیم  
 حاجو نے قرآن کریم انہی دنوں شاہ جی سے پڑھا۔

## آزاد ہائی سکول کا خاتمہ

شاہ جی کی گرفتاری نے اگر گجرات کی سیاسی زندگی کا رخ تبدیل کیا تو آزاد  
 ہائی سکول کی حالت بھی اپنی ساری بہار ضائع کر بیٹھی حکومت نے فوراً سکول  
 کا نام اسلامیہ ہائی سکول رکھ کر اسے پنجاب یونیورسٹی کے تحت کر دیا۔ یہ سکول  
 آج بھی اسی نام سے چل رہا ہے لیکن اب اس کا جامعہ ملیہ یا شاہ جی سے کوئی  
 تعلق نہیں۔

## تحریک ترک موالات کا خاتمہ

ترک موالات اور خلافت کی مشترک تحریکات نے ہندوستان بھر کو  
 پُر امید کر دیا تھا کہ اب غیر ملکی حکمران یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ ہندوستان  
 سے باہر بھی چرچا تھا۔ حالات کی بوسونگھنے والے سیاست دان اور  
 خود انگریز بھی اپنے قدموں کے نشان گن رہے تھے۔ پرنس آف ویلز نے اپنا  
 دورہ ہندوستان ملتوی کر دیا تھا کہ صوبہ یوپی کے ضلع گوردکھ پور کے دیہاتی  
 عوام نے اپنے گاؤں چوراہاری کے پولیس ٹھانڈے پر حملہ کر کے اسے آگ



لگادی۔ جس میں پولیس کے سپاہی اور افسر جمل کر رہا کر ہو گئے۔ اس واقعے نے  
 گاندھی جی کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے ۵ فروری ۱۹۲۳ء کو تحریک ترک  
 موالات بلا کسی مشورہ کے بند کردی۔ تحریک کا بند ہونا تھا کہ سارا ہندوستان  
 گاندھی جی کے خلاف ہو گیا۔

۵ نومبر ۱۹۲۱ء کو جو آگ لگی تھی۔ ۵ فروری ۱۹۲۳ء کو جب یہ بھائی  
 گئی تو مغربی طاقتیں اپنی کامیابی پر مسکرائیں۔ ان کے بھجنے ہوئے چراغوں میں پھر  
 سے روشنی آگئی۔ وقت نے سخت کو مبارک باد دی۔ یونین جیک کی اڑائیں  
 نیشنل فنیک پر غالب آئیں۔

جیل خانوں میں سیاسی قیدیوں کے چہروں پر ہواٹھیلی اڑنے لگیں مقصد  
 کی ناکامی نے شارح شرکی پہاروں کو آگ لگادی۔ قفس کی تیلیاں پاؤں کی بو جھل  
 بیٹریاں بن گئیں لیکن عزم نے ہمت نہ ماری۔ ناکامیوں نے ارادوں کے آنسو  
 پونچھے تو آنکھیں چمک اٹھیں۔ دل اور زبان نے ہم آہنگ ہو کر کہا، ہم پھر لڑنے  
 کا عہد کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک سال چار ماہ کی جدوجہد آزادی ایک موٹے پ  
 آ کر رک گئی۔

## تحریکِ خلافت کا ستر

تو مملکت کی زندگی کا انحصار ہمیشہ ان کی اپنی ہمت پر رہا ہے۔ جو تو  
 اس دور میں پھر سبقتی ہیں زمانہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ ترک اقام  
 یورپ سے اگر اپنی زندگی کی بھیک مانگے تو شاید اس مرد بیمار کو بھیک سے



بھی مجزوم رکھا جاتا لیکن تلوار کی نوک سے حاصل کیا ہوا تڑکی "آج بھی زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔"

پہلی جنگ سمیت کراٹھادی قوموں نے اپنی نوآبادیات سے جو سلوک کیا اور پھر تڑکی کو مرد بیمار سمجھ کر قسطنطنیہ کے بازاروں میں حلیفہ المسلمین کے حرم کو رسوا کیا۔ اگر اس وقت مصطفیٰ کمال کی تلوار بے نیام ہو کر درہ و اتیل پر صاف سے نہ آتی تو شاید یورپ کا یہ مرد بیمار مدت سے دم توڑ چکا ہوتا۔ غازی عصمت انونو نے برطانوی وزیر اعظم لائیڈ سارج کو ٹھیک کہا تھا کہ جو فیصلے تلوار کی نوک سے نہیں کھسے جاتے ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

ترک اپنی تاریخ آزادی خون سے مرتب کر رہے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خون نے جوش مارا مسلمان مسلمان کی امداد کے لئے نکل آیا ہندوستان کا مسلمان غلامی کی حالت میں جو کر سکتا تھا، اس نے کیا۔ آخر ۱۹۴۷ء کو جزیرہ لوزان میں برطانیہ اور ترکیہ کے درمیان صلح کانفرنس ہوئی جس میں برطانیہ نے ترکوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس کے ساتھ ہی تحریک خلافت نے ہندوستان میں دم توڑ دیا۔

## تحریک شدھی

افراد، قومیں اور سلطنتیں ایک دوسرے کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ استقام کی آگ پہلے دلوں میں ملگتی ہے پھر انسانوں کو جلاتی اور عمارتوں کو خاک کا ڈھیر بناتی ہے۔ ہندوستان کی سیاسی تحریکات دم توڑ چکی تھیں۔ افغانستان سے انگریز



مطلبن تھا۔ روس کی اندرونی منہاجت اور بھی انگریز سیاستدانوں کے لیے مفید تھی۔ انگریزوں سے معاہدہ لوزان کے بعد کوئی مزید جھگڑا نہیں تھا۔ ہندوستان کے رہنماؤں میں انگریز سامراج کا مخالف عنصر ہنوز جیل خانوں میں تھا۔

انگریز دانشوروں کا ذہنی وقتی طور پر فارغ ہوا اور انہیں ہندوستان سے انتقام کی سوچ ہوئی۔ ماضی قریب میں جس ہندوستان نے ایوان برطانیہ میں آگ لگا دی تھی خلائی سے نجات کے لئے جس قوموں نے متحد ہو کر آزادی کی لڑائی لڑی، وہیں اب ان دوستوں کی لڑائی کا تماثر دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء کے وسط میں میاںوالی جیل سے سوامی شروہانند کو ان کی معیاد واپس لے کر کے دہلی والٹر سے ملاج میں لایا گیا۔ سوامی شروہانند کا اصل نام غنشی رام تھا۔ ایک مدت یہ پنجاب پولیس میں بطور تھا تیار ملازم رہ چکے تھے۔ دوسری طرف پنڈت مل موہی مالوی کو یہ شرف تھا کہ سرحد کا پٹھان ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔ اس نے سوامی شروہانند سے مل کر ایک ایسی فرقہ دارانہ تحریک کو پروا دی جس نے آگے چل کر خونخوار صورت حال پیدا کر دی۔

## پہلا ہندو مسلم فساد

یوں تو سارے ہندوستان کی فضا لگدر ہو چکی تھی۔ نگاہوں میں میں اور دلوں میں کدورت بیٹھ گئی۔ لیکن ستمبر ۱۹۲۲ء کو ملتان میں محرم کے موقع پر ہندو فساد نے سارے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ فساد جس مقام پر ہوا اس کا ایک طرف مسجد، دوسری طرف شہر اور تیسری طرف پولیس تھا جسے تعزیر محرم کی



سے شہر میں داخل ہو کر چوک بازار مسجد کے سامنے رکھا گیا۔ اچانک اس پر ایک اینٹ لگی۔ چونکہ تحریک شدھی کے باعث شہر کی فضا بیشتر ہی مسموم تھی لہذا بغیر تحقیق کے کہ اینٹ مندر سے آئی ہے یا تختہ کی طرف سے ماتم گھاروں نے تعزیر کی بے صورتی کے سلسلہ میں ہنگامہ کر دیا تیار ہی دوسری طرف سے کبھی مکمل تھی۔ مقامی ڈپٹی کمشنر مسٹر ایمرسن خود تختہ میں موجود تھا۔ یہ اینٹ خود اس نے پھینکی تھی دغیر سرکاری تحقیقات میں اس کی تصدیق ہو گئی تھی۔

غلامی میں صرف آزادی ہی سلب نہیں ہوتی بلکہ عقل انسانی بھی اپنی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور مذہب کی پاکیزگی غلامی کے گناہوں سے آلودہ ہو کر اپنا دامن و اعزاز کھینچتی ہے۔ غلام ہندوستان اپنا وقار تو کھو چکا تھا، لیکن فرقہ وارانہ قضایں کھو کر عقل و دانش سے بھی دور چلا گیا۔ آخر حکمران قوم کا جاؤ سر چڑھ کر رہا۔ نسیم سحر گاہی کا ہر جھونکا باد مسموم بن گیا۔ چین کا ایک ایک پتہ صیاد کا معاویہ بن کر لالہ و گل کی پتیاں بکھیرنے لگا۔

مقامی شہادت جو کبھی وہی جامعہ مسجد کے منبر پر ہندو مسلمان کو اتحاد کی دعوت دیتے تھے آج غلامی کی ریتیاں مضبوط کر رہے تھے۔

## جیل سے رہائی

پچھلے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا  
باشبان جب پودوں کی تخم ریزی اور پھر آبیاری کرتا ہے۔ تو ان کے

۱۹۳۵ء میں پنجاب کا گورنر ہوا اور مسجد شہید گنج گرانے میں اس کا پورا ہاتھ تھا۔



جوان ہونے تک میل و نہار کی محنت اُسے مجبور کرتی ہے کہ وہ روز و شب کی  
ستم ظریفیوں سے انہیں محفوظ رکھے۔ موسم کے نشیب و فراز بھی بھول آنے تک  
سدا رہتے ہیں۔ باغبان کی تمنائیں موسم سے بھی دست و گریبان ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے لوری پر روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں ویدہ و پید ا

۱۹۲۰ء میں ہندوستانی رہنماؤں نے جس بہار کی آرزو کے لیے لالہ وزیر

کو اپنا خون دیا تھا، نرگس کی رنگت مورچ مکھی کو بانٹ دی تھی اور خزاں سے

بہار چھین کر گل و گل ہیں کے رشتے کی نیواٹھائی تھی جب قفس کی تیلیاں ٹوٹیں

تو بہار ان سے روٹ چکی تھی شبنم کے آنسو ہچکیاں لے رہے تھے پھر بادِ نسیم

نے موت کی مہراب سے آنے والوں کا استقبال کیا۔ اس جھیانک منظر نے غلامی

کی عمر بڑھا دی۔ وقت نے غیر ملکی حکمرانوں کا ساتھ دیا اور حالات اس قدر

ناگفتہ بہ ہوئے کہ آس ٹوٹ گئی اور مقدر روکھ گیا۔ ایسے حالات میں شاہ جی

کھوٹی کے پانچ ماہ دے کر دو سال سات ماہ ایئر فرنگ رہ کر ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۲ء

کو میانوالی جیل سے رہا ہوئے۔ پنجابی کے مشہور شاعر محترم خواجہ عبدالرحیم عاجز

بھی شاہ جی کے ساتھ میانوالی جیل سے رہا ہوئے۔ انہی پنجابی تعلم کا ایک مہر و اسی

زمانے کی یاد ہے

واہ عاجز قسمت ویا ولیا

پکی کھرتے ہو گیا دلہیا

پھڑویاں پھڑویاں چڑیاں توں

توں ہنوں باز گوا لیا



رانی کے بعد شاہ جی امرتسر میں حملہ کوچہ عارف ڈار چوک فرید میں رہائش  
 پذیر ہوئے۔ مالک مکان بابا رحیم خاں کو شاہ جی سے ولی عقیدت تھی۔ بہت  
 دیر شاہ جی اس مکان میں رہے مالک مکان تماموں کی طرح سلوک کرتا رہا۔  
 ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۳ء کے حالات میں نمایاں فرق اچھا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں  
 جب شاہ جی جیل گئے تو ہندوستان کے عوام انگریزوں کے خلاف بغاوت کی  
 آگ کو ہوادے رہے تھے اور جب واپس آئے تو وہی عوام آپس کی آگ میں  
 جیل رہے تھے۔ ہندو عہد سبھا اور گریہ سماج کے اختراک نے شدھی و سنگٹوں کی  
 تحریک کو ایسی ہوادی کہ سارے نقشے ہی مٹ گئے۔

## شدھی کا عملی پہلو

ضلع آگرہ کے ملکارہ نامی گاؤں کے راجپوت مذہبیا مسلمان تھے لیکن  
 رسم و رواج اور شکل و صورت میں ہندو نظر آتے تھے۔ ایسے مسلمان کو ہندو بنا  
 لینا کوئی دشوار نہیں تھا۔ چنانچہ شدھی کے بانیوں نے اس گاؤں کو اپنا مرکز بنالیا  
 مسلمان رہنما ان دنوں عجیب الجھاؤ میں تھے۔ وہ اپنی شہرت جو انہیں غیر مسلموں  
 میں حاصل تھی ضائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف شدھی کی تحریک  
 کو انگریزوں کی سازش سمجھ رہے تھے۔ ان دو گونہ مشکلات میں پھنسے ہوئے مسلمان  
 رہنماؤں کے دو حصے ہو گئے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کی  
 پارٹی گوشت تنہائی میں چلے گئے۔ پنجاب میں شاہ جی بڑا کٹر سیف الدین کیلوا  
 میر غلام بھیک بیڑنگ اور مولانا ظفر علی خاں الگ الگ شدھی کا مقابلہ کرتے رہے



موضع نکارہ کے راجپوت بھی الی و نون عجیب الجھپوں میں تھے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا آپس کا کردار انہیں مطمئن نہ کر سکا۔ لیکن ہندوؤں کی دولت قریباً بیس ہزار روپے توں کو ہندو بنانے میں کامیاب ہو گئی۔

۹ مارچ ۱۰ ستمبر ۱۹۲۲ء کی وہ میانی رات کو کوٹاٹ میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ یہ بھائی اور دوسرے شہروں میں فساد کی حد سے باز گشت تھی جس نے یہاں رہنماؤں کو پریشان کر دیا۔ مہاتما گاندھی جو الی و نون وہلی میں مولینا محمد علی جوہر کے ہاں مہمان تھے، اکیس دن کے مرن برت کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مولانا محمد علی جوہر کے مشورے سے ۲۶ ستمبر ۱۹۲۲ء کو اتحاد کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔

بگڑے ہوئے تھوڑا اور بدلی ہوئی نگاہوں نے دل و دماغ کے درمیان کانٹے ہی کانٹے بچھا دیئے تھے جس سے اتحاد کا وامن اُلجھتا ہی چلا گیا۔ گاندھی جی نے مار ستمبر کو اپنا برت شروع کیا۔ یہ برت ہندوؤں کے طرز عمل کے خلاف بطور احتجاج تھا۔

۲۶ ستمبر کی بوزہ اتحاد کانفرنس میں دوسرے رہنماؤں کے ساتھ شاہ جی بھی شریک ہوئے۔ دو دن کی بحث کے باوجود تمام رہنما بغیر کسی فیصلہ پر پہنچے وہلی سے چلے گئے مگر گاندھی جی نے اپنا برت دراکتوبر تک جاری رکھا۔ شاہ جی ان حالات اور واقعات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے بغیر کسی مشورے کے ملک کے موجودہ بگاڑ کی ساری ذمہ داری انگریز حکمرانوں کے سر ڈال دی اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر سامنے اُکھڑے ہوئے اور اپنی



شہلہ بیانی سے سارے ہندوستان کو اس میں متطہر سے آگاہ کیا۔  
 شہزادہ شہنشاہ کی اسپانک دہائی، پیدت مالوی کا پٹھانوں کے خوف  
 سے ہنگامہ، ملتان کا فساد، یہ ایسی چیزیں تھیں کہ عوام انہیں سن کر اپنی حرکتوں پر  
 شرمندہ ہوئے۔ برطانوی حکومت کو شاہ جی نے ایسا ننگا کیا کہ جب اس سے  
 کوئی جواب بن نہ آیا تو جنوری ۱۹۲۵ء میں شاہ جی کو دفعہ ۱۰۸ کے تحت گرفتار  
 کر لیا گیا۔ یہ مقدمہ دہلی کی ایک تقریر پر چلایا گیا۔ اس میں مسٹر آصف علی وکیل  
 تھے۔ دوران مقدمہ شاہ جی نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا اور مقدمہ  
 میں بھی کوئی دلچسپی نہ لی۔ دو ماہ کی مسلسل کارروائی کے بعد مسٹر عبدالصمد کی عدالت  
 سے شاہ جی کو چھ ماہ قید بامشقت یا پانچ سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔  
 جرمانہ کی یہ رقم اہل محلہ نے ادا کر دی اور شاہ جی رہا کر دیئے گئے۔  
 دہائی کے بعد گھراٹے تو جرمانے کی ادائیگی پر سخت ناراض ہوئے رکھی دن  
 محلہ کے کسی دوست سے علیک سلیک نہیں کی۔ آخر انہوں نے ایک جگہ جمع ہو  
 کر شاہ جی سے معافی مانگی۔ شاہ جی کو گلہ تھا کہ آپ نے حلال کی کھائی فرنگی  
 خزانے میں کیوں دی۔ ان دنوں شاہ جی کٹرہ مہاسنگھ کو سپر زنگریزاں میں میاں  
 محمد شریف ٹھیکیدار کے مکان میں رہتے تھے۔

بہار کے دنوں میں بھولوں سے لگاؤ مشکل نہیں ہوتا لیکن خزاں کے موسم  
 میں کانٹوں سے گھڑے کہ منزل کو حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے۔ شاہ جی پہل سے رہا  
 ہوئے تو ہندوستان گیر شہرت نے ان کے قدم لیے۔ زمین کے ذرات آسمان  
 کے ستاروں کی طرح ان کے پاؤں چومنے لگے۔ محبت میں لگا ہوں کے آنسو



پھولوں کی طرح نچھاور ہوئے۔ شاہ جی نے یہ گراں قدر دولت اپنے ہاتھوں  
 ضائع کر دی۔ وقت کا یہی تعاضل تھا۔ اُدھے ہوئے طوفانوں اور تیز رو  
 آندھیوں کے درمیان شاہ جی نمناؤں کا چراغ لے کر نکلے تھے اور جب  
 کہ گھر آئے تو یہ چراغ ہنوز روشن تھا۔

شدھی شخصیات کی تحریکات نے خلافت اور کانگریس کے تمام رہنماؤں  
 چاروں میں لطیفیت کو گمشدہ عافیت میں چھپا لیا۔ ہندو رہنما مسلمانوں میں اور مسلمان  
 ہندوؤں میں اپنی عزت و وقار کا جواز دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ  
 رانہ لائے درون پر وہ اُن ہاتھوں کو جھانک رہے تھے جنہوں نے فرقہ و  
 آگ روشن کی تھی لیکن یہ پائیں گنگ اور لاکھ سمٹ کر رہ گئے تھے۔ ایسے  
 شاہ جی نے انگریز اور ہندو دونوں کے خلاف بڑے استقلال کے ساتھ  
 کام جاری رکھا۔ ۱۹۲۳ء میں جیل سے رہا ہو کر ۱۹۲۵ء کے وسط تک تحریک  
 شدھی و سنگھٹن کے خلاف شاہ جی نے جس جوش ایمانی سے اسلام اور مسلمانوں  
 کی وکالت کی یہ وقت کا عظیم کارنامہ ہے۔

حالانکہ شدھی کوئی تحریک نہیں تھی لیکن غیر ملکی حکمرانوں کی ضرورت سے  
 اسے ایسے رانچوں میں ڈھالی دیا تھا کہ اگر یہ سا پچھان وقت توڑ نہ دیتے  
 جاتے تو ممکن تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بڑھی ہوئی تعداد کے راستے  
 میں کفر حائل ہو جاتا۔ ہندو مسلمان رہنما جو حال ہی میں جیلوں سے رہا ہو کر  
 اس قسم کی تحریک سے وابستگی پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر  
 گاندھی، ڈاکٹر انصاری، پٹیل موتی لال نہرو ایسے لوگ وہی ہیں جو ہندو



کی حرکات کے خلاف تجویزیں تو کرتے رہے لیکن باوجود محکم کے مختصر سے ان کے  
 نام کو اس قدر اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنی صحیفوں بکیرنے کے لئے صحن  
 چمن میں قدم رکھتے۔ لیکن شاہ جی نے اپنی شہرت کو شدھی کے مقابلے کا کام کر کے  
 نتائج کر لیا۔ پنجاب کے مسلم اخبارات میں سے صرف ڈیڑھ لاکھ نے اس تحریک میں  
 شاہ جی کی پوری معاونت کی۔

فرقہ وارانہ تحریکات نے ہندوستان کا متحدہ قومیت کا تصور نہ صرف  
 دلوں سے بلکہ ذہنوں سے بھی زائل کر دیا۔ ہندو مسلم اتحاد کی چلتی ہوئی گاڑی ایسی  
 جگہ آگے چھری کہ غیر ملکی حکمرانوں کو گھٹی کے چراغ جلانے کا موقع ملا۔ اس کی تمام  
 ذمہ داری ہندو قوم پر ڈالنا انصاف سے بغاوت کے مترادف ہوگا اور جی  
 غیر مسلم راہنماؤں نے انگریزوں کو خوش کرنے اور غلامی کی سمر پڑھانے کی سعی کی  
 انہیں ہندو قوم سے الگ کرنا بھی اپنے کو فریب دینا ہے۔ تاہم سوامی  
 شریو صاحب، پنڈت مدن موہن مالوی اور پیٹیاپ کے بہادر شی لالہ لاکھ پتہ  
 نے ۱۹۲۲ء میں شدھی و سنگھٹن کی پرورش کر کے متحدہ قومیت سے فائدہ لیا۔  
 اگر ایسی ذہنی تحریکات کے مقابلے میں شاہ جی کی پرورش تقریریں اور مولانا  
 مظفر علی خاں کی ہنگامی تقریریں نہ ہوتیں تو من حیث القوم مسلمانوں سمیت خسارے  
 میں رہتے۔

## تحریکِ قبا

۱۹۲۵ء سے ایک سال پیشتر جب کہ ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی



دہنما انگریز اور ہندو کے پیدا کردہ طور و اطوار میں اچھے ہوئے تھے، برطانوی حکومت نے ایک نیا کھیل شروع کیا۔

ہندوستان کے تمام مسلمان والی عرب سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے مکہ اور مدینہ میں بڑے بڑے لوگوں کے مزارات سے عمارات (تہے) گرا کر انہیں زمین سے ہمواد کر دیا تھا۔

شریف مکہ کے زوال کے بعد جب نجدیوں نے اس پاک سرزمین پر قدم جمائے تو ترکوں کی دینی ہوئی مذہبی آزادی کے پیش نظر عوام نے اپنی عقیدت کی بنیاد پر بڑے بڑے مزارات کو دینی اور دنیوی ضرورتوں کا حاجت روا جان کر انہیں مسجدوں کی آماج گاہ بنالیا تھا لیکن نئے حکمران سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے اپنے عقیدہ کی بنیاد پر ان تمام حرکات کو خلاف دین اور بدعت سمجھ کر مزارات سے قبضہ کرانے کا حکم دے دیا۔ اس کی صدائے بازگشت جب ہندوستان کے ساحل سے لگائی تو مذہب سے دیوانہ مسلمان آپس سے باہر ہو گیا۔

ہوا ساز گاز نہ ہو تو موسم کا جین بھی درست نہیں رہتا۔ بادل اٹھتے ہیں تو پھاگنی کے دنوں میں بھی سداون بھاؤوں کا سا گمان ہوتا ہے۔ رہنمایان ملک و نکتہ تین تین برس کی مزارکات کو اعلیٰ جلی خاقوں سے رہا ہوئے ہی تھے کہ برطانوی سامراج نے ان کے لئے ایسی فضا پیدا کر دی کہ وہ دل و دماغ کے تصادم میں اچھ گئے۔ شدھی و گھٹھی کے ہنگامے ہنوز چھاری تھے کہ برطانوی سیاستدانوں نے مکہ اور مدینہ کی حکومت کا واسطہ دے کر مسلمانوں کو سلطان ابن سعود کے خلاف بغاوت پر ابھارا اور ہندو سربراہ دار نے مسلمانوں کا رخ بدلا ہوا دیکھ



کر فائدہ اٹھایا لیکن ویو بند درمہ فکر کے علماء نے اُس کے بڑھ کر سلطان عبدالعزیز  
کی حمایت کی۔ چنانچہ شاہ جی نے ان دنوں اپنا موقف واضح کرتے ہوئے کہا۔

ہمیں سنی عقیدہ مسلمان ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ نفع و نقصان

کی وارث صرف اللہ کی ذات ہے۔ حالات کا کعبہ بھی اسی

کے اختیار میں ہے۔ اولاد و پیمانہ و پیمانہ دے کر چھین لیا اسی

کو زیبا ہے۔

اگر مکہ اور مدینہ کے مقدس مزارات پر جا کر مسلمان سجدہ کرتا

تھا، ان مزارات سے مرادوں مانگتا تھا یا انہیں ساجدت و انخیال

کرتا تھا تو میری رائے ہے کہ سلطان عبدالعزیز نے ان قبوتوں

کو گرا کر ان میں آخری غیند سونے والوں کی رُوح کو آرام پہنچایا

ہے۔ یہی وہ نیک لوگ تھے جنہوں نے لات و پہل اور عترت

کی پوجا سے بنی نوح انسان کو منع کر کے صرف اللہ تعالیٰ کی

ذات پر تکیہ کرنے کا درس دیا تھا۔ اگر آج انہی کے مزارات

کی پرستش ہونے لگ جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے مشی

سے یا مقصد سے انحراف کرنے کے تو سجد باری تعالیٰ سے بغاوت

کنا ہے۔

شاہ جی نے اس طرز استدلال پر سارے ہندوستان میں تقریریں کیں تو ان

کریم، حدیث نبوی اور اپنی قوتِ بیانی سے کروڑوں انسانوں کو اسی عقیدے

کا درس دیا۔



پنجاب کے پیر اہل عزام نے بدین و بہر شاہ جی پر "وہابی" ہونے کے علاوہ دوسرے مختلف اقسام پر فتوے لگائے۔ حضرت پیر جماعت علی شاہ کا فتویٰ اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ مولانا سیّد حبیب اور ان کا اخبار روز نامہ سیاست پیروں کے مؤید تھے۔ دوسری طرف مولانا ظفر علی خاں اور زین الدار شاہ جی کے مہنوا تھے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، جمعیت العلماء ہند، چودھری افضل حسنی، مولانا عبداللہ قصوری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے بھی سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی حمایت میں شاہ جی کا ساتھ دیا۔

### ایک سوال

اسی تحریک کے دوران لاہور میں ایک اجتماع ہوا جس میں مجمع سے ایک سوال کیا گیا۔

"آپ کے نزدیک اگر قبر پر قبہ بنانا بدعت ہے تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک پر گنبد خضرا سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

### جواب

اس سوال پر سارے مجمع میں ایک ارتعاش پیدا ہوا۔ دوستوں کی پریشانی بڑھی۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ مخالفین نے تالیوں سے اس سوال کا استقبال کیا۔ لیکن شاہ جی کو قدرت نے ذہن راسخا کیا تھا۔ سوال پر ذرا مسکرائے اور ارتعاش فرمایا۔

"اگر ان معماروں نے عزت کر لی ہے جنہوں نے نبی کریم کی



آخری آرام گاہ سے بھی اُونچے ہو کر اُس پر قبۃ تعمیر کیا ہے تو  
 پھر میری رائے ہے کہ گنبد خنجراد کے مقابلے میں دوسرا کوئی  
 گنبد تعمیر نہیں کرنا چاہئے۔ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم  
 کی قیام ہوتی ہے۔

شاہ جی کا یہ جواب سن کر صحیح نعروں سے گونج اٹھا۔

علی برادران کا ردِ عافی تعلق مولانا عبدالباری فرنگی محل (مکھنوا) سے تھا اور  
 وہ تحریک قبۃ میں سلطان ابن سعود سے اختلاف رکھتے تھے حالانکہ اُن کی جماعت  
 "مخادمِ حرمین" سے حوام کو توقع تھی کہ وہ تحریک قبۃ کی حمایت کریں گے لیکن اُن کے  
 ساتھ ہی علی برادران بھی اس تحریک سے تعاون نہ کر سکے تاہم شاہ جی سے متعلق  
 انہوں نے اپنے اخبار "ہمدرد" میں مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا:۔

"بھائی! میں تمہاری تقریر سے بہت خوش ہوا مگر اپنا فرض سمجھتا  
 ہوں کہ جو رنج ہوا اس کا بھی ذکر کروں۔ تم نے سامعین کو بالکل  
 مسحور کر دیا تھا اور اگر اس کے بعد تم اُن سے کوئی غلط کام بھی  
 کرانا چاہتے تو وہ تمہاری تقریر کے کیف سے اس قدر بے خود  
 تھے کہ فوراً کر بیٹھے۔ جو قدرت تم کو اپنی زبان پر ہے وہ خدا واد  
 ہے اور خدا کی ایک بڑی نعمت ہے مگر ایک بڑی خطرناک  
 نعمت ہے۔"

تمہاری مقبولیت بہت بڑھ گئی ہے جب تک تم اسے  
 حق کی راہ میں استعمال کرو گے غلامِ دوزخ نہ بنو گے لیکن اگر



کبھی یہ باطل کی راہ میں استعمال کی گئی تو ہزاروں بندگاہیں خدا کو  
بھی گمراہ کرنے کے لیے کافی ہوگی۔

میرا منصب نصیحت کرنے کا نہیں مگر تم سے جو محبت مجھے  
اور مجھ سے تم کو ہے اس کی بنا پر اس قدر کہنے کی جرأت کرتا  
ہوں کہ لوگوں کو مسحور کرنا اچھا نہیں۔ مسخر کاری میں نہ ساحر کا وہی  
کے لیے نہ مسحوروں کے لیے فلاح ہے۔ ضرورت اس کی ہے  
کہ ہر مسئلے کے دونوں پہلو سامعین کے سامنے پیش کر دو اور ان  
ہاں سے اس مسئلہ کا اصل اور فیصلہ کراؤ۔ اس طرح تم عوام کی قوت  
فیصلہ کو ترقی دے سکو گے ورنہ کالانعام مشہور ہیں۔ آج تم  
نے انہیں مسحور کر دیا تو کل اسی چوب زبانی اور ظرافت کے  
باعث ان پر کسی دوسرے کا جادو بھی چل سکے گا اور اسی طرح  
حق و باطل کی تمیز ناقیامت نہ اٹھے گی۔ کبھی تمہارے ساتھ  
ہوگی اور کبھی تمہارے مخالفین کے۔ آج تمہیں تخت پر بٹھائیں گے  
کل تمہیں اتار کر کسی دوسرے کو سربراہ بنا دیں گے۔

شدھی اور سنگھٹن کے دوران اگرچہ قوتوں کی تحریک بڑی خطرناک تھی، اس  
تحریک نے مسلمانوں کو آپس میں اُلجھا دیا تھا لیکن چند ماہ کی ہمت اور اتحاد وہی  
نے برطانیہ اور اس کی ایجنٹ طاقتوں کو شکست دینے دی۔

### مرزا بیت کے خلاف فتویٰ

غیر ملکی دور اقتدار کو اپنی زندگی کے لیے جن افراد یا جماعتوں کا سہارا



لینا پڑا ان میں آریہ سماج اور قادیانی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء کے دوران ہندو مسلم کشیدگی نے متحدہ فوقیت کا جو حلیہ بگاڑا۔ یورپین سیاست گزشتہ نے اس بساط پر کس کس طرح اور کون کون سے مہرے آگے بڑھائے گذشتہ اوراق ان واقعات کی گواہی دے رہے ہیں لیکن ہنوز اس مقدمے کا ایک اہم گواہ باقی ہے جس کے بغیر یہ روٹا دانا مکمل رہے گی اور شاہ جی کی جدوجہد میں ان کے اس کردار کی تعمیر بھی اور صوری سمجھی جائے گی۔

آریہ سماج جب شدھی کی تحریک میں سرگرم تھے اور مسلمان ان کا دفاع کر رہے تھے انہی دنوں مرزا یوں نے بعض ایسی کتب شائع کیں جن میں آریہ سماج کے بانی سوامی ویاتند کی زندگی پر ایسے جملے کیے جس کے جواب میں آریہ سماج نے قادیانیوں کی بجائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو ہدف تنقید بنایا۔ آریہ سماج اور قادیانیوں کی ان مقابلے کی عبارتوں نے طرفین میں جھگڑا پر تیل چھڑکا اور حالات بد سے بدتر ہو گئے۔

آخر ہندوستان کے علماء نے حکومت سے آریہ سماج کی کتب کی حتمی کا مطالبہ کیا تو ساتھ ہی مرزا یوں کی کتب کا از سر نو مطالعہ کے بعد حسب ذیل

فتویٰ دیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے علی الاعلان دعویٰ نبوت کیا اور دیگر انبیاء کرام کی توہین کی ہے۔ نیز بعض کو گالیاں دیں اور بعض ایسے دعوے کیے کہ جن کی بنا پر وہ خود کافر ہو کہ مرا اور اسی طرح اس کے ماننے والے بھی کافر اور مرتد ہیں۔ ابتداً ان دمرزا یوں



سے ہر قسم کا قطع تعلق کیا جائے۔ خواہ وہ دنیوی ہو یا دینی۔  
امرتسرہ

رسالہ "انصاف" ایڈیٹر مولانا محمد اود

پسر مولانا نور احمد

۱۹۲۵ء

ماں پر شاہ جی کے علاوہ اٹھ صافی سو سے زائد علماء نے دستخط کیے جن میں علمائے  
فرنگی محل، علمائے دیوبند، علمائے بریلی قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے بعد یہ دوسرا  
موقع تھا کہ شاہ جی نے مرزائیت کے خلاف اپنے دلی احساسات کھلم کھلا اُجاگر  
کر کے مرزائیوں کو بھی اپنے دشمنوں کی صف میں شامل کر لیا۔ ✓

## پنجاب کے پیروں سے ٹکڑے

پنجاب کے بعض روحانی پیشواؤں کی گزشتہ تاریخ اس قدر میلی ہے کہ اس  
کے گندے چھینٹے مذہب کی پاک اور صاف چادر کو بھی داغدار کر گئے۔ بزرگان  
دین کے مزارات پر بیٹھ کر ان مہنتوں نے نہ صرف اسلام کی متعین راہوں کے  
درمیان گڑھے کھودے بلکہ دنیوی جاہ و شہرت کے لیے اپنے درباروں کی  
رواق بھی کفر سے مستعار لی۔ اپنے طرہ و شمار کی جوانی تڑکوں کے خون سے قائم  
رکھی۔ اس کے پیچ و خم میں عرب کے یتیم اور معصوم بچوں کی آہ و بکا زینت بنی ان  
کی دعائیں اور تعویذ ہمیشہ کفر کے ساتھ رہے۔

منقحانہ مقدسہ کی بربادی، جزیرۃ العرب پر برطانیہ کا بالواسطہ قبضہ اور  
تخلات اسلامیہ کی تباہی کے بعد ۱۹۲۸ء میں جب انگریزوں کو فتح ہوئی اور وہ بعد  
کی گلیوں اور قسطنطنیہ کے بازاروں میں محرقہس تھا ان دنوں پنجاب کے پیران عظام



## تحرکِ نشاتمِ رسول

غلامی کا ہر سال جدوجہد آزادی کے لیے مصائب و آلام کے کوہ گراں  
 لے کر آیا۔ ان دنوں ہر صبح طلوع ہونے والا آفتاب اپنی کرنوں میں محبانِ وطن کے  
 لیے ایسے فیصلے لے کر طلوع ہوتا کہ جن میں دارورکن کے فیصلے جلی طور پر رقم ہوتے  
 لیکن ۱۹۲۶ء کا سورج صبح انداز سے ابھرا کہ غیر ملکی استعمار اگر ایک طرف  
 آتشِ اسلحہ سے لیس تھا تو دوسری طرف سیاسی بساط کے مہرے اس رخ پر چلائے  
 کہ ان کی ہر سچاں شہ کو مات دیتی ہوئی پہلی گئی۔

سائنس کمیشن میں ہندوستان کی عدم شمولیت، لارڈ برکن ہیڈ کا چیلنج اور ہندوستان  
 رہنماؤں کے فیصلے ہنوز متضاد تھے کہ آریہ سماج اور مرزاہٹیوں کی حقیقتیں نے ہندوستان  
 میں تحریکِ نشاتمِ رسول کو جنم دیا۔

۱۸۷۵ء میں پنڈت دیانند کی کتاب "ستیا رتھ پر کاش" پہلی بار بنارس میں  
 شائع ہوئی۔ قادیانی مذہب کے بانی مرزا غلام احمد نے "ستیا رتھ پر کاش" کے شائع  
 ہوتے ہی کتاب ہذا کے مصنف اور دوسرے ہندوؤں کو چیلنج کیا کہ جو کتاب میں  
 (مرزا غلام احمد) مستقبل قریب میں لکھنے والا ہوں اگر ہندو اور سوامی دیانند مجھے  
 اس کا جواب دیں تو میں انہیں دس ہزار روپیہ انعام دوں گا۔ اس کے بعد  
 مرزا غلام احمد کی کتاب "براہمن احمدیہ" کا سلسلہ شروع ہوا جس میں ہندو و صہرم، وید،  
 آریہ سماج، پنڈت دیانند پر اعتراضات و الزامات تراشے گئے۔

اکتوبر ۱۸۸۲ء میں پنڈت دیانند کی موت واقع ہوئی اور ۱۸۸۴ء میں براہمن



احمدیہ کی چوتھی جلد شائع ہوئی۔ اس میں پنڈت دیانند کی موت پر اس کے خلاف زور قلم کا مظاہرہ کیا گیا۔ آخر اسی سال ستیارتھ پورکاش کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اضافی طور پر جن دو ابواب کو شامل اشاعت کیا، ان میں داعی اسلام حضور بنیام انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر براہ راست حملے کیے گئے جنہیں مسلمان برائت نہ کر سکا اور کتاب ہذا کے خلاف ہندو نشان بھر میں احتجاجی مظاہرے اور جلسے ہوئے نیز حکومت سے اس کتاب کی ضبطی کا مطالبہ کیا گیا۔

ابھی دنوں قاسم علی احمدی (مرزائی) کی کتاب "انیسویں صدی کا ہمارا شی دیانند" شائع ہوئی، جس میں پنڈت دیانند کو ہدف تنقید بنایا گیا تھا۔ اس کتاب کے بازار میں آتے ہی ہندو مسلمان پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے اکھڑے ہوئے۔ قاسم علی احمدی کے جواب میں آر بی سماجی لیڈر پنڈت چمپا دتی ایم، اے پروفیسر ڈی اے وی کالج لاہور نے (نور بالہ) رنگیلار رسول ایسی رسوائے عالم کتاب لکھی۔

یہ سارا تماشہ ان دنوں ہوا جب لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند کا چینج قبول کرنے ہوئے رہنما بیان ہند نے سامن کمیشن کے پائیکاٹ نیز باہم مل بیٹھنے کی تجویزیں پاس کی تھیں۔

ان واقعات کے یہاں پہنچنے تک ۱۹۲۷ء کا سال اپنے سفر کی ایک تنہائی منزل طے کر چکا تھا۔ لیکن آر بی سماجی ہندو اور مرزائیوں کی باہم تلخ نوائی نیز ان کی تشریحی جنگ نے ہندو نشان کے سنبھلنے ہوئے حالات کو از سر نو طے دیا گوئدھی پنکھٹن کی بادِ سموم کے باعث صحن چین کی ہر روش اپنی نگاہوں کے



ڈورے عمرخ کیے بیٹھی تھی تاہم احساس ہو رہا تھا کہ شنبہ کے آسنوار بار  
 سج گا ہی کے معائنے سے فضاؤں میں انقلاب رونما ہو گا اور صیاد کے ظلم و  
 جور کی بھلیوں سے جلتے ہوئے آشیانوں کو پھر سے تنکے جمع کرنے کا موقع ملے گا  
 مگر بکھرے ہوئے زہرنے دریا کے ہر قطرے کو مسموم کر دیا۔

## شاتمِ رسول واجبِ قتل ہے

3 اس مسموم فضا میں امر لستر کے ایک ہندی رسالہ "ورت مان" نے  
 بھی شاتمِ الانبیاء علیہ السلام کی ذات گرامی پر کیچڑ اچھا لاجسے راج الوقت قانون  
 نے چھ ماہ کی سزا دی لیکن (غزوہ باللہ) کتاب "نگینا رسول" نے حالات کو  
 بد سے بدتر کر دیا۔ علمائے دین کی توجہ جب کتاب ہذا کی طرف ہوئی تو جمعیتہ العما  
 ہندی نے شاتمِ رسول کو واجب القتل قرار دیا۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی  
 عبدالعزیز نامی شخص نے کتاب ہذا کے ناشر ہاشمہ راجپال پر، جس نے کہ  
 مصنف کی ذمہ داری بھی خود قبول کر لی تھی، لاہور میں قاتلانہ حملہ کیا۔ جس سے  
 راج پال زخمی ہوا اور حملہ آور کو چودہ سال کی سزا ہوئی۔

اس کے بعد خدائے بخش نامی (المعروف اکو جیا) نے حملہ کیا، مگر یہ وار  
 بھی جان لیوا ثابت نہ ہوا۔ خدائے بخش کو چھ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔  
 ہندوستان کے مسلمانوں نے حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ راج پال کو  
 گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ آخر مسلسل قاتلانہ حملوں اور مسلمانوں کے  
 اضطراب کے ردعمل پر حکومت نے ہاشمہ راج پال کو گرفتار کر لیا۔ عدالت



نے تین سال قید اور جرمانے کی سزا دی لیکن سیشن جج نے جرمانہ معاف کر دیا اور سزا بحال رکھی۔ ٹائی کورٹ میں اپیل پر جسٹس کنور ولیمپنگھ (عیسائی) نے راجپال کو بری کر دیا۔ اس فیصلے پر لاہور کے انگریزی روزنامہ "مسلم آؤٹ لک" نے تبصرہ کیا تو اسے توہین عدالت پر سزا ہوئی۔ جسٹس کنور ولیمپنگھ کے اس رویے پر عوام کا احتجاج اس قدر عام ہوا کہ حکومت کو عدالت عالیہ کی پوزیشن محفوظ کرنا مشکل ہو گئی۔

## شاہ جی کا موقف

۴ اور ۵ جولائی ۱۹۲۶ء کی درمیانی رات کو مسلمانان لاہور کی طرف سے وہلی دروازہ کے باغ میں ایک جلسے کا اعلان کیا گیا، جس میں شاہ جی، مولانا احمد سعید، مولانا مصطفیٰ کفایت اللہ، چودھری افضل حق، خواجہ عبدالرحمن غازی نے تقریریں کرنی لگیں۔ لیکن اسی روز لاہور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر اوگلوئی نے دفعہ ۱۴۴ لگا کر جلسے کو ممنوع قرار دے دیا۔ مگر شاہ جی کی تجویز پر یہ جلسہ مسیحا عبدالرحیم کے احاطہ میں منعقد کیا گیا (یہ احاطہ موجودہ سزا حضرت شاہ محمد عوث بیرون وہلی دروازہ کے بالمقابل واقع ہے)، اس وسیع احاطہ میں ہزاروں لوگ جمع ہو گئے اور جلسے کی صدارت چودھری افضل حق نے کی۔ فوج اور پولیس کے علاوہ مسٹر اوگلوئی ذاتی طور پر بھی احاطہ کے باہر موجود تھے اور اندر آ کر اعلان کیا کہ

"دفعہ ۱۴۴ کے باعث یہ مجمع خلاف قانون ہے۔ آپ لوگ پانچ منٹ



کے اندر یہاں سے چلے جائیں ورنہ مجھے گولی چلانے کا حکم دینا پڑے گا۔  
 ڈپٹی کمشنر کے اس اعلان پر خواجہ عبدالرحمن غازی نے ڈپٹی کمشنر کو انگریزی

میں کہا،

”ہم اس قانون کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہیں۔ جو قانون ہمیں ناموس  
 پیغمبر کی حفاظت کی ضمانت نہیں دیتا۔ تم جو سچا ہو کر وہم یہ جلسہ کریں گے۔“  
 اس کے بعد شاہ جی نے تقریر کرتے ہوئے کہا،

”آج ہم سب فخر رسل صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس کو برقرار رکھنے  
 کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ بنی نوع انسان کو عزت بخشنے والے کی  
 عزت خطرے میں ہے۔ آج اس جلیل القدر ہستی کا ناموس  
 معرض خطر میں ہے جس کی دی ہوئی عزت پر تمام موجودات کو  
 ناز ہے۔“

آج مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب  
 کے دروازے پر ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور  
 ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا آئیں اور فرمایا کہ  
 ہم تمہاری مائیں ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کفار نے ہمیں گالیاں  
 دی ہیں؟ — ارے دیکھو تو! ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی  
 اللہ عنہا دروازے پر تو کھڑی تھیں؟“

یہ سن کر حاضرین میں کھرام مچ گیا اور مسلمان ڈھاریں مار مار کر رونے لگے۔  
 شاہ جی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا،



”تمہاری محبت کا تو یہ عالم ہے کہ عام حالتوں میں کٹ مرتے ہو،  
 لیکن کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آج سبز گنبد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
 وسلم ٹپ رہے ہیں اور خدیجہ اور عائشہ پریشان ہیں۔ بتاؤ!  
 تمہارے دلوں میں اُتھات المومنین کی کیا وقعت ہے؟ آج  
 اُم المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے اپنے سخی کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ وہی  
 جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سید و عالم  
 صلی اللہ علیہ وسلم کو رحلت کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔  
 اگر تم خدیجہ اور عائشہ رضی اللہ عنہما کی ناموس کی خاطر جانیں دے دو  
 تو کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے۔ یاد رکھو! یہ موت آئے گی، تو  
 پیام حیات لے کر آئے گی۔“

(روزنامہ زمیندار، جولائی ۱۹۲۷ء)

یہ تقریر اس قدر موثر اور جذباتی تھی کہ تمام مجمع میں سحر بپا تھا۔ شاہ صاحب  
 کی تحریک پر لوگوں کے جھٹھے باغ میں جلسہ گاہ جاتے اور گرفتار ہو جاتے۔ ان پر  
 لاکھی چارج بھی کیا جاتا۔ یہ سلسلہ تھوڑی دیر جاری رہا۔ بعد ازاں شاہ جی نے  
 عوام کو اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی اپیل کی اور کہا،

”ہمارا موقف قتل و غارت گری نہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ برطانوی  
 حکومت تعزیرات ہند میں ایک ایسی دفعہ کا اضافہ کرے جس  
 کی رو سے بائیان مذہب کے خلاف تقریر و تحریک کی پابندی  
 ہو اور اس کی خلاف ورزی کرنے والا مجرم قرار پائے۔“



اس قرارداد کے بعد جلسہ برخواست کر دیا گیا لیکن عوام کو پرامن طور پر اس سے باہر نکلنے کے لیے شاہ جی خود روانے پر کھڑے ہو گئے۔ ان کے سامنے مسٹر اوگلو کھڑا تھا۔ شاہ جی اپنے مخصوص انداز میں لوگوں کو پرامن رہنے کی تلقین کر رہے تھے اور ساتھ ہی مسٹر اوگلو سے پنجابی میں کہا کہ

”اوگلو! اوکھے گھر نیو ندرہ پایا ای!“

## نیپیری گرفتاری

ڈپٹی کمشنر لاہور نے قانون کی اوٹ میں اپنی شکست کا انتقام لینے ہوئے ۱۰ جولائی ۱۹۲۷ء کو صحتی سبجے بعد دوپہر شاہ جی اور خواجہ عبدالرحمان غازی کو دفتر پنجاب خلافت کمیٹی حجازی بلڈنگ بیرون وہلی دروازہ سے زیر دفعہ ۱۰۷ گرفتار کر لیا۔ گرفتاری سے پیشتر شاہ جی وہلی، لاہور، امرتسر اور لدھیانہ کے اضلاع میں تقریریں کرنے کے پنجاب کے مسلمانوں کو توہینِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقام پر آمادہ کر چکے تھے۔

دفعہ ۱۰۷ کے تحت قانون کا منشا اور حوزہ دیکھ کر شاہ جی پر دفعہ ۱۰۸ کے تحت بھی مقدمہ چلایا گیا۔ انہیں حکم ہوا کہ تین ہزار کی ضمانت اور تین ہزار کا چھکے دے کر دورانِ مقدمہ رہا ہو سکتے ہیں۔ لیکن شاہ جی نے نہ صرف فرنگی قانون کی یہ رعایت ٹھکرا دی بلکہ عدالت میں اپنا بیان اور مقدمہ میں صفائی دینے سے بھی انکار کر دیا۔ سماعت مقدمہ تک شاہ جی اور خواجہ عبدالرحمان غازی لاہور بورڈل جیل میں رہے لیکن مقدمہ کی کارروائی لاہور سنٹرل جیل میں ہوتی رہی۔ مسلسل چار روز کی بدظرف



کارروائی کے بعد شاہ جی اور خواجہ عبدالرحمن غازی کو ایک ایک سال کی قید  
بامشقت کی سزا دے کر شاہ جی کو رہتک جیل منتقل کر دیا گیا۔

مولانا ظفر علی خان کی ایک نظم کا شعر انہی دنوں کی یادگار ہے۔

بنو غازی کی غیرت لاج رکھ لی جس نے ملت کی

عطا اللہ کا ہمیت رہا ایمان پوجاؤ ✓

(مولانا ظفر علی خان)

## سوامی نندھانند کا قتل

شاہ جی کی گرفتاری اور سزا کے بعد فرنگی اور ہندو کے خلاف نفرت کو

مزید ہوا ملی اور یہ تحریک سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ ان دنوں مسلمانان ہند  
کے حسب ذیل مطالبات تھے:-

۱۔ حکومت برطانیہ ایک ایسا قانون وضع کرے جس سے بائیان مذاہب

کی عزت محفوظ ہو۔

۲۔ جسٹس کنور ویپ سنگھ کو اس کی ذمہ داریوں سے فدا علیحدہ کر دیا جائے

۳۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو جیلوں سے

رہا کیا جائے۔

اس ہنگامی تحریک کے نتیجے میں والسی افغانستان غازی امیران اللہ خان

نے حکومت برطانیہ کو حسب ذیل مفہوم کا ایک خط لکھا:-

”اگر برطانوی ہند میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت محفوظ



نہیں رہ سکتی تو ہمیں برطانیہ کے ساتھ کیے گئے معاہدوں پر  
اندسہ زور کرنا پڑے گا۔

مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کو بھی اپنی وولوں کے فتار کیا گیا۔  
شدھی ونگھٹن کے برگ و بار پھر اُبھر کر سامنے آئے۔ سوامی شرودھانند  
نے اپنے اخبار "تیج" میں یہ جذباتی نعرہ لگایا کہ میں عنقریب دہلی جامعہ مسجد کے  
ممبر پر شدھی کا جھنڈا لہراؤں گا۔ اس اعلان پر مسلمانوں میں اضطراب بڑھا۔ آخر  
مولوی عبدالرشید نے جو جامعہ مسجد دہلی کی بیٹھڑیوں پر پرانی کتب فروخت کیا  
کرتا تھا، سوامی شرودھانند کو قتل کر دیا اور اسی جرم میں اسے ۲۱ نومبر ۱۹۲۷ء کو  
دہلی جیل میں پھانسی پر لٹکایا گیا۔

الغرض واقعات نے ہندوستان کو ایسی ڈگر پر ڈال دیا جہاں کے  
شار مٹھیلاں بھی خون انسانی سے لالہ و گل کو رنگت بخشتے رہے اور اس راہ کی ہر  
شے نے خاتم الانبیاء کے ناموس کی حفاظت کی۔

## تعزیرات ہند میں ترمیم

غیر ملکی نظام حکومت غلام رعایا کو باہم دست و گریباں دیکھ چکا، آدمی  
کے ہو سے آدمیت کی ذلت چھکنے لگی، دلوں کے انگارے بُو دینے لگے، تو  
شاہانِ فرنگ نے محکوم رعایا پر دستِ کرم کیا کہ تعزیرات ہند میں ترمیم کر کے  
دفعہ ۱۹۵ کا اضافہ کیا جس کی رو سے ہر ایسی تحریر و تقریر قانوناً جرم قرار دے  
دی گئی۔ جس سے کسی مذہب کے بزرگ یا بانی (REFORMER) کی امانت کا



پہلو نکلتا ہو لیکن پہلے کی تنازعہ فیہ کتب کو ممنوع قرار نہ دیا گیا۔

## نہرو رپورٹ

۱۲ فروری ۱۹۲۸ء کو لارڈ برکن ہیڈ اور سالمن کمیشن کے جواب میں ہندوستانی رہنما دہلی میں جمع ہوئے۔ پنجاب کی نمائندگی چودھری افضل حق، مولانا داؤد غزنوی اور مولانا مظفر علی خان نے کی۔ اس اجتماع میں سر علی امام، مسٹر شعیب قریشی، مسٹر ایسے مسٹر جیکر، سردار منگل سنگھ، سر تیج بہادر سپرو پر مشتمل ایک کمیٹی ترتیب دی گئی۔ جس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ آگے چل کر نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔

اگرچہ سالمن کمیشن کی آمد پر مسلم لیگ اور کانگریس کے اتحاد سے ہندوستانی رہنماؤں کی مساعی جلیہ نے بگڑے ہوئے ماحول کو سنوارنے کی شب و روز سعی کی لیکن فضا میں تلخی بدستور زہر گھول رہی تھی۔ انہی دنوں مئی ۱۹۲۸ء میں شاہ جی مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی اور غازی عبدالرحمن امرتسری ایک ایک سال معیاد امیر ہی گزار کر رہا ہوئے۔ ان کی آمد پر امرتسر کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ مسلمانوں کے دلوں کے آئینوں میں شوق و محبت کی تصویریں آویزاں کیں۔ سقف و بام پر خوشی کے آئینوں کی جھلکیں لٹکادیں۔ کوچہ و بازار محبوب رہنماؤں کی آمد پر مسکراہٹ کے موتی بکھیرنے لگے۔ گھروں میں عید اور دکانوں پر میلے لگ گئے۔ اس استقبال کی تیاریوں کی اطلاع نہ جانے کس طرح شاہ جی کو ملی کہ وہ اچانک یوں غائب ہوئے کہ ان کے ساتھی بھی انہیں تلاش نہ کر سکے۔ شاہ جی رات کے اندھیرے میں چھپ



کر گھر پہنچ گئے۔

امر تیسری پلوی سے ایشیہ پر استقبال کرنے والے ہجوم کو سناہ جی کی یہ  
بے اعتنائی پسند نہ آئی۔ وہ ہالیوس بھی ہوئے اور ناراض بھی۔ اس کے باوجود مولانا  
حبیب الرحمن اور فاضل عبدالرحمن کا جلوس اپنے پورے وقار سے نکلا۔ ناموس  
رسالت کے محافظ بھی راستوں سے گزرتے نگاہیں فرش راہ اور دلوں نے عقیدت  
کے پھول برسائے۔

شاہ جی کی جلوس سے غیر متوقع غیر حاضری نے ان کے حلقہٴ احباب  
پر بھی اثر کیا۔ چنانچہ عام دوستوں نے باہم فیصلہ کیا کہ شاہ جی سے تعلقات منقطع  
کر لیے جائیں۔ اس فیصلے کے تحت احباب نے رخ پھیر لیا۔ شاہ جی جس دوست  
کے مکان پر جاتے وہ خدمت تو کرتے، اُدبھکت بھی کرتے لیکن خاموشی سے۔  
چاہے گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھے رہیں۔ سارے گھر میں اور سارے حلقہٴ احباب  
میں بھی بے رنجی اور بے نیازی کا عالم رہا۔ بازار سے گزرتے تو السلام علیکم کا جواب  
نہ ملتا۔ گھر سے نکل کر محلے میں آتے تو بچوں اور بوڑھوں تک میں منقطعہ کی وضعا  
پاتے۔

اسی طرح پندرہ دن گزر گئے لیکن لبوں پر تہر خاموشی بدستور رہی۔ گو یہ  
غصہ، ناراضگی، بے نیازی و بے رنجی احباب کی ایک سازش کا نتیجہ تھی لیکن شاہ جی  
ایسے باغ و بہار آدمی کے لیے وبال لبان بن گئی اور وہ اس قدر پریشانی ہوئے  
کہ مرنے مارنے پر اتر آئے۔ جن دوستوں سے زیادہ قربت تھی، وہاں زیادہ  
رنج ظاہر کرتے۔ آخر دوستوں نے بھی اتنی ہی سزا کافی سمجھ کر کمرٹھ مہاشگھ کے



میونسپل کمشنر میاں محمد شریف ٹھیکہ دار کے گھر دعوت کا انتظام کیا اور اس مجلس میں  
شاہ جی نے جلوں سے غیر حاضرانہ کے لیے سلسلہ اجواب سے معذرت چاہی۔ یہ  
نگین محفل جس میں اردو اور پنجابی کے شعراء، بذلہ بیچ حضرات شامل تھے، رات  
دو بجے تک جاری رہی۔

## چیدر چلو ان کا مقدمہ

۱۔ باوجودیکہ ہرورپورٹ کے ذریعے حسب ذیل فرقہ وارانہ فیصلے ہوئے  
۱۔ جداگانہ انتخاب کو ہندوستان سے ختم کر دیا جائے۔  
۲۔ مخلوط انتخاب کے ساتھ نشستوں کا تعین غیر مفید قرار دیا جائے۔  
۳۔ پنجاب اور بنگالی میں انتخاب کھلا رکھا جائے نیز کسی فرقہ کے لئے  
نشستیں مخصوص نہ کی جائیں۔

۴۔ مرکز میں مسلمانوں کو ایک نہایت نمایندگی دینے سے انکار کیا گیا البتہ اس  
سبب پر فیصلہ ہوا جو صوبہ جاتی نشستوں کے فیصلے کی رو سے مرکز میں مسلمانوں  
کو حاصل ہو سکیں گی۔

لیکن ہندو مسلم کشیدگی برابر برصغیر رہی اور سائنس کمیشن اپنا کام کرتا رہا۔ یہ  
دور قانونی موٹگیائیوں کا دور تھا۔ شاہ جی ان دنوں کچھ دیر کے لئے حاکم ہند  
کی دیکھ بھالی میں مصروف رہے۔

متحدہ ہندوستان میں مسلمان قومی کارکنوں کی زندگی ہمیشہ ایک اطمینان  
بشرطیکہ وہ کارکن ہوں سو داگر نہ ہوں۔ گو پروان وہی لوگ چڑھے جنہوں نے دماغ



اور ضمیر کا سودا کیا اور وقت نے بھی اپنی کو حقیقت جاننا۔ حالانکہ وہ افسانہ  
 تھے لیکن آئینہ ٹوٹ کر بھی دیکھنے والے کو مایوس نہیں کرتا۔  
 انسان کا اگر اپنا ضمیر مطمئن ہو تو حالات کا بگاڑ راستے کی دیوار نہیں بنتے  
 کانٹے لاکھ سر بھوڑیں پھول نکل ہی آتے ہیں۔ شاہ جی اگر مقبول ہو رہے تھے، یا  
 شہرت ان کی پیشوائی کر رہی تھی تو ان کے سہارے تعلیم، دولت یا کوئی دوسرا  
 طلسم نہیں تھا، بلکہ خلوص، جذبہ ایثار اور ایمان کی خشکی یہ ایسی چیزیں تھیں، جو انہیں  
 زمانہ پر فوقیت دے رہی تھیں۔ درویش کی زندگی کا مدار اس کی گوڑھی تک ہوتا ہے  
 شاہ جی نے مگر یوں حالات کو جلا دینے کے لئے وقت سے عاریتاً مہلت مانگی  
 اور امرتسر پرانی گندم منڈی نائی والی مسجد میں صبح کا درس اور جمعہ کے خطبہ پر متعلقین  
 کروائے گئے۔ یہ گاڑی ایک معتینہ مدت تک چلی۔

امرتسر میں زرگر سونا چاندی یا گولڈ کناری خریدنے محلوں میں عام گشت کیا  
 کرتے تھے۔ اسی طرح ایک خیر مسلم زرگر کو سپر جیڈر پہلوان میں پھرنے کا تھا کہ امرتسر کے  
 مشہور جیڈر پہلوان کے بھائی محمد سرور نے اس کے سر پر اچانک لوہے کا ہتھوڑا  
 دے مارا۔ آدمی کمزور تھا۔ ضرب کاری لگی اور ہلاک ہو گیا۔ ملزم محمد سرور کا دعویٰ توڑ  
 گزشتہ کئی برسوں سے درست نہیں تھا۔ اس کی اس حرکت نے سارے شہر کا  
 توازن خواب کر دیا۔ ملزم موقع پر گرفتار کر لیا گیا۔ واقعہ سے تیسرے روز ہمسایہ  
 قوم نے جیڈر پہلوان کو ملزم فرار دے کر گرفتار کر دیا۔

جیڈر پہلوان سیرت اور صورت کے لحاظ سے اپنے فن کی برادری میں منفرد  
 پہلوان تھا۔ پنجاب مرحوم اپنے اکھاڑے کے اس جیلے جوان پر جی جان سے



فریضہ تھا۔ ہندوؤں نے جیسے ہی حمید کو کھانا مل چھڑا کر قانون کے حوالے کیا، امرتسر کا  
 مسلمان فریق بن کر سامنے آ گیا۔ حمید کا تہوار بھی قریب تھا اور حمید کے دوسرے روز  
 حمید نے کشتی لڑنی تھی۔ مقامی حکام اس حادثے کے باعث تعلق میں تھے۔ ہندو  
 قوم کی دولت نے قانون کے سارے راستے مسدود کر دیئے۔ پولیس کی ابتدائی  
 رپورٹ میں حمید پہلوان کا نام درج نہیں تھا اور یہی ایک راستہ ایسا تھا، جہاں  
 ہندوؤں کی دولت کوئی رکاوٹ نہ کر سکی۔

مقدمے کی سماعت ڈپٹی کمشنر نے خود سنبھالی۔ ہمسایہ قوم نے لندن کے  
 مشہور بیرسٹر مسٹر پٹیل کو وکالت کے لئے پیش کیا اور مسلمانوں نے میاں سر  
 محمد شفیع کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا، مگر نہی دامن اور خالی ہاتھ سر شفیع کے اونچے  
 محل تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ عزیز جان تو دے سکتا ہے مگر ایشیا زر اس  
 کے بس کا روگ نہیں۔ ایشیا پینتہ مسلمان جب ونبوی سرمائے سے عاری ہو جاتا ہے  
 تو جذبات کا سودا کرنے لگتا ہے۔ کھڑا ہاٹنگھ کے لوگوں نے شاہ جی سے  
 گزارش کی کہ

حمید پہلوان کے مقدمہ میں مسلمانوں کی عزت کہیں اسلام کی شکست کا  
 نشان نہ بن جائے۔

تو شاہ جی ابدیدہ ہو کر چہرہ مانگنے محلے میں نکل کھڑے ہوئے۔ شام تک  
 امید نے ڈھارس بندھائی لیکن دریا خشک ہو جائے تو آنسوؤں کی روانی اس کی  
 پیاس ختم نہیں کر سکتی۔ اگلے روز باغبانپورہ لاہور میں میاں سر محمد شفیع کے مکان  
 کے سامنے چوک میں تقریر کرنے کا ارادہ لے کر شاہ جی لاہور پہنچے۔ منادی ہوئی



ہزاروں کی تعداد میں مجمع تھا۔ شاہ جی نے عشاء کی نماز کے بعد تشریح شروع کی اور صبح کے چار بج گئے۔ اس دوران حیدر پہلوان کی شخصیت، مقدسے کی نوعیت، مسلمانوں کی بے بسی، ہندوؤں کے انفراد اور دولت پر تبصرہ کیا لیکن سر شفیق کا نام تک نہ لیا۔ آخر اذان کے وقت میاں سر شفیق بے اختیار ہو کر شاہ جی کے قدموں پر آگرے اور اسی وقت امر نثر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ دوسرے روز مقدسے کی پہلی پیشی تھی اور اس مقدسے کی چشم دید گواہ محلے کی لکھی دھوبن نامی ایک عورت تھی جس نے اپنی شہادت میں حیدر پہلوان کو موقع وار ذات پر غیر حاضر قرار دیا۔ ولایت سے آئے ہوئے مسٹر پیٹ مین اور میاں سر محمد شفیق پیر سٹریٹ لا آفیسر نے سامنے کھڑے کھنٹے۔ عدالت سے باہر ہزاروں مسلمان جمع تھے کہ حیدر پہلوان ہتھکڑی کے ساتھ عدالت میں لائے گئے جسے دیکھتے ہی مسلمانوں کی چیخیں نکل گئیں اور ساتھ ہی ہندوؤں نے اپنی پہلی کامیابی پر "ہر ہر مہا دیو" کے نعرے بلند کیے۔

شاہ جی عدالت میں نہیں آئے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ میں اپنے اللہ کے سہلوے سر سبجود ہو کر رہتا رہا اور مسلمانوں کی کامیابی کے لئے دعا کرتا رہا۔ لکھی دھوبن کی گواہی کے بعد میاں سر محمد شفیق نے عدالت سے کہا کہ استغاثہ کی ابتدائی رپورٹ اور چشم دید گواہ کے بعد میرا عدالت سے صرف ایک ہی سوال ہے،

"کیا عدالت کے نزدیک پولیس زیادہ معتبر ہے یا کوئی دوسرا گواہ؟"

عدالت: پولیس!



تشریح: نوپھر پولیس کی ضمنی یا ابتدائی رپورٹ میں حیدر پہلوان کا نام بطور ملزم کے درج نہیں بلکہ محمد سرور کا نام ہے۔ لہذا میری عدالت سے درخواست ہے کہ ملزم حیدر پہلوان نہیں بلکہ محمد سرور ہے۔ بس۔

استغاثہ کے ایک گواہ کی شہادت اور محمد شفیق کے دلائل سننے کے بعد عدالت نے دوسرے فریق کے دلائل سننے بغیر حیدر پہلوان کو مقدمے کی پہلی پیشی پر باعزت بری کر دیا اور محمد سرور کو پاگل قرار دے کر غیر معینہ عرصہ کے لئے پاگل خانے بھیج دیا۔

حیدر پہلوان کو عدالت سے بری ہوتے ہی پچھلے دروازے سے نکال کر گھر بھیج دیا گیا۔ جب مسلمانوں کو یہ خوش خبری ملی تو وہ دیوانے ہو گئے لیکن اس دیوانگی میں انہوں نے کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی۔

شاہ جی اور مسلمانان امرتسر اپنی اس کامیابی پر بہت مسرور ہوئے۔ یہ ستمبر ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے۔

## پیر کرم شاہ

جب قوموں کا گزرا نخطاط کے دور سے ہوتا ہے تو راستے کی ہر پگھڑندی انہیں منزل کا نشان دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ پگھڑندی نہ تو راستہ ہوتا ہے اور نہ ہی منزل۔ لیکن بھٹکے ہوئے راہی ہر موڑ کو رنگ میل سمجھتے ہوئے اپنے قیاس میں کھو جاتے ہیں۔

اس دور کا مسلمان عقیدے کی پختہ چٹان سے محصل کران پختوں پر



ہے جس سے تراشے ہوئے صنم خدائی کے وجود میں۔ مخلوق اپنے خالق سے  
 انحراف کر کے بغاوت کے اُس دستور کو اپنا رہی ہے جس کی ہر تجویز انسانیت  
 سے ناواقف معلوم ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شعبہ باز صرف لائق کی صفائی  
 سے دل و نظر کو فریب دینے میں کامیاب ہو رہا ہے۔

۱۹۲۸ء کی بغاوتیں چھوٹ رہی تھیں کہ امرتسر کا مسلمان پیر کرم شاہ کے  
 اُمتانے پر سجدہ ریز تھا۔ مسلمان عورت کا اُگینہ عصمت اس دلیر سے ٹکرا کر چور  
 چور ہو چکا تھا۔ ایمان و توحید کی قدیریں وند کر کے تار عنکبوت میں الجھ رہا تھا۔  
 تیس تیس کا سن، سر و قد، سُرخ و سپید رنگت جیسے میدے میں سبز چھوڑ گوند  
 کر بنایا گیا ہو، کشادہ پیشانی، چشم آہو میں بلا کی چمک، جیسے کسانے موتی کوٹ  
 کر بھروئے ہوں، تنگی ناک جیسے تلوار کی دھار، عتاب کی طرح سُرخ ہونٹ، سر پر  
 لہجہ اور سنہری بال، ایسا جال تھے جہاں میں راہ چلتی جو انبوں کا پھنس جانا معجزہ نہیں تھا  
 ان سب پر سیاہ ریشم کے عربی کاٹ کے لباس کی سجاوٹ تھی۔ یہ تھا پیر کرم شاہ!  
 جس کی شہرت نے گھروں کے گھر اُس کے قدموں پر لا ڈالے تھے۔ یہ اکثر پہرے  
 پر نقاب رکھتا اور ملنے والوں کو دیدار کی ہوس رہتی تھی۔ امرتسر قلعہ بھنگیاں کوچہ  
 ستاریوں میں رہائش کے دنوں اُس کا چہرہ چاندنی کی طرح پھیل گیا۔ امرتسر کا سرکاری  
 خطاب یافتہ طبقہ، شمال مرچنٹ، پٹنہ کے سو واکرا اُس کے میزبان تھے۔ لباس  
 گنگو، نقش و نگار اور ظاہری رکھ رکھاؤ نے کرم شاہ کے متعلق مختلف تپاں اُڑائی  
 کو ہوا دی۔ کمزور اعتقاد مسلمان روحانی پیر سمجھ کو پوجا کرنے لگا۔ اور اکثر کی  
 رائے تھی کہ کرم شاہ درحقیقت وہی کرنل لانس ہے جس نے عربوں میں انقلاب



برپا کیا تھا۔ دوسری رات کے باعث سرکاری خطابات کی سچا ہمت کے لوگ  
کرم شاہ کے گرد زیادہ تعداد میں جمع ہوئے۔

امیروں کی بھینٹ دیکھ کر غریبوں کے ایمان بھی متزلزل ہو گئے۔ قریب

خود وہ عوام نے آستانہ کرم شاہ پر سب سے سائی کی انتہا کر دی۔ اولاد سے محروم

عورتوں کی لڑکیاں صاف ہاند سے شہب و روز کھڑی رہیں۔ اس طرح سب سارا

امر تسر سواں کھو بیٹھا تو شاہ جی خواجہ عبدالرحیم عاجز کی ہمراہی میں کرم شاہ سے

ملنے گئے۔ معلوم ہوا آج یوم خواتین ہے مردوں کے لیے اجازت نہیں۔ گو

شاہ جی کا ماتھا نہیں سے ٹھنکا لیکن بادل خواستہ دوسرے دن کا قصد لے کر

واپس لوٹ آئے۔ دوسرے روز گئے تو مصروف سے دو گھنٹے تنہائی میں

میر حاصل گفتگو کے بعد شاہ جی مسکراتے ہوئے باہر آئے اور اگلے دن چوک خراساں

متصل ڈیرہ کرم شاہ میں اہل امر تسر کو خطاب کرتے ہوئے شاہ جی نے کہا:-

دراہ مستقیم سے بچنے کے ہوئے مسلمانو! ہر چہ تھی ہوئی چیز سونا نہیں

ہوتی۔ جس آدمی کو تم سے روہانی پیشوا یا انگریزی جاسوس

تجامل کر لیا ہے یہ دونوں میں سے کچھ نہیں، برطانوی جاسوس

نہ تو گلی محلوں میں قیام کرتے ہیں اور نہ اس طرح کی بھینٹ انہیں راس

آتی ہے اور یہ روہانی آدمی بھی نہیں۔ یہ محض نفس پرست انسان

ہے۔ ممکن ہے آج میری باتیں تمہیں کڑوی معلوم ہوں، لیکن

عنقریب سنو گے کہ یہی مصحوم لڑکی کو اعزاز کے لئے بھاگا لیکن

تم اپنے ایمان نہیں بچا سکتے تو گھروں کی عزت کی حفاظت



گورو ججورتوں کو دہاں جانے سے منع کر دو۔

مجھ سے پوچھتے ہو تو میری نظروں نے فتنہ و فجور کے

علاوہ دہاں اور کسی چیز کا اندازہ نہیں لگایا۔ وہاں روسانیت

کی نہیں برصیت کی تربیت دی جاتی ہے جس شخص کو تم

نے پیر بنا رکھا ہے، یہ بہت بڑا بد معاش ہے۔ انشاء اللہ

میں بہت جلد اس کا یہ سارا طلسم ختم کروں گا۔ تم چاہو آج

پیر اساتذہ دو لیکن کل میرے سامنے ضرور بنو گے۔

شاہ جی کی یہ تقریر رات دو بجے تک جاری رہی اور دوسرے دن اس

سے کھڑکی دور چوک کھڑکے نشید میں جلسے کا اعلان کیا گیا۔ اس جلسے میں حاضرین

کا اندازہ دو لاکھ سے اوپر بیان کیا جاتا ہے۔ پنجابی کے مشہور القاب شاعر خواجہ

عبدالرحیم عاقر نے "دو سہیلیوں کے باہم تکیار" کے عنوان سے ایک نئی نظم اس

جلسہ کے آغاز میں پڑھی جس کے دو شعر یاد ہیں۔

چل درشن کر بیٹے فی آج دل کرم شاہ پیر دے

ہاں گھر گھر ورتھ اڑ بیٹے آج پیر چھپ چھپ پیر دے

مرو گنگھن اوٹھے بچپیر کے اندر

اڑے تینویاں گنگھیاں گنگھیاں

اساں سنبیا اوٹھے اچ کھیلڈن

جینوے وٹھ سے نال گلسیاں

اوتھے نقشے دسدے نہیں اسان سنبیا رانچھ پیر دے چل درشن کر بیٹے فی آج دل کرم شاہ پیر دے



شاہ جی کی تقریر صبح اذان کے وقت ختم ہوئی دانشوروں سے کہ تلاش  
کے باوجود یہ تقریر نہ مل سکی،

ان تقاریر کے بعد کرم شاہ نے اچانک امر نسر چھوڑ دینے کا فیصلہ  
کر لیا اور بی بی چلا گیا۔ وہاں اُس نے چند تجارت پیشہ لوگوں پر اپنا وار کیا۔ لیکن  
بہت جلد شراب نوشی اور دوسری بد معاشیوں کا انکشاف ہونے کے بعد یہ لاپرواہ  
چلا آیا۔ یہاں اسکے گرد اسی فحاشی کے لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ پھر یہ اس قدر  
بدنام ہوا کہ لاہور میں لالہ لاجپت رائے کی ارٹھی کے جلوس کے موقع پر راجو  
کہ سائمن کمیشن کے خلاف احتجاجی جلوس میں لاکھوں سے زخمی ہو کر فوت ہوئے  
تھے، کرم شاہ کو عوام نے کار میں دیکھ لیا اور اس قدر پٹائی کی کہ بڑی مشکل سے  
جان بچا کر بھاگا۔ اس ہنگامے کے بعد یہ کشتیر بھاگ گیا۔

کرم شاہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ کہاں چلا گیا؟ یہ خاک کہاں  
سے اڑی اور کہاں جا کر بیٹھ گئی۔ اس اندھیر گردی میں کتنی عصمتیں لٹیں؟ کتنے ایمان  
خاتم ہوئے؟ انسانیت کو کہاں کہاں شرمندہ ہونا پڑا، زمانے کے پاس  
اس کی کوئی فائل نہیں۔ حالات واقعات پر اسی طرح خندہ زن رہے۔ لیکن  
شاہ جی کی آواز سے بڑگوں بچ پیدا ہوئی تھی، اُس کی صدائے بازگشت ہنوز  
سنائی دے رہی ہے۔ "مسلمانو۔۔۔! ہر جگہ ہوتی ہوئی پیڑ سونا نہیں ہوتی!!"

۱۹۴۹ء

زندگی کے سن و سال جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں، آدمی کی ذمہ داریاں



بھی اسی قدر ترقی پذیر ہوتی ہیں۔ انسانی شعور کے بالغ ہونے تک گزشتہ زندگی کے راہ و رسم احساس کے سہارے پروان چڑھنے ہیں۔ اگر یہ کڑی درمیان میں نہ ہو تو ساری زنجیر ٹوٹ کر رہ جائے۔

اس سال شاہ جی کی عمر اڑتیس سال کے قریب تھی لیکن تبلیغی اور سیاسی ذمہ داریوں کا بوجھ اس شدت سے اُن پر آ کر ان کے احساس نے انہیں جوانی کی سرحدوں سے دور کر دیا تھا۔ حالانکہ یہی دن ایام بہاراں کہلاتے ہیں۔ جو راستہ روزِ ازل سے انہوں نے منتخب کیا تھا وہاں بہاروں کا گزر ممکن نہیں تھا۔ اگر ۱۹۲۹ء کے سیاسی اور مذہبی واقعات میں سے شاہ جی کے کردار کو الگ کر لیا جائے، تو اس سال کی تاریخ رنگ و روغن سے تہی معلوم ہوتی ہے۔ یہی سال دراصل شاہ جی کی شہرت کو کابل کی دیواروں سے اس کماری تک لے گیا ورنہ اس سے پیشتر پنجاب، سرحد اور یوپی کے چند اضلاع تک ہی متعارف تھے۔

## شاہ رسول کا قتل عام

ایک طرف سائمن کمیشن کے ارکان ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایسی بُو سونگھ رہے تھے جس سے انہیں اپنے اپنے سکون میسر نہیں تھا، دوسری طرف مہاشہ راج پال کے بری ہونے پر فرقہ پرست ہندوؤں نے منظم سازش کے تحت تحریک شاہ رسول کو ہندوستان میں ہوادہی جس سے آریہ سماجی ہندوؤں کے جوصلے بڑھے اور انہوں نے بیہیمہ آخر الزماں حضور نبی کریم ﷺ کے







حسام الدین، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی اور شاہ جی نے سارے پنجاب میں  
نہرو رپورٹ کے اثرات سمجھاٹے۔

مسلمانوں کے دو گروہوں میں حقیقتیں جاری تھیں کہ ہاتھ گا ندھی اور پنڈت  
مدن موہنی مالویہ نے ایک مشترکہ اعلان میں کہا:-

”نہرو رپورٹ کے فیصلے سے سکھوں سے نا انصافی ہوئی ہے۔“

اس اعلان سے سکھوں اور ہندوؤں میں اتحاد کی ایک نئی لہر اٹھی اور  
سارے ملک میں ہنگامہ ہوا۔ انہی دنوں مسلمان رہنماؤں نے بھی جو نہرو رپورٹ  
پر دستخط کر آئے تھے، اعلان کیا:-

”چونکہ مسلمان قوم نہرو رپورٹ کے ناموں کو قبول نہیں کرتی

لہذا ہم اس کی ذمہ داری سے دستبردار ہوتے ہیں۔“

گانڈھی جی اور مالویہ کے اعلان کے بعد پنجاب کے رہنماؤں کے نہرو رپورٹ  
سے انکار پر سائنس کمیشن کا مشا پورا ہوا لیکن وہ ہندوستانیوں کا مزید تماشادیکھنے  
کے لیے یہاں ٹھہرے رہے۔ ان واقعات سے ایک طرف ہندوستان کے  
مشترک مقصد کو نقصان پہنچا، دوسری طرف انگریز حکمرانوں کی سیاست گوری  
کا میاب رہی۔

ایسے حالات میں اول الذکر گروہ (آر پی سماج) نے سرور کائنات صلی اللہ  
علیہ وسلم کی توہین کرنے کا فیصلہ پختہ کر لیا۔ اس سلسلے میں وہ ایسی ایسی تحریریں لکھنے  
لائے کہ مسلمانوں کے دل بیٹھ گئے۔ غلامی کا جوا ان کی گردنوں پر کوہ ہمالیہ سے  
بھی بوجھل معلوم ہونے لگا۔ غم اور غصے کے بلے جگہ جگہ سے ہندوؤں



کا مقابلہ کرتے رہے۔ آخر انہی دنوں شاہ جی نے عصمت انبیاء کے تحفظ کا فیصلہ کیا۔ درویش اپنی گودڑی سنبھالی کر بے سرو سامانی کے عالم میں نکل کھڑا ہوا۔ قانون فرنگ اور دولت ہندو افس کے ارادوں میں نہ تو کانٹے بکھیر کے اور نہ ہی افس کے قدموں کی رفتار مدد مہم ہو سکی۔

”مسلمانو! میں تمہاری سوٹی ہوئی عیزت کو جھنجھوڑنے آیا ہوں۔ آج کفار نے تو میں پیغمبر کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انہیں شاید یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مسلمان مر چکا ہے۔ آؤ اپنی زندگی کا ثبوت دیں۔ عزیز لڑ جوانو! تمہارے دامنی کے سارے داغ صاف ہونے کا وقت آ پہنچا ہے۔ گنبد خضرا کے گلین تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ آپ کی آبرو خطرے میں ہے۔ آپ کی عزت پر کتنے بھونک رہے ہیں۔ اگر قیامت کے دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے طالب ہو تو پھر نبی کی توہین کرنے والی زبان نہ رہے یا سننے والے کان نہ رہیں۔“

ان خیالات کو شاہ جی نے برصغیر کے مسلمانوں میں بیان کیا۔ وہ شب و روز دیوانوں کی طرح تقریریں کرتے۔ گاؤں، قصبات، شہر اور بستیاں اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے منہ خون میں حور ت پیدا ہوئی۔ بس پھر تھا، شہر کی طرح پھیرا ہوا مسلمان گستاخ ہندوؤں کی تلاش کرنے لگا۔ نگاہیں جنت کی تلاش میں موت سے ہلکا رہنے کو بے قرار نظر آنے لگیں۔ دلوں میں شوق شہادت کی لذت محسوس ہونے لگی۔ بنو مسکراتی رہی مگر عشق منزل کی جانب واں



دو ال ہوا۔ اس طرح شاہ جی نے مسلمان نوجوانوں کو ابھار کر ایسے مقام پر لا کھڑا  
 کیا کہ اس کے آگے وہی راستے تھے۔ یا تو ہندوستان میں داعی اسلام کی  
 عزت ہمیشہ کے لئے نابود ہو جاتی یا پھر غیر مسلموں میں آئندہ جرأت نہ ہوئی  
 کہ حضور کی ذات گرامی پر زبان طعن و راز کرتے۔

دلوں کے اس فیصلہ کن مقام پر پہنچ کر سب سے پہلے ۶ اپریل ۱۹۲۹ء  
 کو لاہور کے ایک بڑھئی نوجوان غازی علم الدین نے دوپہر کے وقت لاہور میں کتاب  
 "نگیار رسول" (نعوذ باللہ) کے ناشر مہاشہ راج پال کو اس کی دکان (ہسپتال روڈ)  
 میں قتل کر دیا۔

اس مقدمہ میں شاہ جی کی خواہش پر علم الدین نے راج پال کے قتل کا اقرار  
 کر لیا تھا۔ حالانکہ وکیلوں کی خواہش تھی کہ علم الدین ایسا نہ کرے۔

## ایک خوفناک دھماکہ

غازی علم الدین کی گرفتاری سے ابھی اخبارات کی سرخیاں ماند نہیں پڑی  
 تھیں کہ ۸ اپریل ۱۹۲۹ء کو دہلی سنٹرل اسمبلی میں بم کا ایک خوفناک دھماکہ ہوا  
 جب اس دھوئیں کے بادل چھٹے تو اسمبلی ہال کی گیلری پر دو نوجوان کھڑے تھے۔  
 سردار بھگت سنگھ اور بنگال کے مسٹر بی کے، دت۔ اسمبلی ہال کی حمارت کو  
 کافی نقصان پہنچا۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ ممبران حواس باختہ ہو کر کچھ تو  
 فرنیچر کے نیچے پناہ گزین تھے اور باقی ہال چھوڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہو  
 گئے تھے۔



۸ اپریل ۱۹۴۹ء کو سنٹرل اسمبلی میں جس کی صدارت مسٹر وٹھل بھائی پٹیل کر رہے تھے، بینک سینیٹا بل پیش ہونے والا تھا کہ یہ سادہ پیش آیا۔ دونوں ملزم گرفتار کر لیے گئے۔

انہی کے بعد دیگر سے مذہبی اور سیاسی قسم کے تشدد و امیز واقعات نے ہندوستان کے رہنماؤں اور عوام کو الگ الگ دھڑوں میں تقسیم کر دیا۔ عدم تشدد کی پالیسی کا عدم قرار دی جانے لگی اور عوام جو سیاسی رہنماؤں کی نرم پالیسی سے تنگ آچکے تھے آتشیں اسلحہ کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔

ہندوستان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ہر انگریز کو جان کے لالے پڑ گئے۔ چنانچہ ۱۳ اپریل کو سائمن کمیشن کے ارکان حالات کا مزید اکتشاف کیے بغیر لندن واپس چلے گئے۔

## خلیفہ قادیان کا خطبہ

انہی اخرا تفری کے دنوں خلیفہ قادیان مرزا بشیر الدین محمود کو بھی سوچی کہ انہوں نے مجھ کے خطبہ میں غازی علم الدین سے متعلق حسب ذیل خطبہ دیا۔

”وہ شہیدیت الفطرت اور گند سے لوگ جو انبیاء کو گالیاں دیتے ہیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کی تعریف کی جائے۔ ان کی قوم اگر اپنے اندر دین واری اور اخلاق رکھنے کی مدھی ہے تو اس کا فرق ہے کہ ایسے افعال کی پورے درو کے ساتھ مذمت کرے۔ اسی طرح اس قوم کا جس کے جو شیلے آدمی قتل کرتے ہیں



خواہ انبیاء کی توہین کی وجہ سے ہی وہ ایسا کریں، فرض ہے کہ  
 پررے زور کے ساتھ ایسے لوگوں کو دبا یا جائے اور ان سے  
 اظہار برات کرے۔ انبیاء کی عزت کی حفاظت قانون شکنی کے  
 ذریعے نہیں ہو سکتی۔ وہ نبی بھی کیسا نبی ہے جس کی عزت کو  
 بچانے کے لئے خون سے ماتھ رنگنے پڑیں جس کو بچانے  
 کے لئے اپنا دین تباہ کرنا پڑے۔ یہ سمجھنا کہ محمد رسول اللہ  
 (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت کے لئے قتل کرنا جائز ہے،  
 سخت نادانی ہے۔ وہ لوگ جو قانون کو ماتھ میں لیتے ہیں وہ  
 بھی مجرم ہیں اور اپنی قوم کے دشمن ہیں اور جو ان کی پیٹھ کھٹکتا  
 ہے وہ بھی قوم کا دشمن ہے۔ میرے نزدیک تو اگر یہی شخص اجال  
 کا قاتل سے جو گرفتار ہوا ہے تو اس کا سب سے بڑا خیر خواہ  
 وہی ہو سکتا ہے جو اس کے پاس جائے اور اسے سمجھائے کہ  
 دنیوی سزا تو اب تمہیں ملے گی ہی لیکن قبل اس کے کہ وہ ملے تمہیں  
 چاہئے کہ خدا سے صلح کر لو۔ اس کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ  
 اسے تباہ یا جائے کہ تم سے غلطی ہوئی ہے۔

(۱۹ اپریل ۱۹۲۹ء اخبار الفضل قادیان)

ان دنوں جب کہ مسلمان نوجوان نخریک شاتم رسول کی بیخ کنی کے لئے کفن  
 بروش ہو کر میدان عمل میں آچکا تھا خلیفہ قادیان کا مندرجہ بالا بیان ان نوجوانوں  
 کی پیٹھ میں جھرا گھونپنے کے مترادف تھا جو توہین رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی



باقاعدہ سازش کو بے نقاب اور ختم کرنا چاہتے تھے۔

اپریل کا پورا مہینہ اسی ہماہی میں گزرا اور مٹی کے شروع میں غازی علم الدین کا مقدمہ زیر دفعہ ۳۰۲ عدالت میں پیش ہوا۔ استغاثہ کی ابتدائی شہادتوں کے بعد غازی علم الدین نے اپنے بیان میں کہا،

”میں اس عدالت میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں۔ میں نے کتاب رنگیلار رسول کے ناشر راج پال کو قتل کیا ہے۔ اس لیے کہ کتاب مذکور سے میرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت توہین ہوئی تھی۔ راج پال کو اپنے اس فعل پر ندامت تھی اور نہ انہوں نے! اگر میں اس مقدمے میں بری کر دیا گیا تو میں توہین رسول کرنے والے کو پھر قتل کروں گا۔“

اس اقبال جرم کے بعد ۲۲ مئی ۱۹۲۹ء کو کیشن جج کی عدالت سے غازی علم الدین کو سزائے موت کا حکم ہوا۔

۱۵ جولائی کو ٹائی کورٹ نے بھی اپیل خارج کر دی۔ پھر پریوی کونسل نے بھی فیصلہ بحال رکھا۔ آخر ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو میاوالی جیل میں غازی علم الدین کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

مسلمانان لاہور کے مطالبے پر ۷ نومبر کو لاش لاہور لائی گئی اور لاکھوں مسلمانوں نے نماز جنازہ کے بعد اشک بار آنکھوں سے عاشق رسولؐ کو قبرستان میانی صاحب میں سپرد خاک کیا۔  
شروحات کے بعد راج پال کے قتل نے گستاخ زبانوں کو قدر تکام دی۔



مگر کفر کے منظم فیصلے میں کوئی بچک نہ آئی۔ غازی علم الدین کی شہادت نے قتل کے واقعات کو ہندوستان بھر میں مسلسل ہوا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تصور میں محمد صادق نے پالے شاہ کو، کلکتہ میں محمد عبداللہ اور عبدالعزیز نے لاہور سے جا کر بھولا رام کو، کراچی میں عبدالقیوم نے نکتورام کو، بہاولپور میں غلام محمد نے اپیل سنگھ کو، چکوال میں (نام معلوم نہ ہو سکا) نے پلون کے سکندر ڈاکٹر کو، اور کیمبل پور میں عبدالمنان نے پیارے لال کو قتل کیا۔

مندرجہ بالا نوجوانوں کو سزائے موت ہوئی اور آخر الذکر عبدالمنان کو سیشن جج مسٹر ڈی جی، کھوسلہ نے سات سال کی سزا دی اور فیصلے میں لکھا کہ کوئی مسلمان توہین رسول پر واہنت نہیں کر سکتا۔

تحریک شاتم رسول میں قتال کا یہ سلسلہ ۱۹۲۳ء تک جاری رہا۔ ان مسلسل اور پیہم واقعات نے کفر کو اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کے لیے مجبور کر دیا۔ شاہ جی کی یہ تحریک کہ توہین رسول کرنے والی زبان نہ رہے یا توہین رسول

سننے والے کان نہ رہیں۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۳ء تک گاہے گاہے اپنا کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ گستاخ زبانیں ہمیشہ کے لئے خاموش کیا دیا گئیں۔ وہ پھانسی کے رستے اور دار کے تختے چوم لینے کے قابل ہیں جن کے ذریعے ان نوجوانوں کو موت کی سزا دی گئی جنہوں نے شاتم رسول کے ناپاک جسم کو ہمیشہ کے لئے خاک میں ملا کر اپنے لئے شہادت کا مقام حاصل کیا۔

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاکِ طہنت را



## ڈیرہ غازی خان

تحریک شائقِ رسول اندر اندر اپنا کام کر رہی تھی کہ شاہ جی کو ڈیرہ غازی خان جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ ۱۹۲۹ء کے وسط کی بات ہے۔ شاہ جی اس علاقہ کے اندرونی حالات سے ناواقف اور بے خبر تھے۔ غیر ملکی اقتدار کے باعث اس ضلع کی عزیز مسلم آبادی ایک طرف تین واروں اور دوسری طرف ہندو ساہوکاروں کے جنگل میں گھسنی ہوئی تھی۔

سرور احمد خاں پٹانی (مرحوم) اس ضلع کے مشہور زمیندار اور اہل دل مسلمان تھے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ تھا لیکن اپنے ضلع کے مذہبی حالات سے غیر مطمئن تھے۔ جب انہیں شاہ جی کی آمد کا علم ہوا تو اپنے گھر دراجن پور ڈیرہ غازی خان، سے چند مخلص نوجوانوں کا ایک وفد لے کر شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

۱۔ اس ضلع کی دو افتادہ بسٹیوں میں رواج پڑ چکا ہے کہ عزیز مسلمان اپنی و بیوی ضرورتوں کے لئے ہندو ساہوکار کے پاس معمولی رقم کے عوض اپنی بیٹیاں رہیں رکھتا ہے اور قرض مع سود کی واپسی تک لڑکی ہندو ساہوکار کے پاس رہتی ہے اور اکثر ایسا ہوا کہ وہاں اس کے ہاں اولاد بھی پیدا ہوئی۔

۲۔ ڈیرہ غازی خان کے مسلمانوں نے ۱۸۶۲ء کے ہندو بستی میں فرنگی عدالتوں میں اپنے آپ کو قرآنِ کریم کی بجائے رواج کا پابند لکھوایا، جس کے باعث انہوں نے بیٹیوں کو جاڈاؤ سے محروم قرار دیا ہے جب کہ قرآنِ کریم



سورۃ نسا میں بیٹی کو بھی باپ کی جائیداد کا وارث قرار دیتا ہے۔

۳۔۔۔ ضلع کے تین واروں نے اپنی تفریح طبع کے لیے کتے اور

سوڈ پال رکھے ہیں۔ جب یہ لوگ موج میں آتے ہیں تو ان جانوروں کے درمیان لڑائی مٹا شتہ دیکھتے ہیں۔ اگر کتا جیت جائے تو اس کا جلوس نکالتے ہیں اور سوڈ کو مار کر اس کے گوشت میں بہترین قسم کے بیگھی چاول ڈال کر پلاؤ پکا کر کتے کو کھلاتے ہیں۔

دشاید یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں ایک مدت سے اچھی قسم کے

چاول کی پیداوار ناپید ہو چکی ہے۔

مندرجہ بالا واقعات کے بعد سردار احمد خان پٹانی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ

نے آپ کو دل کے ساتھ زبان اور نظر بصیرت عطا کی ہے۔ اگر آپ نے اس ضلع کی ناگفتہ بہ حالت کی طرف توجہ نہ کی تو عند اللہ آپ مجرم ہوں گے میری دولت اس کام کے لیے آپ کی پوری طرح معاون ہوگی۔

شاہ جی سمالات سُن کر زار و قطار رونے لگے اور سردار احمد خان سے

وعدہ کیا کہ میں جب تک زندہ رہوں گا، اس علاقہ کے مسلمانوں کی اصلاح میں کوئی

دقیقہ فرود گزارا نہت نہیں کروں گا۔ چنانچہ شاہ جی ہر سال جون اور جولائی کے تیسرے

ہوٹے موسم میں جب کہ یہاں کا کسان اور مزدور پیشینہ طبقہ فصل کی کٹائی اور ٹہائی

سے فارغ ہوتا تھا، اس ضلع میں تشریف لے جاتے۔ شہر ہی آبادیوں سے دور

آبادکاروں کی بستوں میں دوپہر کے وقت ان کی زبان میں خطاب کرتے۔ دس

دس اور بیس بیس گوس سے آٹے ہوئے دیہاتی شاہ جی کی باتیں سنتے۔ گھنٹوں



خطاب کرنے کے بعد شاہ جی ان سے سوال کرتے۔

”بلند صبحی کاٹی گال سمجھ گیدھی نا؛“ دوسری کوئی بات آپ کی سمجھ میں

آتی ہے ہی

”اگر سلسلے میں سے ایک دیہاتی نے بھی کہہ دیا،

”سائیں کوئی“ یعنی کوئی نہیں؛

تو شاہ جی پھر اس ایک دیہاتی کو سمجھانے کے لیے سارے مجمع سے

اسی طرح گھنٹوں خطاب کرتے۔ جب تک پورا مجمع بات سمجھ نہ لینا تقریر ختم نہ

کرتے۔

اس طرح زندگی کے تیس برس مسلسل ڈیرہ غازی خان کے عوام کو مختلف

اوقات میں خطاب کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متن داروں نے کتے اور سوروں کی پرورش

سے تو یہ کر لی۔ اس علاقہ کے ڈیروں سے روپیہ لے کر غریب مسلمان لڑکیوں

کو بہت و ساہوکاروں کے جنگل سے نجات دلائی۔ شہری اور دیہاتی مسلمان کو مجبور

کیا کہ شریعت کی رو سے اپنی مہاں دلی سے لڑکیوں کو بھی حصہ دیں۔ قانون

کو تبدیل نہ ہو سکا لیکن ڈیرہ غازی خان اور ضلع مظفر گڑھ کے اکثر لوگوں نے

شریعت کے اس قانون کی پیروی شروع کر دی۔ شاہ جی جن دنوں اس علاقے کا

دورہ کرتے، گرجی کی شدت سے ان کے تمام جسم پر چھوڑے پھینسیاں نکل آئیں

اس کے باوجود دور دراز ایسی بے آب و گیاہ زمینوں میں جاتے جہاں کے

لوگ پانی کی قلت کی وجہ سے مجبور ہو کر چوہا پٹر کا پانی پیتے اور کھانے کے لیے

انہیں پیانہ، اچار یا مسور کی والی میسر جتنی۔ جن گھروں میں گوشت یا دوسری بہتر



خوراک میسر آسکتی تھی، شاہ جی نے ان گھرانوں سے یہ کہہ کر ہمیشہ اجتناب کیا،  
 "میں جن لوگوں کو سمجھانے آیا ہوں اگر ان کے ساتھ کھل مل نہ جاؤں  
 تو ان پر میری بات کا اثر نہیں ہو سکتا۔"

حالا نکہ یہ ضلع پیر پستھی میں پنجاب کے تمام ضلعوں پر سبقت رکھتا ہے  
 اور شاہ جی چاہتے تو یہاں کی عزت اور عوام کی سادگی سے پورا فائدہ اٹھا سکتے  
 تھے۔ علاقے کے من وارا نہیں سونے کے برابر وزن کرتے لیکن وہ دیہاتیوں  
 کے ساتھ کھاتے پیتے اور انہی کے گھروں میں کھڑتے، جہاں ایک طرف طحیل  
 ڈنگر بندھے ہوتے اور تمام کمرہ گوبر کی بدبو سے اٹا ہونا مگر شاہ جی کی پیشانی  
 پر کبھی مشک نہ پڑتی۔ تیس برس اسی جدوجہد میں گزرے جس نے اسلام اور انسانیت  
 کے حق میں بہتر نتائج پیدا کیے۔

## ایک واقعہ

ڈیرہ غازی خان سے چالیس میل دور حاجی پورہ نامی گاؤں میں ایک  
 بزرگ کی خانقاہ پر عرس کے دنوں لوگ بڑے افعال کے مرتکب ہوتے تھے۔  
 اتفاقاً اسی سال شاہ جی کا گزر ڈیرہ غازی خان سے ہوا، تو آپ نے مذکورہ  
 گاؤں میں جانے کا فیصلہ کیا۔ اس ارادے کی اطلاع جب ضلع کے انگریز ڈپٹی  
 کمشنر مسٹر ایل، اے، گل کو ہوئی تو اس نے شاہ جی پر پابندی عائد کر دی کہ وہ  
 حاجی پورہ نہیں جا سکتے۔ شاہ جی نے ڈپٹی کمشنر کا یہ حکم مان لیا لیکن شہر میں اپنی  
 تقریر کی منادی کرادی اور رات چلے میں ڈپٹی کمشنر بھی صبح اپنی بیگم کے شاہ جی



کی تقریر سننے آیا۔ شاہ جی کو اس کا پتہ چل گیا۔ دورانِ تقریر ڈوچی مکشتر کو خطاب کرنے ہوئے کہا،

”مستر ڈوچی مکشتر! اگر آپ نے مجھے سماجی پورہ جاننے سے روک دیا۔ اگر میں وہاں جاتا تو لوگوں کو بھنگ، پیرس اور اسی قسم کی دوسری عشیات سے منع کرتا کہ بزرگوں کے مزارات فاجح خوانی کے لئے ہوتے ہیں اس قسم کی بڑی چیزوں کے لیے نہیں ہوتے خیراب میں تمہیں اسلام سمجھانا ہوں۔ اگر تم مع اپنی بیوی کے مسلمان نہ ہو جاؤ تو میرا نام بخاری نہیں۔  
یہ سن کر ڈوچی مکشتر فوراً جلسہ گاہ سے چلا گیا۔“

## ہتھکڑی

۱۹۳۹ء میں شاہ جی ڈیرہ غازی خان گئے تو حلقہ احباب سے پوچھا کہ یہاں مسز می دوست محمد لو مار کون ہیں؟ میں انہیں بلنا چاہتا ہوں۔ دوستوں نے وہ پوچھی تو کہا، ان کے ماتھ کی بی بی ہوئی ہتھکڑی نے مجھے ہمیشہ آرام پہنچایا اور وہ میرے ماتھ میں پوری اترتی ہے۔ جنوب مغربی پنجاب پولیس کے لیے ہمیشہ مسز می دوست محمد نے ہتھکڑیاں جیسا کی ہیں اور ہر ہتھکڑی پر انگریزی کے حروف ایلم ڈی، ایم کنڈہ ہوتے ہیں جنہیں پڑھ کر شاہ جی نے انہیں بلنے کی خواہش کی۔ چنانچہ بڑی مشکل سے مسز می صاحب کو تلاش کیا گیا۔ شاہ جی ان سے ملے تو وہ بہت خوش ہوئے اور شاہ جی ہتھکڑی کے موضوع پر ان سے



گھنٹوں گفتگو کرتے رہے۔

”ہتھکڑی کے لئے کس قسم کا لوہا استعمال ہوتا ہے؟ اس کے مانچے کیسے تیار کیے جاتے ہیں؟ اس پر کوئی سرکاری پابندی ہے یا نہیں؟ بعض محسوم پولیس کی موجودگی میں ہتھکڑی اتار کر فرار ہو جاتے ہیں، یہ کیسے؟“  
ان سوالات میں شاہ جی نے اس قسم کا مزاج پیدا کیا کہ تمام محفل کشتِ رحمان بنی رہی۔

## ملائن کا محشم

سادثہ کر بلا انسانیت کے دامن پر اس نذرِ عظیمِ داغ ہے کہ دیوائے عزت، وجہ اور شیل مل کر بھی اس داغ کو دھونا سچا ہیں تو اپنا سامنے لے کر رہ جائیں اسلام نے جو اصول وضع کئے تھے خالوادہ نبوت نے اپنے خون سے ان اصولوں کی پائتھا کی اور قیامت تک کے لئے ضابطہ حیات میں ایسا سنگِ میل نسب کیا کہ آنے والا ہر مسافر اسی پگڈنڈی پر گامزن رہ کر منزلِ حیات کا نشان پاسکتا ہے۔

صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ سنی نوع انسان نے اس جانکاہ حادثہ کو شدید رنج و غم سے محسوس کیا لیکن دو قسم کے عوام نے واقعہ کو بلا کو بظاہر زیادہ محسوس کیا۔ اول وہ جنہیں احکامِ شریعت سے نا آشنا رہی اور اس طرح سے وہ نمائشی جذبات کا مظاہرہ کرنے میں زیادہ کامیاب ہوئے۔ دوسرے وہ جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کی قربانی کو بطور پیشہ کے اپنا یا محرم الحرام کے ونوں میں



تجزیہ داری میں جو لوگ نالہ و شیون کے طریقے اختیار کرتے ہیں ان میں بعض ایسے افراد بھی شامل ہوتے ہیں جن کے پیش نظر مندرجہ بالا مقصد کے سوا دوسرا کوئی اصول کار فرما نہیں ہوتا۔

سال ۱۹۲۹ء کی آخری ششماہی میں جب شاہ جی ملتان گئے تو محرم کی رسم تجزیہ داری دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ تیرہ روز تک شہر کے مختلف محلوں میں اس رسم کے خلاف تقریریں کیں۔ جس کی بنا پر مخصوص عقائد رکھنے والے لوگ اس قدر مشتعل ہوئے کہ شاہ جی کے خلاف شہر میں باقاعدہ محاذ قائم کر لیا گیا اور اس قدر اشتعال پھیلایا کہ آخری دن جب "عام خاص باغ" میں جلسے کا اعلان ہوا تو شہر کے خان بہادر، انیری، جھڑیٹ اور سرکاری قسم کے دوسرے لوگوں نے انگریزوں کی طرف سے کہا کہ اگر آج عطا اللہ شاہ نے ملتان میں تقریر کی تو وہ قتل ہو جائے گا۔ تو اس پر ڈپٹی کمشنر نے خان بہادر سید حسن بخش گروینری، انیری، جھڑیٹ سے کہا،

"اگر تمہارے اس اشارے کے بعد عطا اللہ شاہ قتل ہو گیا تو میں نہیں بطور مجرم کے گرفتار کر لوں گا۔"

ملتان کی فضا شیعہ سنی منافرت سے گدلی ہو چکی تھی اور واقعی اس دن یہ خوف تھا کہ شاہ جی قتل کر دیئے جائیں گے۔ جماعتی دوستوں نے بھی شاہ جی کی خدمت میں درخواست کی کہ آج شہر میں آپ کے خلاف حالات اس قدر زہریلے کر دیئے گئے ہیں کہ آپ کی جان خطرے میں ہے۔ لہذا آپ اگر آج جلسہ میں کوئی ایسی بات نہ کہیں تو بہتر ہے۔ اس پر شاہ جی نے کہا:-



”میرا جواب وہی ہے جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کے معاملہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو دیا تھا۔ اگر تم سب ڈرتے ہو تو میں آج اکیلا جلسے میں جاؤں گا اور وہی بات کہوں گا، جو میرا ضمیر کہے گا۔“

ملتان کی عوامی تاریخ میں اس قدر اجتماع دوبارہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ پولیس جلسہ کے چاروں طرف ہر طرح کے کیل کانٹوں سے لیس کھڑی ہے۔ تمام فرقے اپنی اپنی حفاظت کے لئے تیار ہیں۔ دلوں میں جذبات، آنکھوں میں خون، سینوں میں انتقام کے شعلے موجزن ہیں کہ شاہ جی اپنے حلقہ احباب کی معیت میں جلسہ گاہ پہنچے۔

دن کی روشنی مستقبل قریب میں ایک سیاہی کے ایمان کے امتحان کا پھر سے نمائش دیکھنا چاہتی ہے۔ شاہ جی نے اسٹیج پر آتے ہی کلام پاک کی تلاوت شروع کی۔ قریباً پون گھنٹہ قرأت کے بعد داستان کہ بلا اس انداز سے بیان کی کہ سارا مجمع آہ و فغاں کرنے لگا۔ جیسے جیسے دھوپ کی تہارت بڑھتی جاتی، شاہ جی کا زور بیان نکھرتا جا رہا تھا۔ دوران تقریر آپ نے کہا،

”ان پاک شخصیتوں کے دن ضرور مناؤ! جو قومیں اپنے آباؤ اجداد کے نشان چھوڑ دیتی ہیں، ان کی تاریخ بے نشان ہو کر مرٹ جاتی ہے۔“

شیعہ حضرات سے خطاب کرتے ہوئے کہا،

”کون بد بخت تمہیں اپنے عقیدے سے منع کرتا ہے لیکن میرے



عزیز و! میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ، فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا،  
 بی بی زینب رضی اللہ عنہا اور معصوم سکینہ رضی اللہ عنہا کے ماتم کے لئے تمہیں بازاری  
 عورتیں ہی ملتی ہیں؟ اس طاہر خاندان کے پاک اور صاف لباس  
 پر گندی نالی کے پھینٹے اڑانے ہو؟ تم کیسے حسین کے نام لیا ہو؟  
 اپنے ہاتھ سینوں پر نہیں اللہ کے آگے پھیلاؤ کہ وہ ہمیں ان  
 پاک رُوحوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ میں تو تمہیں  
 نیکی کی بات بنا رہا ہوں اور تم ہو کہ میرے قتل کا سامان کر رہے  
 ہو۔ اگر واقعی عطا اللہ شاہ قتل کے قابل ہے تو یہ سینہ حاضر ہے۔  
 اس موقع پر شاہ جی نے جذبات سے اپنا گریبان چاک کر لیا۔ بس پھر کیا  
 تھا، سارا مجمع بے اختیار چیخیں مارنے لگا۔ اور شاہ جی بار بار کہہ رہے تھے:-  
 "نکالو، اپنے اپنے خنجر! سید کا سینہ حاضر ہے۔ تم نے پہلے  
 بھی ایک سید مسافر کو قتل کیا تھا، آج پھر اس سنت کو تازہ  
 کرو! میں سید بھی ہوں اور مسافر بھی!!"  
 شاہ جی اس وقت قرآن کریم کی بار بار تلاوت کر رہے تھے۔ آخر جب  
 سارا جلسہ اپنے آئسو ختم کر چکا تو آپ نے جلسہ ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔  
 جلسہ کے اختتام پر خان بہادر چودھری ناظر شاہ ابدیشیل و سرتکٹ مجسٹریٹ  
 ملتان اور حاجی رانجھا شاہ مال آفیسر ملتان نے آگے بڑھ کر شاہ جی کے گھٹنوں  
 کو چھوا اور کہا،  
 "آج شہر کا امن آپ کے ایک ایک بول کا محتاج تھا۔ اللہ آپ کو جزائے



خیر دے کہ آپ نے امن بحال رکھنے میں ہماری امداد کی۔  
 اس جلسہ کے بعد کئی سال تک تعزیرہ داری کے جلوس میں "اُس بازار" کا  
 سلسلہ بند رہا۔

## شاد ایل

عیسائی قومیں عالم اسلام کے خلاف ابتدائے آفرینش سے عجیب و غریب  
 حربے استعمال کرتی آئی ہیں۔ کہیں اپنی اکثریت کے سہارے اور کہیں حکمرانی کے  
 زور پر۔ لیکن اسلام باوجود مظلوم ہونے کے صرف اپنی حقانیت کی بنا پر پروان  
 چڑھتا رہا۔

مغذہ ہندوستان میں عیسائی حکمرانوں نے نئے نئے حیلے بہانوں سے  
 اسلام اور مسلمانوں کو دوسری اقوام کی نظر میں اپنی غلامی کے زور پر رسوا کرنے میں  
 ایسی حرکتیں کیں کہ جن کی وجہ سے خطرہ ہونے لگا تھا کہ مسلمان اپنی قدریں مٹا کر  
 کفر کی آغوش میں امان ڈھونڈنے سہارے ہیں، لیکن دیوبند اور علی گڑھ کا لچ سے  
 فارغ التحصیل رہنماؤں نے فرنگی حکمرانوں کی قلبی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے  
 بیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح سامنے آکر حکمران جماعت کے تمام ہتھیار بیکار  
 کر دیئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تو اکثر قانون ہندوستان میں ایسے وضع کیے گئے  
 جن کی براہ راست زور اسلام پر پڑتی رہی۔ لیکن غیر ملکی نظام حکومت ان سے پیچھا نہ  
 رہ کر اپنا کام کرتا رہا۔

۲۳ ستمبر ۱۹۲۹ء کو دہلی سنٹرل اسمبلی کے ہندو ممبر مسٹر سربھاسی شاردوا نے



ایک مسودہ قانون پیش کیا جو آگے چل کر شارو ابل اور شارو ایکٹ کے نام سے مشہور ہوا۔

شارو ابل بظاہر ہندو سوسائٹی کی اصلاح سے متعلق تھا لیکن اس کے پس منظر میں ایک ایسا ادھیچا وار تھا کہ جس کی ضرب سے احکام شریعت براہ راست متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ بل پر بحث سے قبل یہ سوال سامنے آیا کہ یہ بل صرف ہندو عوام تک رہے گا یا ہندوستان کے تمام مذاہب اس سے متاثر ہوں گے۔ اور اکثر مسلمان ارکان نے بغیر علماء کے مشورہ کے اس بل کی تائید کر دی۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء کو یہ بل پاس کر دیا گیا۔ نیز یکم اپریل ۱۹۳۰ء سے اس پر عملدرآمد ہونا منظور کیا گیا۔

جمعیتہ العلماء نے ہند نے قرآن کریم کے واضح ارشاد کی روشنی میں شارو ابل کو مداخلت فی الدین قرار دے کر اس کے نفاذ سے پیشتر اس قانون کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ انبالہ سے پرلی طرف مولانا احمد سعید اور پنجاب سے سرحد تک کے اضلاع شاہ جی کے سپرد کیے گئے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء سے یکم اپریل ۱۹۳۰ء تک دونوں رہنماؤں نے اپنی اپنی ذمہ داریوں کے پیش نظر ہزاروں ناپالغ بچوں کے نکاح پڑھا کر اور عوام کو اس کی ترغیب دے کر انگریزوں کے اس قانون کو سمیٹنے کے لئے دفن کر دیا۔ آج بھی پنجاب اور سرحد میں سیکرٹوں گھرانے ایسے ملیں گے جنہیں شاہ جی نے اس زمانے میں آباد کیا تھا۔

شارو ایکٹ جس کا محرک بظاہر غیر مسلم تھا۔ جس کی رو سے اٹھارہ سال



سے کم عمر لڑکی اور اکیس سال سے کم عمر لڑکے کی شادی قانوناً جرم قرار دے دی گئی تھی عیسائی حکومت کی قانونی قوت نے اسے ایسی زندگی بخشی کہ اگر اس پر حمل درآمد ہوتا تو اسلام کے اصول بڑی طرح مجروح ہوتے۔

سرگودھا، میانوالی، گجرات، بہلم، پنجاب میں ایسے اضلاع ہیں کہ انگریزی عملداری میں یہ علاقے فوجی مرکز سمجھے جاتے تھے۔ ان پر کسی انگریزی قانون کا عا جلازہ اطلاق مشکل نہیں تھا، مگر شاہ جی نے شب و روز کی تقریروں سے ان علاقوں میں شادوا ایکٹ کو ناکارہ بنا دیا۔ ہر فرد نے شاہ جی کی کوہانہ پر لبیک کہا اور شادوا ایکٹ کی دھجیاں بکھیر دیں۔

## مجلس احرار کی صدارت

نہرو رپورٹ کی ناکامی کے باعث ہندوستان کے سیاسی افق پر واقعات کے نئے بادل اُٹھ اُٹھے۔ ہواؤں کا رخ اس انداز سے تبدیل ہوا کہ سارا ہندوستان تلخی محسوس کرنے لگا۔ سائمن کمیشن کی ناکام واپسی کے بعد گاندھی جی نے انگریزوں کو چیلنج کیا کہ اگر ۱۹۲۹ء کے آخر تک نہرو رپورٹ کے فارمولہ کو منظور نہ کیا گیا، اور اسے سرکاری حیثیت نہ دی گئی تو میں عدم تشدد کی لڑائی شروع کر دوں گا۔ برطانوی حکومت گاندھی جی کی اس تجویز کو ہواؤں میں اڑا کر مستقبل کا انتظار کرنے لگی۔ انگریزی حکومت کی اس بے اعتنائی کے سبب دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور میں دریائے راوی کے کنارے آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر گاندھی جی نے نہرو رپورٹ کو دریائے راوی کی لہروں کے سپرد کر دیا۔



مسلمان رہنماؤں نے گاندھی جی اور کانگریس کی اس حرکت کو سکھوں کی  
 بے جا حمایت اور مسلمانوں سے نا انصافی قرار دے کر اپنی علیحدہ تنظیم کا فیصلہ کیا  
 چنانچہ مولانا لکلام آزاد کی تجویز پر نیشنلسٹ مسلمانوں نے آل انڈیا کانگریس کے  
 پنڈال میں چودھری افضل حق کی زیر صدارت ایک اجلاس منعقد کیا جس میں شاہ جی  
 کے علاوہ مولانا ظفر علی خان، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، شیخ حسام الدین،  
 خواجہ عبدالرحمان غازی، مولانا مظہر علی اظہر اور دوسرے مسلمان رہنما شامل ہوئے  
 اس اجلاس میں مجلس احرار کی بنیاد رکھی گئی اور شاہ جی کو پہلا صدر منتخب کیا گیا۔

## تمکین ستیہ گرہ

مجلس احرار کی بنیاد کے ساتھ ہی کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس میں  
 مکمل آزادی کی قرارداد منظور کر کے اقوام ہند کو آزادی وطن کے لیے اہتمام و  
 قربانی کی نئی دعوت دی۔ مسلمان جس نے سلطان حیدر علی ٹیپو، حضرت شاہ ولی اللہ  
 دہلوی آف جھانسی اور ۱۸۵۷ء جیسی تحریکات میں فرنگی سامراج کے خلاف جہاد  
 آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا، کانگریس کی اس دعوت کو نظر انداز کرنا مناسب  
 نہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ مجلس احرار کے رہنماؤں نے بھی نئی عمارت کی تعمیر کو غامضی  
 طور پر روک دیا اور سب کے سب کانگریس کے ہمنوا ہو کر آزادی کی نئی جدوجہد  
 میں شامل ہو گئے۔

۱۹۲۹ء کے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی اٹھتی شعاعوں نے شخص کی  
 سرخیوں میں ایسا رنگ بھرا کہ ۱۹۳۰ء کا سال ظلام ہندوستان کے لیے مصائب



دالام کی بے شمار آزمائشیں اپنے ساتھ لایا۔ شدھی اور سنگٹن، تحریک شاتم  
 رسول، شاروا ایکٹ ایسی فرقہ وارانہ تحریکات ہنوز ہندوستان میں اپنے کام میں  
 مصروف تھیں۔ شاہ جی ان کے فیصلوں سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ مجلس اسرار  
 کی صدارت نے شاہ جی کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ جماعت نے جنگ  
 آزادی میں کانگریس کے دوش بدوش لڑائی لڑنے کا فیصلہ کر کے شاہ جی کو مزید  
 الجھا دیا۔

علامہ غیر ملکی آقاؤں سے آزاد ہونے کے لیے زندگی کا آخری اثاثہ  
 لے کر میدان کارزار میں اپنی صفیں درست کرنے لگے۔ کھن بر دوش مجاہد شہادت  
 کی لے پر خون کے گیت چھیڑ کر شہادت گاہ اُلفت کی طرف رواں دواں ہوئے  
 جیل خانے، ہتھکڑیاں، پھانسی کے تختے، مشین گنیں، بید زنی، لاکھی چارج، پولیس  
 فوج، انگریزی سامراج اپنے ظلم و جور کی یہ ساری پونجی جمع کرنے میں مصروف ہو  
 گیا۔ یہ وہی دن تھے جب لاہور میں سردار بھگت سنگھ اور مسرطی کے، دت کو موت  
 اور عبور دیائے شور کی سزائیں سنائی جا چکی تھیں۔ اور پورا ملک انگریزی حکومت  
 کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔ ہاتما گاندھی نے ۱۳ مارچ ۱۹۳۰ء  
 کو ٹانڈی ضلع گجرات (کاٹھیاواڑ) میں نمک بنا کر انگریزی قانون کی خلاف ورزی  
 کرنے کا اعلان کیا اور بہتر آدمیوں کا جھنڈے کر اپنے سر کرنے سے رواتہ ہوئے  
 اور گرفتار کر لیے گئے۔ اس گرفتاری کے ساتھ ہی سارے ہندوستان میں نمک  
 سنیہ گره کی تحریک شروع ہو گئی۔



## امیر شریعت کا اعزاز

پیشتر اذیٰں نخریر کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی ابتری نے ملک کا امن و سکون تہہ و بالا کر دیا تھا اور یہ خانہ ویرانی اسلام کی ترقی کی راہ میں ٹنگ گئی تھی۔ ہندو کے طرز عمل نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے لیے شہادت کی موت تلاش کریں تاکہ ہندوستان میں خاص کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابر و محفوظ رہ سکے۔ شذھی و سنگھٹن، شمار و ایکٹ، تحریک شاتم رسول کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے کمزور اور قبیل تعداد مسلمانوں کو اس قدر ہراساں کر دیا تھا کہ علمائے کرام کی اپنی ذمہ داریاں بھی مخدوش نظر آنے لگی تھیں۔ خطیب شہر کی اذیٰں بے اثر ہو رہی تھی۔ صحیح حرم اور مسجد کے مینار اپنی رونق کی تلاش میں سرگرداں تھے کہ مارچ ۱۹۳۳ء کے آخری ہفتے میں لاہور میں انجمن خدام الدین کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری نے فرمائی۔ وقت اور حالات کی موجودگی میں علمائے ہندوستان کا یہ تاریخی اجتماع تھا۔ دوسرے علمائے کے ساتھ شاہ جی بھی اس جلسے میں شریک ہوئے۔ ہزاروں کا اجتماع تھا۔ صدارتی تقریر ہو رہی تھی کہ شاہ جی جلسہ گاہ میں پہنچے۔ حضرت انور شاہ صاحب فرما رہے تھے:-

دین کی قدریں بگڑ رہی ہیں۔ کفر چاروں طرف سے یلغار کر چکا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کو اپنے لئے ایک امیر کا انتخاب کرنا چاہئے۔ میں اس کے لئے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو منتخب کرتا ہوں۔ وہ نیک بھی ہیں اور بہادر بھی۔ اس وقت تک انہوں نے فتنہ شاتم رسول اور



نثار وا ایکٹ کے سلسلے میں جس جرأت اور دلیری سے دین کی خدمت انجام دی ہیں، آئندہ بھی ان سے ایسی ہی توقع ہے۔  
 یہ کہہ کر حضرت انور شاہ صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ شاہ جی کی طرف بھائے اور شاہ جی نے اپنے دونوں ہاتھ حضرت انور شاہ صاحب کے ہاتھوں سے کر فرمایا:-

”آپ یہ نہ سمجھیں کہ حضرت نے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے بلکہ حضرت نے مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمایا ہے۔“  
 یہ جملے کہہ کر شاہ جی زار و قطار رونے لگے اور ان کا سارا جسم کانپنے لگا اس کے بعد باقی علماء نے جن کی تعداد اس وقت پانچ سو کے قریب تھی شاہ جی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا احمد علی لاہوری سرفہرست تھے۔

حصولِ زندگی میں مذہب ایسے جذبات کا مجموعہ ہے جس کا عقل انسانی احاطہ نہیں کر سکتی اور نہ ہی فکر و تدبیر میں ان کا وزن کیا جاسکتا ہے۔ جنوں شوق ہی البتہ اس کسک کو محسوس کرتا ہے۔ پھر غمزدگی آگ ہو یا دریائے نیل کی موجیں وہ ان تمام خطرات کی دعوت پر لبیک کہتا ہے۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۰ء تک فرنگی عملداری میں کفر و ارتداد نے اصول اسلام، داعی اسلام اور مسلمانوں پر وقت کے مختلف مٹوں سے جس طرح بے محابا خشت باری کی حضرت امیر شریعت نے سینہ سپر ہو کر ان سے ٹکراؤ لیا اور بامراد ہوئے۔ حضرت انور شاہ صاحب اور دیگر پانچ سو مقتدر علماء کا

آئندہ شاہ جی کی بجائے امیر شریعت کا لفظ آئے گا۔



سید عطاء اللہ بخاری کو امیر شریعت کا اعزاز بخشا انہی خدمات کا صلہ تھا اور منظور  
کی کٹی امیدیں ان سے وابستہ تھیں۔

## امریکہ میں جمعیتہ علمائے ہند کا اجلاس

مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد ستیہ گروہ کی تحریک میں خاصا ہیجان پیدا ہوا  
سول نافرمانی کے ذریعے رضا کار، کارکن، رہنما جیل خانوں میں جا چکے تھے مجلس  
کے سوا باقی مسلم جماعتیں اور خاص کر جمعیتہ علمائے ہند جو نہرو رپورٹ میں اختلاف  
کے باعث کانگریس سے الگ ہو چکی تھی اچھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی۔ مولانا شبیر  
مدنی آزادی وطن کی تحریکات میں کانگریس سے اشتراک کے حامی تھے۔ مولانا شبیر  
عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی، الگ اپنی رائے رکھتے تھے۔ نہرو رپورٹ سے  
علیحدگی کے باعث علی برادران نے بھی جمعیتہ العلماء علیحدہ بنالی تھی جسے دوسرے  
گروہ کی تائید حاصل تھی۔

ہندوستان میں اس کشمکش نے مسلمانوں کو من حیث القوم کسی فیصلے پر پہنچنے  
کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ اول الذکر گروہ نے ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو امرہ ہر ضلع  
مراد آباد میں اپنا ایک اہم اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ جمعیتہ علماء کا یہ تاریخ  
اجتماع تھا جس میں جمعیت کی آئندہ پالیسی پر غور ہونا تھا۔

امیر شریعت پنجاب میں سول نافرمانی کا آغاز کر چکے تھے۔ حکومت ان کے  
تد مقابل آپکی تھی اور گرفتاری کی تیاریوں میں تھی کہ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے  
جو ان دنوں گرفتار ہو کر لدھیانہ جیل میں تھے، امیر شریعت کو کسی طرح جان بچھڑے



بھیانہ بلا بھیجا۔ امیر شریعت لدھیانہ ڈسٹرکٹ جیل کے سپرنٹنڈنٹ پنڈت من موہن  
 موٹر میں لدھیانہ پہنچے اور نصف رات گئے سپرنٹنڈنٹ جیل کے ذریعے ہی وہ مولانا  
 بیب الرحمن سے ملے۔ وہیں فیصلہ ہوا کہ امیر شریعت راتوں رات پنجاب کی حدود  
 سے نکل کر امر وہ پہنچنے کی کوشش کریں تاکہ جمعیت علمائے ہند کو مجبور کیا جائے کہ وہ  
 لاشرط آزادی وطن کی تحریک میں کانگریس سے اشتراک کرے۔ چنانچہ ۲۲ مئی کو امیر شریعت  
 امر وہ پہنچ چکے تھے۔

علی برادران کی جمعیت العلماء کا اجلاس بھی انہی تاریخوں وہلی میں ہو رہا تھا۔  
 دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ بند تھیں۔ جمعیت علمائے ہند کے خلاف امر وہ کے عوام  
 میں مخالفین نے مشہور کر دیا تھا کہ یہ ہندوؤں کے ذریعہ ہیں، وہابی ہیں، نجدی ہیں،  
 پیروں کے دشمن ہیں۔ انگریزوں سے لڑ کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا سچا ہتھیہ ہے وغیرہ  
 وغیرہ! اس پروپیگنڈے سے گمراہ ہو کر مقامی رضا کاروں نے جمعیت کے جلسوں کا  
 ارادہ ملتوی کر دیا تھا لیکن امیر شریعت نے امر وہ پہنچ کر حکم دیا:-

”آج ہم مفتی ہیں۔ جلسوں کے نکلے جانے میں ہمارا فتویٰ سچلے گا۔  
 لہذا امر وہ کے بازاروں میں جلسوں نکلے گا اور اس کی رہنمائی ہم  
 خود کریں گے۔“

جلسوں عربی لباس میں جمعیت علماء کے رضا کاروں نے اونٹوں پر نکالا اور ہر اول  
 دستے میں امیر شریعت کا اونٹ سب سے آگے تھا۔ یہ ۲۲ مئی کا واقعہ ہے۔ اسی رات  
 امر وہ میں امیر شریعت کی تقریر کا بھی اعلان کیا گیا جس میں مخالفین نے اپنی پوری قوت  
 کا مظاہرہ کیا۔ لیکن امیر شریعت کی تقریر جو بعد نماز عشاء شروع ہو کر رات تین بجے



تک جاری رہی، یہی کسی کو لب کشائی کا موقع نہ ملا۔ دورانِ تقریر دو آدمی بے پروا ہو گئے۔ یہ دونوں راستے میں اختلاف رکھتے تھے لیکن امیر شریعت کی تقریر سے متاثر ہوئے کہ ان کے اعضا مثل ہو گئے۔

۳۱ مئی کو جمعیتہ علمائے ہند کا تاریخی اجلاس مولانا سید معین الدین اجمیری

صدارت میں شروع ہوا جس میں مولانا مسقط الرحمن سوہاروی کی تجویز پر بحث شروع کی کہ جمعیتہ علمائے ہند کو کانگریس کی تحریک سول نافرمانی میں شامل ہو جانا چاہئے۔ تجویز کی تائید مولانا حسین احمد مدنی نے کی۔ اس قرار داد کی مزید تائید میں حضرت شریعت نے تین دن (۱۷، ۱۸، ۱۹) تقریر کرتے ہوئے دلائل و برہان کے انب لگا دیئے۔ اس تاریخی تقریر کے مختصر جملے ملاحظہ فرمائیے جو حسب ذیل ہیں:-

”علمائے کرام! اختلاف کی تحریک کے بعد ایک اور وقت آیا ہے کہ ہم عالم اسلام کے دشمن فرنگی سے جس کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا مگر اسلام کے غروب ہونے کا خطرہ بڑھ رہا ہے ایسی جنگ لڑیں کہ وہ ہندوستان کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ اگر ہم بحیثیت مسلمان انگریز کو یہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو یاد رکھیں اس سے نہ صرف عرب ریاستیں بلکہ تمام بلادِ اسلامیہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائیں گے۔“

یہ ہندو کو بھی اپنا دوست قرار نہیں دیتا لیکن اس کی دشمنی ساحل سمندر تک محدود ہے مگر انگریز تو سمندر پار تک اسلام کا تعاقب کر رہا ہے۔



اگر میں اپنے چھوٹے دشمن (ہندو) کے ساتھ مل کر انگریزوں کے  
اسلام کے بڑے دشمن کو شکست دے سکوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ  
سودا کوٹی ہنگامہ نہیں ہوگا۔

علمائے کرام! اگر میرا میں چلے تو میں انگریزوں کو مارنے کے  
لئے سوڑوں سے اتحاد کرنے میں بھی گریز نہ کروں۔ کیوں کہ اُس کی  
زندگی سے اسلامی تہذیب و تمدن اور انسانیت کی موت ہو جائے  
گی اور اُس کی موت سے اسلام اور مسلمان زندہ ہو جائیں گے۔ اسلامی  
ممالک میں اتحاد بڑھے گا۔ مسلمانوں میں رُوح جہاد جاگ اٹھے گی۔  
جو مسلمان انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر خانہ کعبہ پر گولی چلاتا  
ہے اور پیران پیر کے روضہ پر حملہ آور ہوتا ہے وہ پھر اپنے  
مقامات مقدسہ کی حفاظت کرے گا۔ لہذا میری درخواست ہے  
کہ آپ دین اسلام کے لئے، مسلمانان عالم کی آزادی کے لیے  
کانگریس سے تعاون کریں۔

ہندو اتنا طاقتور نہیں ہے کہ ہم اُس سے مخالفت ہو کر عالم  
اسلام کی امداد کو نظر انداز کر دیں۔ یار لوگ کہتے ہیں کہ ہندو مسلمان کو  
کھا جائے گا۔ حضرات! یہ کس قدر جھوٹ ہے۔ یہ مرغی کی ایک  
ٹانگ تو کھا نہیں سکتا وہ میرے ایسے مسلمانوں کو کیسے سٹم کر سکتا ہے۔  
ہندو تہذیب یا اُس کی دشمنی گنگا سے کاشی تک ہے لیکن  
اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جس کی بنیاد سمندر کی انتہا گہرائیوں



سے اُسما نوں کے آخری جہانوں تک ہے۔ اگر اس بیاد می اور  
 سچے مذہب کی حفاظت چاہتے ہو تو عیسائی حکمرانوں سے ہندوستان  
 کو نجات دلاؤ۔

اپنی تقریر کے دوران امیر شریعت قرآن کریم سے سورہ بقرہ کے اکثر  
 حصے تلاوت کرتے رہے۔ آخر تین دن کی مسلسل بحث کے بعد ۶ مئی کو جمعیت علمائے  
 ہند نے مولانا حفظ الرحمن کی قرارداد کو بغیر کسی اختلاف کے منظور کر لیا۔

## وارنٹ گرفتاری

پنجاب پولیس امیر شریعت کے وارنٹ لے کر امر وہم پہنچی دوسری طرف  
 امر وہم میں امیر شریعت نے جو تقریر کی قانون نے اُسے بھی پسند نہ کیا۔ چنانچہ  
 ایک وارنٹ یہاں بھی تیار ہو گیا۔ چنانچہ اطلاع ملی کہ امر وہم کی پولیس آج کسی وقت  
 امیر شریعت کو گرفتار کرے گی۔ یہ سن کر مقامی کارکنوں نے ۷ مئی کی رات کو امیر  
 شریعت کی تقریر کا اعلان کر دیا۔

پولیس اس خیال میں رہی کہ دن کی گرفتاری سے عوام میں ہنگامہ نہ ہو۔ رات  
 جب وہ جلد سے فارغ ہو کر قیام گاہ پر آئیں گے گرفتار کر لیں گے۔  
 جیلے کی ابتدائی تقریر مولانا احمد سعید دہلوی کی تھی لیکن لوگ امیر شریعت کی  
 تقریر کے منتظر تھے۔ پولیس اپنی جگہ مطمئن تھی۔ رات دو بجے مولانا احمد سعید نے اپنی  
 تقریر کے دوران گٹھی دیکھ کر کہا،

”اوہو! کافی رات جا چکی ہے اور آپ لوگ سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر



کے انتظار میں ہوں گے۔ چلو پھر سنا لینا۔ اب میں جلسہ برخواست کرتا ہوں۔  
 اس اعلان کے بعد پولیس امیر شریعت کی تلاش میں نکلی تو معلوم ہوا کہ وہ  
 جلسہ شروع ہوتے ہی امر وہہ سے نکل گئے تھے۔ مانتے آیا ہوا شکار ضائع ہونے  
 پر شکاری کس قدر شرمندہ ہوتا ہے۔ امر وہہ کی پولیس اپنے اقدام کی ناکامی پر  
 سخت شرمندہ ہوئی۔

دوسرے دن اطلاع ملی کہ امیر شریعت الہ آباد سواراج بھون میں پنڈت  
 موتی لال نہرو کے ہال مہمان ہیں۔ پنڈت جی امیر شریعت کی تقریر اور تلاوت قرآن  
 کریم سے متاثر تھے۔ رات الہ آباد میں امیر شریعت کی تقریر ہو رہی تھی کہ پولیس نے  
 چاروں طرف سے جلسے کا محاصرہ کر لیا۔ پولیس کی اس حرکت سے امیر شریعت کی  
 گرفتاری کا شبہ ہوا تو دیکھتی نظروں نے جلسہ گاہ میں جو ایک منٹ پہلے روشنی سے  
 بقتہ نور ٹھٹھا تاریک اور حیران کنجا آتے تھے میں معلوم ہوا۔ کہ امیر شریعت اپنے  
 میزبان کی کار پر الہ آباد سے جا چکے ہیں حالانکہ وہ سواراج بھون ہی میں مقیم تھے۔  
 دوسرے روز جب پولیس کو اطمینان ہو چکا کہ امیر شریعت ان کی حدود سے  
 نکل گئے ہیں تب امیر شریعت پنڈت موتی لال نہرو کی ہمراہی میں آگرہ پہنچے۔ جلسے  
 کا اہتمام پیشتر سے ہو چکا تھا۔ پروگرام کے مطابق عین وقت پر امیر شریعت کی  
 کار قلعہ کے میدان میں پہنچی۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں فرشِ راہ تھے۔ خطبہ مسنونہ کے بعد  
 حسب عادت مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تو ایک کونے سے آواز آئی،  
 ”تم نے اگر حکومت کے خلاف یا کانگریس کے حق میں کوئی بات کہی تو قتل  
 کر دیئے جاؤ گے۔“



جیسے ہی امیر شریعت نے اذان کی طرف توجہ دی تو شہر کے قصاب ہاتھوں  
 میں چھڑے اور کلہاڑیاں اٹھائے ایک کونے میں کثیر تعداد میں کھڑے تھے اور دیکھتے  
 رہی دیکھتے مجمع پھیر کر امیر شریعت کے سامنے اکھڑے ہوئے۔ بلوائیوں کی اس حرکت  
 سے جلسے پر خوف و ہراس جاری ہو گیا۔ خود پنڈت موتی لال نہرو پریشان ہوئے۔ پولیس  
 بطور تماشاخی کے سامنے کھڑی رکھیل دیکھتی رہی۔ اتنے میں امیر شریعت نے قرآن کریم  
 کی تلاوت شروع کی اور سورہ بقرہ کے دو رکوع پڑھ کر ترجمہ کرنا چاہا لیکن مفسدوں نے  
 اس کی بھی اجازت نہ دی۔ اسی کشمکش میں رات نصف ہو چکی تھی۔ شاہی قلعہ اور تاج محل  
 کی چڑشکوہ عمارتیں مسلمانوں کے انھیلاط کی مانند قابل غور دیواروں کو گرتے دیکھ کر اور خاموش ہو گئیں  
 جیسے جیسے رات بھگتی جا رہی تھی جلسے پر نیند کا غلبہ برسر رہا تھا مگر امیر شریعت اور ان  
 کے قاتل آمنے سامنے کھڑے تھے۔

ملک الموت کو صند ہے کہ جہاں لے کے ٹلوں گا

چھوڑا ہے صند ہے کہ میری بات رہے

اسی گھینچا تانی میں مرغ سحر نے اذان دی اور امیر شریعت نے سورہ یوسفؑ  
 کی تلاوت شروع کر دی۔ رات کی موت پر طلوع سحر کی پیدائش کا لہجہ لاپتے ہوئے  
 زندگی نے انگریٹائی لی۔ اگرہ کے حوام نے رات بھر تماشا دیکھا کہ قاتل اور مقتول  
 مقتول میں اپنی ذمہ داریوں کے تول ٹل رہے ہیں مگر نہ قاتل کے ہاتھ اٹھے اور نہ  
 مقتول کی گردن جھکی۔

کلام اللہ اور امیر شریعت کی زبان، نسیم صبحگاہی، ان سب نے قاتلوں کے  
 عزائم پر نیند کا بوجھ ڈال دیا۔ امیر شریعت نے تقریر شروع کی جو دن کے نونے



تک جاری رہی۔ گو سامعین کی تعداد میں بدستور کمی آتی گئی، مگر معرکہ حسن و باطل میں امتیاز کرنے والے عشاق بدستور جھے رہے۔ اس دوران مخالفین کو زبان درازی کی جرات نہ ہوئی، حالانکہ صبح سب کے سب امیر شریعت کے قدموں میں آگرے اور رات بھر کی گستاخیوں کی ہزار بار معذرت چاہی۔

## قائدانہ حملہ

نمک کی ستیہ گہ کے دنوں حکومت کی طرف سے ہر ضلع کی پولیس کو اختیار تھا کہ جس مقرر کو چاہے گرفتار کر سکتی ہے۔ ہندو نشان بھر کے سیاسی کارکن کچھ تو گرفتار ہو چکے تھے اور کچھ روپوش ہو کر شریک کی رہنمائی کر رہے تھے۔ کانگریس کی سرگرمیاں خلاف آئین قرار دی جا چکی تھیں لیکن امیر شریعت کی سرگرمیاں گورنمنٹ آف انڈیا کے لئے قابل اعتراض ہی نہیں، بلکہ قابل برداشت حد تک پہنچ چکی تھیں۔ اس وقت تک پنجاب اور صوبہ یوپی سے امیر شریعت کے خلاف بیس وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے اور انگریزی قانون کے محافظ نشان پائے امیر شریعت کی تلاش میں سرگرداں تھے امیر اور آگرہ کی شکست کے بعد حکومت اور حکومت پرست نے منصوبے بنا کر دھنسنے لگے جس سے وہ بڑھتے ہوئے طوفان کا راستہ روک سکیں۔

صوبہ یوپی سے فارغ ہو کر امیر شریعت علیٰ غیبی پہنچے۔ حالات فرنگی قانون سے بغاوت کا علم تھامے کھڑے تھے۔ واقعات کے ماتھے سامراج کے خلاف جلتی آگ کو دامن دل سے ہوا دے رہے تھے۔ ساحل سمندر سے لگتی ہوئی موجوں نے آگے بڑھ کر امیر شریعت کے قدم لینے۔ رات بندرہ وڈ پر سب سے کا اعلان کر دیا گیا۔ لاکھوں کی آبادی کا شہر بندرہ وڈ



پراٹھ آیا۔ اگرہ کی شکست کا انتقام لینے خواہہ تا شانِ برطانیہ اپنے ارادوں سے مسلح  
جملے کی صفِ اول میں جگہ سنبھال چکے تھے۔

تالون اور وقت جب ایک دوسرے سے متصادم ہوں تو دلوں سے بغاوت  
کا پھوٹ نکلنا اچھیجی کی بات نہیں۔ آزادی ہند کی تحریک میدانوں سے نکل کر پہاڑوں  
اور سمندروں تک جا پہنچی تھی۔ بغاوت کے الاؤ اس قدر روشن تھے کہ برطانوی راج  
کا وجود خطرے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ایسے وقت میں برطانوی باغی کا بھٹی پہنچنا  
حکومت کے لئے ناپسندیدہ تھا۔ فیکٹریوں کا شہر جہاں چینوں کے دھوئیں سمندر  
کی وسعتوں کو بادلوں کا فریب دیتے ہیں۔ یہاں کے انسان دولت کے انبار پر  
کھڑے ہو کر انسانیت کو بہت اونچائی سے دیکھتے ہیں۔ کارخ امراء کی بلند و بالا  
چوٹیاں اوجی کو دیکھنے میں جہاں ہمیشہ فریب خوردہ ہوں وہاں انگریزوں کے خلاف بات  
کرنا اپنے بخت کو بگڑے ہوئے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ لیکن امیر شریعت نے  
بھٹی کے عوام کو خطاب کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ انگریزی سامراج کے خلاف  
جلیٹی ہوئی بھٹی میں مزید ایندھن کا اضافہ ہو سکے۔

امیر شریعت نے خطبہ مسنونہ کے بعد تقریر شروع کی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”غلامی سب سے بڑا گناہ ہے اگر اس گناہ سے نکلنا ہے تو اس  
سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ ہم انگریزوں کے خلاف پرامن لڑائی میں شریک  
ہو جائیں۔“

یہ فقرہ اچھی نا کمل تھا کہ مجمع میں سے کسی نے تیز دھار کی چھری امیر شریعت  
کی طرف زور سے پھینکی جسے ایک نوجوان نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنے سینے



پر روک لیا اور یہ ضرب اس قدر شدید تھی کہ محتوی دیر بعد نوجوان کا انتقال ہو گیا۔ مقتول نورا خاں نامی کوٹاٹ کارہنے والا اکیس سالہ بچہ تھا۔ نورا خاں کی موت سے امیر شریعت کی جان بھی لیکن نورا خاں کے خون سے غیر ملکی سامراج کا وقار آخر کو مسٹ کو رہا۔ گو نورا خاں کا قاتل گرفتار نہ ہو سکا مگر تحقیق پر معلوم ہوا کہ چھری زہرا لوبو بھتی اس انفرافری میں امیر شریعت پولیس کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

## گرفتاری

اگرہ اور ملیٹی کے قاتلانہ حملوں کے بعد امیر شریعت نے اس ضلع کو فوراً چھوڑ دینا مناسب سمجھا۔ چنانچہ ایک ماہ کے پیدل اور سنگلاخ راستوں پر خاموشی سے سفر کرنے کے بعد کلکتہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہندوستان بھر میں ہر ضلع سے گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ حالات کے غیر مطمئن ہونے کے باعث امیر شریعت کے لیے ایک جگہ قیام غیر ممکن تھا۔ کلکتہ کے عوام جو ۱۹۰۵ء (تقسیم بنگال) سے انگریزوں کے خلاف دہشت پسندی اختیار کر چکے تھے، کانگریس کی تحریک سے بھی تعاون کر رہے تھے۔ امیر شریعت کے اس دور میں دورہ سے سیاسی حالات کو اور جلال گئی آپ نے دیہات، قصبات اور شہری عوام کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر ابھارا۔ آخر ۱۹۳۰ء کو دیتاج پور (بنگال) میں دفعہ ۱۰۸ کے تحت گرفتار کر لئے گئے۔ وارنٹ تو بہت تھے لیکن مقدمہ صرف ضلع علی پور کی ایک تقریر پر چلا۔ چونکہ کانگریس نے انگریزی عدالتوں سے عدم تعاون کا حکم دے رکھا تھا لہذا امیر شریعت نے عدالت کی تمام کارروائی سے عدم تعاون کیا۔ آخر ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو چھ ماہ قید بامشقت کی



سزا ہوئی۔

علی پور جیل سے آپ کو ڈوم ڈوم جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔ جہاں تمام ایام  
اسیری گزارے۔

---



۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء

باب سوم

## ڈم ڈم جیل

جیل باوجود اس متحرک دنیا میں ہونے کے اپنے آئین کی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ہر گوشے میں ظلم و انصاف کے درمیان ٹکراؤ رہتا ہے۔ اجنبی حکمران جیلوں میں سیاسی قیدیوں سے بعض ایسے ضابطے منواتے رہے جسے زخمیر پسند کرتا تھا اور نہ ہی دماغ اس پر رضا مند ہوتا تھا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو امیر شریعت جب ڈم ڈم جیل میں داخل ہوئے تو پرنٹنڈنٹ جیل مسٹر سیمی (جو بعد میں بنگالی دہشت پسندوں کے ہاتھوں مارا گیا) نے امیر شریعت کو حکم دیا کہ اپنے سر سے گاندھی کیپ اتار دیں۔ یورپین پرنٹنڈنٹ کے مطالبہ پر امیر شریعت نے کہا:

”اول تو یہ گاندھی کیپ نہیں، ہاجل کیپ ہے۔ اور یورپی کے اکثر شرقا

اسے پہنتے ہیں۔ دوسرے میں اسے کلاس کا قیدی ہوں۔ مجھے اپنا ہر طرح

کا ذاتی لباس پہننے کا قانونا حق ہے۔“

پرنٹنڈنٹ نے جواب میں کہا:



علماء کی رائے ہے کہ یہ گاندھی کیپ ہے لہذا آپ اسے جیل کے اندر نہیں لے جا سکتے۔

امیر شریعت: میں خود عالم ہوں اور میں جانتا ہوں کہ ویو بند کے علماء عام طور پر یہی کیپ پہنتے ہیں۔ لہذا میں اسے نہیں اتاروں گا۔

یہ بحث تمام دن رہی۔ آخر امیر شریعت کامیاب ہوئے۔ لیکن ابتداء کی یہ لڑائی سزا کے اختتام تک وجہ نزاع بنی رہی۔ جیل میںوں نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو محدود اختیارات سونپ رکھے ہیں۔ تڑپتے ہوئے جانور کی طرح قید کا تماشہ تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن لہلہ کے زخموں پر مرہم کا رواج اس مقتل میں نہیں۔ امیر شریعت کو بڑی حیثیت کے قیدی تھے لیکن تھے تو قیدی۔ زنجیر سونے کی ہو اور خوراک میں یا قوت استعمال ہوں تب بھی قفس قفس ہے۔ قفس آشیاں نہیں ہوتا۔

## رستم زماں سے ملاقات

دنیا کے شہ زور اور فن پہلوانی میں اپنے وقت کے رستم زماں غلام حسین عرف گاما پہلوان نون والے کے آباؤ اجداد آج سے قریب پندرہ صدی پیشتر ہمارے گلاب سنگھ والی کشمیر کے تشد کے باعث کشمیر چھوڑ کر امرتسر آباد ہو چکے تھے۔ ان کے والد عزیز بخش پہلوان سیٹاپور ناجی ریاست کے سرکاری پہلوان تھے۔ اور یہیں ان کی شادی ریاست کے نامی گرامی نون پہلوان کی لڑکی سے ہوئی جس کے لہن سے غلام حسین نے جنم لیا۔ والد کی موت کے باعث غلام حسین کی



پر مدتش ان کے نانا فونو پھانوں کے سپروہیٹی۔ چونکہ ابتدائی زمانہ کی ذہن پہلو ان  
 کی گود میں پر دان چڑھی تھی لہذا ساری زندگی گاما پہلو ان کو اور اولے کے ہاں سے  
 نسلی اتہیز کی آگے ایسے دلیں میں بھی روشن ہوتی ہے جن کے نزدیک یہ اتہیز  
 گناہ کی آخری منزل قرار دی گئی ہے۔ امیر شریعت اور مستم زمانہ گاما پہلو ان کے  
 درمیان بظاہر کوئی واٹھانہیں ملتا لیکن ڈونڈو شاہی کے ساتھ سے کشتیری شاہی  
 جب پنجاب آکر آبد ہوسے تو جہاں جوں کا یہ تو اور ایک ایسی بیادری اور خاندانی  
 عصیت اپنے ساتھ لایا کہ مقامی باشندوں کے رسم و رواج انہیں اپنے اندر  
 جذب نہ کر سکے۔ امیر شریعت کشتیری، مستم زمانہ کشتیری، دو لوں امرتسر میں مقیم  
 اس کے علاوہ امیر شریعت کی یہ مانی دودھ پھتی کہ چڑیا گھر یا امرتسر میں شہر کو  
 اور اکھاروں میں پہلو انوں کو دیکھنا بہت پسند کرتے۔ ان وجوہ کی بنا پر امیر شریعت  
 اور مستم زمانہ کے درمیان کئی رشتے مشترک بنے۔ چنانچہ جب کبھی فرصت ہوتی  
 امیر شریعت مستم زمانہ سے ملنے جاتے اور اکثر مستم زمانہ بھی لاہور یا امرتسر  
 میں انہیں ملنے آتے تھے۔

ان دنوں مستم زمانہ بنگال کے دور سے پرتھے کہ انہیں امیر شریعت کے  
 ڈوم ڈوم جیل میں قید ہونے کی اطلاع ملی۔ ملاقات کا قصد سے کہ پہلو ان جیل پہنچے  
 تو امیر شریعت اور پہلو ان کے درمیان تپیش آگے آئی۔ امیر شریعت کی  
 خواہش تھی کہ پہلو ان اندر ملاقات کریں۔ اس میں ان کا اصرار تھا لیکن پہلو ان  
 کا اتفاقاً تھا کہ امیر شریعت نام قیدیوں کی طرح جنگلے میں ملاقات کریں۔ اس میں  
 امیر شریعت کی توہین تھی کہ وہ اسے کھانوں کے شاہی قیدی تھے۔ سارا دن اسی



کھینچا تانی میں گزر گیا۔ آخر پورٹنڈنٹ کو مارمانٹی پڑی اور دستم زمان نے جیل کے اندر امیر شریعت سے ملاقات کی۔ اس موقع پر بنگالی قیدیوں نے خواہش کی کہ پہلو کپڑے اتار کر اپنے بدن کی نمائش کریں۔ قیدیوں کے تقاضے پر دونوں مسکرائے اور دستم زمان نے لنگوٹا کر کے اپنے جسم کی نمائش کی تو بنگالی قیدیوں نے بے لاشما کہا — "سپے مانس!" (ارے یہ انسان!)

امیر شریعت نے ایام اسیری ضائع نہیں کیے بلکہ سویٹل کمار نامی بنگالی قیدی سے آپ سٹو انگریزی پڑھنی شروع کی اور سویٹل کمار امیر شریعت سے ٹرائی کریم پڑھنا رہا۔ متبادل تعلیم کی ودیش ہوئیں۔ صبح سویٹل کمار قرآن کریم پڑھتا تھا اور شام کو امیر شریعت انگریزی پڑھتے۔ وقت اسی طرح گزرتا گیا۔

## رہائی

آخر جنوری ۱۹۳۱ء میں گاندھی اردن پیکٹ کے تحت ٹھیک سٹیہ گره کی رطائی بند کر دی گئی۔ تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے۔ امیر شریعت بھی اسی موقع پر رہا ہوئے۔

بہادر پھر سال بڑوں نہیں ہوتا۔ امیر شریعت کے چچا سیامیم شاہ پولیس آفیسر تھے اور ان دنوں کلکتہ میں تعینات تھے۔ جیل سے رہا ہو کر امیر شریعت چند دنوں کے لئے اپنی کے ٹال ٹھہر سے ٹونڈرا سے اساطرہ کر لیا لیکن وینڈر آفیسر نے انگریز کے باغی کہ پناہ دینے میں کسی قسم کی آہ خصوص نہ کی۔ قانون اور فرانس کے درمیان دل و دماغ منحصوا دم رہے لیکن خاندانی شرافت نے جہان بھتیجے کے



لئے پیشانی کو شکن آلود نہیں ہونے دیا۔

## مجلس احرار کی تشکیل نو

۱۱ جولائی ۱۹۲۱ء کو اسلام آباد کالج لاہور کے جدید تالی میں اسرار کا نفرنس  
نفا پہلا اجلاس مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں حضرت  
امیر شریعت، چودھری افضل حق، خواجہ عبدالرحمان خانہ نقی، مولانا مظفر علی عثمانی شیخ  
سہام الدین، مولانا محمد واؤ وغزنوی، مولانا مظہر علی اظہر اور دوسرے مسلمان رہنما  
شامل ہوئے۔ اس اجلاس کی آخری قرارداد میں جدا گانہ انتخاب کی پوزیشن  
کی گئی جس سے کانگریس اور ہندو پرپرسن خصوصاً سواں بانٹتے ہو گئے۔ اجلاس کے  
اقتناع پر پنجاب بھر میں اسرار کے وفاتر قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ کام  
حضرت امیر شریعت کے سپرد ہوا اور آپ اپنے رفقاء کو لے کر اس پر وگرام  
کو سرانجام دینے کے لیے پنجاب کے دورہ پر روانہ ہو گئے۔

## گاندھی جی سے ملاقات

اسی سفر کے دوران پنجاب کی حدود سے نکل کر جب امیر شریعت دہلی  
اور یوپی کے اضلاع میں پہنچے تو گاندھی جی کی لندن روانگی کا پتہ چلا۔  
گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے لندن روانہ  
ہونے والے تھے۔ اسرار رہنماؤں کی رائے تھی کہ انگریز کی میز پر بیٹھ کر ہندوستان  
کی قسمت کا فیصلہ غلام مانگا کا لیڈر نہیں بلکہ غیر ملکی حکومت کا اقتدار ہی کر سکتا ہے۔



۲۱ اگست ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی جب بمبئی پہنچے تو امیر شریعت بھی اپنے  
 رفقاء کے ساتھ انہیں ملنے کے لئے بمبئی پہنچ گئے۔ آپ نے گاندھی جی کو  
 گول میز کانفرنس میں شمولیت سے منع کیا۔ گاندھی جی نے احرار رہنماؤں کی رائے  
 کو وزن تو دیا لیکن لندن جانے کا ارادہ ترک نہ کیا۔

### میکینگ کالج کا حادثہ

ستمبر ۱۹۳۱ء کے آخر کا واقعہ ہے کہ میکینگ کالج لاہور کے انگریز پرنسپل  
 مسٹر ڈیکیر نے مسلمان طلباء کی دلداری کرتے ہوئے کلاس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ  
 علیہ وسلم کی ذات گرامی پر ایسے رشتی حملے کیے جس سے مسلمان طلباء آپس سے  
 باہر ہوا۔ اور کالج سے سڑاٹیک کر دی۔ محمد علی جناح نے طلباء نے مرکزی کمیٹی  
 بنا لیا اور پرنسپل کے خلاف باقاعدہ ایجنڈیشن شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں طلباء کا وفد  
 شاعر مشرق علامہ اقبال کی قیام گاہ پر پہنچا۔ واقعات سن کر ڈاکٹر صاحب نے  
 انہیں احرار رہنماؤں سے ملنے کا مشورہ دیا۔

بمبئی سے واپسی پر دفتر مجلس احرار میں امیر شریعت گاندھی جی سے ملاقات  
 کی یہ پورٹ آپسے سائنٹیوں کے سامنے پیش کر رہے تھے کہ طلباء کا وفد انہیں ملنے  
 کے لیے آن پہنچا۔ حالات اور واقعات سے تحریک کے زیادہ پھیلنے کا احتمال  
 ہوا۔ اسی رات مورچہ دروازہ کے باغ میں امیر شریعت کی تقریر کا اعلان کر دیا گیا۔  
 لاکھوں کا مجمع تھا۔ حکومت پنجاب انگریز پرنسپل کی پشت پناہ تھی۔ رات دس بجے  
 امیر شریعت نے نشریہ شروع کی اور دو بجے رات تمام مجمع کو سناٹے سے کر



راتوں رات میکلیگن کالج کے دروازے پر پہنچ کر ڈیرہ ڈال دیا۔ صبح ہونے تک سارا لاہور میکلیگن کالج کے دروازے پر تھا۔ پولیس کے انتظامات کے باوجود حالات ہر آن بگڑنے جا رہے تھے لیکن امیر شریعت مصداقینے رفقا مولانا محمد واڈو وغزنوی، مولانا صدیق الرحمن لدھیانوی عوام کو ہر قسم کی قانون شکنی سے روکتے رہے۔ گرفتاریاں شروع ہوئیں تو مولانا محمد واڈو وغزنوی اور مولانا احمد علی گرفتار کر لیے گئے۔ دن بھر کی ہنگامہ آرائی نے شام ہونے تک جھگڑے کو اس قدر مختصر کر دیا کہ پرنسپل نے طلباء سے معافی مانگ لی اور کالج سے خارج شدہ طلباء دوبارہ داخل کر لیے گئے۔ گرفتار ہونے والے رات ہونے تک رہا کر دیئے گئے۔ اس طرح حضرت امیر شریعت اور جماعت کی ایک دن کی ہیبت نے انگریز پرنسپل کو بچھا ڈیا۔

## تحریک کشمیر

تحریک کشمیر میں مجلس احرار اور حضرت امیر شریعت کی شرکت کا سبب سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس تحریک کا مختصر پس منظر بیان کر دیا جائے۔ ہمارا بڑا بڑا ہر ہی نگہ والی کشمیر نے ریاستی نظم و نسق سنبھالنے ہی غریب عوام اور کسانوں پر ٹیکسوں کی بھرمارہ کر دی۔ اس مظلوم طبقہ کی کٹھالی کی ساری پونجی مایاں اور آبیانہ کی نظر ہو جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ کشمیر کے غریب عوام موسم سرما میں کشمیر سے نکل کر پنجاب کے میدانی علاقوں میں محنت مزدوری کے لیے پھیل جابا کرتے۔ یہ حالات تھے کہ عوام نے اپنے جائز حقوق معوانے کے لیے باقاعدہ تحریک



کا آغاز کر دیا۔ انہی دنوں ریاست جموں میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس سے  
ہندو حکمران اور مسلمان رعایا کے تعلقات خاص طور پر الجھ گئے اور آخر کار یہ  
تحریک ریاست سے باہر بھی پھیل گئی۔

حادثہ یہ تھا کہ جموں میں ریاستی پولیس کا ایک مسلمان سپاہی اپنی بیمرک میں  
قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا کہ بغیر کسی نزاع کے ایک ہندو سفیاسی نے سپاہی کے  
ہاتھ سے قرآن کریم چھین کر زمین پر رسے مارا۔ کتاب اللہ کی توہین نے تمام نظم و نسق  
کو پریشان کر دیا۔

عوام، کسان اور خصوصاً مسلمان حکومت کشمیر کے خلاف بروداڑنا ہو گئے۔  
یہی وہ زمانہ تھا کہ شیخ عبداللہ کشمیری عوام سے لیڈر کی حیثیت سے روٹنٹاں ہوئے  
ان کی تقریروں نے کشمیری عوام کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا کر مہاراہہ کے سامنے  
لاکھڑا کیا۔ ان تصادم میں حکومت کی طرف سے ہتھے مسلمانوں پر گولیاں چلیں  
اور خون بے گناہ سے دیا گئے جہلم کی بھری ہوئی موبیں کٹاؤں سے ٹکرانے لگیں۔

ایسے حالات نے پنجاب کے مسلمان کو بھی چونکا دیا اور پریس نے  
حالات کے بیدار کرنے میں وقت کی خوب معاونت کی۔ انہی دنوں سر فضل حسین  
نے شملہ میں چنڈر جنت پسند مسلمانوں کے تعاون سے کشمیر کمیٹی کی بنیاد رکھی جس  
کے صدر قادیان کے مرزا بشیر الدین محمود اور سیکرٹری عبدالرحمان درو و مرزا انٹی کو  
نامزد کیا۔ میاں صاحب اس کمیٹی کے نگران مقرر ہوئے۔

کشمیر کمیٹی کی تشکیل کے ساتھ ہی مرزا انٹی خلیفہ نے سرکار پرست مسلمان  
رہنماؤں کو اس کمیٹی کا رکن نامزد کر لیا۔ پچانوچہ علامہ سر محمد اقبال کو بھی اس میں شامل کر لیا



گیا۔ احرار رہنماؤں کو جب اس ڈرامے کا علم ہوا تو وہ علامہ اقبالؒ سے ملے۔ انہیں حالات سے آگاہ کیا کہ آپ کی وجہ سے نہ صرف کشمیر کا بنس لاکھ مسلمان مرزائی ہو جائے گا۔ بلکہ بیرونی ممالک کے مسلمان بھی اس فریب سے متاثر ہوں گے۔ لہذا آپ کو کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کا اعلان کر دینا چاہئے۔ چنانچہ دوسرے ہی روز بרכת علی محمد نال میں کشمیر کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس میں تحریک کشمیر کی ساری ذمہ داری مجلس احرار کے سپرد کر دی گئی۔

مجلس احرار کی درکنگ کمیٹی نے اپنے لاہور کے اجلاس منعقدہ ۱۸ اگست میں تحریک کشمیر کو باضابطہ چلانے کا فیصلہ کیا۔ انگریز ریاستی حکام اور مرزائی حالات سے ہر گھڑی باخبر تھے۔ مجلس احرار کے فیصلے کی روشنی میں آنے والے نئے طوفان کا خوف دلا کر انگریز نے اپنے بااعتماد آدمی ہرشن کول کو کشمیر کا وزیر اعظم بنا دیا۔

## دند کی روانگی

اوائل اکتوبر ۱۹۳۱ء میں چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر اور خواجہ غلام محمد دند کی صورت میں کشمیری حکام سے بات چیت کے لئے جموں روانہ ہوئے۔ انگریز اور مرزائی اپنی اپنی اوٹ سے جھانک رہے تھے کہ احرار رہنما سرنگپور پہنچے۔ ڈوگرہ شاہی منتظر تھی کہ دند کے ارکان کو کسی شیشے میں اتار لیں گے۔ راج محل کا تمام جل جلاؤ اپنی امیدوں میں ناکام رہا۔ احرار رہنماؤں کا ضمیر زبیر نے والے شاہی سوداگر گداؤں کی طرح ہر روز ملاقات کو آتے گئے اور پانچ سو روپے کی



موجودوں پر تیرنے والا شاہی ہاؤس بوٹ ہر روز دیکھتا کہ شاہی بیٹیوں سے شکست  
کھا رہی ہے۔ آخر وفد ناکام لوٹ آیا۔

## امیر شریعت کی گرفتاری

وفد کے کسمپوش جانے سے پیشتر حضرت امیر شریعت نے پنجاب کو اپنی  
تقریریں سے گما کر میدان کارزار کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اسرار کے سرخ  
پوش جیوش کشمیری سرحدیں عبور کرنے کے لیے حکم کے منتظر تھے۔ وفد کی ناکام  
واپسی پر ڈوگرہ شاہی کی انگلیں اور برطانوی جیل خانے مجاہدین کے انتظار میں تھے۔  
مجلس اسرار ہنوز سول نامہ رانی کے نقشے سوتل رہی تھی کہ ۱۵۔ اکتوبر  
۱۹۳۱ء کو ۱۲ بجے تحت حضرت امیر شریعت کو دہلی میں گرفتار کر لیا گیا اس  
گرفتاری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے شریک کشمیر کے ڈکلیئر اول مولانا مظہر علی  
ظہر نے ۱۸ اکتوبر کو واٹسٹرائے ہنڈ کے نام حسب ذیل مکتوب تحریر کیا:-  
"عام طور پر یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے  
خلاف جو وفد ۱۲ بجے لگائی گئی ہے۔ اس میں مرزا بشیر الدین محمود  
کا بھی نام تھا ہے۔ میری اطلاع ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری  
کے خلاف کارروائی کرنے کی منظوری ویسٹمنسٹر کی ذمہ دار صرف  
حکومت دہلی ہی نہیں ہے۔"

بہر حال حکومت ہنڈ اور حکومت پنجاب کی پوزیشن خواہ کچھ  
ہی ہو۔ عام نا اطمینانی ہے کہ حکومت پنجاب نے دوسری پارٹی



مرزاٹی کی جو صلہ افزائی کی خاطر ایک پارٹی کو ہدف بنایا ہے  
 ہماری جماعت (احرار) کے لوگ کسی سیاسی مقصد کے  
 حصول کے لئے جیل جانے سے نہیں ڈرتے۔ ایک دوسری  
 جماعت کی خاطر ہماری جماعت کو تختہ مشق بنانا کسی طرح کوئی  
 سازگار نصاب پیدا نہیں کر سکتا۔

سرکاری اعلان یا کسی دوسرے ذرائع سے اس امر کی  
 ترمیم کافی نہ ہوگی۔ اگر حکومت رائے عامہ کو مطمئن کرنا چاہتی ہے  
 تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ مقدمہ واپس لے لے لے اور اگر  
 کسی صوبے کی حکومت سید عطا اللہ شاہ کو مجرموں زنداں کرنے کی  
 مشتاق ہے تو وہ اس کے لئے دو سب سے مواقع تلاش کر سکتی ہے۔  
 مولانا مظہر علی کے اس مکتوب کے جواب میں حکومت خاموش رہی اور اس  
 مقدمہ میں امیر شریعت کو ڈیڑھ سال قید با مشقت کی سزا دے دی گئی۔

## پورٹل جیل

نومبر ۱۹۳۱ء میں جلس احرار نے کشمیری عوام کی امداد کے سلسلے میں ریاست  
 پور پختا شروع کی۔ پہلے سے پیر پور، راولپنڈی سے کرالہ، راولپنڈی سے پشاور  
 کے راستے احرار رضا کار ریاست کی حدود میں داخل ہوتے۔ انہیں یا تو گرفتار کر  
 لیا جاتا یا وہ ریاستی حکام کے ظلم و سحر کا نشانہ بن کر زخمی ہوتے۔ اس طرح تقریباً  
 تین ماہ کی مسلسل لڑائی کے نتیجے میں سپاہیں ہزار مسلمان سبیلوں میں گئے اور یا پھر توڑا



نے تمام شہادت نوش کیا۔ اجنبی حکمران اس دوران تماشائی بنا رہے مگر ڈوگرہ شاہی کا  
 پیچھے ہٹنا چکا تھا۔ لہذا اس نے ایک طرف انگریزی حکومت سے اور دوسری  
 طرف جمعیت علمائے ہند کو درمیان میں لا کر احرار سے صلح کی گفتگو کرنا چاہی۔  
 اس موقع پر احرار اور گنگ پٹی کے تمام ممبران کو پنجاب کی مختلف جیلوں سے لاہور  
 بورڈل جیل میں منتقل کیا گیا۔ جس میں حضرت امیر شریعت بھی شامل تھے۔

وہی سے حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید ناظم جمعیت  
 علمائے ہند حکومت کشمیر کے ایما پر احرار رہنماؤں سے صلح کی گفتگو کے لیے لاہور  
 پہنچے۔ دونوں حضرات صبح نو بجے جیل تشریف لائے اور چار بجے شام واپس چلے  
 جاتے۔ آخر ایک ہفتہ کی ناکام گفتگو کے بعد جمعیت علماء کے رہنما واپس چلے  
 گئے۔ حالات نے نئی کر دٹی۔ مہاراجہ کی درخواست پر انگریزی حکومت  
 نے احرار رضا کاروں کی گرفتاریاں شروع کیں اور ریاست کے قیدی انگریزی  
 جیلوں میں تبدیل کر دیئے گئے۔

حضرت امیر شریعت ان دنوں بورڈل جیل کی بارڈر لائن میں تھے۔ جیل کا  
 یہ حصہ دس سال سے کم عمر بچوں کے لئے مخصوص تھا جو مصوم احرار رضا کاروں  
 سے بھرا ہوا تھا۔ امیر شریعت ان بچوں کے درمیان رات دن کھیل کود میں مصروف  
 رہتے تاکہ بچوں کو اپنے گھر اور والدین کی یاد نہ تھائے۔ اس طرح ایشیا کے عظیم  
 خطیب اور ہندوستان کے سیاسی اور مذہبی رہنما نے جس کی ایک لاکھ ایوان  
 برطانیہ میں زلزلہ پیدا کر دیتی تھی، جماعت کے بلند مقاصد اور کشمیری عوام کی غلامی  
 کے خلاف قید خانے کو کارِ طفلاں بنا دیا تھا۔



انگریز اور مہاراجہ کے سمجھوتے نے تحریک احرار کا رخ براہ راست  
برطانیہ کی طرف موڑ دیا۔ اب ہندوستان میں کانگریس اور احرار کی تحریکیں ساتھ  
ساتھ چل رہی تھیں۔ انہی دنوں امیر شریعت اور دوسرے احرار رہنماؤں کو  
نیوسٹرل جیل عثمان تبدیل کر دیا گیا۔

کانگریس کی جدید سول تافرمانی کے باعث جمعیتہ علماء کے رہنما پہلے  
سے عثمان جیل میں موجود تھے جن میں مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی،  
مولانا احمد علی لاہوری، مولانا محمد داؤد غزنوی، شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی ظہر  
مولانا نور الدین بہاری، مسٹر آصف علی، مولانا مرتضیٰ احمد میمن، مولانا حبیب الرحمن  
درصیانوی شامل طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان مذہبی اور سیاسی بلند مقام شخصیتوں کے  
باعث جیل کا احاطہ باقاعدہ علمی مجالس میں منتقل رہنے لگا۔ ۱۹۳۱ء سے  
۱۹۳۲ء تک یہ روٹیں جاری رہیں۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ میجر فضل الدین جو انگریزی  
کے علاوہ جوہنی، ترکی اور ایرانی زبان پر قدرت رکھتے تھے۔ ان علمی محفلوں میں برابر  
شریک رہتے اور استفادہ ہوتے تھے۔

## ایک ماں کا اپنا

یوں تو ہزاروں ماؤں نے اپنے بچوں کو تحریک کشمیر کے لئے اپنے ہاتھوں  
کفن بردوش روانہ کیا لیکن بورٹل جیل لاہور میں ملاقات کے دوران جب ایک ماں  
اپنے بچے کو تسلی دینے کے لئے اس کا سولہ بڑھارہی تھی، امیر شریعت نے بچے کی ماں  
سے کہا:



”بچے سے پوچھو اسے کوئی تکلیف تو نہیں۔“

ماں نے مسکراتے ہوئے ابدیدہ نگاہوں سے کہا:

”سیڈا! میں نے اپنا گودی واپتر دی تیرے حوالے کرنا آئی آں۔“

میں تو اپنی گود کا بچہ بھی تمہارے سپرد کرتے آئی ہوں،

جواب میں امیر شریعت نے ماں کے ان جذبات کو اسلام کے لیے

زندہ رہنے کی دعا فرمائی۔

## جیل سے رہائی اور رکھوں سے ٹکراؤ

(دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد گاندھی جی اور دوسرے رحمت

پسند ہندو مسلمان رہنماؤں نے برطانوی وزیر اعظم مسٹر پیئر سے میٹنگ انڈیا کو اپنا

تالش مقرر کر لیا۔ برطانوی وزیر اعظم نے ۱۴ اگست ۱۹۴۲ء کو اپنا تالیفی فیصلہ

سناتے ہوئے تمام ہندوستان میں مخلوط انتخاب رائج کرنے کی تجویز دی۔ اس

تالیفی فیصلہ کی تفصیلات میں پورے ملک میں مخلوط انتخاب، سندھ کی علیحدگی، اچھوتوں

کے لیے برحیثیت ایک قوم جداگانہ انتخاب کا حق اور پنجاب و بنگال میں مسلم اکثریت

کو تسلیم کیا گیا۔

اس تالیفی فیصلہ سے سکھ بے حد بدبھم ہوئے۔ چنانچہ اکتوبر میں ماسٹر تارا سنگھ

نے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اگر پنجاب میں مسلم راج قائم کرنے کی طرح ڈالی

گئی تو ہم شیخوں کی شریاں بھاریں گے۔

سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی طرف سے اس قسم کی ہتھکڑی صحیفیں گرم کھٹن کے



۲۶ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو امیر شریعت ملتان نیو سنٹرل جیل سے اپنی معیاد امیری گزار کر رہا کر دیئے گئے۔ ان دنوں دیگر احرار رہنما بھی پیشتر ازیں رہا ہو چکے تھے۔ (سکھوں کی مسلسل اشتعال انگیزی کے باعث پنجاب کا مسلمان حالات سے مقابلہ کے لیے تیار تھا کہ مجلس احرار نے سکھوں سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جماعت نے حضرت امیر شریعت کو منتخب کیا کہ ایک بہت بڑے اجتماع میں سکھوں کے پہنچنے کا جواب دیں۔ چونکہ امرتسر سکھوں کا مرکزی شہر تھا اس لیے قصہ زمین برسر زمین کے مصداق اس شہر کا انتخاب کیا گیا۔ اس اجتماع کی تشریح ایک ہفتہ پیشتر سے شروع کی گئی۔ پنجاب کے اکثر شہروں سے مسلمان امرتسر پہنچ چکے تھے۔ عید گاہ زبیرون رام باغ کے وسیع میدان میں لاکھوں مسلمانوں کا سمندر اُٹا۔ عید گاہ کو اپنی تنگ دامنی کا گنہ کرنا پڑا۔ ہواؤں نے اپنے دامن سنبھال لیے۔ دھوپ نے نمازت کم کر دی۔ آسمانوں کے تارے سورج کی کرنوں سے جھانکنے لگے۔ راتج الوقت قانون کے محافظ امتیاز سے لیس ہو کر دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

نماز عصر کے بعد امیر شریعت اپنے اصحاب کے جلو میں عید گاہ پہنچے۔ خطبہ مسنونہ کے بعد مسلم نوجوان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”غیرت حیران ہو کر آج نوجوان مسلمان کا منہ تکنتی ہے کہ یہی اس قوم کے بے خبر نرند ہیں جن کو انگلیوں پر گنے جانے والی قوم خون کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ جس قوم نے وجہ اور فرات کو اپنے پاؤں تلے روندنا اور تلواروں کے درمیان کھڑے ہو



کر موت کو زندگی کی دعوت دی۔

بے خبر نوجوان! ہوش سنبھال اور عقل کے ناخن سے سکھوں  
سے کہہ دو کہ ہمیں اپنی پایاب ندیوں سے نہ ڈرائیں۔ ہم تو خون  
کے بحر بے کراں میں گھوڑے دوڑانے کے عادی ہیں۔

آخر میں سکھوں سے خطاب کرتے ہوئے صرف دو فقرے کہے :-

دوسرے صا سجان کو میرا مشورہ ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر بات کریں ایسا

نہ ہو کہ مایختوں سے وی ہوئی دانستوں سے کھولنی پڑے اور جس

قوم کے سہارے وہ مسلمان کو خون کی ندیاں بہا دینے کی دھمکیاں

دے رہے ہیں وہ ہندو قوم تو نو سو سال تک ہمارے گھٹنوں تلے

رہی ہے یہ

سیر ندیس

امیر شریعت کی یہی تقریر امرتسر کے بعد سارے پنجاب میں گونجی، جس

سے سکھوں کی لٹکار دھم پڑ گئی۔ آخر گوردوارہ پر بندھک کھٹی لاہور کے ڈومہ دار

رکن سہرا پرتاب سنگھ ایڈوکیٹ نے امیر شریعت کی تقریروں کے بعد اپنے پریس

بیان میں کہا :-

”مسلمان دوستوں نے ہماری بات کا غلط مفہوم لیا ہے۔ ہمارا

جھگڑا تو صرف حکومت اور کانگریس سے ہے۔ مسلمانوں سے

ہماری کوئی لڑائی نہیں۔ سکھ اپنے حقوق کے لئے صرف حکومت

پر دباؤ سے ٹکرائیں گے۔“



## امیر شریعت کو زہر دیا گیا

مئی ۱۹۳۳ء میں امیر شریعت کو مدرسہ عربیہ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے شجاع آباد جانا پڑا۔ خان محمد انور خان کی حویلی میں قاضی احسان احمد کی زیر صدارت امیر شریعت نماز ظہر کے بعد تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو قاضی صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا

"پان نہیں کھڑو گے؟"

قاضی صاحب نے حاجی نور محمد کو پان لانے کے لیے کہا۔ حاجی صاحب تعمیل ارشاد کے لیے چلے ہی بختے کہ برابر کھڑے ایک آدمی نے کہا،

"میں شاہ جی کے سٹے پان لایا ہوں۔"

یہ کہہ کر پان حاجی نور محمد کے ہاتھ میں دیا اور انہوں نے قاضی صاحب کو دیا۔ امیر شریعت نے تقریر کے دوران جب یہ پان منہ میں رکھا تو ایک منٹ کے بعد کہا،

"قاضی جی زہر دے دیا۔"

یہ کہتے ہوئے پان کھڑک دیا اور قاضی جی نے اُسے اپنے ہاتھ پر لے لیا۔ ان کے کہیں امیر شریعت کے جسم پر کسی رنگ سیاہ چڑ گیا اور قاضی صاحب کا ہاتھ بھی پھول کر ڈبل روئی کی طرح ابھرا یا تقریر سمیٹ لی اور جلسہ ختم کر دیا گیا۔ اس واقعہ نے شہر کے عوام کو پریشان کر دیا اور قاضی جی کا تمام گھر پاگل ہو گیا۔ اکثر

۱۔ سالانہ جلسہ احرار کھروٹہ پکا ضلع ملتان



پہن داکس رہا اور سول سرجن نے امیر شریعت کو دیکھ کر تشخص کی کہ انہیں زہر  
دے دیا گیا ہے۔

اسی وقت پیاز کا پانی بڑی مقدار میں تیار کیا گیا۔ ڈاکٹر نے اس پانی سے  
دوا دینا شروع کی تو جسم سے زہر کا رنگ پیشاب اور پاخانے کے راستے خارج  
ہونا شروع ہوا۔ پیاز کے مسلسل استعمال سے رات تین بجے تک جسم کا تمام زہر  
خارج ہو گیا۔ اس دوران ڈاکٹر لچھن داس امیر شریعت کے سر ہانے بیٹھ رہے  
آخر سات بجے تین بجے رات ڈاکٹر نے قاضی صاحب کو مبارک باد دی کہ اب  
شاہ جی خطرے سے باہر ہیں۔

زہر دینے والے کو پوچھا کہ گنہگار کیسے ہو گیا۔ اس کا نام سید  
عنایت اللہ شاہ یا ولایت شاہ تھا۔ بہر حال جب اسے امیر شریعت کے سامنے  
لایا گیا تو امیر شریعت نے اپنے زہر دینے والے سے مخاطب ہو کر صرف اتنا کہا:  
"بھائی! میں نے آپ کا کیا نقصان کیا تھا؟"

پھر پوچھا افسر سے کہا:

"میں اس سے کوئی انتقام لینا نہیں چاہتا۔ خدا بھی اسے معاف فرمائے

آپ بھی معاف کریں۔"

اگر بلوچ پر قانون گرفت کرتا تو ممکن ہے کہ تکاب جرم کا انکشاف ہوتا مگر  
امیر شریعت کی بلند سوجھ بوجھ نے یہ رائے نہ کھینچنے دیا کہ زہر کیوں دیا گیا تھا اور اصل  
جرم کون تھا۔

اگر وہ اور بھی کسی کے بعد امیر شریعت پر قتل کا یہ تیسرا حملہ تھا۔ گو حملوں کی



ذہنیات مختلف رہیں مگر مقصود میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ قاتل اور مقتول بھی ایک دوسرے سے اوجھل نہیں ہوئے۔ چونکہ موت و حیات کے باہم انسانی ارادت کو کوئی دخل نہیں اس لئے موت کا ہر اوجھادار زندگی کی راہ میں مرگ ناگہاں ثابت نہ ہو سکا اور نہ ہی امیر شریعت کے مقاصد میں کوئی دیوار سائل ہو سکی۔

## پنڈت کرپا رام پر بھاری

ابھی دنوں میر پور (کشمیر) کی انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ اجلاس میں امیر شریعت کو شمولیت کی دعوت ملی جسے انہوں نے منظور کر لیا لیکن ریاستی حکام اور برطانوی سامراج کسی طرح بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ امیر شریعت کشمیر کے کسی شخصے میں داخل ہوں۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۳ء کے دوسرے ہفتے کی صبح کو چہ رنگ پور میں امرتسر پولیس کے محاصرہ میں تھا۔ پولیس افسران امیر شریعت سے ایک نوٹس کی تعمیل کرانا چاہتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ امیر شریعت کشمیر کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتے۔ پولیس اپنے ارادے میں مایوس ہوئی کیونکہ امیر شریعت گھر نہیں تھے اس ناکامی کے بعد پنجاب بھر کے تمام پولیس اسٹیشنوں کو مطلع کر دیا گیا کہ یہ عطا افسند شاہ بخاری کو کسی صورت اور کسی راستے سے بھی کشمیر کی حدود میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ نیز تمام ریپورے اسٹیشنوں، لارپوں کے اڈوں اور دوسرے پیدل پہاڑی راستوں پر خفیہ پولیس تعینات کر دی گئی اور اس طرح امیر شریعت کی کھوج میں پوری خیمزئی حرکت میں آگئی۔ امیر شریعت کو حکومت کے اس ارادے کی اطلاع خلیع بالندھر کے ایک گاؤں میں دی گئی۔



انسان اگر اپنے عزم میں مخلص ہو تو آسمانوں کی بلندیاں اس کے قدم لیتی  
 ہیں۔ ستارے فرشِ راہ ہوتے ہیں۔ سورج کی کرنیں اسے چاند کے ماتے تک لے  
 جاتی ہیں لیکن حوصلے کی لپٹی خلوص کی معراج تک پہنچ کر بھی انسان کو اس کی شکست  
 سے نہیں بچا سکتی۔ تمام آئینی پابندیوں کے باوجود امیرِ شریعت نے اپنے وعدے  
 پر میرپور پہنچنے کا فیصلہ کر لیا۔ پولیس اسٹیشن پر کہ امیرِ شریعت اب گھر نہیں آئیں گے  
 اس مورچہ سے غافل ہو گئی۔ اسی رات بارہ بجے امیرِ شریعت گھر پہنچے تو معلوم ہوا  
 کہ میرپور سے کوئی صاحب آپ کو لینے آئے ہوئے ہیں اور اس وقت وہ محلہ  
 کی مسجد میں سو رہے ہیں۔ امیرِ شریعت نے انہیں بیدار کیا اور صبح چھ بجے کی  
 گاڑی روانگی کا فیصلہ کر کے وہیں سو گئے۔ رات چار بجے اسٹیشن کے ایک ویران  
 کونے میں جا پہنچے۔ نیز ساتھی سے کہہ دیا کہ تم گاڑی میں میرے ساتھ نہ بیٹھنا۔ اگر  
 مجھے آواز دینے کی ضرورت ہو تو شاہ جی کی بجائے پنڈت کو پارام برہمچاری کہہ  
 کر آواز دینا۔ ہندی میں پنڈت کے معنی اُدبھی ذات کے ہیں اور مسلمانوں کے ہاں  
 سید سروار کے معنی میں مستعمل ہے۔ گریہ ہندی میں عطا کرنے کو کہتے ہیں اور رام اللہ  
 کے ہم معنی استعمال ہوتا ہے۔ ہندی میں برہمچاری مجھ کو کہتے ہیں۔ امیرِ شریعت نے  
 بخاری کا وزن برابر رکھنے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا۔ اس طرح پنڈت کو پارام  
 برہمچاری سید عطا اللہ شاہ بخاری کے ہم معنی بن گیا۔ اس طرح امیرِ شریعت نے  
 اپنے بلند مقاصد کی ادائیگی اور پولیس کی گرفت سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے  
 نام کا ہندی ترجمہ کر لیا تاکہ پولیس یا کوئی دوسرا سرکاری آدمی چوکس نہ ہو۔  
 نیلے رنگ کا تہ بند، نیم آستین کی واسکٹ، سر پر موٹے کھدر کی سفید کپڑی



اور ہاتھوں سے خالی — لیکن پنجاب پولیس امیر شریعت کو مزہ جو ذیل لباس  
میں دیکھنے کی عادی تھی — سر پر کپڑے کی گول ٹوپی، نیم اسٹین کا لمبا کمر تہا،  
گھٹنوں سے اونچا پاجاما اور ہاتھ میں ایک موٹا ڈنڈا۔

اجنبی لباس میں ملوٹس امیر شریعت نہ تو پولیس سے پہچانے گئے اور نہ  
سفر میں کسی دوسرے مسافر سے۔ جہلم کے اسٹیشن پر اترتے وقت ضرورت پڑی  
تو ہمراہی نے امیر شریعت کو تلاش کے لیے پنڈت کو پارام کہہ کر مسلسل پکارا مگر  
امیر شریعت اُسے ریلوے سٹوڈ سے دور جا کر ملے۔

ہر چکیں غائب بلائیں سب تمام اک مگر مرگِ ناگہانی اور ہے

میرپور، جہلم شہر سے نو میل دور دریائے جہلم کے اُن پار آبادی آباد  
ہے۔ یہ کشمیر کے ان باشندوں پر مشتمل ہے جن کے اکثر افراد اپنی جنگ عظیم میں بھرتی  
ہو کر استعماری فوج کے دوش بدوش لڑ چکے تھے۔ تحریک کشمیر کے دنوں میں بھی  
اس لہتی کے عوام نے اپنی آزادی کے لئے مجلس احرار کے تحت بڑی قربانی کی  
تھی۔ پولیس کے انتظامات امرتسر سے جہلم تک مکمل ہو چکے تھے لیکن مجرم محافظوں  
کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنی منزل کے سامنے کھڑا تھا۔

میرپور کے سامنے سے گزرتے ہوئے دریائے جہلم کی چیخ و پکار سے  
پختروں کے دل دھڑک رہے تھے۔ ناخدا کشمیریوں کے پتوار پھیلائے موجوں  
سے برسر پیکار تھے کہ امیر شریعت نے پتن پر قدم رکھا۔ پولیس ہر مسافر کی  
دیکھ بھال کر رہی تھی۔ حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے امیر شریعت نے  
پتن پر سے دریا کو عبور کرنا مناسب نہ سمجھ کر دو میل اوپر جا کر دریائے جہلم



کو پار کیا اور پھر کسی میل پیدل سفر کے بعد میرپور میں داخل ہوئے۔ ہمراہی کو قنبہ  
کیا کہ تم جاؤ لیکن میری آمد کی اطلاع نہ کرنا۔ میں آپ سے آپ جلسہ میں  
پہنچ جاؤں گا۔

انجمن کے سالانہ اجلاس کا آخری دن تھا۔ ریاستی حکام مطمئن تھے برطانوی  
پولیس اپنے کارنامے پر خوش تھی کہ عطا اللہ شاہ بخاری ریاست میں داخل نہیں  
ہو سکا۔ منتظمین جلسہ نے اس خوف سے کہ انجمن کی بدنامی نہ ہو اور رات کے  
اجلاس میں لوگوں کی حاضری کم نہ ہو شہر میں مناوی کہادی کہ رات آخری اجلاس میں  
امیر شریعت عوام سے خطاب کریں گے۔ اجلاس شروع ہوا تو صدر جلسہ نے  
عوام سے معذرت کی:

"ہمیں افسوس ہے کہ امیر شریعت ریاستی اور برطانوی قانون کی

پابندیوں کے باعث تشریف نہ لاسکتے۔"

ابھی یہ فقرہ ادا ہو رہا تھا کہ امیر شریعت نے جلسے کے ایک کونے سے  
آواز دی۔ "آپ غلط کہتے ہیں۔" یہ فقرہ کہتے ہوئے اور مجمع کو چیرتے  
ہوئے اسٹیج کی جانب بڑھنے لگے۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کون دیہاتی ہے کہ  
صدر انتقالبیہ کی بات کاٹ رہا ہے۔ اب امیر شریعت اسٹیج پر تھے اور بخاری  
بھر کم کھڑکی پگڑی اتار کر عوام کے سامنے کھڑے تھے۔ اس وقت مجمع کا حال  
دیکھنے والا تھا۔ آخر امیر شریعت نے صبح چار بجے تک تقریر کی۔

امیر شریعت کے میرپور پہنچنے کے نتیجے میں پنجاب پولیس اور ریاستی  
حکام کے کسی افسیر معطل ہوئے اور انہی دنوں میرپور کے اکثر دیہاتوں میں لگانے



پھیل گئی۔ سرکاری عمارات کو تذرہ آتش کیا گیا۔

## قادیان کا نفرین

ضلع گورداسپور کا قصبہ قادیان مرزا غلام احمد کی نبوت کا مرکزی مقام تھا اور مرزائی اُمت بہت بڑی اکثریت میں یہاں آباد تھی۔ مرزائیوں کی جماعت احمدیہ نے حکومتی طرز پر اپنا نظام قائم کر رکھا تھا، جس کے تحت مختلف شعبے اور دفاتر قائم تھے۔ عملاً اس قصبہ میں جماعت احمدیہ اور اُس کے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود کی حکومت تھی۔

غیر مرزائی عوام مسلمان، ہندو اور سکھ اپنی مذہبی اور معاشی زندگی میں آزاد نہ تھے۔ یہاں تک کہ خلیفہ قادیان کی جانب سے ہر غیر مرزائی دکاندار کو یہ حکم تھا کہ اپنی دکانوں پر درج ذیل عبارت نمایاں طور پر آویزاں رکھیں:

”میں آئندہ سے مرزا غلام احمد کو حضرت مرزا غلام احمد صاحب کہوں گا۔“

میں اپنے کسی مذہبی اجتماع میں شامل نہیں ہوں گا اور نہ ہی قادیان میں اپنے کسی عقیدے کے بزرگ کو آنے کی دعوت دوں گا۔  
میں کسی ایسے دکاندار سے لین دین نہیں کروں گا جس کے پاس یہ اقرار نامہ نہیں ہوگا۔“

۱۹۲۸ء میں مولانا عبدالکریم اور ان کے خاندان نے مرزائیت سے

۱۔ اس وقت کے مرزائی مبلغ



تائب ہونے کا اعلان کیا جس کے نتیجے میں انہیں سخت اذیتیں دی گئیں اور ان کی غیر معتاد سزا بڑاؤ کو نذر آتش کر دیا گیا۔ یہ خاندان ترک مرزا ایت کے بعد قادیان سے شمال منتقل ہو گیا۔

احرار رہنماؤں کی نظر میں مرزائی دین اسلام کے باغی اور برطانوی سامراج کے کھٹے ایجنٹ تھے۔ مرزائیوں کے منطالم انتہا کو پہنچ رہے تھے اور کوئی بانہ پیمس نہ ہو رہی تھی۔ تو انہوں نے ریاست کشمیر کی طرح قادیان کے عوام مسلمان ہندو اور سکھوں کی خدمت کرنا بھی دینی اور سیاسی ثواب سمجھا۔

مجلس احرار نے ۱۹۳۳ء میں قادیان میں اپنا دفتر قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور درپردہ دفتر کے لیے مکان کی تلاش شروع کر دی۔

قادیان کے مظالم اور بکس عوام کی زبردست خواہش تھی کہ کوئی ان کے زنجیوں کی مرہم بن کر یہاں آئے مگر ان کے دل خلیفہ قادیان کی قوت کے خوف سے دہشت زدہ تھے۔ وہ ہر اجنبی کو قادیانیوں کا خاصوس سمجھ کر نگاہیں ملانے سے کتراتے تھے۔ آخر مولانا عبدالکریم کے نیم سوختہ مکان میں دفتر مجلس احرار کی بنیاد رکھی گئی۔ علاؤ الدین اور حریب شاہ نامی دو رضا کاروں کو یہاں منتعین کیا گیا۔ ان کے وجہ اس کا علم ہوا تو انہوں نے دونوں رضا کاروں کی خوب چٹائی کی اور مولانا عبدالکریم کے مکانوں کو بھی مزید جلا کر خاک کر دیا۔

ان واقعات کی روشنی میں مجلس احرار نے اپنی تمام توجہ قادیان کی طرف نکلانے کا فیصلہ کیا۔

۱۹۳۳ء مخصوص سیاسی حالات اور فرقہ وارانہ فضا کی بدولت ایک ہمہ گیر



سال تھا اور کسی دوسری تحریک کو ہوا دینا غیر ملکی حکمرانوں کی عمر بڑھانے کے مترادف تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی سامراج نے جن تحریکات کو از خود ختم دسنے کو پروا ہی چڑھایا تھا مرزائیت اسی پودے کا ایک اہم بیج تھا۔ احرار رہنماؤں کے نڈر نے اس سے چشم پوشی کو ہندوستان سے غداری اور اسلام کے بنیادی عقیدہ ختم نبوت سے انحراف سمجھ کر قادیان کے نظام حکومت میں دراڑ ڈالنا ضروری خیال کیا۔ چنانچہ ۲۱، ۲۲، ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو قادیان میں امیر شریعت کی صدارت میں تبلیغی کانفرنس کرنے کا اعلان کیا۔ اس فیصلے سے مرزائی اور حکومت اپنی اپنی جگہ سوچ میں پڑ گئے۔ پنجاب میں خصوصاً احرار رضا کاروں نے کانفرنس میں شمولیت کی تیاریاں شروع کر دیں۔

برطانوی سامراج ذہنی طور پر اس تحریک سے مقابلے کے لئے تیار نہیں تھا کیونکہ کانگریس اور دوسرے مسلمان رہنما مستحق قومیت اور سودا کی سر و جنگ میں مصروف تھے۔ دوسری جانب انگریز حکمران بین الاقوامی سیاست میں جرمن اور روس کے اتحاد میں الجھا ہوا تھا۔ ہاں ہمہ احرار کشمیر کی لڑائی میں جس قوت کا مظاہرہ کر چکے تھے، حکومت اس سے بھی غافل نہیں تھی۔ تاہم احرار سے الجھاؤ نامناسب سمجھ کر کانفرنس کی تیاریوں میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالی گئی۔ حکومت کی اس سر و جہری کو دیکھتے ہوئے مرزائیوں نے داویلا کیا تو حکومت نے قادیان کی میونسپل حدود میں وقفہ ۱۹۳۷ء نافذ کر دی۔ حکومت کے اس رویہ نے احرار کو ایک نیا ولولہ دیا لیکن وہ لڑائی کے موڈ میں نہیں تھے۔ لہذا قادیان کی میونسپل حدود سے باہر غیر مسلموں سے کانفرنس کے لیے جگہ حاصل کر لی گئی۔ ہندو سبھا ہائی اسکول کی عمارت جہانوں کے لیے اور



سرور الیٹرنل کی زمین کانفرنس کے پنڈال کے لئے لی گئی۔

پنجاب کے مختلف شہروں سے احرار رضا کاروں کے قادیان پہنچنے کے لئے ریلوے حکام نے سپیشل گاڑیاں چلانے کا انتظام کیا۔ وہاں تک کے رضا کار جالندھر ریلوے اسٹیشن پر اور پشاور تک کے رضا کار لاہور ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو گئے۔ دونوں سپیشل گاڑیاں جب مقررہ اوقات پر قادیان کو روانہ ہوئیں تو یہ نظارہ بھی دیدنی تھا۔ گاڑی کے انجن اور ہر ڈبے پر مختلف مقام کے رضا کاروں کے سُرخ جھنڈے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ جب دونوں سپیشل گاڑیاں امرتسر پہنچیں تو امیر شریعت ان کے استقبال کے لئے پہلے سے وہاں موجود تھے۔ دونوں کے درمیان امیر شریعت کے لئے ایک تیسری گاڑی کا امرتسر سے علیحدہ انتظام تھا جس نے شمال اور دوسرے اضلاع کے رضا کاروں کو بھی سوار کرانا تھا۔ احرار کا یہ سُرخ اٹوٹا امیر شریعت کی معیت میں جب قادیان پہنچا تو اس سرزمین نے ایک نئی کر دہائی دکھائی۔ کفر پر اسلام کی یلغار اس عہد کا عظیم واقعہ تھا۔ امیر شریعت قادیان ریلوے اسٹیشن سے ہزاروں رضا کاروں کے جلوں میں پیدل پنڈال تک پہنچے جہاں ایک نیا شہر آباد تھا۔ ہر طرف چھوڑا دیان اور نیچے نصب تھے۔ ان پر ہراتے ہوئے سُرخ پرچم ہواؤں سے کھیل رہے تھے۔ سُرخ وردیوں میں احرار رضا کار اس طرح لگتے جیسے بیر بہوٹیاں پہاڑوں کی شاہراہوں پر بکھری پڑی ہوں۔

احرار ہندوؤں کے علاوہ ہر مکتبہ فکر کے علماء نے اس اجتماع میں شرکت کی۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاکھوں انسانوں کی موجودگی میں نماز عشاء کے بعد احرار



تبلیغ کا نفرنس کا پہلا اجلاس حضرت امیر شریعت کی صدارت میں شروع ہوا۔ امیر شریعت حسب عادت رات دن سبھی صدارتی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ آسمانوں نے تاروں کو رات بھر جاگنے کی تاکید کر دی۔ ہواؤں نے مہانوں پر اپنے سائے پھیلا دیئے۔ چاند نے رات کے اندھیرے پر اپنی سفید چادر ڈال کر کھڑکا کر وہ چہرہ ڈھانپ دیا۔ امیر شریعت گویا ہوئے تو کھڑکوش برآواز تھا تمام رات دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے اور سنتے رہے۔ صبح کی اذان کے ساتھ امیر شریعت نے اپنی تقریر ختم کی۔ کانفرنس کی باقی کارروائی تین دن میں مکمل ہوئی۔

## گفتاری

ساتھ شجاع آباد نے حرم امیر شریعت کو ایسا غم دیا کہ وہ دائم المریض ہو کر رہ گئیں۔ زہر پلنے کی اطلاع جیسے ہی امرتسر پہنچی۔ گھر میں اہلیہ محترمہ کو خون کی قے آئی۔ بعد میں ڈاکٹروں کی تحقیق نے ٹی بی کی نشان دہی کر دی۔ امیر شریعت کی تہی دامنی اس شاہی مرض کے علاج کی متحمل نہیں تھی۔ وہ خاصے پریشانی پہننے لگے۔ سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں میں تعلق آگیا۔ مسکراتا چہرہ گھرلو پریشانیوں کی نظر ہو گیا۔ مخالف موسم مرض کا ہمنوا ہوا۔ ڈاکٹروں نے رائے دی کہ مرینہ کو کسی پہاڑی مقام پر رکھا جائے لیکن گرہ میں اس قدر سولہ کہاں تھا کہ پہاڑوں کا بوجھ سہہ سکے۔ تاہم بادل نخواستہ دوستوں اور حکما کی رائے پر سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ بیوی بچوں کو مسوری لے گئے۔ وہاں علاج شروع کر دیا گیا۔



## ایک دلچسپ واقعہ

اگر گھر یلو معاملات میں اطمینان نہ ہو تو قلب و نظر کا سکون بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ امیر شریعت دیکھنے کو مسوری ایسی خوشنما اور دل فریب فنمیں رہ رہے تھے مگر رفیقہ حیات کی بیماری نے یہ جنت بھی جہنم بنا دی تھی۔ اسی عالم میں ایک دن امیر شریعت کی چھ سات سالہ پتی گھر سے کھینے بازار اتری کہ غائب ہو گئی۔ بیچی کی گمشدگی نے سارے گھر کے ساتھ حلقہ اسباب کو بھی پریشان کر دیا۔ مسوری کے نشیب و فراز کھنگال ڈالے گئے مگر بیچی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ بہتر پر مریضہ کی حیرت بڑھ گئی۔ برطانیہ عظمیٰ سلطنت کو لٹکارنے والے پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگے۔ دو سونوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اسی طرح دن گزر گیا اور شام کے چراغوں نے مسوری کو جگمگا دیا۔ اتنے میں ایک انگریز خاتون چٹھی کو لے کر گھر پہنچی۔ دیکھتے ہی امیر شریعت نے بیچی کو سینے سے لگا لیا اور انگریز عورت سے تانخی اور غصتے میں کہا:

”تم نے یہ کیا کیا؟ تم کون ہو؟ میرے گھر کا نظام تو نے وہ ہم پر ہم کر دیا۔ انگریز خاتون امیر شریعت کی یہ گفتگو نہ سمجھ سکی مگر اس نے انگریزی میں کہا:

”عرصہ ہوا میری بیچی جو شکل و صورت میں بالکل ایسی ہی تھی فوت ہو چکی ہے۔ مجھے یہ بیچی بہت بھلی معلوم ہوتی۔ میں آپ کی اطلاع کے بغیر اسے لے گئی۔ مجھے معاف کر دیں۔ لیکن آئندہ ہر صبح میں اسے یہاں سے لے جایا کروں گی اور شام کو چھوڑ جایا کروں گی۔“



اس پر امیر شریعت نے کہا:  
 "تو ماں ہے۔ اگر ماں کے دکھی دل کو میرے دل کے ٹکڑے سے کوئی  
 سکون مل سکتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن یہ دیکھنا کہ اس کی مریض والدہ  
 بھی اسی کے سہارے زندہ ہے۔"

چنانچہ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ کئی دنوں کے بعد انگریز خاتون اپنے  
 خاوند کے ساتھ مسوری سے جانے لگی تو اس نے بلیوں کا نہایت خوبصورت  
 جوڑا بچی کے کھیلنے کے لیے دے دیا۔ بلیاں اچھی نسل کی تھیں۔ گھر کے ہر فرد  
 سے ماؤں ہو گئیں۔ بچی کو کھیلنے کے لیے جیتے جاگتے کھلونے مل گئے۔

تادیان تبلیغ کانفرنس نے مرزائی مخالفت اور ایوان برطانیہ میں ارتعاش  
 پیدا کر دیا تھا۔ مرزائیت کی ارٹھی ہوئی خاک میں تالیف تادیان کو موت کے نقصے  
 ابھرتے دکھائی دینے لگے۔ باطل و عموں کی ایک ایک کیر مٹنے لگی۔ آخر خود کا  
 پودے کی حفاظت کے لیے امیر شریعت کو تادیان کانفرنس کی تقریر کی بنا پر  
 دفعہ ۱۵۳ کے تحت مسوری سے گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن دوسرے ہی دن ڈیرہ دون  
 میں انہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ یہ ضمانت ڈاکٹر محمد امیر صاحب نے وی جو ان  
 دنوں ڈیرہ دون وٹرنری ہسپتال کے انچارج تھے۔

امیر شریعت کو جس دن مسوری سے گرفتار کیا گیا اس دن اور رات کو اس  
 گرفتاری سے اہل خانہ تو بہر حال پریشان تھے لیکن بلیوں کے جوڑے میں سے  
 نے تمام دن اور رات بغیر کچھ کھائے مکان کی چھت پر کھلی فصائیں وقت گزارا

۱۹۳۲ء



حالانکہ گھر کے سب لوگ اُسے دودھ پینے کے لیے پچکارتے رہے مگر وہ نیچے نہ اترتا۔ جیسے ہی امیر شریعت ضمانت پر رہا ہو کر مسوری پہنچے اور گھر والوں نے اُن سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو انہوں نے فوراً آواز دی۔ بتلا جلدی سے نیچے اتر کر امیر شریعت کے پاؤں پھاٹنے لگا اور دودھ بھی پی لیا۔ بعد میں یہ مقدمہ ضلع گورداسپور کے جسٹریٹ مسٹریٹ جوائنٹ کھانڈ کی عدالت میں تقریباً دو ماہ زیر سماعت رہا۔

## مجدوب کی دعا

مقدمہ گورداسپور کی مصروفیت کے باوجود امیر شریعت اپنے مشن کے لیے رواں دواں رہے۔ ۱۹۳۲ء کا سال آخری دموں پر تھا کہ معراج الہی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر امیر شریعت کو ملتان جانا پڑا۔ جلسے کی حاضری ناخوشگوار تھی اور اس پر خاموشی کا یہ عالم جیسے انسانی سروں پر پرندے بلیچھ رہے ہوں۔ رات کے اس سکوت کو صرف امیر شریعت کی آواز توڑ رہی تھی۔ واقعہ معراج النبی کا ذکر کرتے ہوئے اُسے تشبیلی انداز میں پیش کیا۔ اور حاضرین کی محویت کا یہ عالم تھا کہ وہ محسوس کرنے لگے جیسے کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری اُن کے سامنے سے گزر رہی ہے۔ عین ایسے وقت میں مجمع سے ایک مجدوب اٹھا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اُس نے ملتان کی زبان میں کہا:

سید! ایشالا اتھائیں دن بختیوں! دلے سید! خدا کرے آپ یہیں

(ملتان میں) دن ہوں)



شاید یہ قبولیت کا وقت تھا کہ دل سے نکلی ہوئی بات حقیقت بن کر

رہی۔

## مقدمہ کی رویت اور

بظاہر ۱۵۳ الف کا مقدمہ اپنے اندر کوئی ایسی جاؤ ہریت نہیں رکھتا کہ قانون اور ملزم کے درمیان انصاف کرنے والی عدالت کو الجھاؤ محسوس ہو لیکن امیر شریعت کے اس مقدمہ نے صرف عدالت کو بلکہ حکومت کی پوری مشینری کو اپنی جانب منسوب کر لیا۔ مقدمہ کے دوران ہر پیشی کے دن ہزاروں انسانوں کا احاطہ کچھری میں ہجوم، عدالت پر بارگاہ ثابت ہونا۔ اس روز دیگر عدالتوں کا کام بھی معطل ہو جاتا۔ امرتسر سے گورداسپور کے درمیان ریل گاڑیوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ ملتی۔

## جمعۃ الوداع

ابھی دنوں مجلس اعمار نے اعلان کیا کہ رمضان المبارک کا آخری جمعہ گورداسپور میں امیر شریعت پڑھائیں گے۔ اس اعلان کے ہوتے ہی پنجاب بھر کے مسلمان گورداسپور پہنچنے کے لیے پر توڑنے لگے۔ حکومت پنجاب نے بھی جو شروع سے مسلمانوں اور قادیانیوں کے درمیان تماشائی کھٹی، جمعہ کے اجتماع میں مداخلت مناسب نہ سمجھی۔

شہر سے باہر کھلے میدان میں نماز جمعہ کا انتظام کیا گیا۔ گورداسپور کی



سرزمین اُس روز اپنے مہمانوں کو سنبھالنے سے قاصر تھی۔ ہنہر کا دامن اپنی  
ساری دستوں کے ساتھ ہی دامنی کا تنگ کر رہا تھا۔

امیر شریعت سر پر عربی طرز کا رومال باندھے، ہاتھ میں کلہاڑی سنبھالے  
جب جمعہ کے خطبہ پر گھڑے ہوئے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی عربی شہساز  
ہے جو ابھی گھوڑے سے اتر کر فوج سے میدان جنگ میں خطاب کر رہا ہے۔  
زبان کی شیرینی اللہ کے کلام کی صورت میں بانٹی جا رہی تھی۔ جس سے لاکھوں  
انسانوں کے دلوں کی جھولیاں بھر رہی تھیں۔ نظریں تھیں کہ امیر شریعت  
کو چاٹ رہی تھیں۔ دل تھے کہ بیویں اچھل رہے تھیں۔ اور امیر شریعت تھے  
کہ لاکھوں انسانوں کے جذبات سے کھیل رہے تھے۔

فاز سے فارغ ہو کر مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے امیر شریعت  
کے ہاتھ پر بیعت کی تجویز پیش کر دی جسے امیر شریعت نے قبول کر لیا۔  
ایک ایک آدمی اگر بیعت کے لئے آتا تو ہفتوں گورہ جاتے مگر امیر شریعت  
نے حکم دیا کہ میرے رومال کے ساتھ ایک پگڑی کو گورہ دے لو اور پھر  
اس سے تولیے، رومال، چادریں اور پگڑیاں باندھنے جاؤ جس کا لاکھوں  
پگڑوں سے لگ جائے گا وہ میری بیعت میں اپنے کو داخل سمجھیں۔ بس  
پھر کیا تھا۔ لاکھوں انسانوں کے سروں پر پگڑیوں، چادروں، تولیوں  
اور رومالوں کا ایک جال بن دیا گیا۔ یہ سلسلہ ختم ہوا تو امیر شریعت نے  
بیعت ہونے والوں کو شرعی احکام سمجھائے۔ نیز فرمایا کہ کل ہر شخص اپنے  
اپنے گھر پہنچ کر ایک پوسٹ کارڈ پر اپنا نام اور پتہ درج کر کے مجھے بھیج دے



۲۳ مارچ ۱۹۲۵ء کو جب خلیفہ قادیان مرزا بشیر الدین محمود امیر شریعت کے مقدمہ میں بطور گواہ صفائی اپنی شہادت دینے آئے تو خطوط سے بھری ہوئی سات بوریاں امیر شریعت نے عدالت کے سامنے پیش کیں جو بیعت کرنے والوں نے اطلاعاً لکھے تھے۔ تاکہ حکومت اور خلیفہ قادیان کو معلوم ہو سکے کہ میرے رُوحانی مریدوں کی تعداد بھی کئی لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔  
 خلیفہ قادیان کی شہادت چاروں تک جاری رہی اور اس دوران اس کی نگاہیں بار بار خطوط سے بھری ہوئی بوریوں سے ٹکراتی رہیں۔

## فرد جرم

عدالت نے امیر شریعت پر فرد جرم عائد کرتے ہوئے لکھا:-  
 "مذرم نے اپنی تقریر کے دوران ملک معظم کی رعایا کے دو طبقات احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان دشمنی یا حقارت پیدا کرنے کی کوشش کی۔"

لفظ طبقات مذہبی فرقوں پر اطلاق پاتا ہے:-

امیر شریعت نے فرد جرم کے جواب میں کہا:-  
 "میری تقریر کے جن حصوں کے متعلق شکایت کی گئی ہے وہ مستند عبارتیں ہیں جس سے میری اصل تقریر کے معنی ہی بدل دیے گئے ہیں۔ میں اقبال کرتا ہوں کہ میں نے اپنی تقریر میں یہ لفظ کہے تھے کہ بنی کسی دھوکے باز نہیں ہوتا



تبلیغ کافر نس میں جہاں میں نے سچے اسلام کی اشاعت  
 کے لئے خطبہ صدارت پڑھا تھا مرزا بشیر الدین اور مسلمانوں  
 میں حقارت پیدا کرنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ مرزائی چالیس  
 کروڑ مسلمانوں کو، مرزا غلام احمد کو نبی نہ ماننے کی وجہ سے  
 کافر سمجھتے ہیں اور چونکہ یہ مذہبی اختلافات ہیں۔ اس وجہ  
 سے احمدیوں اور غیر احمدیوں میں شادی بیاہ کے اور دوسرے  
 تعلقات ممکن ہی نہیں۔ مرزائی مسلمانوں کے بچوں کا جنازہ  
 بھی نہیں پڑھتے اور وہ مسلمانوں کے متعلق شہزادہ کا لفظ استعمال  
 کرتے ہیں اور ان کی عورتوں کو گالیاں دیتے ہیں اور گتیا سے  
 بھی بُرے لفظ استعمال کرتے ہیں۔  
 اگر ضرورت ہوئی تو میں ایک تحریری بیان شامل کروں گا۔

## تحریری بیان

دیوان سکھانند ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گورداسپور نے امیر شریعت کے  
 تحریری بیان کے حسب ذیل اقتباسات اپنے فیصلے میں نقل کیے ہیں۔  
 "شعبہ تبلیغ مجلس احرار کا فرض تھا کہ اسلامی دنیا کو متنبہ کر دے کہ وہ  
 اپنے تئیں جماعت قادیانی کے جھوٹوں، دھوکوں، غلط الزامات اور  
 حیلوں سے بچائیں۔"

"ضمیمہ انجام الحکم" اور "نذول المسیح" جو مرزا غلام احمد قادیانی باغی



جماعت کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جو پیر مہر علی شاہ گولڑوی اور دیگر مقتدر مسلمانوں  
کے خلاف سخت الفاظ اور گالیوں پر مشتمل ہیں۔

”خداوند مسیح کو بھی اس مسیح موعود نے نہیں چھوڑا۔“

”تزیان القلوب“ و ”نور الحق“ اور بہت سی کتابیں مرزا غلام احمد کی

لکھی ہوئی اور انگریزوں کے ساتھ اس کی وفاداری اور چاہلو سی اور برٹش  
گورنمنٹ کی بے نظیر خدمات کا ثبوت ہیں۔

”نور الحق“ میں مرزا غلام احمد نے لکھا ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ

سے عدار میں نہرا اور رسول سے عذاری کے برابر ہے اور اگر اس بارے

میں مرزائی بھی عدار ہو جائیں تو ان سے بڑا عدار کوئی نہ ہوگا۔

”میں نے کہا تھا کہ اوپر ٹھہرا! تو نبی بنا تھا تو تجھے وہی وقار قائم

رکھنا چاہئے تھا۔ جب نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو تمہیں انگریزوں کے کٹے

نہ بننا چاہئے تھا۔ تم انگریزوں کے بغیر دم کے کتے ہو۔“

”موجودہ خلیفہ کے وقت میں قادیان کے لوگوں پر ہر قسم کا دباؤ

علاجاً جاتا ہے اور تشدد کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کے

بارے کوئی عینی شاہد واقع شدہ منظام کی گواہی دینے کو بھی تیار نہیں ہوتا

محمد امین کو دن دھاڑ سے مار ڈالا گیا۔ مہاپنہ بلڈنگ گرا کر جلا دی گئی لیکن حکومت

مجرموں کو پکڑ نہ سکی اور نہ ان کا چالان کیا گیا اور نہ کوئی اور کاروائی ان

کے خلاف کی گئی یہ موجودہ خلیفہ کی حکومت کا نتیجہ ہے۔ اس کا اثر منظوموں

سے پنجابی لفظ ہے۔



اور ان کے ہم خیالوں کے دلوں پر ظاہر ہے۔ ان لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سوائے خلیفہ کے انگریزوں کی کوئی حکومت قادیان میں نہیں اور خلیفہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ محمد امین کے قتل سے ان مسلمانوں میں تبلیغ کرنے کا راستہ کھل گیا جن کے دل پہلے ہی ڈر سے زخمی ہو گئے تھے۔

”ملزم نے اس شخص کو چیلنج کیا جسے اپنی طاقت کا گھنڈہ تھا اور جس سے تمام ڈرتے تھے۔ مرزاٹیوں اور ان کی نبوت اور خلافت کے متعلق ملزم نے کہا کہ اب یہ نہیں رہے گا۔“

”ملزم نے بیان کے آخری حصے میں بطور صفائی کے کہا کہ جماعت اہلحدیث نے اپنے کاموں سے اپنے خلاف دنیا میں اتنی نفرت پیدا کر لی ہے کہ میرے لئے ان کے خلاف نفرت پیدا کرنا بے فائدہ تھا۔ بالخصوص اس حالت میں میرا مقصد یہ نہ تھا کہ میں نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے الفاظ استعمال نہیں کیے۔“

راہب شریعت کی تقریر جسے عدالت نے اپنے فیصلے میں نقل کیا،  
 ”اب ہم ملزم کی تقریر کی طرف آتے ہیں۔ سامعین جو کہ اکثر گنوار تھے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ملزم نے دوران تقریر کہا۔ اس علاقہ میں جہاں بت خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں ہم غریبوں کا اکٹھا ہونا جن میں سے اکثر کا کوئی گھر بھی نہیں، کوئی معمولی بات نہیں۔ پھر ملزم نے کہا، فرعون کا توحید اٹھا جا رہا ہے اور خدا نے چاہا تو یہ نہیں رہے گا۔ پھر قادیان کے متعلق ملزم نے کہا۔ اس علاقہ میں حکومت کے اندر ایک اور حکومت پیدا ہو



گئی ہے۔ جہاں ظلم، نا انصافی، تکبر اور غرور اتنا بڑھ گیا ہے کہ سب بخاری  
 مسوری سے امرتسر کو آیا تو پولیس سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہی  
 اور امرتسر پہنچنے پر اُسے دفعہ ۱۴۴ کے تحت دو سب انسپکٹروں نے  
 نوٹس دیا۔ اس موقع پر ملزم نے پولیس کو چوٹیوں کی فوج قرار دیا۔ پھر تقریر  
 کرتے ہوئے کہا، اللہ اللہ! قادیان میں عزیز شاہ پٹ جاتا ہے۔ ظالم  
 سمجھتا ہے کہ وہ مر گیا اور حکومت کہتی ہے کہ گواہ نہیں ملتا۔ یہ چشم پوشی  
 ہے اور ہم اتنے ذلیل ہیں۔ اس لہجہ میں ملزم نے قادیان کی طرف اشارہ  
 کرتے ہوئے کہا کہ یہاں احمدیوں نے ریاست بہاولپور، پٹیالہ اور کشمیر  
 جیسے اختیارات حکومت سے حاصل کر لیے ہیں اور ہمیں انتہا تک کرنے کی  
 اجازت نہیں۔

پھر اس موقع پر قیام امن کے لئے پولیس متعین کیے جانے کی  
 طرف اشارہ کر کے اور احمدیوں کی اس کانفرنس کے ناکام کرنے کی کوشش  
 کی طرف اشارہ کر کے ملزم نے کہا اگر یہ اصرار کی تبلیغی کانفرنس نہ ہوتی  
 تو نہیں معلوم کیا ہو جاتا۔ آج پیروان حسین سنگھ پٹیاں پہننے ہوتے۔  
 ملزم نے لوگوں کو تلقین کی کہ دلیری سے تکلیفیں برداشت کریں  
 اور اپنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کی پیروی کریں۔ ملزم  
 نے خلیفہ قادیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ وہ ایک نبی کا بیٹا  
 ہے۔ میں نبی کا نواسہ ہوں۔ وہ آئے تم خاموش بیٹھے رہو۔ وہ میرے ساتھ  
 اردو، پنجابی، عربی اور فارسی میں تمام مسائل پر بحث کرے تو اس جھگڑے



کا آج ہی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ وہ پروے سے نکلے، گھونگٹ اٹھائے اور  
 حکومت کو ہمارے اختلاف کے بارے میں درمیانی میں نہ لائے۔ وہ  
 کشتی کرے اور مولانا علی رضا کے جوہر دیکھے اور جس شان سے چاہے آئے۔ وہ  
 موٹر میں آئے میں پیدل آؤں۔ وہ حریر پہن کر آئے میں کھدر کا کرتا پہن کر آؤں  
 وہ اپنے ابا کی سنت کے مطابق عنبر بھننا ہوا گوشت، بیاض تیاں اور پلوں  
 کی ٹانگ وائٹ پی کر آئے اور میں اپنے نانا کی سنت کے مطابق جو کی روٹی  
 کھا کر آؤں۔ اُسے حکومت سے مدد نہیں مانگنی چاہئے۔ اکیلا آئے اور  
 بخاری کے جوہر دیکھے۔

اگر ہم یہاں دو چار سال رہے تو خدا کے فضل سے یہ بالکل تباہ  
 ہو جائیں گے۔ اٹھارہ "زیبندار" اور اس کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں کی طرف  
 اشارہ کرتے ہوئے اور اپنے اس کانفرنس کے صدر ہونے کی طرف اشارہ  
 کر کے ملزم نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان کے کسی مولوی میں اس طرح قادیان میں  
 آنے کی طاقت نہیں۔ یہ کسی اکیلے آدمی کا کام نہیں۔ یہ ایک جماعت کی طاقت  
 ہے۔ جماعت کے سر پر خدا کا لاٹھ ہوتا ہے۔ حکومت آج آزما کر دیکھے  
 کہ باوجود پابندیوں کے جو حکومت نے لگا دی ہیں اور باوجود جماعت اچھیہ  
 کی مخالفت کے غلامان محمد صلی اللہ علیہ وسلم اتنی تعداد میں نظر آتے ہیں۔  
 پھر قادیان اور خلیفہ کا ذکر کر کے ملزم نے کہا ہم سب کو ایک عزم  
 یہاں لایا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس ناپاک زمین کو پاک کیا جائے۔ خدا اس  
 زمین کو پاک کرے۔ کیونکہ یہاں خاتم النبیین کی توہین ہوتی ہے۔ اس جگہ



پیار سے مدنی، مکی رسول موجود نہیں ہیں۔ یہاں شرک ہے اور یہاں جہاں  
 کھنڈ مسلمانوں کے تیرہ سو سالہ قبلہ کے احترام کی تہک کی جاتی ہے۔ میں  
 ایک بات جانتا ہوں کہ خواہ کوئی شخص مکہ میں پیدا ہو اور مکہ ہی میں مرے لیکن  
 اگر اُس نے رسولؐ سے محبت نہ رکھی تو اُس کی نجات نہیں ہو سکتی۔ میں غریب  
 ہوں اور اپنے ولی خیال کا اظہار کرتا ہوں۔ حکومت کو یاد رکھنا چاہئے کہ  
 جو شخص نبوت کی قمیض تک نہیں چھوڑتا ہم اُس کے لئے طاعون اور سمیٹ  
 کی طرح ہیں۔ اگر حکومت کوئی اور ہاتھ دیکھنا چاہتی ہے تو اس کی مرضی  
 تم نے ہمیں سینکڑوں بار آزمایا ہے۔ قبل ازیں مخالفت اور مقامات  
 مقدسہ کے احترام کا سوال اٹھا۔ رسول اکرمؐ کی عزت پر حملہ کیا گیا تو یہ  
 احمدی خوشی کے مارے اچھل پڑے۔ جب ملک کا سوال اٹھا، انہوں  
 نے کہا کہ یہ (مرزائی) ہندوستان کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے اور صرف  
 خدا کے رسولؐ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حکومت نے ہماری طاقت کو نہیں  
 آزمایا سب گیارہ بجے ہیں۔ سورج نکلنے میں ابھی سات گھنٹے باقی ہیں اور  
 یہاں ہزاروں لوگ جمع ہیں۔ حکومت کو اپنی طاقت بٹھالینی چاہئے۔  
 میں گورنمنٹ کے سامنے مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنا چاہتا  
 ہوں لیکن اس شخص کا کیا حشر ہوگا جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد  
 نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

ہمارے ساتھ کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہ انگلستان والوں کے  
 دھمکتے کتے ہیں اور انگریزوں کی سپا پوسی بھی کرتے ہیں اور ان کی جوتیوں کے



تعلیٰ صحاف کرتے ہیں۔ میں فخر نہیں کرتا اور خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اگر مجھے  
اکیلا بھڑوڑ دیا جاتے تو تم میرے اور لشیر کے معرکے دیکھو۔

میں کیا کہوں لفظ تبلیغ نے مجھے مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ یہ پوٹیکل  
کا لفرس نہیں ہے۔ اگر باہیں ڈھیلی چھوڑ دی جائیں تو مرزا میو! میں مہتیں کہتا ہوں کہ  
تم پیشاب کی جھاگ کی طرح بلیٹھ بھاؤ۔ ہم نے کبھی حکومت سے ادا حاصل  
نہیں کی۔ ان کی ثروت اور خلافت حکومت کے سہارے کھڑی ہے۔ مہتیں کیا  
پتہ پانچ سال کے عرصہ کے اندر اندر یہ پولیس ہمارے قبضہ میں ہوگی۔

پھر علماء سے جو اسٹیج پر بیٹھے تھے ملزم نے مخاطب ہو کر پوچھا کہ  
آیا جو شخص پانچویں جماعت میں فیل ہو جائے وہ نبی بن سکتا ہے؟ ہندوستان  
میں تو اس کی ایک مثال موجود ہے کہ ایک شخص نے فیل ہو کر نبی کا دعویٰ کیا۔  
پھر ملزم نے کہا کہ حدیث اور تفسیر سے ثابت ہے کہ مرزا غلام احمد نبی  
نہیں تھا اور کہ نبی دھوکے باز نہیں ہوتا۔ پھر اب دفعہ ۱۴۲ نافذ کر دی گئی  
ہے۔ عرب شاہ کو مارا گیا۔ محمد امین کو قتل کیا گیا۔

ادھیچ کی بھڑوڑ! تم سے بیٹنے کے لئے کوئی نہیں آیا۔ ہاں اب  
تمہارا مجلس اسوار سے مقابلہ ہے۔ اس نے مہتیں ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے  
یہ مرزا نبی ہر جگہ ایک ہی ہیں۔ انگریز اگر مکہ پر بھی قبضہ کر لے تو یہ وہاں بھی ان کی  
ادا کریں گے۔ اور مرزا میو! یہ تمہاری ثروت کی تصویر ہے اور یہ حکومت  
سے مخفی نہیں ہے۔ تم اس کی دیر تک خدمت کرتے رہے ہو اور تم اس  
کے ناصح اور خیر خواہ ہو۔



یہ ہندوستانی نبی ڈپٹی کمشنر کے پاس جا جا کر کہتا ہے کہ میں نے تو  
میرے باپ نے حکومت کی بڑی خدمتیں کی ہیں۔ اونجیٹ! اگر تم نبی ہو گئے  
تھے تو تمہیں اپنا وفادار قائم رکھنا چاہئے تھا۔

ملازم نے ایک جھوٹے مدعی کی مثال بیان کی جس نے شہنشاہ عالمگیر  
کو گمراہ کیا تھا اور کہا اگر نبوت ہو گا دعویٰ تھا تو پھر تمہیں انگریزوں کا کتا  
نہیں بننا چاہئے تھا۔ لانا ہے اور لاکھ لعنت ہے اس نبوت پر۔!  
کتاب "ایجنڈہ کمالات" کا ذکر کر کے ملازم نے کہا۔ مرزا غلام احمد نے لکھا ہے  
کہ وہ جو مجھے نہیں مانتا حرامی ہے۔

میں حکومت سے دریافت کرنا چاہتا ہوں اور حکومت کو جواب  
دینا ہو گا۔ اگر ایسا ہی کوئی لفظ "زمیندار، احسان، ایاست، اجراء" میں چھپ  
جائے تو یہ تمام اخبارات ضبط ہو جائیں گے لیکن یہ مرزائی حرامی کا لفظ  
استعمال کریں تو کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا۔ "انوار اسلام" میں بھی جو مرزا غلام احمد  
کی لکھی ہوئی کتاب ہے کہتا ہے کہ مرزا غلام احمد کے حقائق میں جو اس پر ایمان  
نہیں رکھتے سو ردِ حتمیہ ہیں اور ان کی بیویاں کتیاں ہیں۔

تقریر ختم کرنے سے پہلے ملازم نے حکام کو مخاطب کر کے کہا کہ کانفرنس  
کے انعقاد سے ہماری عرض لفظی نہیں بلکہ اس علاقے کے مظلوم مسلمانوں کا  
بچاؤ ہے۔ پھر سامعین کو یاد دلایا کہ مرزائی واقعہ ۱۲۴۲ھ تعزیرات ہند کے  
نافذ کر لینے پر بھی شرمندہ نہیں ہیں۔



## فیصلہ

میں ملزم کو زیرو دفعہ ۱۵۳ الف تعزیرات ہند حضور ملک معظم کی عیبت کے دو فرقوں میں یعنی احمدیوں اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان نفرت ڈالانے کے الزام میں مجرم قرار دیتا ہوں۔ فیصلہ کے متعلق اس بات کا پورا احساں رکھتے ہوئے کہ یہ تعزیر ایک تبلیغی کافر نس میں ہوئی تھی میں سمجھتا ہوں کہ چھ ماہ قید یا مشقت اس کے لئے کافی ہوگی۔ پس میں ملزم کو چھ ماہ قید یا مشقت کی سزا دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ بی کلاس کے قیدیوں کا سا برہنہ ٹاڈ کیا جائے۔ دستخط سکھانند

محکم دعوے کے ساتھ  
مدرسہ اسلامیہ گورداسپور مورخہ ۲۰/۱۹۳۵

## سیشن کورٹ میں اپیل

(تحت عدالت کے فیصلہ کے خلاف سیشن کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔  
ابتدائی سماعت میں امیر شریعت ضمانت پر راکھ دیئے گئے۔  
مقدمہ کی پیروی کے لیے بنجاری ڈیفینس کونسل قائم ہوئی جو چار وکلاء پر مشتمل تھی۔

- ۱۔ مولانا مظہر علی اعظمی ڈوکیٹ ۲۔ شیخ شریف حسین پلڈر
- ۳۔ شیخ چراغ الدین (جو بعد میں پنجاب ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے)
- ۴۔ لالہ پشاوری ٹل اپڈوکیٹ



مرزا ٹیوں کی جانب سے چوہدری سرفراز اللہ خاں اور ان کے بھائی  
چوہدری اسد اللہ خاں پیروکار تھے۔

## اپیل کا فیصلہ

مسٹر جی ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور نے فریقین کے دکلا کی بعت  
کے بعد حسب ذیل فیصلہ دیا۔

اپیلانٹ سید عطا اللہ بخاری کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ الف  
کے ماتحت مجرم قرار دیتے ہوئے ۶ ماہ قید بامشقت کی  
سزا اس تقریر کی بنا پر دی گئی ہے جو اس نے احرار تبلیغ کانفرنس  
کے موقع پر ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو کی تھی۔

اپیلانٹ کے خلاف فرد مجرم پر نظر ڈالنے سے پہلے چند واقعات کا  
بیان کرنا ضروری ہے۔ جو معاملہ زیر بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ تقریباً پچاس  
برس کا عرصہ ہوا قادیان کے ایک شخص مسی غلام احمد نے دنیا کو اعلان کیا کہ وہ  
مسیح موعود ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی اس نے اسلام کے اعلیٰ پادری  
کی حیثیت اختیار کر لی جس کے ارکان اگرچہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں،  
لیکن ان کے بعض عقائد اور اصول اسلام کے عام مسلمہ اصولوں سے بالکل  
متضاد تھے۔ اس فرقے کا جو قادیانی یا مرزائی یا احمدی کہلاتا ہے امتیازی  
نشان یہ ہے کہ اس کے ارکان اس فرقے کے بانی کی وجہ سے مرزا کہا جاتا  
ہے، نبوت پر کامل اعتقاد رکھتے ہیں جو تحریک اس طرح شروع کی گئی اس



سے جلدی ہی شکل پکڑی اور آہستہ آہستہ لیکن غیر مشتبہ طور پر بڑھنا شروع کیا  
 انداز کے پیرو چند ہزار کی تعداد میں ہو گئے۔ قدرتا کچھ مخالفت ہوئی اور  
 مسلمانوں کی اکثریت باقی فرقہ کی مذہبی فوقیت کے گھنٹے سے سخت ناراض  
 ہوئی۔ مذہب کے مخالفوں نے "کافر" کے الزام کا جو مرزا نے ان پر لگایا  
 شدت سے جواب دیا۔ مگر قادیانیوں نے اس پیرونی تنقید کا بالکل خیال  
 نہ کیا اور اپنے وطن قادیان میں مقامی طور پر محفوظ ہوتے ہوئے جہاں تک  
 ہو سکا حالات کے مطابق خوش حال رہے۔

مقابلہ محفوظ ہونے کی اس حالت نے غرور پیدا کر دیا جس نے  
 قادیانیوں میں تقریباً مقررہ کی شکل اختیار کر لی۔ اپنے دلائل کو منوانے اور فرقے  
 کو ترقی دینے کے لیے انہوں نے ان ہتھیاروں کا استعمال شروع کیا جن کو  
 عام طور پر نہایت ناپسندیدہ کہا جائے گا۔ انہوں نے ان اشخاص کے  
 دلوں میں جنہوں نے ان کی جماعت میں شامل ہونے سے انکار کیا۔ نہ صرف  
 بائیکاٹ، اخراج اور بعض اوقات اس سے بھی بدتر مصائب کی دھمکیوں سے  
 ہمیشہ انگریزی پیدا کی، بلکہ اکثر انہوں نے ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنا کر  
 اپنے تبلیغی سلسلے کو مضبوط کیا۔ قادیان میں ایک والٹیر کو مقرر کی گئی۔ جس  
 کا منشا غالباً اپنے احکام کو منوانے کے لئے قوت پیدا کرنا تھا۔ انہوں نے  
 عدالتی اختیارات کا استعمال بھی اپنے ذمے لے لیا۔ دیوانی مقدمات  
 میں ڈگریاں صادر کی گئیں اور اجراء بھی کرایا گیا۔ فوجداری مقدمات میں  
 سزا کے حکم سنائے گئے اور سزائیں بھی دی گئیں۔ لوگوں کو فی الحقیقت



قادیان سے نکال دیا گیا۔ قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ قادیانیوں پر صریح لزام لگایا گیا کہ انہوں نے مکانوں کو تباہ کیا، جلایا اور قتل بھی کیے گئے۔ اس خیال سے کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ مذکورہ بالا واقعات محض احوال کے تحویل کی ایجاد ہیں یہ لازمی ہے کہ میں چند واقعی مثالیں بیان کر دوں جو اس مقدمے کی مسل پر لائی گئیں۔

کم از کم دو اشخاص کو اپنے وطن قادیان سے باہر نکالا گیا کیونکہ ان کے خیالات مرزا کے خیالات سے متضاد تھے۔ وہ اشخاص حبیب الرحمن نمبر ۲۸ اور اسمعیل ہیں۔ مسل پر ایک چھٹی ڈی زیڈ نمبر ۳۳ موجود ہے جس کا کاتب خود موجودہ مرزا ہے اور جس میں حکم دیا گیا کہ حبیب الرحمن گواہ صفائی نمبر ۲۸ کو قادیان میں آنے کی اجازت نہیں۔ اس چھٹی کو مرزا بشیر الدین محمود احمد گواہ صفائی نمبر ۳۰ نے تسلیم کیا ہے۔ گواہ صفائی نمبر ۲۰ (خانصاحب فرزند علی) نے تسلیم کیا ہے کہ اسمعیل کو جماعت سے خارج کیا گیا اور قادیان میں داخل نہ ہونے کا حکم دیا گیا۔ بہت سے دیگر گواہوں نے نشدہ اور ظلم کی داستانیں بیان کی ہیں۔ بھگت سنگھ گواہ نمبر ۲۹ بیان کرتا ہے کہ مرزاٹیوں نے اس پر حملہ کیا۔ ایک شخص غریب شاہ کو قادیانیوں نے مارا اور جب اس نے دعویٰ کرنا چاہا تو کوئی شخص اس کی شہادت دینے کے لیے آگے نہ آیا۔ قادیانی ججوں کے فیصلہ شدہ مقدمات کی مسلیں پیش کی گئیں جو مسل میں موجود ہیں۔ مرزا نے تسلیم کیا ہے کہ عدالتی اختیارات قادیان میں استعمال کئے جاتے ہیں اور ان معاملات وہ خود آخری عدالت اپیل ہے۔ عدالت



کی ڈگریوں کا اجرا کیا جاتا ہے اور ایک ہفتا بھی موجود ہے جہاں ڈگری کے اجراء میں ایک مکان کو نیلام کیا گیا۔ قادیان میں ایک والتیٹر کوڈ کی موجودگی کی شہادت گواہ صفائی نمبر ۴ (مرزا شریف احمد) نے دی ہے۔

غلا وہ ازیں سب سے سنگین معاملہ عبدالکریم کا ہے جس کی داستان حقیقتاً ایک داستان درد ہے۔ اس شخص نے مرزائی مذہب قبول کیا اور قادیان چلا گیا۔ مگر وہاں اس کے دل میں مذہبی شکوک و شبہات پیدا ہوئے اور اُس نے مرزا بیت سے توبہ کر لی۔ تب اس پر ستم آرائی کی ابتدا ہوئی اُس نے ایک اخبار "مباہلہ" نامی جاری کیا جس کا مقصد مرزائی جماعت کے اعتقادات پر تنقید کرنا تھا۔ مرزا نے ایک تقریر میں جو دستاویز ڈی زیڈ نمبر ۳۹۱ (فضل مورخہ پہلا) میں شائع ہوئی ہے اس تقریر میں ان لوگوں کی طرف اشارہ بھی کیا جو اپنے مذہب کی خاطر قتل کرنے کو بھی تیار ہوتے ہیں۔ اس تقریر کے فوراً بعد عبدالکریم پر قاتلانہ حملہ ہوا لیکن وہ بچ گیا۔ ایک شخص محمد حسین عبدالکریم کی امداد کرتا تھا اور ایک فوجی مقدمہ میں جو عبدالکریم کے خلاف چل رہا تھا اس کا ضامن تھا۔ اس پر فی الحقیقت حملہ ہوا اور اُسے قتل کر دیا گیا۔ قاتل پر مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا ہوئی۔

نہ مرزا کو جو عرضیاں دی جاتی ہیں ان پر قادیانی ساخت کا اسٹامپ اور کورٹ میں تیار کر کے فروخت اور استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہ سب پوشیدہ طور پر کیا جاتا ہے۔



پھانسی کے حکم کی تعمیل ہوئی اور پھانسی کے بعد لاش تقادبان لائی گئی اور اس کو دھوم دھام سے اُسے اس جگہ دفن کیا گیا جس کا نام "بہشتی مقبرہ" ہے۔ افضل انجاریں جو مرزائی جماعت کا انجاریہ ہے قتل کی تعریف اور قاتل کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ لکھا گیا کہ قاتل مجرم نہیں تھا اور امر واقع سے قبل ہی جان دے کر پھانسی کی بدنام کفتہ سزا سے بچ گیا۔ خدا نے اپنے عدل و انصاف میں یہ مناسب سمجھا کہ پھانسی کی ذلت سے پہلے ہی اس کی روح قبض کر لے۔

جب عدالت میں مرزا کا ایک معاملے کے متعلق بیان لیا گیا تو اس نے بالکل مختلف کہانی بیان کی اور کہا کہ محمد حسین کے قاتل کو باعزت طریق پر اس لیے دفن کیا گیا تھا کہ اس نے اپنے جرم پر اظہارِ ندامت کیا تھا اور اس طرح گناہ سے بری ہو گیا تھا لیکن دستاویز ڈی زیڈ نمبر ۴۴ اس کی تردید کرتی ہے اور مرزا کی نیت اور اس کی دلی کیفیت کا پتہ اس اظہارِ خیال سے بالکل عیاں ہے۔ (ڈی زیڈ نمبر ۴۴)

میں یہاں یہ بھی کہہ دوں کہ اس دستاویز کا مضمون لاہور ہائی کورٹ کی توہین بھی ہے۔

ایک اور واقعہ بھی ہے جو محمد امین کے قتل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ محمد امین بھی مرزائی تھا اور یہ امر واقعہ ہے کہ وہ اس فرقے کا ایک مبلغ تھا اس کو بخارا بھیجا گیا تھا لیکن کسی وجہ سے اس کو ملازمت سے سبک دوش کر دیا گیا۔ اس کی موت کلہاڑی کی ایک ضرب سے ہوئی جو چوہدری فتح محمد گواہ



صفائی نمبر ۲۲ نے لگائی۔ عدالت ماتحت نے اس معاملے کو سرسری نظر سے دیکھا ہے لیکن اس پر نظر غائر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ محمد امین اگرچہ مرزائی تھا لیکن وہ مرزا کا مورد عقاب ہو چکا تھا۔ اس لئے ہستی بزرگ نہیں رہا تھا۔ اس کی موت کے واقعات کچھ بھی ہوں یہ امر ناقابل انکار ہے کہ محمد امین تشدد کی موت مرزا پولیس کو واقعے کی اطلاع دی گئی لیکن بالکل کارروائی نہ کی گئی۔ یہ بحث کرنا فضول ہے کہ قابل حفاظت خود اختیاری کر رہا تھا کیونکہ یہ فیصلہ تو اس عدالت کا کام ہے جو مقدمے کی سماعت کرے۔ یہ امر کافی تعجب انگیز ہے کہ چوہدری فتح محمد نے باقرار صالح بیان دیا ہے کہ اُس نے محمد امین کو قتل کیا تھا مگر پولیس کچھ نہ کر سکی اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مرزائی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ کوئی گواہ سامنے آکر سچ بولنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہمارے سامنے عبدالکریم کے مکان کا معاملہ بھی ہے۔ عبدالکریم کو قادیان سے نکلانے کے بعد اس کا مکان جلا دیا گیا۔ اُسے قادیان کی حال ٹاؤن کمیٹی سے حکم حاصل کیے نیم قانونی طریقے سے گرانے کی کوشش بھی کی گئی۔

یہ افسوس ناک واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ قادیان میں طوائف الملوکی تھی جس میں آتش زنی اور قتل بھی ہونے لگے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکام ایک غیر معمولی درجے کے فارج کا شمار ہو چکے ہیں۔ اور دیوبند اور دینی معاملات میں مرزا کے حکم کے خلاف کبھی آواز نہ اٹھائی گئی۔ مقامی افسروں کے پاس کسی مرتبہ شکایات کی گئیں لیکن افسردہ



نہ ہوا۔ مسل پر ایک دو ایسی شکایات ہیں لیکن ان کا حوالہ دینا غیر ضروری ہے اور اس مقدمے کے اغراض کے لیے یہ بیان کر دینا کافی ہے کہ قادیانیوں کا ظلم و جور جاری ہونے کے متعلق غیر مشتبہ الزامات عائد کئے گئے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی گئی۔

ان کارروائیوں کے سدباب کے لیے اور مسلمانوں کے اندر عقیدانہ روح حیات پیدا کرنے کے لئے احرار تبلیغ کا نفرین بلائی گئی۔ قادیانیوں نے قدرۃً اس اقدام کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور انہوں نے کانفرنس کے انعقاد کو کلیدیہ روکنے کے لیے دیرانہ کوشش کی۔ احرار کانفرنس کے انعقاد کے لئے ایک شخص ایئر سنگھ کی زمین حاصل کی گئی تھی۔ قادیانیوں نے اس زمین پر قبضہ کر لیا اور اس پر دیوار کھینچ دی۔ اس طرح اس ایک ہی قطعہ زمین سے بھی محروم کر دیئے گئے جو ان کو قادیان میں حاصل ہو سکتا تھا اور اس لئے مجبور کر دیئے گئے کہ قادیان سے ایک میل کے فاصلے پر ایک جگہ اپنا اجلاس کریں۔ دیوار کا بنایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت فریقین میں تعلقات کس قدر کشیدہ تھے۔ اور مرزا ٹیوں کا تخریبی حد تک پہنچ گیا تھا کہ وہ اپنی دست درازی کے قانونی انجام سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ و مامون سمجھتے تھے۔

لیکن اجلاس ہوا اور یہی اجلاس تھا جس کے لئے ایپلنٹ کو کہا گیا جو بے اوزار منتقلیسی جذب اور اعلیٰ درجے کی نصیبانہ خطابت کا مالک ہے۔ اس نے اس اجلاس میں وہ تقریر کی جسے ولولہ انگیز خطاب کہا جاسکتا



ہے۔ تقریر کئی گھنٹے جاری رہی اور بیان کیا گیا ہے جماعتیں کی یہ کیفیت تھی کہ گویا مسحور ہیں۔ اس تقریر میں ایپلائنٹ نے اپنے خیالات کا اظہار کس قدر صاف گوئی سے کیا اور اس نے اس بات کو پوشیدہ نہ رکھا کہ اس کے دل میں مرزا اور اس کے پیروؤں کے خلاف کس قدر ناپسندیدگی بلکہ نفرت ہے۔ تقریر اخبارات میں شائع ہوئی اور اس پر اعتراض کیا گیا معاند حکومت پنجاب کے سامنے پیش ہوا جس نے موجودہ مقدمہ کی اجازت دی۔

ایپلائنٹ کے خلاف جو فروجم ہے اس میں اس کی تقریر کے ساتھ حصے درج ہیں جن کو خاص طور پر قابل اعتراض اور قابل گرفت بنایا گیا ہے۔ وہ حصے یہ ہیں :-

”فرعونی تخت الٹا جا رہا ہے انشاء اللہ یہ تخت نہیں رہے گا“  
 وہ نبی کا بیٹا ہے میں نبی کا نواسا ہوں۔ وہ آٹے تم سب  
 چھپ چھپ بیٹھ جاؤ۔ وہ ٹھہرے اردو فارسی، پنجابی میں  
 ہر معاملے پر بحث کرے۔ یہ جھگڑا آج ہی ختم ہو جائے گا  
 وہ پردے سے باہر آئے۔ نقاب اٹھائے۔ کشتی لڑے  
 مولا علی کے جوہر دیکھے۔ وہ ہر رنگ میں آئے۔ وہ موٹر میں بیٹھ  
 کر آٹے میں ننگے پاؤں آؤں۔ وہ ریشم پہن کر آٹے میں کھڑ  
 وہ مزعور، کتاب، یا قوتیاں اور پومر کی ٹانگ واٹن اپنے  
 ابا کی سنت کے مطابق کھا کر آٹے میں اپنے نانا کی سنت



کے مطابق جو کی روٹی کھا کر آؤں۔

یہ ہمارا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ برطانیہ کے دم کٹے کتے  
ہیں۔ وہ خوشامد میں برطانیہ کے بوٹ کی ٹوٹا کر تا ہے  
میں تکبر سے نہیں کہتا ہوں بلکہ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ  
مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ پھر بشر کے اور میرے ہاتھ دیکھو۔ کیا  
کرنا لفظ تبلیغ نے ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ یہ سیاہی مجلس  
نہیں ہے۔ اور مرزا یوں! اگر بائیں ڈھیلی ہوتی۔ میں کہتا ہوں  
کہ اب بھی ہوش میں آؤ۔ تمہاری طاقت اتنی بھی نہیں جتنی  
پیشاب کی جھاگ ہوتی ہے۔

جو پانچویں جماعت میں نزل ہوتے ہیں نبی بن جاتے۔ یہ یوں کہ  
ہندوستان میں ایک مثال موجود ہے۔ جو نزل ہوا وہ نبی بن گیا۔  
اور مسیح کی پھیڑو تم سے کسی کا کراؤ نہیں ہوا۔ اس سے اب متنازع  
پڑا ہے یہ مجلس احرار ہے۔ اس نے تم کو ٹکڑے کر دینا ہے۔  
اور مرزا یوں! اپنی نبوت کا نقشہ دیکھو۔ اگر تم سے نبوت کا  
دعویٰ کیا تھا تو نبوت کی شان تو رکھنے۔

اگر تم نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو انگریزوں کے

کتے نہ بنتے۔

اپیلنٹ نے عدالت ماتحت میں بیان کیا کہ اس کی تقریر درست  
طور پر نہیں لکھی گئی۔ اس نے جملہ نمبرہ کے متعلق خواص طور پر کہا کہ وہ اس کا



کہا ہوا نہیں ہے اگرچہ اس نے تسلیم کیا کہ باقی جملوں کا مضمون میرا ہے  
 لیکن اس نے عبارت کے غلط ہونے کا عذر اٹھایا۔ عدالت ماتحت کے  
 فیصلے پر کہ جلد نمبرہ کی رپورٹ غلط ہے اور ایپیلٹ کو اس کے متعلق  
 قرار نہیں دیا جاسکتا ایپیلٹ کی سزایابی باقی چھ فقروں پر مدار کھتی ہے  
 ایپیلٹ کے وکیل نے بحث کے وقت ذرا تسلیم کیا کہ فقرہ جات نمبرہ  
 نمبر ۴ اور نمبرہ تاء فی الحقیقت ایپیلٹ نے کہے۔ وہ اس مرحلے پر  
 رپورٹ کی عبارت کی درستگی کو بھی زیر بحث نہیں لانا چاہتا۔ اس لیے میرے  
 واسطے یہی امر قابل غصہ ہے کہ آیا یہ چھ جملے زیر دفعہ ۳۵۱ الف قابل  
 گرفت ہیں اور کیا یہ الفاظ کہہ کر مرافعہ گزار نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔  
 مرافعہ گزار نے عدالت میں بہت سی تحریری شہادتیں پیش کیں اور یہ  
 دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اس کی تقریر کا مقصد مرزا اور اس کے تبع  
 کے جبر و تشدد اور ستم رانیوں پر جائز اور معقول تنقید کرنا تھا۔ اس کا بیان ہے  
 کہ اس کی تقریر کا واحد مقصد جوئے ہوئے مسلمانوں کو دعوت بیداری دینا  
 مرزائیوں کے مذموم افعال کا راز طشت ازبام کرنا تھا۔  
 اس نے اپنی تقریر میں جا بجا مرزا کے ظلم و تشدد کا ذکر کیا ہے  
 اور مطالبہ کیا ہے کہ ان مسلمانوں کی شکایات کا ازالہ کیا جائے جو صرف  
 مرزا کی نبوت ادا اس کے خود ساختہ اقتدار کے منکر ہونے کی وجہ سے  
 ہدف جو و ستم بنے ہوئے ہیں۔

میں نے مرافعہ گزار کی تقریر پر ان حالات کی روشنی میں غور کیا



ہے جو قادیان میں ڈوٹھا ہو رہے تھے۔ اوتن یہ کہ وہ مرزا احمد اٹس کے  
 تبیین کے افعال پر تنقید کرے۔ وہم یہ کہ مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب  
 دینا چاہتا تھا کہ وہ مرزائیوں کے مقابلے میں بیدار ہو کر اپنی شکایات کے  
 ازالہ کی کوئی صورت نکالیں۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ تقریر مسلمانوں کی طرف سے صلح کا ایک  
 اعلان تھی۔ لیکن اسے سرسری طور پر پڑھنے سے کوئی معقول آدمی اس بات  
 سے انکار نہیں کر سکتا کہ اعلان صلح کی بجائے یہ تقریر پیکار آزمانی کی  
 دعوت تھی۔ مرافعہ گزارنے قانون کے اندر رہنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ  
 کی ہو لیکن اپنی سائنیت اور جوش فصاحت میں وہ قانون کی اطمینانی حدود کو  
 پھاند گیا اور اس نے ایسی باتیں کہہ دیں جو اس کے سامعین کے دل میں مرزا احمد  
 کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے سوا اور کوئی اثر نہیں پیدا کر سکتی تھیں۔  
 ایک پختہ کار مقررہ کی طرح مرافعہ گزارنے رومہ کے مارک انٹرنی کی سنت  
 پر عمل کرتے ہوئے یہ اعلان تو کر دیا کہ وہ احمدیوں سے برسر پور خاشا نہیں  
 ہونا چاہتا لیکن صلح و اتحاد کا یہ اعلان ایسی سخت کلامی سے محلو تھا جس کا  
 مقصد سامعین کے دل میں احمدیوں کے خلاف منافرت و سفارت پیدا  
 کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مرافعہ گزار کی تنقید میں ایسے حصے بھی ہیں جو مرزا  
 کے افعال کی جائز اور معقول تنقید پر مبنی ہیں۔ تقریر کے دوران عزیز شاہ  
 کو زد و کوب کرنے کا واقعہ، محمد حسین اور محمد امین کے واقعات قتل اور



مرزا نے قادیان کے جبروت شد کے متعدد ایسے واقعات کا سوال دیا  
 کیا ہے جن پر تنقید کرنے کا ہر سچے مسلمان کو حق ہے۔ نیز اس تقریر کے دوران  
 اس قوانین کا ذکر بھی کیا گیا جو احمدی، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں دوا  
 رکھتے ہیں اور جن سے لازمی طور پر مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں لیکن  
 مرزائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کئی نبی آ  
 سکتے ہیں اور ان پر وحی نازل ہو سکتی ہے اور یہ کہ مرزائیہ فرقہ کا بانی نبی اور  
 مسیح موعود تھا۔ اس حد تک مرافعہ گزار کی تقریر قانون کی زد سے باہر ہے  
 لیکن جب وہ سخت کلامی سے کام لیتا ہے اور مرزائیوں کو ایسے ایسے ناموں  
 سے خطاب کرتا ہے جنہیں سنتا کوئی معقول آدمی گوارا نہیں کر سکتا تو وہ  
 جائز اور معقول تقریر کی حدود کو پھاند جاتا ہے اور خواہ اس نے یہ باتیں  
 ویدہ و دانستہ کہیں یا جذبات کے جوش میں قانون ان سے اغماض نہیں  
 برت سکتا۔

مرافعہ گزار کو معلوم ہونا چاہئے تھا کہ اس کے سامعین کی اکثریت  
 نامواخذہ دیہاتیوں پر مشتمل ہے اور یہ کہ اس قسم کی تقریر ان کے دل میں احمدیوں  
 کے خلاف بغض و عناد کے جذبات کی پرورش کرے گی۔ واقعات سے  
 ثابت ہوتا ہے کہ تقریر نے سامعین پر مزعومہ اثر ڈالا اور مقرر کی سائیت  
 سے مسخوہ ہو کر لوگوں نے متعدد دفعہ جوش کا مظاہرہ کیا۔ یہاں اس امر پر  
 بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ سامعین نے اس وقت اپنے مخالفین کے



خلاف متشددانہ اقدام کیوں نہ کیا اس تقریر نے نفرت کو کچھ زیادہ ہی  
 کر دیا ہے۔

فرد جرم میں جن سات حصوں کو قابل گرفت ٹھہرایا گیا میرے نزدیک  
 ان میں سے نمبر ۱ اور ساتواں سب سے زیادہ قابل اعتراض حصے ہیں۔ ان  
 فقروں میں مرافع گزار نے احمدیوں کو برطانیہ کے دم بریدہ کتے کہا ہے۔  
 میرے نزدیک دوسرے حصے تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ کے ماتحت  
 قابل گرفت نہیں ہیں۔

پہلا حصہ یعنی فرعونی تخت اٹا جا رہا ہے میرے نزدیک بالکل  
 بے ضرر ہے۔ دوسرا حصہ مرزا کی خوراک کے متعلق ہے۔ یہ امر قابل  
 دلچسپی ہے کہ مرزا نے اول نے اپنے عقیدت مندوں میں سے ایک کے  
 نام خط لکھا تھا جس میں خوراک کی ایسی تمام تفصیلات موجود تھیں۔ یہ خطوط  
 کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کا ایک نسخہ اس مقدمے کے کاغذات  
 میں شامل ہے۔

میری رائے میں نمبر ۱ اور ساتویں حصے کے سوا اور کوئی حصہ قابل  
 گرفت نہیں۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ مرافع گزار کی تقریر میں صرف دو حصے ہی  
 قابل اعتراض ہیں۔ تقریر کے کوائف سے پتہ چلتا ہے کہ مرافع گزار کا مقصد  
 جہاں احمدیوں کے افعال شنیعہ کا تار و پود بکھیرنا تھا وہاں مسلمانوں کے دل  
 میں ان کے خلاف جذباتِ حقارت پیدا کرنا بھی تھا۔ یہ امر کہ سائینس نے  
 اس کی تقریر سے متاثر ہو کر تشدد اور امن شکنی کا مظاہرہ کیوں نہ کیا اس کے



جرم میں صرف تخفیف کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ مرافقہ گزار احمدیوں پر تشدد کرنے میں حق بجانب تھا تاہم میرے خیال میں اس نئے قانون کی حدیں توڑ دیں اگرچہ مرافقہ گزار نے اصطلاحی جرم کا ارتکاب کیا ہے تو بھی قانون کی ہمہ گیری کا تحفظ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس مقدمے کے تمام پہلو پر غور کرنے اور سامعین پر اس تقریر کے اثرات کا اندازہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مرافقہ گزار نے تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۲ الف کے ماتحت ارتکاب جرم کیا ہے اور اس کے جرم کو قائم رہنا چاہیے۔ سزا کی کمی اور بیشی کا اندازہ کرتے وقت یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جو قادیان میں رونما ہو رہے تھے۔ پٹنہ میں اس کی سزا میں تخفیف کرتے ہوئے اُسے اپنا اختتام عدالت قید محض کی سزا دیتا ہوں۔

دستخط

جسٹس جی۔ ڈی۔ کھوسلا سیشن جج۔ گوردھار پورہ

۱۹۳۹ء

تقریر امیر مسٹر

یادداشت عدالت گوردھار پورہ میں مقدمہ ایچ۔ ڈی۔ سہاسنی تھا کہ امیر شریعت نے امرتسر میں ۱۹۳۹ء کو رات کو سید خیر الدین علی مولانا عبدالغفار غزنوی کی زیر صدارت تقریر کرتے ہوئے کہا:



بعض تعاقبت اندیش لوگ کہتے ہیں کہ مرزاٹھیت کے ساتھ ہمارے  
 شیعہ، سنی اور وہابی کی طرح کے فروعی اختلافات ہیں اور اسی سلسلے  
 میں گورنر بہادر انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں مسلمانوں کو اتحاد اور  
 اتفاق کی تعلیم دے چکے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان کے بڑے  
 اپنے خود کا شتر پودے کی مخالفت ناقابل برداشت ہے ہم  
 انتشار اللہ اس پودے کو بڑھنے سے اکھاڑ کر پھینکے۔

مرزاٹھیت کے وجود میں آنے کی وجہ یہ ہے کہ تیرہ سو سال  
 سے عیسائیت کے جگر میں ایک کاٹنا تھا جو کسی طرح نکلنے میں نہیں  
 آتا تھا۔ وہ کاٹنا یہ تھا کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے  
 جو رحمت ملی یا مرکزیت عطا ہوئی تھی یہ دنیا کی کسی قوم کو حاصل  
 نہ تھی۔ عیسائیت چاہتی تھی کہ اسلام کی اس رحمت کو ہمیشہ کیلئے  
 ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کی بربادی کے لیے پنجاب میں مرزا غلام  
 قادری کو کھڑا کیا گیا۔ اور اس نے ایڑھی چوٹی کا زور و حدت ملی  
 کو تباہ کرنے میں لگا دیا۔ یہ اختلافات فروعی ہیں؛ کہ نبی کے مقابلے  
 میں نبی کھڑا کر دیا گیا ہے اور دینہ النبی کے مقابلے میں دینہ المسیح  
 اور جنت المسیح کے مقابلے میں ہستی و روانہ بنایا گیا ہے۔

اس وقت ضرورت ہے کہ مرکزی شعبہ تبلیغ مجلس اہرار کو  
 مضبوط کیا جائے۔ محلہ محلہ شعبہ ٹائے تبلیغ قائم کر دیئے جائیں۔  
 اور قادیان میں زمین اور بھارت اور خیر پارٹی جائے۔ جس دن ہمارا اپنا



مائی سکول، اپنا تبلیغی کالج، اپنی مسجد اور وہاں نماز قادیان میں تیار ہو گیا۔ سمجھو کہ مرزا نیت کا خاتمہ ہو گیا۔

مرزا بشیر الدین محمود نے پیش گوئی کی تھی کہ ۶ ماہ کے بعد استوار کا کام ختم ہو جائے گا۔ اور یہ لوگ ٹھنڈے پڑ جائیں گے لگے میں بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا کام اب شروع ہوا ہے۔

قادیان کا نفرس کے نیچے کی بنا پر جس دفعہ ۱۵۳ کے تحت مجھے گرفتار کیا گیا ہے اس کی مرزا زیادہ سے زیادہ صرف دو

سال ہے۔ میرا جرم یہ ہے کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم ہوں۔ ان جرم میں یہ مرزا بالکل کم ہے۔ میں خاتم الانبیا کی ناموں پر ایسی ہزار جہاں قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے شیروں اور پتیلوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے اور

پھر کہا جائے کہ تمہیں جرم عشق محمدؐ تکلیف دی جا رہی ہے۔ تو میں خندہ پیشانی سے اس مرزا کو قبول کر دوں گا۔ میرا اکٹھ سالہ بچہ عطا ہفتیم اور اس جیسے خدا کی قسم، ہزار بچے رسول اللہ کی خدمت پر سے بچھاؤ کر دوں۔

### زلزلہ کوٹھ

۳۱ اور ۳۱۔ مئی ۱۹۳۵ء کی درمیانی رات جب کہ نظام کاٹنا رات کو خراب تھا اور صرف آسمان کے ستارے سے جھاگ رہے تھے، کوٹھ میں



ایسا زلزلہ آیا کہ بزرگانِ خدا عذابِ الہی کے باعث نیند کے راستے موت  
 کی پگڑندی پر سفر کرنے لگ پڑے۔ دن بھر کے تھکے ماندے لوگ رات  
 کو صبح اٹھنے کی آس لے کر سوئے تھے کہ زلزلے نے انہیں لاکھوں من  
 ملبہ کے ڈبیر تلے دبا دیا۔ اس عظیم حادثہ میں ہزاروں انسان جان و مال  
 محروم ہو گئے۔

یوں تو کوئٹہ زلزلہ کے حادثات کا عادی تھا لیکن انسانی تباہی کا  
 یہ منتظر اپنی نوعیت میں عظیم تر تھا۔ ان دنوں مجلس احرار کا آفتاب نصف النہا  
 پر تھا جس کی روشنی سے غیر ملکی سامراج کی آنکھیں بھی پتیرھیار نہ تھیں۔ مجلس  
 احرار نے کوئٹہ سے دہلی تک اپنے ریپیٹ کیمپ کھول دیئے۔ ہزاروں  
 باوردی رہنما کارِ مصیبت زدگان کی امداد کے لیے رات دن مصروف  
 ہو گئے۔

مجلس احرار کی اس بے لوث خدمت سے متاثر ہو کر وائسرائے ہند  
 نے احرار رہنماؤں کو دہلی آنے کی دعوت دی تاکہ انہیں ان خدمات کے  
 صلے میں سرکاری سٹریفیکیشن دیا جائے۔ وائسرائے کی اس دعوت پر جماعت  
 میں قدرے اختلاف تھا۔ درکنگ کمیٹی نے اپنے ایک غیر رسمی اجلاس میں  
 اس دعوت پر غور کیا۔ اس اجلاس میں امیر شریعت بھی ابرقمر سے پہنچ گئے  
 جب انہیں وائسرائے کی اس دعوت کا علم ہوا تو اجلاس سے خطاب کرتے  
 ہوئے فرمایا:

”ملک ہمارا ہے۔ نقصان ہمارا ہی ہوا ہے۔ بھائی بھائی ہمارے



مرے ہیں۔ ان کی خدمت کرنا بطور انسان کے ہمارا فرض تھا  
 سو ہم نے جو کچھ کیا اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا۔ اس میں  
 دائرے کوئی ہے جو ہماری خدمات سے خوش ہو کر ہمیں  
 سٹیفنڈیٹ دے۔ ہم تو اپنے خدا سے انعام چاہتے ہیں  
 انگریز کا سٹیفنڈیٹ ہمارے لیے کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ اگر  
 مجلس احرار نے کوئی ریٹ کیپ وائسراے کو خوش کرنے کے  
 لیے کھولا تھا تو پھر اس کی دعوت پر فوراً وہی جانا چاہیے اور اگر  
 مصیبت زدگان کی امداد خدا کے لیے کی ہے تو پھر میری  
 دائے میں دو سنتوں کو اس قسم کے مشورے پر اپنا قیمتی وقت  
 ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

امیر شریعت کی اس رائے کو وہ کٹنگ کنجی نے پسند کیا اور وائسراے کو  
 اطلاع کر دی گئی کہ کوئی ریٹ کیپ کے سلسلے میں آپ کی دعوت کا شکریہ بعض  
 مشروفیتوں کی بنا پر ہم ملاقات کے لیے نہیں آسکتے۔

## مسجد شاہ چراغ

سادہ سیاست پر پیشینہ والے کھلاڑی جب حالات و واقعات کی  
 بعض پرانگیوں رکھتے ہیں تو ان کے منکر کی دماغی نالیوں ابھر کر حالات کے نقشے کو  
 کچھ اس ترتیب سے لکیرتی ہیں کہ واقعات آپ سے آپ سلجھتے جاتے ہیں۔  
 جھوٹ اور فریب کا خوبصورت نام ہے سیاست اور سیاست میں



اقتدار کے گھوڑے پر سفر کرنے والے لوگ عموماً اسی لباس سے آراستہ  
رہتے ہیں۔

۱۹۳۵ء کے آئین نے ہندوستان کو جو رعایت دی، وقت کے  
دانشور گرسوں کا لباس اُتار کر عوام میں شاہین بن کر پروانہ کرنے لگے،  
حالانکہ وہ شاہین کی طرح شکار کرنے کے عادی نہیں تھے۔ لیکن گرسوں میں  
پہرہ ریش پانے والے جب بال و پوسنوار کو سامنے آئے، تو رنگا پیں  
فریب کھا گئیں۔

(۱۹۳۵ء کے نفاذ کے بعد میاں فضل حسین جبب وائسرائے کی  
کونسل سے منسارخ ہو کر پنجاب میں آئے تو ان دنوں سر سکندر حیات  
آئندہ انتخاب کے لئے دوسری سیاسی پارٹیوں کے علاوہ مجلس احرار  
کے یہی رشتہ گانڈھے تھے۔ ان کی رائے میں مجلس احرار ہی اُسس  
وقت ایسی جماعت تھی جو پنجاب کی سیاست پر غالب تھی۔

فضل حسین زیرک آدمی تھے اور ہوائی قلعے تعمیر کرنے کے عادی  
تھے۔ اس گٹھ جو ڈیراپنے مستقبل کو روشن نہ پا کر حکومت سے سازش کرنے  
سر سکندر حیات خان کو سٹیٹ بینک آف انڈیا کا ڈپٹی گورنر بنا کر کھینکے  
پھجوا دیا۔ راستے کی اب دوسری بڑی دیوار صرف مجلس احرار تھی جس کے  
رہنما لوگوں کی سرخ و دریاں گرتے ہوئے فرنگی دستار کے افواہ پر چھایا  
ڈالی رہی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس دیوار کو گرانے کے لیے سیاسی  
اُستادوں نے مسجد شہید گنج کو گرانے کا منصوبہ تیار کیا۔



سات اور آٹھ جولائی ۱۹۳۵ء کی درمیانی رات کو چند سیکھ مزدوروں نے لنڈا بازار کی تاریخی مسجد "مسجد شہید گنج" کو بلا کسی وجہ کے گرانہ شروع کر دیا۔ ران دنوں پنجاب کا گورنر مسٹر ایمرسن تھا، یہی وہ انگریز آفیسر ہے جو ۱۹۲۴ء میں ملتان کا ڈپٹی کمشنر تھا، جس نے تعزیری واری کے موقع پر ہندو مسلم فساد کرایا تھا، مسجد گرنے سے لاہور اور باقی پنجاب کی ساری فضا پھر سے مکدر ہو گئی، سیاسی اُستاد گھٹات میں تھے، اور مسجد کا تمام طبقہ مجلس احرار پر گرا دیا گیا۔ اس سارے کھیل تماشے کے پس منظر میں مولانا ظفر علی خان اور فضل حسین کی سیاست کام کر رہی تھی۔

مجلس احرار نے اعلان کیا کہ مسجد گری نہیں گرائی گئی ہے، اور یہ سب ایکشن کی سیاسی تدبیریں ہیں، مگر انگریز، مرزائی اور رجعت پسند مسلمان اس تیز روی سے پنجاب کی سیاسی زندگی کو اپنے قبضے میں کر چکے تھے کہ وقت کی سب سے بڑی فعال جماعت احرار کو سنبھالا لینا دشوار ہو گیا، اس ہنگامہ آرائی میں امیر تریبٹ نے لاہور ثنا ہی مسجد میں تقریر کے دوران کہا،

"مسجد شہید گنج آج ہی سکھوں کے قبضے میں نہیں آئی، بلکہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی جن واقعات نے نئی کروٹ لی، اور ۱۷۶۷ء میں ہمارا جہر بحیثیت سنگھ حکومت کے سنگھاسن پر براجمان ہوئے تو پنجاب کی قسمت نے پٹا کھایا، ایک ہزار برس تک اٹھارہ لاکھ مربع میل پر حکومت کرنے والی مسلمان قوم بھی ان کی غلامی میں چلی گئی۔"



۴  
 موجودہ مسجد شہید گنج جو کبھی مسجد عبداللہ خان کے نام سے  
 مشہور تھی، سکھوں کی غلامی میں جا کر اس نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا۔  
 یہ عبداللہ خان، شہزادہ داراشکوہ کا خاندان تھا۔ لیکن یاد رہے کہ  
 خاندان سے مراد انگریزی عہد کا کھانا پکانے والا نہیں، بلکہ اُس  
 دور میں خاندان کے معنی "خانِ سامان" یا "امیرِ سامان" تھا، یعنی سامان  
 کی حفاظت کرنے والا تھا۔

آج ایکشن کی ضرورت نے انگریز پست لوگوں کو مجبور کیا  
 کہ مسجد گرا کر اور اس کے گھنٹے کو سیڑھیاں بنا کر پنجاب اسمبلی میں  
 جائیں۔ ان مسجد کے شیدائیوں سے پوچھو کہ کیا لاہور میں کوئی دوسری  
 مسجد نہیں، جس میں آج کل سرکاری دفاتر قائم ہیں۔ اس کی بازیابی کئے  
 لیے تو آواز بلند نہیں ہوتی، مگر ایک ایسی مسجد کو گرا کے کونسل کی سیڑھیاں  
 بنایا جا رہا ہے جس کے گرنے سے پنجاب ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان  
 میں خون کی ندیاں بہہ جانے کا احتمال ہے۔"

یہ تقریر صرف آدھ گھنٹہ جاری رہی، اور امیرِ شریعت کے اس فقرے نے کہ  
 کیا لاہور میں کوئی اور دوسری مسجد نہیں جس میں آج کل سرکاری دفاتر قائم ہیں، حکومت  
 اور عوام کو گہری فکر میں ڈال دیا۔

مسجد شاہ چراغ کے متعلق رائے بہادر کنہیا لال اپنی کتاب "تاریخ لاہور"  
 میں لکھتے ہیں :

امیرِ شریعت کا یہ اشارہ مسجد شاہ چراغ کی طرف تھا جس میں ان دنوں سرکاری دفتر تھا۔



”محلہ بیتہ چراغ شاہ، محلہ موج دریا بخاری کے مشرقی جانب واقع تھا۔ سادات گیلانی اس میں سکونت رکھتے تھے۔ یہ محلہ شاہ جہانگیر کے عہد میں آباد ہوا، اور مدت تک آباد رہا۔ آخر بے منتظمی کے باعث سکھ غارتگروں نے اس کو ویران کر دیا۔“

بیتہ چراغ شاہ کا مقبرہ و مسجد پختہ اب تک موجود ہے، مسجد تو سرکاری قبضے میں ہے اور اس میں اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر ہے۔“

حکومت پنجاب نے یہ سوچ کر کہ شہید گنج نامی جو سکھ مزدوروں کے ہاتھوں اڑھی، اور مجلس احرار کے دامن سے لپٹ گئی، ایسا نہ ہو کہ بیتہ عطا اللہ شاہ بخاری کی اس تقریر کے بعد مسجد شاہ چراغ کی اینٹیں حکومت کو بھی زخمی کر دیں، چنانچہ تقریر کے دوسرے ہی دن اخبارات میں یہ خبر جلی عنوان سے شائع ہوئی، کہ ”حکومت نے مسجد شاہ چراغ مسلمانوں کو واکوار کر دی ہے، اور اس کا انتظام انجمن اسلامیہ کے سپرد کر دیا ہے۔“

## قتل کی سازش

پھول جب اپنی بہار چھوڑ دیتا ہے، تو نسیم سحرگاہی کا ایک ہی بھونکا اسے شاخ سے علیحدہ کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

جو قومیں حصول زندگی کے سانچے اپنی تن آسانی کے ہاتھوں توڑ دیتی ہیں، پھر انہیں اپنے مستقبل کے راستے اندھیر و کھائی دیتے ہیں۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت انتخاب کی ضرورت نے مسلمان قوم سے وہ



شور مچین لیا، جس سے امتیاز کی دیوار قائم تھی، اور اپنے پرانے کے درمیان  
 نشانہ کی جا سکتی تھی سیاسی شعبہ بازوں نے اچھی بھلی قوم کو فک کی تمام  
 صلاحیتوں سے بیگانہ کر دیا، اور ایسے سبز باغ دکھائے کہ اپنے پرانے میں امتیاز  
 مشکل ہو گیا۔ مسجد شہید گنج کی ہر اینٹ مجلس احرار کے دفتر کی طرف اٹھنے لگی۔ سیاست  
 کے کھلاڑی مہروں کو اس انداز سے حرکت دینے کہ بساط کی ساری ہانڈی انہی کے  
 حق میں سلوم ہوتی۔ انہی دنوں قادیان کے بٹوں نے بھی حیدرآبی کا دعویٰ کیا،  
 وہ بھی اپنے راستے کے پہاڑ سے نکلنے کو نکل پڑے۔

امیر شریعت اپنے رفیقوں کی معیت میں بھیرہ (ضلع سرگودھا) سے اس مشن پر  
 یوپی تک دورہ کرنے کا ارادہ لے کر روانہ ہوئے کہ مسلمانوں کو سمجھائیں کہ مسجد شہید گنج  
 گرمی نہیں گرائی گئی ہے۔ اس کے لیے کن کن ہاتھوں نے کیا حرکتیں کیں ہیں۔  
 چنانچہ مجلس احرار کا یہ وفد امیر شریعت، مولانا حبیب الرحمن، شیخ حسام الدین اور  
 راقم الحروف پر مشتمل مسلسل سفر کے بعد پنجاب کی سرحدوں کو عبور کر کے یوپی میں  
 داخل ہوا۔ یہاں سے مولانا حبیب الرحمن اور شیخ حسام الدین جماعتی ضرورت  
 کے لیے واپس کر دیے گئے۔ اب امیر شریعت اور راقم اس سفر کے لیے.....  
 باقی رہ گئے۔ یہی وہ تاریخی سفر ہے جس کے دوران لکھنؤ میں امیر شریعت پر انکشاف  
 ہوا، کہ یہاں (لکھنؤ میں) مدح صحابہؓ و انبیاؑ جرم ہے، اور اسی سفر میں امیر شریعت کے  
 دل میں اس قانون کو ختم کرنے کے ارادے نے جنم لیا۔

یہ سفر کانپور تک جاری رہا، جب واپس ہوئے تو امیر شریعت کی صحت تھکن کی  
 وجہ سے بہت کمزور ہو رہی تھی۔ تاہم کچھ دنوں کے بعد ارادے، آبدوز میں



اور عزم اسی طرح جوان تھے۔

لاہور پہنچے کچھ دن گذرے تھے کہ پولیس کا ایک ذمہ دار افسر میرے پاس آیا، اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اُس نے مجھ سے سوال کیا۔ ”آپ راجندر سنگھ آتش کو جانتے ہیں؟“

”جی ہاں!“

میرے جواب پر اُس نے سنبھل کر کہا۔ ”کیسے اور کب سے؟“

”۱۹۳۰ء میں راجندر سنگھ آتش میرے ساتھ لاہور پورسٹس جیل میں بطور

سیاسی قیدی کے رہا ہے، اس کے بعد میری اُس کی ملاقات نہیں ہوئی۔“

میرے جواب پر پولیس افسر نے کہا۔ ”چلیئے وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

”کہاں؟“ — ”تھانے کی حوالات میں۔“ — اب میری پریشانی کچھ بڑھی۔

کیونکہ یہی نوجوان اخبار کی ایک خبر کے مطابق گذشتہ دنوں کلکتہ سے انقلابی پارٹی

کے ممبر ہونے کے شبہ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ پولیس افسر نے مجھے مجبور کیا، کہ میں

راجندر سنگھ آتش سے ملوں۔ اُن کے ساتھ جب میں متعلقہ تھانے پہنچا تو حوالات

میں میں نے ایک ایسے نوجوان کو دیکھا جو میرے تصور سے بالکل جدا نکلا۔

۱۹۳۰ء میں جس راجندر سنگھ آتش کو میں نے دیکھا تھا، اُس کے سر کے بال ابدوڑھی

اُس کی عمر سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن پانچ برس گزرنے پر راجندر سنگھ آتش پورپن لباس

میں ایک ایسا فیشن اپن نوجوان تھا، جس کا سر اور منہ سیکھ مذہب کے اصولوں سے

خدا ہی کر چکا تھا۔

”آئیے جاننا صاحب! کیسے مزاج کیسے ہیں؟“ بھٹک ہیں، لیکن آپ نے



کیا کیا؟" بس یہی کہانی سنانے کے لیے آپ کو بلایا ہے، یاد ہے گذشتہ  
 دن سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ساتھ آپ نے پنجاب اریو لوجی کا دورہ کیا تھا،  
 "ہاں"۔ "یہ اس پورے دورے میں ساتھ ساتھ تھا۔ اس کے بعد  
 اجندر سنگھ آتش نے ہمارے سفر کے تمام واقعات من وعن سنانے  
 بس کی تصدیق کرنا پڑی۔

"لیکن آپ نے ہمارے ساتھ یہ وعدہ کیوں کیا؟"

میرے اس سوال پر اس نے پولیس افسر سے کہا کہ ہم کوئی بات  
 کرنا چاہتے ہیں، آپ ذرا ہٹ جائیں۔ مگر پولیس افسر نے کہا: "یہ آپ  
 دونوں کی گفت گو میں ڈیوٹی پر متعین کیا گیا ہوں" اس پر اجندر سنگھ آتش  
 نے اپنی گفت گو کا لہجہ آہستہ کر دیا۔ راجندر سنگھ نے کہا:

"تخلیفہ قادیان بشیر الدین محمود نے مجھے سید عطاء اللہ شاہ

بخاری کے قتل پر مقرر کیا تھا، اور اس کے عوض دس ہزار

روپیہ دینے کا وعدہ کیا، جس کی ادائیگی پانچ ہزار روپیہ پیشگی

اور پانچ ہزار واقعہ کے بعد طے پائی تھی، لیکن میں اراداً

ایسا نہیں کر سکا۔ حالانکہ مجھے اکثر مواقع میسر آئے۔ میری

ناکامی کی وجہ صرف یہ ہے کہ شاہ جی کو قتل کرنے کو میرا جی

نہیں چاہا۔ ایک آدمی عوام کو اچھی باتیں سنانا پسے خواہ وہ

کسی مذہب سے کیوں نہ ہو، میں اپنی ذاتی غرض کے لیے

اُسے کیوں قتل کر دوں۔



اس کے بعد جب میں واپس قادیان پہنچا تو میری  
 ناکامی پر بشیر الدین محمود نے کہا، تو پھر تم ڈاکٹر گوردیچن سنگھ کو  
 قتل کر دو۔ لیکن میں نے اس پر بھی انکار کیا۔ میرے اس  
 انکار پر مرزا ایوں نے مجھے ایک سازش کے تحت کلکتہ میں  
 گرفتار کر لیا ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ میں یہ تمام واقعہ  
 عدالت میں کہہ دوں، کیا..... آپ کی جماعت (مجلس احرار)  
 اس مقدمے میں میری امداد کرے گی؟

یہ سارا کچھ سننے کے بعد میں نے کہا۔ پارٹی سے مشورے کے بعد  
 ہی کوئی رائے دے سکتا ہوں۔ اس پر راجندر سنگھ سے میری ملاقات  
 دوسرے دن پر ملتوی ہو گئی۔

چودھری افضل حق سے ابھی پہلے دن کی گفت گو کا ذکر چل ہی رہا تھا  
 کہ اخبارات آگئے، چودھری صاحب نے پہلی سڑخی دیکھتے ہی کہا، لو! اس کو  
 تو پولیس نے رہا کر دیا۔ معلوم ہوا کہ پولیس افسر نے ہم دونوں کی گفت گو  
 اپنے حکام کو پہنچائی، تو پنجاب کی حکومت نے بہتری اسی میں سمجھی کہ راجندر سنگھ کو  
 رہا کر دیا جائے۔

قضا و قدر کی تحریریں نہ مٹائی جاسکتی ہیں، اور نہ ہی ان کا کوئی شوشہ  
 تبدیل ہو سکتا ہے۔ لیکن انسان ہے کہ اپنے قلم کے فیصلے کی طرح ان میں بھی  
 ترمیم چاہتا ہے۔ اگر، بمبئی اور شجاع آباد کے بعد امیر شریعت کے قتل کی

لے ڈاکٹر گوردیچن سنگھ قادیان میں مرزا ایوں کا سخت مخالف تھا۔



یہ پوچھتی کوشش تھی جو بہر حال ناکام رہی

## قاتل سے ملاقات

حالات کی پیشانی ٹھکنے آؤد تھی، خنداؤں میں انتقامی ارادوں کے تیور  
ہنوز مٹخ تھے کہ امرتسر میں راجندر سنگھ آتش سے پھر ملاقات ہو گئی۔ اُس نے  
امیر شریعت سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن میں اُسے طرح دے گیا آخر  
اُس کا اصرار بڑھا تو میں اُسے امیر شریعت کے مکان پر لے گیا، قاتل اور  
مقتول کا آئنا سامنا ہونے سے پیشتر میں نے احتیاط کا وامن ہاتھ سے  
نہ چھوڑا، اور اپنی تسلی کے لئے راجندر سنگھ کے جسم کو ہاتھ اور نگاہوں سے  
گھنٹا ل ڈالا، جس پر وہ مسکرایا، اور یہ مسکراہٹ میرے شبہ پر طعن تھی۔  
”تپاس اور جسم کی تلاش میں اب کیا رکھا ہے جاننا زبا دل اور آنکھوں میں  
تلاش کرو، جن میں نہ امانت کے کس قدر آفسوہیں، جو شاہ جی کی بھینٹ کرنے  
آیا ہوں۔ میں اپنے پر ماتما کی سو گند کھا کر کہہ رہا ہوں کہ میرے پاپ مجھے  
پچھتایا پ کے لیے اُس عظیم انسان کے چہرے میں جس جھکا دینے کیلئے  
مجبور کر رہے ہیں کہ جس کی زبان نے میری چھری کو گند کر دیا، اور میرے ارادوں کو  
موت آگئی، ورنہ آج قاتل اور مقتول کا رشتہ ٹوٹ چکا ہوتا۔“  
یہ کہتے ہوئے راجندر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور میں نے  
امیر شریعت کے دروازے پر دستک دی۔  
”کون ہے بھائی! اندر آ جاؤ۔“ یہ امیر شریعت کی آواز تھی، ہم بیٹھک میں



چلے گئے، امیر شریعت پان بنانے میں مصروف تھے۔

”یہ آپ کا قاتل ہے شاہ جی! میں نے عرض کیا۔ امیر شریعت نے ایک نظر اجندر سنگھ کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ ”ہاں بھائی! ایسے ہی لوگ میرے قاتل ہوتے ہیں۔“ میں نے اپنے فقرے کو دوبارہ ذرا وضاحت سے دہرایا تو سنبھل کر بیٹھ گئے اور متعجب ہو کر سوال کیا۔ ”کیا مطلب؟“

”یہ اجندر سنگھ آتش ہے، یہ آپ کے حالیہ طویل سفر میں مرزائیوں کی طرف سے آپ کے قتل پر مامور کیا گیا تھا۔“

”کیوں بالو! یہ درست ہے؟“ ”ہاں شاہ صاحب! تو پھر کونسی چیز مانع رہی؟“ ”یہ میں نہیں جانتا شاہ صاحب! مگر آپ کچھ طرز تکلم نے مجھے اس گناہ سے بچائے رکھا۔“ اس پر امیر شریعت نے زور سے تہقیر لگایا، اور اجندر سنگھ کو مخاطب کر کے کہا :-

”میرا طرز تکلم مجھے کیا بچا سکتا ہے بالو! موت اور

زندگی خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یاد رکھو، جو رات قبر کی

ہے وہ پابہ نہیں آسکتی، اور جس رات کو پابہ آنا ہے،

اسے دنیا کی کوئی طاقت قبر کے سپرو نہیں کر سکتی۔ البتہ تمہیں

میری نصیحت ہے کہ بحیثیت انسان ہمیشہ ان کی بھلائی

کے لیے سوچا کرو۔ دولت ہاتھ کی میل ہے بالو! اس کے

لاپٹ میں اگر تم مجھے قتل بھی کر دیتے، اور میرے قتل کے

الزام سے تمہارا دامن محفوظ بھی رہتا، تو کسی دوسرے موقع پر



بغیر عزم کے مار کھا جاتے — فیرا —

امیر شریعتؒ پھر مسکرائے اور قرآن کریم کی چند آیات کا ترجمہ سناتے رہے کہ اتنے میں چائے آگئی۔ راجندہ سنگھ امیر شریعتؒ کی گفتگو اور قرآنی عوینہ کے لفظوں میں اپنے ماضی پر غور کرتا ہوا بے اختیار رونے لگ پڑا اور روتا ہوا امیر شریعتؒ کے قدموں پر گر پڑا۔

”اپنے دل کے سامنے گرو جو تمہیں معاف کرے ہیں

تو تمہارا چاکر ہوں بابو ابو چائے ہو۔“

امیر شریعتؒ اور راجندہ سنگھ آتش کے درمیان یہ ملاقات مغرب کی

نماز تک رہی۔

## تحریک مدح صحابہ کی ابتدا

پنجاب اور یو۔ پی کا دورہ کرتے ہوئے لکھنؤ (احاطہ شوکت علی) میں تقریر کے دوران کسی نے امیر شریعتؒ سے صحابہ کرام کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنے پر بلند آواز سے پکارا۔

”شاہ صاحب! یہاں صحابہ کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کہنا جرم ہے۔“

یہ فقرہ سنتے ہی امیر شریعتؒ نے مجمع سے دوبارہ تصدیق کی — اور

معا بعد طبیعت ہیں یکایک تیزی آگئی، اور صحابہ کرام کا بار بار نام لیا، اور ہر نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہا۔ حالانکہ امیر شریعتؒ چار روز لکھنؤ ٹھہرے، لیکن



قانون اور حکومت دونوں خاموش رہے۔

امرتسر والپس پہنچ کر جماعت سے صلاح و مشورے کے بعد  
۲۶ اگست ۱۹۳۵ء کو دوبارہ لکھنؤ گئے اور چوک ٹرنکی محل میں صبح پیل تقریر کی۔

بڑھے افسوس ہے کہ انگریزوں نے لکھنؤ میں ایک ایسا

قانون جاری کر رکھا ہے جس کی رو سے منقبت صحابہ کرنا

اورد کرنا جرم ہے۔ حضرت ابوبکر و عمر، عثمان غنی و علی

رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف کرنا قابل سزا جرم ہے

اور یہ سزا دو سال قید تک ہے۔

غضب خدا کا اتنی بڑا اہل سنت و الجماعت کی

آبادی اور وہ اس قانون کو حکومت سے نہیں بدلواتی،

پندرہ ماہ ہوئے ہمارے بھائی غازی جی نے یہاں

مدح صحابہ پڑھی تھی جس کی پاداش میں ان پر مقدمہ چل رہا ہے

میں حکومت سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ اس قانون کو فوراً منسوخ

کر دے۔ یہ مداخلت فی الدین ہے، حالانکہ حکومت نے مذہب

کی آزادی کا اعلان کر رکھا ہے۔

گالیاں بکنا تو جرم ہو سکتا ہے، مگر کسی کی تعریف کرنا

کیونکہ جرم قرار دیا جاسکتا ہے۔ آج حکومت نے قمار بازی،

شراب نوشی اور عصمت فروشی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔

۱۔ لکھنؤ مجلس احرار کے ناظم اعلیٰ تھے۔



لیکن خلفائے راشدہ کی تعریف پر پابندی عائد ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اپنی پوزیشن پر غور کرے۔

میں شیعہ حضرات سے خطاب نہیں کر رہا، بلکہ میرا رد سے سخن حکومت کی طرف ہے، شاید کل کو کچھ اور سمجھ لیا جائے۔ اس لئے کان کھول کر سن لو، میں تمام یو، پی کو ایک مرکز پر جمع کروں گا، اور اس قانون کو آئینی جدوجہد سے ختم کرا کے دم لوں گا۔ اور اگر اس طرح بھی اس قانون کو ختم نہ کیا گیا تو پھر میں بے آئینی بھی کر سکتا ہوں۔“

ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات میں حکومت ان دنوں کسی طرح بھی دوسرے رنگ میں سوچنا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ کیونکہ ۱۹۳۵ء کے آئین کے نتیجے میں جو واقعات سامنے آئے، والے تھے، ان کے پیش نظر صوبائی ہنگاموں کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ لہذا امیر تشریحیت کی مندرجہ بالا تقریر کو حکومت نے ہوا کے دوش پر لٹکا دیا۔ اس کے بعد مجلس احرار نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور یہاں سے تحریک مدح صحابہ کی ابتدا ہوئی۔

## قادیان میں تہارہ جمعہ

احرار ہمیشہ خیالات اور جذبات کے دو مختلف محاذوں پر برسرِ پیکار رہے ہیں، اول ہندوستان میں اسلام کا غلبہ اور دوسرے درجہ پر وطن کی آزادی۔



ان آئینے سامنے کے دو مختلف مورچوں پر احرار کبھی انگریزوں سے اور کبھی  
ہندو سے نبرد آزما رہے۔

(۱۹۳۵ء میں انگریزوں نے جو آئین ہندوستان کو دیا، احرار نے  
دونوں مقاصد کے لیے اس آئین کے تحت الیکشن میں اترنے کی تیار  
کر رہے تھے کہ پنجاب میں مسجد شہید گنج اور یو پی میں مدح صحابہ کے  
ایسے جال پھیلائے کہ جن کا تعلق احرار کے جذبہ ایمان سے تھا۔  
سن میں امیر شریعت کے مقدمے کا فیصلہ لکھتے وقت گورنمنٹ کے سینئر  
مسٹر جی، ڈی کھوسلہ نے مرزا ایت کے تاہوت میں جو بیخ ٹھونکی، اس  
قادیانی مذہب کی بنیادوں میں دبا ڈال دی۔ چنانچہ اس خفت کو مٹانے  
کے لیے خلیفہ قادیان بشیر الدین محمود نے احرار کو مباہلہ کے لئے وقت دیا  
آنے کی دعوت دی، جسے احرار نے قبول کر لیا۔ جب وہ تیار ہو کر تیار دیا  
جانے لگے، تو قادیانیوں نے اپنی سرکار سے واویلا کرنا شروع کیا، کہ دیکھو  
احرار پھر قادیان آ رہے ہیں۔ چنانچہ حکومت نے قادیان میں دفعہ ۴۴  
نفاذ کر دیا۔ چونکہ احرار اس سفر کا عزم کر چکے تھے، لہذا جماعت نے قادیان  
میں جمعہ پڑھنے کا اعلان کر دیا، اور امامت کے لئے امیر شریعت کا نام تجویز کیا۔  
سال بھر کی دوڑ دھوپ اور مقدمہ سے رہائی کے بعد امیر شریعت  
کچھ دنوں گھر میں سستانے کا ارادہ رکھتے تھے کہ جماعتی فیصلے کے تحت  
مولانا مظہر علی انہر امرتسر پہنچے اور امیر شریعت کو جماعتی فیصلے سے آگاہ کیا۔  
امیر شریعت نے مجلس احرار اسلام ہند کے ناظم اعلیٰ کا حکم سن کر تھوڑی دیر سوچ



پڑے رہے۔ پھر فوراً ایک سرواہ بھری، اور کہا — ”بہت اچھا، جو مزاج یار میں آئے!“

۶ دسمبر ۱۹۳۵ء کو امیر شریعتؒ بذریعہ گاڑی امرتسر سے قادیان روانہ ہوئے۔ اس وقت احرار دوستوں کا جم غفیر بھی ان کی معیت میں اسی گاڑی پر سوار تھا۔ بٹالہ ریلوے اسٹیشن پر پولیس افسروں نے امیر شریعتؒ سے دفعہ ۴۴ کے نوٹس پر عمل کرانی چاہی، جس کی رو سے امیر شریعتؒ قادیان کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتے تھے، لیکن امیر شریعتؒ نے تعمیل نوٹس سے انکار کر دیا، اور اپنا سفر جاری رکھا۔ جینتی پور کے اسٹیشن پر سب انسپکٹروں نے خان چراغ الدین نے امیر شریعتؒ کو دفعہ ۴۴ کی خلاف ورزی میں گرفتار کر لیا، اور اسی وقت سفری مجسٹریٹ مسٹر ڈنڈنی نے آپ کو تین ماہ قید اور ایک سو روپیہ جرمانہ اور عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں مزید ایک ماہ قید با مشقت کی سزا کا حکم سنا کر گورداسپور ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا، جہاں سے ایک ہفتہ بعد آپ کو لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ قادیان میں نماز جمعہ کی تحریک نے مستقل شکل اختیار کر لی، اور ہر جمعہ کوئی نہ کوئی گرفتاری ہوتی۔ آخر ایک ماہ بعد حکومت نے دفعہ ۴۴ واپس لے لی، مگر لیڈروں کو اپنی میعاد اسیری گزارنے کے بعد ہار کیا گیا۔ چنانچہ امیر شریعتؒ ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور سنٹرل جیل سے رہا کیے گئے۔

## سینما کی تعمیر

امیر شریعتؒ رہا ہو کر آئے تو ملک کی سیاسی فضا یکسر بدلی ہوئی پائی۔



تمام سیاسی جماعتیں جن میں مجلس احرار بھی شامل تھی، اپنے اپنے مینی فیسٹو  
لے کر انتخابی ہنگاموں میں مصروف تھیں۔ امیر نثر لیت کا مزاج ان ہنگاموں سے  
متفق نہ تھا۔ آپ فرمایا کرتے کہ

”برطانیہ نے ہندوستان کو ایسا آئین بنانے کی اجازت  
کیونکہ دسے دی، جس کے تحت صوبے خود مختار ہوں گے“

اور ساتھ ہی غالب کا یہ شعر پڑھتے تھے

پچھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا وہ وہ جام  
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

لیکن جماعت (مجلس احرار) الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ لہذا امیر نثر لیت نے  
یاد دل سخواسنہ اپنی طبیعت کا رخ بھی اسی طرف موڑ لیا۔

مجلس احرار کی پوزیشن انہدام شہید گنج کے بعد عوام میں مخدوش ہو چکی تھی  
لیکن اس کے باوجود پنجاب کی سیاسی زندگی احرار سے عبارت تھی اور دوسری  
کسی جماعت یا افراد کے لیے مشکل تھا کہ وہ اس کے بغیر آگے بڑھ سکے،  
پنانچہ فضل حسین ایک طرف سرسکندر حیات سے تو دوسری طرف بڈا اعظم  
محمد علی جناح سے پنجاب کے آئندہ انتخابات کے لیے مصروف کار تھے،  
اسی طرح سرسکندر حیات کے ایما پر نواب مظفر علی جو ان دنوں گورنر کی  
انتظامیہ کے ممبر تھے، مجلس احرار سے ناٹھ جوڑ رہے تھے۔

انہیں دنوں صدر گورنر وارہ پیر بندھکس کمیٹی راولپنڈی نے جامع مسجد  
کے عقب میں سینما تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ شہر کے مسلمانوں کے احتجاج کے



وچوسینا مکمل ہو رہا تھا کہ مسلمانانِ راولپنڈی نے امیر شریعت کو اپنی مشکلات سے  
گاہ کیا، اور انہیں راولپنڈی آنے کی دعوت دی۔

انتخابات کا زمانہ اپنے جلو میں جن واقعات کو جنم دیتا ہے، ان کے  
نب و روز میں ہزاروں بے بنیاد کہانیاں اپنے نقش و نگار تراشتی ہیں،  
درمٹ جاتی ہیں۔ لیکن ان کے معمار اپنے ذہن کی قذو کاوش میں فارغ  
نہیں بیٹھتے۔ امیر شریعت کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ جماعت کے انتخابی  
دوگرام کے درمیان کوئی دوسری مصروفیت اختیار کرتے، تاہم راولپنڈی  
کے ایسے وقت نکال لیا گیا۔

راولپنڈی میں سکھ مسلمان کشیدگی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ دونوں طرف  
آگ برباد لگ رہی تھی۔ ہندو اپنی دولت کے سہارے سکھوں کی پشت پناہی  
رہے تھے۔ امیر شریعت نے دو ایک دن میں شہر کے واقعات دیکھے اور  
سُنے۔ آخر معرین شہر کو جن میں سکھ، ہندو اور مقامی حکام بھی شامل تھے، باہم  
کلی بیٹھنے کی دعوت دی۔ یہ اجتماع شہر کی جامع مسجد میں ہوا۔ اس اجتماع کو  
خطاب کرتے ہوئے امیر شریعت نے کہا:

سکھ صاحبان اور دوسرے معزز دوستو! میں ایک  
مسافر ہوں۔ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ کے شہری معاملات  
میں مداخلت کروں۔ گذشتہ سالوں سے میری زندگی کا ایک  
میشن رہا ہے کہ میں انسانوں کو لڑنا دیکھنا پسند نہیں کرتا پھر  
جبکہ ایک تیسری حکومت ہم کو لڑنا دیکھ کر خوش ہوتی ہے ہمارے لیے



آپس کی عملی اور بھی زیادہ مفید اور کارآمد ہے۔ جنوری سے جو  
 قضیہ آپ کے شہر میں چل رہا ہے، جس نے آپ کی شہری زندگی  
 میں ایسا زہر گھول دیا ہے کہ آپ ایک دوسرے کی جان کے  
 دشمن بن گئے ہیں۔

یہ مسجد ہے، اور ایک مذہبی آدمی ہونے کی حیثیت سے  
 اس کا احترام میرے لیے لازمی ہے۔ اسی قدر آپ کو بھی  
 اس کا احترام کرنا چاہیے۔ اسی طرح میں گوردوارہ کی بھی عزت  
 کرنا ہوں۔ کیونکہ وہ بھی رب کی عبادت گاہ ہے۔ گو میرا آپ کا  
 عقیدہ عبادت جدا جدا ہے۔

اگر گوردوارہ کے سامنے یا برابر میں کوئی ہنگامہ ہو، تو  
 آپ برداشت کریں گے، یقیناً نہیں۔ اسی طرح یہ حق مجھے بھی  
 دو، کہ میں بھی مسجد کے احترام میں آپ سے گذارش کروں، کہ  
 آپ یہاں سینما کی تعمیر بند کر دیں۔ یہ میری درخواست ہے۔  
 میں یہ درخواست آپ سے ایسے وقت کر رہا ہوں،  
 جب کہ سارا ہندوستان انگریزوں سے آئینی لڑائی میں مصروف  
 ہے، اس میں آپ کا فائدہ ہے کہ شہر میں امن ہو جائے گا۔  
 بہو بیٹی کی عزت محفوظ رہے گی، شہری زندگی کسی دوسری  
 طرف دھیان کر سکے گی۔

مجھے آپ جانتے ہیں، میں ان دھندوں کا آدمی نہیں ہوں



لیکن آپ کی پریشان زندگی اور اللہ کے گھر کی بے حسرتی نے  
مجھے مجبور کیا، کہ میں پارٹی کا کام چھوڑ کر یہاں حاضر ہوا ہوں۔  
مجھے اُمید ہے کہ سیکھ صاحبان میری گزارش کو قبول کریں گے۔

(امیر شریعت کی اس تقریر نے اجتماع کو متاثر کیا۔ مقامی حکام کی  
بزدلی میں گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کے عہدیداران نے وعدہ کیا کہ آئندہ سے  
ملاکی تعمیر روک دی جائے گی۔ صبح ہوتے ہی سیکھ عوام کو اس فیصلے کی  
خبر ملی، تو انہوں نے مذہبی ضد کی بنا پر رات کے فیصلے کو کالعدم قرار دیدیا،  
شہر کے حالات زیادہ خطرناک ہو گئے۔ دوسرے دن امیر شریعت نے جامعہ  
میں تقریر کرتے ہوئے سرکاری حکام اور شہر کے حکام کو مخاطب کرتے ہوئے  
یہ مسنونہ کے بعد کہا:

"کل رات معزز افسران اور فوڈ ڈپٹی کمشنر کی موجودگی میں  
سیکھ صاحبان سے جو فیصلہ ہوا تھا۔ مجھے افسوس ہے، کہ  
سیکھ رہنا اپنی قوم سے وہ فیصلہ منوانہ سکے۔ اب میں اپنا  
فیصلہ اپنی قوم سے منوا کر دکھاؤں گا۔ بشرطیکہ مقامی حکام  
درمیان میں حائل نہ ہوں۔ ہاں! اگر وہ انتظامی معاملات میں  
کوئی چارہ کریں، تو اس سے پس منع نہیں کروں گا۔"

میری اس گفت گو سے یہ مراد نہ لی جائے کہ مسلمان سیکھ  
بھائیوں سے دست و گریبان ہوں گے، یا کوئی خون خرابہ کریں گے،  
نہیں۔ بلکہ میں عدم تشدد کا حاتی ہوں اور اسی پر کار بند رہ کر



اپنی بات اپنی قوم سے منواؤں گا۔ فیصلہ کل رات کو ہو گا۔  
 ہم گھنٹے باقی ہیں، سیکھ صاحبان کو اپنے رقبے پر غور کرنا چاہیے۔  
 دوسرے دن شہر میں حالات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔ دن بھر سکھ پریشان رہے۔  
 نہ جانے شاہ جی رات کو کیا حکم دیں۔ حکومت اپنی جگہ سوچ میں نہ رہی۔ شہر  
 پولیس اور فوج کی نفری میں اضافہ کر دیا گیا۔ رات پھر جلسے کا اعلان تھا۔ جامعہ  
 میں انسانوں کا اس قدر ہجوم اس مسجد کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ امیر شریعت  
 اس روز خلاف معمول نماز عشاء کے ساتھ ہی تقریر کے لیے کھڑے ہو گئے،  
 آپ نے صرف مسلمان نوجوانوں سے چند منٹ خطاب کیا۔ زندگی میں اتنی مختصر  
 تقریر امیر شریعت نے کبھی نہیں کی تھی۔

سرور! ہماری لڑائی کسی سے نہیں، اگر کوئی قوم اپنی  
 ضد پر اتر آئے تو ہمیں خوف نہیں کھانا چاہیے، لہذا ایسا کام  
 کرو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاشی بھی نہ ٹوٹے، میرے ساتھ  
 وعدہ کرو کہ جو میں کہوں گا وہی کر دو گے۔  
 اس موقع پر تمام مجمع کے ہاتھ کھڑے ہو گئے، امیر شریعت نے کہا:  
 دیکھو! جو میں کہوں وہی کرنا ہو گا، اگر کسی دوسری  
 نازیبا حرکت کی شکایت آئی تو میں ناراض ہو کر چلا جاؤں گا۔  
 اس پر مجمع نے پھر وعدہ کیا۔

عزیزانِ من! سنو! یا تو مسجد رہے اور یا سینما بنے  
 میں نے مقدور پھر کوشش کی شہر کے ذمہ دار حکام گواہ ہیں،



کہ مکہ رہناؤں نے وعدہ کے باوجود بات نہیں مانی۔ خبر  
اب تم اپنا کام کرو، یا تو مسجد کے قریب سینما نہ ہو اور یا سینما  
کے قریب مسجد نہ ہو، بس! لیکن میری یہ درخواست یاد رہے  
کہ اینٹوں کے سوا انسانوں پر ہاتھ نہ اٹھیں۔“

امیر شریعت کی تقریر سننے ہی تمام مجمع سینما کی طرف دوڑا، اور صبح  
اٹھے تو ایک اینٹ وہاں باقی نہیں تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بچوں کی فوج  
نے راتوں رات سینما کا تمام ملبہ اٹھا کر نہ جانے کہاں پھینک دیا کہ اب  
اس کا نشان تک نہیں ملتا۔

حالانکہ پولیس کا انتظام تھا، سکھ نوجوان بچہ سے کھڑے تھے۔ لیکن  
امیر شریعت نے پہلے روز جو طریقہ عمل اختیار کیا تھا، سرکاری حکام اس سے  
مطمئن تھے۔ سکھ رہناؤں نے مسجد میں جو وعدے کیے تھے، وہ ان سے  
منحرف ہو چکے تھے، لہذا مسلمان نوجوانوں کے ہاتھ جب رات کے  
اندھیرے میں زیر تعمیر سینما کی طرف بڑھے، تو سب قوم کے وقتی جذبات  
پولیس کی حفاظتی دیوار توڑنے کی جرات نہ کر سکے۔

راولپنڈی سے کاہنہ تاریخی میدان آج مجاہد پارک کے نام سے مشہور ہے۔

تبلیغ اسلام

۱۹۳۵ء کے برطانوی آئین نے جہاں اور حالات میں رد و بدل  
کیا، وہاں اچھوتوں کو ہندوستان کی ایک الگ قوم قرار دیتے ہوئے



یہ حق بھی دیا کہ وہ بحیثیت ایک ہندوستانی قوم اپنی قومیت برقرار رکھتے ہوئے نئے انتخابات میں الگ انتخاب رکھ سکتے ہیں، جبکہ اس سے پیشتر کے آئین میں اچھوتوں کا ووٹ ہندو قوم کے ساتھ شامل ہوتا تھا۔

اس اعلان نے ہندوؤں میں ایک خاص قسم کا سیاسی ہیجان پیدا کر دیا، مہاتما گاندھی نے انہی دنوں برطانیہ کے اس قانون کو تبدیل کرانے کے لئے ۲۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو مرن برٹ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ نیز ہندو قوم کو اچھوتوں پر اپنے مندروں کے دروازے کھول دینے کا مشورہ بھی دیا۔

سیاسیات کی دوڑ میں قوم نہیں ناپے جاتے بلکہ ووٹ گنے جاتے ہیں، جو قوم صدیوں سے اچھوتوں کے سائے سے دامن بچاتی رہی، اپنی سیاسی ضرورت کے لیے اس نے نہ صرف اچھوتوں کو انسان تسلیم کیا بلکہ انہیں اپنی برادری کا جزو سمجھنے پر مجبور ہو گئی۔ انہی دنوں ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو لاہور میں اچھوت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے امیر شریعت نے مسلمان قوم کو پیغام دیا:

”اس وقت ہمارے سامنے تین مثلے سب سے زیادہ

اہم اور غور طلب ہیں، پہلا مسئلہ انتخاب کا ہے جس کا

ظاہر اتنا دلفریب ہے کہ بڑے سے بڑا تارک الدنیازاہد

گوشہ نشین بھی اس کے حسن دلفریب کی تاب نہ لاسکا،

اور بے چین ہو کر میدان انتخاب میں نکل آیا، نہ کوئی ہندو بچا

نہ سکھ اور نہ عیسائی۔ مسلمان بھی اس سے بے نیاز نہیں



کوئی جماعت بھی ایسی نہیں جو مسئلہ انتخاب میں دلچسپی نہ  
لیتی ہو۔

دوہرا مسئلہ ختم نبوت کا ہے چونکہ مسلمان سیاسی  
انجمنوں میں مصروف ہو گئے ہیں، اس لیے انہوں نے  
اس طرف توجہ نہیں کی۔ ہندوستان کو ابھی عسلائی میں  
جکڑے رکھنے کے لیے قادیانی نبوت اپنا جال پھیلا  
رہی ہے مسلمانوں کو اس دائمی لعنت سے بچنے کیلئے  
کوئی راہ سوچنی ضروری ہے۔

۱ ( تیسرا اہم مسئلہ اچھوتوں کا ہے، اس وقت تمام  
ہندوستان کی توجہ ڈاکٹر امبیڈکار کے اعلانات کی طرف ہے  
وہ پولیٹیکل اچھوت ہے اور ہندوؤں سے بھڑبی واقف  
ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس وقت ہندوؤں کو دبانے سے  
کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ ~~ب~~ وہ ٹاٹ پر بیٹھنا نہیں چاہتا  
لیکن ہندوستان کے آٹھ کروڑ اچھوت جو ہزاروں سال  
سے حیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں اور کوئی ان کا  
پیران حال نہیں ہے، اگر ان کو مساوات اور انسانیت کا  
درجہ کسی مذہب میں حاصل ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے  
اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب اچھوتوں کو اپنے میں

لے اچھوتوں کا لیڈر



## جذب نہیں کر سکتا۔

کائنات میں سب سے بڑا غلام اچھوت ہے  
 غلام کا جسم اور اس کی کھالی اپنی نہیں ہوتی، بلکہ مالک کی  
 ہوتی ہے۔ لیکن اسلام سے دنیا میں غلام کا درجہ بلند  
 کر دیا ہے، اور اچھوت پر سب سے بڑا احسان کرنے والے  
 محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جنہوں نے اپنی پھوپھی زاد عمو شہزادہ  
 زینب سے منسوب کر دیا، جو غلام تھا۔ اسلام نے مذہب کے  
 معاملہ میں جبر و اکراہ سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنے عمل سے  
 اسلام کی تلقین کرنا، کہ ایسے لوگوں سے کیا سلوک کیا جائے  
 جو مسلمان نہیں ہیں۔

نشر پلا کے کرانا تو سب کو آتا ہے

مذہب کے گرتوں کو ققام سے ساقی

لیکن لیٹر نشے کے گرتوں کو ققام سے ساقی ہے، ہمارا فرض ہے  
 کہ ہم اپنے عمل سے اور اپنے مذہب کی تڑپوں کے ذریعے  
 اچھوتوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ وہ اسلام قبول کرنے  
 پر مجبور نہ ہوں اور سوائے مذہب اسلام قبول کرنے کے  
 ان کے لینے کوئی چارہ نہ رہے۔

خاص ضمن میں ایسے شرعی مسائل نے اپنے چشم دید واقعات سے  
 بیان کیے، جن کی روش سے اچھوتوں کا ہمیشہ اپنے کو انسانی



دائرے سے بھی خارج سمجھتے ہیں اور کہاں  
 ”مسلمانوں کو روٹ لو اور پکڑ لو، ان گرسے ہوئے اچھوتوں کو  
 اور اپنے سینے سے لگاؤ۔ ہم روپیہ دے کر کبھی بھی ان کی  
 اصلاح نہیں کر سکتے۔ نہ ہندو قوم کی طرح ہم انہیں سیاسی  
 لالچ دے کر ان کے ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں (اسلام  
 اسلام ہے) تشنگی بچانے کے لیے دریا کسی کے گھر نہیں  
 جاتا، ہمیشہ پیاسے ہی دریاؤں پر جاتے ہیں (کوئی تلوار  
 کارگر نہیں ہوتی۔ لیکن اخلاق کی تلوار انسان کو ہمیشہ کے لیے  
 رام کر لیتی ہے۔ اس لیے اچھوتوں کو سائیکھڑا لیتے اور  
 دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم  
 اس خلیق عظیم کو اختیار کرو، جو اسلام سے تم کو نشا سہی ہے۔“

## ڈسکہ میں انتخابی معرکہ

متحدہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ۱۹۳۶ء کا سال آبینی جڈ جہر کا  
 اہم سال قرار دیا جاسکتا ہے، اس سال کسی بھی سیاسی جماعت نے غیر آبینی  
 حرکت نہیں کی، بلکہ ہر پارٹی انتخاب کے ذریعے اقتدار کی کوشش میں مشغول رہی  
 مجلس احرار، مسجد شہید گنج کے بلے کے ڈھیر سے نکل کر منورہ اسپینے  
 کپڑے جھاڑ رہی تھی کہ انتخاب کا ہنگامہ سر پر آن پہنچا۔ چنانچہ اس کی نگاہ انتخاب  
 نے پنجاب میں جن شہروں اور لوگوں کو دین، وطن اور جماعتی ضرورت کیلئے



انتخاب کیا، ان میں ڈسکہ (ضلع سیالکوٹ) کی سیدٹ پراس کی خاص نو  
 گذشتہ سال ۱۹۳۵ء میں مجلس احرار کا وفد جب وہلی میں والٹر  
 ہند سے ملا کہ وہ چودھری سرفراز اللہ خاں کو اپنی انتظامیہ میں شامل نہ کرے  
 والٹر اسے مستجاب میں کہا تھا کہ سرفراز اللہ خاں مسلمانوں کے ووٹ  
 منتخب ہوتے ہیں۔ مجلس احرار اس وقت تو لا جواب رہی۔ مگر اب  
 آگیا تھا کہ انگریز والٹر اسے کے سوال کا جواب بھی دے دیا جائے  
 اگرچہ امیر شریعت انتخابات کے دنوں پنجاب کے  
 صوبہ لہور میں بھی مصروف تھے، تاہم ان کی زیادہ تر توجہ کامرکھڑ  
 سیدٹ تھی۔ چودھری سرفراز اللہ خاں ہمیشہ اسی سیدٹ سے مسلمانوں کے  
 ووٹوں پر کامیاب ہوتے تھے اور آج ان کے بھائی چودھری اس  
 خاں ایڈووکیٹ اسی سیدٹ پر الیکشن کے میدان میں سامنے آئے  
 سرفراز اللہ خاں اپنی جات برادری اور ضلع میں مقبول عام تھے، اس  
 اثر و سوج بھی انہیں پناہ دے سکتے تھے۔ اس تحصیل کے مسلمانوں  
 چودھری سرفراز اللہ خاں کا اثر ریاستی نواب کی طرح تھا، ایسے حالات میں یہ  
 ٹکراؤ بڑی جان جوکھوں کا کام تھا، خصوصاً جبکہ الیکشن بھائی چارے سے  
 برادریوں کے نام پر لڑے جا رہے ہوں۔  
 بڑی دودھ و ٹھوپ کے بعد اسی برادری (جات) کے ایک  
 جات چودھری غلام رسول سترہ نے جو اپنے حلقہ میں خاصے رسول  
 مالک تھے، مجلس احرار کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔



چو دھری غلام رسول کے پاس روپیہ، برادری کا اثر و شوخ  
 سب کچھ تھا، لیکن برادری دباؤ کا ثبوت سید راہ تھا، دوسری جانب  
 اس حوالہ تکستی تھی کہ یہی شخصیت سر ظفر اللہ کے کفر کو توڑ سکے گی چنانچہ

رات امیر شریعت نے چو دھری غلام رسول سے کہا۔

”دیکھو غلام رسول! اس وقت پیغمبر اسلام (صلی اللہ  
 علیہ وسلم) کی عزت کا سوال ہے، غیر ملکی حکومت کا نمائندہ  
 (وائسرائے) کہتا ہے کہ تم ظفر اللہ کو مسلمان نہیں کہتے،  
 لیکن اس حلقہ کا مسلمان تو اس کو ووٹ دے کر منتخب  
 کرنا ہے۔“

چو دھری صاحب! اگر آج اس سیدٹ سے اس  
 خاندان کا کوئی فرد جو حضور صمدی کائنات کو آخری نبی نہیں مانتا  
 مسلمانوں کے ووٹ سے اسمبلی میں چلا گیا تو قیامت کے  
 دن تم مجرم قرار پاؤ گے، کیونکہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے دنیوی  
 خوبیوں سے نوازا ہے۔ برادری میں تمہارا اثر اس سے کم  
 نہیں، دولت اور عزت تمہیں بھی خدا نے دی ہے حکومت  
 میں تمہارا بھی وقار ہے۔“

امیر شریعت کی یہ باتیں سن کر چو دھری غلام رسول نے کہا:-  
 ”شاہ جی! میں بہت ہی سیاہ کار ہوں، اس کے  
 باوجود آپ حکم دیتے ہیں، تو حاضر ہوں۔ لیکن میرے پاس



برادری کی وہ قوت نہیں جو چودھری سرفطر اللہ کے پاس ہے۔

دوسرے تو میں سوچ کر سکتا ہوں، لیکن حلقہ اور برادری کے

ذمہ دار لوگ شاید میرا ساتھ نہ دیں۔“

امیر شریعت نے چودھری غلام رسول کا جواب بڑھاتے ہوئے کہا،

”تم اللہ کے رسول کی عزت رکھو، اللہ تمہاری

عزت کا وارث ہوگا۔ مجلس احرار کی سرخ فوج آج سے

تمہارے حلقہ میں متعین کر دی گئی ہے، بے فکر رہو۔“

یونگ شروع ہونے میں قریباً ایک ماہ باقی تھا کہ ڈسکہ سب کی

مہم شروع کی گئی۔ امیر شریعت ساتھ ساتھ دوسرے حلقوں میں بھی جاتے

لیکن اس حلقہ میں زیادہ وقت اور توجہ صرف کرتے۔ مرکزی حکومت کے

اشارے پر حکومت پنجاب نے بھی اس سبب پر فاضلی توجہ دی۔ امیر شریعت

نے گاؤں گاؤں پھر کر جاٹ برادری کو خصوصیت کے ساتھ حضور خاتہ بند

علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ناموس پر اپیل کی، کہ وہ اپنا ووٹ برادری کے

نام پر نہیں بلکہ حضور کے نام پر دیں تاکہ دشمنان دین کے تمام منصوبے

خاک میں ل جائیں۔ اس سلسلے میں امیر شریعت جب گھوٹنگی کے قلعہ پر وٹ

پہنچے اور وہاں نماز جمعہ پڑھانے کا پروگرام تھا، تو چودھری عبدالغنی من

بمقام اپنی جاٹ برادری کے بندو قوں، پستولوں اور دوسرے اسلحوں سے

مسلح ہو کر آئے پہنچے کہ ہم عطاء اللہ شاہ بخاری کو تقریر نہیں کرنے دے گئے

دیکھ لوگ چودھری اسد اللہ کے حامی تھے لیکن امیر شریعت نے کہا اگر اتنا



پہ اجازت دیں، تو میں صرف جمعہ کی نماز پڑھ لوں۔ انہوں نے کہا، "ہاں۔"  
 از سے پہلے امیر شریعت نے قرآن کریم کا ایک رکوع پڑھا، اور مخالفین  
 سے پوچھا، اگر آپ حکم دیں تو اس آیت کی تشریح کر دوں۔ اس پر مخالفین  
 کے دو حصے ہو گئے، ایک حصہ تشریح کے حق میں تھا، اور دوسرا مخالف۔  
 خزانہ جی نے قرآن کریم کی تفسیر شروع کی۔ بس پھر کیا تھا کہ جمعہ کی نماز بھی  
 قرہ وقت سے ایک گھنٹہ بعد پڑھی گئی، آخر میں مخالفین امیر شریعت کے  
 منوا ہو گئے اور چودھری عبدالغنی گھمن کو اپنے ارادے میں بڑی طرح  
 شکست ہو گئی۔

کیونکہ امیر شریعت جاٹ برادری کے دل اپنے قبضے میں کر چکے تھے  
 ہزارہ جدوجہد کے باوجود سرکاری اثر و سوراخ بھی کوئی کام نہ دے سکا۔ یہ  
 رانی مسلمان اور مرزائی کے عنوان پر لڑی گئی۔ امیر شریعت کی مسلسل اور پیہم  
 تقریروں سے ڈسکہ تحصیل کا مسلمان، مرزائی اور مسلمان کے درمیان حدفاصل  
 سمجھ گیا، اور جب اس الیکشن کا نتیجہ سامنے آیا تو چودھری غلام رسول ستراہ  
 نے چودھری اسد اللہ خان ایڈووکیٹ کو ہزاروں ووٹوں سے شکست دی۔  
 اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ سیاسی طور پر اس گھرانے کا وقار ڈسکہ تحصیل سے  
 ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، اور تحریک مرزائیت کو خاصہ نقصان پہنچا۔

## حضرت ندنی سے اختلاف

انتخابی موسم بھی عجیب موسم ہوتا ہے، ہر پارٹی سیاسی اکھاڑوں میں



ایسے ایسے واپس کھینچ لیتی ہے کہ آدمی منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

(۱۹۳۶ء میں متحدہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں نے ایک

۱۹۳۵ء کے تحت انتخابات میں جو طریقے استعمال کیے، ان میں ایک یہ بھی

کہ مسلم لیگ کے رہنماؤں نے جمعیتہ علمائے ہند سے بعض ایسے وعدے

کیے کہ مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی ایسے مذہبی اور سیاسی

سوچنے پوچھنے کے لوگ اس بساط پر مات کھا گئے، جمعیتہ علمائے ہند اور

مسلم لیگ نے باہمی اشتراک سے یو پی کے تمام اضلاع میں الیکشن

انہی دنوں ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو امیر شریعت<sup>۷</sup>، حافظ محمد ابراہیم کی حمایت

ضلع بجنور کا وفد کر رہے تھے کہ بجنور میں مولانا حسرت موہانی سے مدد پھر ہو گئی

امیر شریعت<sup>۷</sup> ایک جلسہ میں تقریر کر رہے تھے، کہ مولانا حسرت موہانی مخالف

سمت سے خاصی جماعت کے ساتھ امیر شریعت<sup>۷</sup> کی مخالفت کے لیے جلسہ

میں آن پہنچے۔ عوام نے جو امیر شریعت<sup>۷</sup> کی تقریر سے متاثر ہو چکے تھے وہ

حسرت موہانی کی اس حرکت کو ناپسند کیا، اور قریب تھا کہ مجمع مولانا حسرت موہانی

ٹوٹ پڑتا، امیر شریعت<sup>۷</sup> نے مداخلت کر کے مولانا حسرت کو با احترام سٹیج

پٹھالیا، تقریر جاری رہی، آخر جو لوگ مولانا حسرت کے ساتھ امیر شریعت<sup>۷</sup>

مخالفت کرنے آئے تھے، اس قدر نادام ہوئے کہ ان کے لیے یہاں

واپسی مشکل ہو گئی۔

بجنور سے الہ آباد جاتے ہوئے اسٹیشن پر حضرت شیخ الہند

حسین احمد مدنی سے امیر شریعت<sup>۷</sup> کی ملاقات ہوئی، عقیدت، محبت اور احترام



بڑے مجھے جذبات سے امیر شریعت نے آگے بڑھ کر حضرت سے مصافحہ اور معافی  
 کرنا چاہا، لیکن حضرت مدنی نے جو ان دنوں مسلم لیگ کی حمایت کر رہے تھے،  
 امیر شریعت سے مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا، اور کہا :-

”چونکہ آپ کا مسلک فقط ہے لہذا امیر آپ سے کوئی تعلق نہیں“

اس پر امیر شریعت کو قلبی رنج پہنچا، اور حضرت مدنی سے عرض کیا :-

”حضرت! اگر آپ حکم کریں تو میں اپنا اور ہاتھ دھو کر کے

پھر باہر چلا جاؤں۔ چونکہ آپ مسلم لیگ سے اشتراک کیے ہوئے

ہیں، اور اپنے خادموں سے ناراض ہیں، لیکن کل آپ

اپنے اس فیصلے پر غور و نام ہوں گے مسلم لیگ سے آپ کا

یہ اشتراک عمل صحیح نہیں آیا، جبکہ کل تک آپ خود ہمیں

ورس دیتے رہے ہیں کہ مسلم لیگ سرکار پستوں کی ٹولی ہے

خیر!..... آپ ناراض ہوں تب بھی میں نیاز مند ہوں“

اس گفت گو کے بعد امیر شریعت اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

انتخابِ مسلم ہونے پر مارچ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا

جو پہلا اجلاس ہوا، اس میں تمام رحمت پسند ممبران شامل ہوئے، اس پر

جمعیتہ علمائے ہند نے اعتراض کیا کہ جمعیتہ علماء اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ اس

بنیاد پر ہوا تھا، کہ مسلم لیگ سے تمام رحمت پسند عناصر نکال دیا جائے گا،

تو آج انتخاب کی کامیابی کے بعد ایسے عناصر کو پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں

شامل کرنا اپنے وعدوں سے انحراف کرنا ہے۔



یکم اپریل ۱۹۳۵ء کا دن ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کا دن تھا،  
 کانگریس اور جمعیتہ علماء کے درمیان اس ایکٹ کے خلاف ہڑتال کرنے کا  
 فیصلہ تھا، لیکن قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی تمام شاخوں کو حکم دیا  
 کہ وہ اس ہڑتال میں حصہ نہ لیں، اس پر جمعیتہ علماء نے قائد اعظم سے دریافت  
 کیا کہ جب تمام سیاسی جماعتوں نے اس ایکٹ کی مخالفت کا فیصلہ کیا ہے  
 تو آپ نے اس سے علیحدگی کا کیوں اعلان کیا ہے؟ اس پر صدر مسلم لیگ نے  
 اپنے ایک پریس بیان میں کہا کہ جمعیتہ علماء الیکشن میں مسلم لیگ سے اشتراک  
 کر چکی ہے تو انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ پارلیمانی پارٹی کے فیصلوں پر  
 اعتراض کرے۔

اس بیان کا شائع ہونا تھا کہ جمعیتہ علماء نے مسلم لیگ کی عہد شکنی کی  
 بنا پر اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان پڑھ کر امیر شریعت نے حضرت  
 مدنی کو امرتسر سے مبارک باد کا برقی پیغام بھیجا۔

امیر شریعت ہمیشہ حضرت مدنی کا احترام کرتے رہے۔ حضرت مدنی کے  
 دل میں بھی امیر شریعت کی عزت رہی، لیکن مسلم لیگ سے اتحاد کے بعد جو سخت  
 جمعیتہ علماء نے ہند کو اٹھانا پڑی، جمعیتہ کے رہنما امیر شریعت کے سامنے اپنے

اس طریقہ عمل کی بنا پر ہمیشہ شرمندہ رہے۔

تحریک مدنی صحابہ کا دورِ شامی

۳۱ مارچ ۱۹۳۶ء کا غروب آفتاب اپنی کرنوں کے ساتھ



وہ تمام الاؤ سمیٹ کر لے گیا، جن کی چھٹکارہ یوں نے ہندوستان کے ہر گھر میں آگ لگا رکھی تھی۔ بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا اور ماں سے بیٹی اپنی رائے کی بنا پر دشمنی کرنے لگی تھی۔ انتخابات ختم ہوئے تو ہفتا پائی کا دامن سمٹ کر ان لوگوں کے آنکھ میں لہرانے لگا، جنہوں نے مستقبل میں صوبوں کے راج سنگھاسن سنبھالنے تھے۔

یکم اپریل ۱۹۳۷ء کا سوریج اپنے جلو میں ایک ایسا قانون لے کر طلوع ہوا، جس سے فرنگی راج کی جگہ اپنے دیس کے لوگوں نے صوبہ خود مختاری کے تحت حکومتیں سنبھالیں۔ عوام کے نئے منتخب نمائندوں نے آگے بڑھ کر غیر ملکی آئین کو اپنی رائے کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا، تو متحدہ ہندوستان کے بعض صوبوں میں انگریزی راج کی پیدا کردہ مشکلات نے انہیں آن گھیرا، یعنی ۱۹۰۳ء میں لکھنؤ کے شہید، سنی اور ہندو مل کر تعزیرے کا جلوس نکالتے تھے، اور یہ جلوس تال کٹورا کی کربلا میں ختم ہوتا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں شہید حضرات نے اس ماتمی جلوس میں شامل ہونے والوں پر یہ قدغن لگا دی کہ تعزیرے کے جلوس میں نہر بہنہ اور پابہنہ شامل ہوں۔ یہ شرط سنی عقیدہ کے مسلمانوں کے لیے تھی۔ کیونکہ شہید تو پہلے ہی ننگے سر اور ننگے پاؤں شامل ہوتے تھے۔ اس سے پیشتر سنی عقیدہ کے مسلمان سر پہ ٹوپی اور پاؤں میں جوتا پہننے جلوس کے ہمراہ چلتے تھے۔ نئے استعماریہ سٹیبلز نے اعتراض کیا، تو حکومت نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی علیحدہ کربلا بنا لیں۔ چنانچہ شہر سے آٹھ میل دور پھول کٹورا کے نام سے نئی کربلا تعمیر کی گئی۔



۱۹۰۶ء کا خرم سنیوں نے اسی کربلا میں منایا۔ یہ بنیاد تھی لکھنؤ میں شیعہ سنی کے مابین جھگڑے کی۔

۱۹۰۶ء میں رام پور کے شیعہ مولوی مقبول احمد، جو دہلوی کہلاتا تھا، نے اعلان کیا :-

”چونکہ حکومت کا اعلان ہے کہ وہ کسی کے مذہب میں مداخلت نہیں کرے گی، لہذا تیرہ کہنا ہمارا مذہب ہی حق ہے، اور ہم تیرہ کہیں گے۔ اس پر ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔“

اس اعلان سے سنی عقیدہ کے مسلمان برہم ہوئے، اور اس سال لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد ہوا، اس فساد کی بنا پر ۱۹۰۹ء میں حکومت یو۔ پی نے ایک کمیشن مقرر کیا جس نے اپنی رپورٹ کے آخر میں حکومت کو مشورہ دیا کہ ”عشرہ محرم کے دن، جہلم کے موقعہ پر اور ۱۲ رمضان کے دن مدح صحابہ کی بندش کی جائے۔“

کمیشن کے اس مشورے پر حکومت نے اعلان کیا :-

”کوئی شخص ایسے اشتہار یا نظمیں یا دوسرے الفاظ جن میں بلوگر، عمر اور عثمان کی تعریف کی گئی ہو، یا ان کی مدح میں ہوا تقریروں میں یا کسی دوسرے اسلامی جلوس کے راستے پر نہ پڑھے، اور نہ ایسے مقام پر پڑھے، جہاں سے جلوس تک آواز نہ پہنچ سکے، اور نہ کسی مجمع اور نہ کسی پبلک مقام پر ایسے



بدجیہ اشعار اور نظمیں پڑھے۔

اگر کوئی شخص احکام مذکورہ کی خلاف ورزی کرے گا  
تو وہ فوراً گرفتار کر لیا جائے گا، اور اس پر دفعہ ۲۹۸ یا  
کسی مناسب دفعہ تعزیرات ہند کے تحت مقدمہ چلایا جائیگا۔

اس قسم کے ہنگامی اور مذہبی واقعات سے نہی حکومتوں کے راستے میں  
کانٹے پکھیرے اور مشکلات پیدا کیں۔

جون ۱۹۳۷ء میں یو۔ پی میں نواب چغتاری نے بحیثیت مسلم لیگ کے  
جب اپنی عارضی گورنمنٹ ترتیب دی تو راجہ صاحب سلیم پورہ کو جو عقیدتاً  
شیعہ تھے، اپنی وزارت میں شامل کر لیا۔ ان کے عہدہ وزارت میں  
مدح صحابہ کا قضیہ جب ان کے سامنے لایا گیا، تو مصلحتاً انہوں نے یہ  
کاغذات آنے والی وزارت کے سپرد کرنا ہی بہتر سمجھا۔

(یو۔ پی میں بادچو کہ کانگریس اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی، لیکن ہنوز  
ان کے درمیان وزارتیں قبول کرنے میں اختلاف تھا۔ آخر چار ماہ کی مسلسل  
بحث کے بعد جب کانگریس بہتر قبول کرنے کا فیصلہ کیا تو نواب  
چغتاری کی وزارت مستعفی ہو گئی۔ مدح صحابہ کی شہکار نے انہیں ایسا پریشان  
کیا کہ کانگریس گورنمنٹ اس عقذہ کے حل کرنے میں ایسی اچھی کہ سلجھاؤ کا  
کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔ اس دوران شیعہ سنی اختلافات بڑھتے گئے۔

اس سال ۹، محرم کو امیر شریعت لکھنؤ گئے تو انہوں نے شیخ  
شوکت علی وکیل کے احاطہ میں تقریر کے دوران سنی مسلمانوں سے صرف



ایک سوال کیا :-

”اس صوبہ میں آپ کا کوئی وارث ہے یا نہیں؟“  
اس سوال کو ہی امیر شریعت نے اپنی تقریر کا عنوان بنا کر تین گھنٹے سنی  
مسلمانوں سے خطاب کیا۔

اس تقریر کے بعد مجلس احرار کے دوسرے رہنما چودھری افضل حق،  
مولانا حبیب الرحمن اکثراب لکھنؤ گئے۔ مولانا حسین احمد مدنی کی وساطت سے  
یو، پی کا کونسل حکومت سے رابطہ قائم کیا۔ لیکن حکومت خواہ کسی کی ہو، اس کا  
استانہ اس قدر بلند ہوتا ہے کہ اس پر پیر پینے کے پڑھنا و شواہ ہے، اور  
یہ پیر انسانی لاشوں سے تیار ہوتا ہے۔

شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے رہنماؤں نے کانگریس حکومت کے  
وزیر اعلیٰ پنڈت گوند و لچور پنڈت اور گوند زبیر سہرنا ہیک سے متعدد بار گزارش کی کہ  
”لکھنؤ میں سنی مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی  
تشریف کریں، چیکہ یہاں ان کی تعداد اٹھاسی ہزار کے  
قریب ہے اور شیعہ حضرات صرف ہزار۔“

مگر حکومت نے کسی بھی قسم کی توجہ نہ دی۔ آخر ۱۹۳۶ء بروز جمعہ مجلس  
احرار نے کانگریس حکومت کے خلاف سول نا افرمانی کا اعلان کر دیا۔ اس تحریک  
میں قریباً پچیس ہزار مسلمان گرفتار ہوئے۔

آخر ۱۹۳۷ء کو گوند زبیر کے اعلان پر تمام قیدی رہا کر دیے گئے، اور ۲۶  
مارچ ۱۹۳۸ء کو سنی مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کرتے ہوئے حکومت نے وار



طور پر اسلان کیا۔

”سٹیوں کا یہ حق ہرگز ماہہ التزاع نہیں کہ آیا انہیں جلد سے

عام یا خاص مجلسوں میں خلفائے نکلانہ کی مدح شمار کرنے کا

حق ہے یا نہیں۔ بلاشبہ ان کو یہ حق حاصل ہے جھگڑا جھڑپ

اس بات کا ہے کہ کس طریقے اور کن حالات پر ان کو لکھنویں

مدح صحابہ پڑھنی چاہیے۔

جب مختلف اقوام کے عقائد اور نقطہ نظر میں فرق ہو

تو گورنمنٹ کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ امن عامہ کو قائم رکھنے کیلئے

مداخلت کرے اور عام لوگوں کی سہولت کا خیال کرے۔“

اس طرح یو اے پی حکومت نے سنی عقائد کے مسلمانوں کا مدح صحابہ کا حق تسلیم

کرتے ہوئے ۱۹۵۹ء کے انگریزی اعلان کو ختم کر دیا۔

## قبل کی سازش کا الزام

۱۹۳۸ء میں گورنمنٹ ہندوستان کے سیاسی حالات پر مسکون نہیں تھے

تاہم قانون شکنی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ہر سیاسی تنظیم اپنے حکایتیوں کی تعداد میں

اضافے کے لئے کوشاں تھی۔

مسلم لیگ اور کانگرس کے اختلافات بڑھانے والوں کی جس مذہباتی

پیشانی اور مشورہ کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ لڑائی مذہب سے لا تعلق تھی، تاہم سیاسی

مشروریت کے سبب اس عمارت کی بنیاد مذہب پر اٹھانی گئی تھی۔ اس وقت



ہندوستان کی سیاست دو دھڑوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ مسلم لیگ میں کافی تعداد مسلمانوں کی شامل تھی، اور کانگریس سے ہندو اکثریت وابستہ تھی۔ انہی دونوں کی بات ہے کہ وہلی کے اخبار ہفت روزہ "الامان" کے مدیر اعلیٰ مولانا مظہر الدین نے اپنے اخبار میں لکھا کہ

گزرات میں نے ایک خواب دیکھا ہے، ایک ہندو  
 دیوی جو گھدر کے لباس میں ہے، اس نے مولوی حسین احمد کی  
 پیشانی پر کشتہ لگایا ہے اور مولوی عطاء اللہ شاہ کے گلے میں  
 چھو پہنایا ہے۔"

اس خواب کو مولانا مظہر الدین نے کارٹون کی شکل میں اپنے اخبار  
 "الامان" میں شائع کیا۔ دن بھر یہ کارٹون اپنوں اور غیروں کے درمیان  
 بحث کا مرکز بنا رہا، اور کچھ دنوں بعد ۲۴ مارچ ۱۹۳۹ء کو ان کے دفتر میں  
 انہیں قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کے الزام میں دو نوجوان محمد شفیع اور محمد احمد کو  
 گرفتار کیا گیا۔

اس قتل کا پس منظر کیا تھا؟ لیکن پیش منظر میں یہ مقدمہ سیاسی نوعیت  
 اختیار کر گیا۔ چنانچہ وہلی کی مرکزی حکومت اور لکھنؤ قری محل کے مولانا قطب الدین  
 اس قتل کی ساڑھن میں الزام سے یہ اقرار کرانے پر مصر ہے کہ اس قتل پر  
 نوجوانوں کو آمادہ کرنے والے سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مصطفیٰ کتایت، اللہ  
 اور مولانا حسین احمد مدنی تھے، مگر الزام نے سہم اصرار کے باوجود اس  
 اقرار پر انکار کر دیا، البتہ الزام نے اپنی صفائی کے گواہان میں امیر شریعت اور



مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کا نام دیا۔ جب یہ دونوں حضرات عدالت میں  
تشریف لائے تو مزاجان نے عدالت سے کہا:

”ہم ان بزرگوں کی صرف زیارت کرنا چاہتے تھے گواہی  
کی ضرورت نہیں۔“

آخر اس مقدمے کے فیصلے میں ایکسپوزیٹو کو جوان کو سزا سے موت اور دوسرے  
کو عبودیت سے شہر کی سزا دی گئی۔

### ضلع میانوالی کا دورہ

(۱۹۳۹ء کا سال ۱۹۱۴ء کی طرح یورپین قوموں کے مفکر کے  
عروج و زوال کا سال تھا) یورپ کے افریقہ پر دوسری جنگ عظیم کے باطن  
منظماً تھے نظر آتے تھے۔ اس جنگ کے نتائج خواہ کچھ ہوتے، لیکن  
چوگان سیاست میں کھیلنے والے جانتے تھے کہ اگر اب برطانیہ جنگ میں اٹھا  
تو وہ سوج جو اس کی سلطنت میں غروب نہیں ہوتا، وہ اس کو لے ڈوبے گا  
اور یہ وقت تھا کہ برطانیہ پر ضرب کاری لگائی جائے، پنجاب کے ایسے علاقوں  
میں جا کر لوگوں کو انگریزی فوج میں بھرتی ہونے سے منع کیا جائے، جو خالص فوجی  
علاقے کہلاتے ہیں (پچنانچہ اگست ۱۹۳۹ء کے دوسرے ہفتے امیر شریعت اور  
مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی ضلع میانوالی کے دورہ پر روانہ ہو گئے۔

یہ زمانہ پنجاب میں سرسکندر حیات کی وزارت کا تھا اس کی فونڈیشن  
پادٹی شروں اور رائے بہادروں پر مشتمل تھی۔ انگریزوں کی کھڑے سے جنم لینے والے



یہ لوگ انگریزی سامنے کو رحمت خداوندی سے لقمہ لقمہ کرتے تھے (انہیں  
 جب پتہ چلا کہ امیر شریعت اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی خلیفہ میراٹوی کا  
 دورہ کو شہسہ ہیں، تو حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آگئی) اور  
 موت سے کھیلنے والے لوگوں کی سر زمین گورنمنٹ کے پہاڑوں  
 تھے آباد ہے، مگر پتھروں کے دل رکھنے والے سبھی انوں کی آبادی میں  
 امیر شریعت نے جمیہ توحید باری تعالیٰ اور برطانوی سامراج کے اختلاف  
 بغاوت کے پھول کا نٹہ پھیر سے تو یہ تیلی نہ بین کا دامن بھی ٹراؤ نہ ہوا،  
 اور خشک پہاڑوں سے امیر بہار کی بو آنے لگی۔ رات جس گاؤں میں  
 امیر شریعت تقریر کرتے، گرد و نواح کی فضا کو راتوں کی آواز سے دہشت زدہ  
 کر دیا جاتا۔ دن کو جن راستوں پر سفر کرتے انہیں ڈاکوؤں کی آماجگاہ بنا دیا  
 جاتا۔ امیر شریعت کے ہمراہیوں کو غلج کی پولیس نے اکثر پھینکا گیا، مگر  
 پرخطر ماحول میں پروہش پانے والے انسان ہر خطرے کو خود دوست  
 سمجھ کر اپنے گرد جمع کر لیتے ہیں، اور یہی وہ زندگی ہے جو انہیں آخر کو  
 منزل سے ہمکنار کرتی ہے۔

## گفتاری

اس منگلارخ وادی میں پندرہ دن گزار کر جب امیر شریعت واپس  
 آئے، تو دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہٹلر کی فوجیں پولینڈ، ناروے  
 اور ڈنمارک سے گزرتے گزرتے فرانس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ پنجاب میں



یونینسٹ حکومت کو یہ بات پسند نہ آئی، کہ خالص عسکری علاقوں میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کو پھیلنے دیا جائے، جبکہ انگریز براہ راست جنگ میں شریک ہو چکا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کی برستی ہوئی گھاٹوں نے یورپ کی دلدل میں ایشیا کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹنا چاہا۔ چنانچہ ہندوستان میں انگریزی پرچم کی آزاد اڈانوں کی نگاہیں ایسے لوگوں کی جستجو میں معروض نظر آنے لگیں، جن کے ارادے اس جنگ کے منتظر تھے اور وہ انگریزی اقتدار سے نجات کے راستے تلاش کر رہے تھے۔ آخر ڈیفنس آف انڈیا ورلڈ کی نگاہ اول نے امیر شریعت کو ناک کر سب سے پہلا وار کیا، اور انہیں ۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کو صلح مظفر گڑھ سے وقفہ ۱۱۔۱۱۔۱۹۳۹ء اور ۱۲ الف اور ۱۳ کے تحت پیش جی راولپنڈی کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا۔

## مجلس افسر ار کی قرارداد

(امیر شریعت کی گرفتاری کے ساتھ سارے ہندوستان میں سیاسی کارکنوں کی عام گرفتاریاں شروع ہو گئیں، کانگریس اور مجلس افسر ار ایسی سیاسی جماعتیں تھیں، جنہوں نے ماضی قریب میں ہندوستان کو اپنی سیاسی تالیف کو اس پہلو پر ترتیب دیا تھا کہ انگریزی راج ان سے متزلزل تھا، دوسری جنگ عظیم سے متعلق بی فیصلہ کرنے کا انہی جماعتوں کو اختیار تھا، چنانچہ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۹ء کو اجراء کو مجلس عاملہ (ورڈنگ کمیٹی) نے امرتسر میں فیصلہ کیا،



(مسلمانان ہند اس وقت تک اس جنگ میں  
حکومت برطانیہ کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے جب تک  
کہ برطانیہ اسلامی ممالک سے اپنی فوجیں واپس نہ بلائے  
نیز ہندوستان کو مکمل طور پر آزاد نہ کر دے)

مجلس عاملہ کی رائے میں پھر یہ سوچنا باقی ہے کہ آیا  
ہمارے برطانوی فوج میں جاسٹے سے انسانیت کو تو کوئی  
نقصان نہیں پہنچتا؟

(مجلس اترار کی اس قرارداد سے ایک طرف انگریزی سامراج پر ہم ہوا  
تو دوسری طرف کانگریس کے جو اس بھی درست نہ رہے۔ کیونکہ کانگریس ذہنی  
طور پر یہ سمجھتی تھی کہ اس کے بغیر اس جنگ کے متعلق کوئی دوسری پارٹی  
رائے دینے کی مجاز نہیں۔)

(مندرجہ بالا قرارداد نے امپیر شریعت کے مقدمات پر بھی اثر ڈالا،  
اور عدالت نے انہیں ضمانت پر رہا کرنے سے انکار کر دیا) جو بیس روٹ کی  
سلسل کارروائی کے بعد ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو یہ مقدمات سیشن جج راولپنڈی  
کے پیرو کر دیے گئے، لیکن قانونی امپیر شریعت پر عائد کردہ تمام دفعات کی  
سچائی میں ناکام رہا، اور اس گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کے لیے ۸ دسمبر  
۱۹۳۹ء کو لالہ موسیٰ ضلع گجرات میں ایک دوسرا مقدمہ ۱۱ اور ۲۰ کے  
تحت تیار کر لیا گیا۔ سرکاری استغاثہ نے امپیر شریعت پر الزام لگایا کہ انہوں نے  
۲۸ جون ۱۹۳۹ء کو لالہ موسیٰ میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ :



”اب اسلام کی حکومت کہیں نہیں رہی اور مسلمانوں  
 کو انہر نو حکومت سنبھالنی چاہیے، موجودہ حکومت میں مسلمان  
 عورتوں کے نکاح کے فیصلے شیطان فریقا کرتا ہے، اور  
 اسلامی قانون کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا، اور غیر دیانت دار  
 یورپین مؤرخوں نے حکومت کے زہر اثر تارکچی واقعات کو  
 غلط پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ عالمگیر اورنگ زیب  
 الزام ہے کہ وہ ہر روز صبح ہندوؤں کے بارہ من جینو  
 اتارنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور حاضرین کی وصلہ اخراجی پر  
 شاہ صاحب نے کہا کہ میں انگریزی حکومت کا تختہ الٹا دوں گا  
 اور ان کو استغناء سے سمندر میں دھکیل دوں گا کہ وہ پھر  
 واپس نہ آسکیں گے، سمندر کے پانی کو انگریزوں کے خون  
 سے سرخ کر دوں گا، اور زمین کو بھی انگریزوں کے خون سے  
 اس طرح سرخ کروں گا، جس طرح یزید نے امام حسین کی  
 فوجوں کو قتل کر دیا تھا۔

مرزا غلام احمد کافر ہے، اس نے برٹش گورنمنٹ کی

پانچ سو گھوڑوں سے امداد کی تھی۔

گجرات، ڈسٹرکٹ جیل میں اس مقدمے کی سماعت لالہ لکھمی داس  
 جسٹریٹ نے کی، ویوان چمن لال امیر شریعت کی طرف سے سینٹرو کیل تھے،  
 ان کے علاوہ دوسرے قانون دانوں نے بھی امیر شریعت کی حمایت میں



اپنی کتب کے اوراق کھٹکال ڈالے۔

۱۱ جنوری ۱۹۲۰ء کو امیر شریعت<sup>۷</sup> مقدمے کی پیشی کے لیے عدالت کے  
کمرہ میں داخل ہونے لگے تو کسی نے اشارے سے کہا "شاہ جی" یہ ہے  
لالہ لدھارام پولیس رپورٹ جس نے آپ کی تقریر کی ڈاڑھی لکھی تھی، اور  
آج آپ کے خلاف عدالت میں پیش ہوگا" اس پر امیر شریعت<sup>۷</sup> نے نظر اٹھا کر  
لدھارام کی طرف دیکھا، نیز اس سے مخاطب ہو کر کہا:

"بالو لدھارام اس عدالت کے سوا ایک دوسری عدالت  
بھی ہے، جہاں تم نے پیش ہونا ہے، شہادت دیتے  
وقت اس عدالت کا خیال بھی رکھنا"

یہ فقرے کہہ کر امیر شریعت<sup>۷</sup> عدالت میں داخل ہو گئے۔

ڈاکٹر عبدالقادر زنگرات کا بیان ہے جو اس مقدمہ میں امیر شریعت<sup>۷</sup>  
کے معاون تھے، کہ سرکاری گواہ امیر شریعت<sup>۷</sup> کے مندرجہ بالا فقروں پر  
آبدیدہ ہو گیا، اور دیر تک تنہائی میں خاموشی کھڑا رہا۔







بطور وکیل پیش ہوئے۔ لہذا رام نے حسب ذیل ابتدائی بیان دیا :-

"میں نے ۲۸ جون ۱۹۳۹ء کو اس جلسہ میں شرکت

کی تھی جو گرانڈ ٹراک روڈ کے قریب ٹالہ موسیٰ میں ہوا تھا

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اس جلسہ میں تقریر کی تھی

لیکن مجھے یہ بات یاد نہیں کہ شاہ صاحب کے علاوہ کسی اور

شخص نے بھی تقریر کی تھی یا نہیں۔ میں نے شاہ صاحب کی

تقریر کا خلاصہ لکھا تھا جس کتاب پر حروف تہجی، "ٹھی" تحریر ہیں

اس میں تقریر کا اردو خلاصہ درج ہے، اور میرے ہی ہاتھ کا

لکھا ہوا ہے، لیکن یہ خلاصہ دراصل اس تقریر کا نہیں ہے جو

شاہ صاحب نے کی تھی، بلکہ یہ تقریر کا مسخ شدہ خلاصہ ہے،

جو میں نے تقریر کے وقت نہیں، بلکہ تقریر کے بعد کیا تھا،

اصل تقریر کا خلاصہ جلا دیا گیا تھا۔

تقریر پیش نظر کا خلاصہ پریسیڈنٹ انسپیکٹر کی

ہدایت پر میں نے گجرات میں ان کے مکان پر مرتب کیا تھا

اور دو کورسے لکھے ہیں، اسے مفصل عبارت میں منتقل کیا۔"

اس مرحلے پر استغاثہ نے عدالت سے درخواست کی کہ اسے

قانون شہادت کی دفعہ ۱۵۱ کے تحت گواہ پر جرح کرنے کی اجازت دی

جائے، مختصر عبارت کے بعد عدالت نے یہ درخواست قبول کر لی۔ پریسیڈنٹ انسپیکٹر

انسپیکٹر کی جرح کے جواب میں گواہ نے کہا :-



”میں نے یہ خلاصہ تقریر کے تین روز بعد مرتب کیا تھا  
 مجھے وزیر اعظم پنجاب (سر سکندر حیات) کا ایک خط دکھایا گیا  
 تھا، جس میں مجھے پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر حاضری  
 ہونے کی ہدایت کی گئی تھی، میں نے اس کی تعمیل کی، اس  
 خط میں تحریر تھا کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو  
 تم پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر پہنچو، لیکن اس خط میں  
 وہاں پہنچنے کے لیے تاریخ معین نہیں کی گئی تھی۔ یہ خطناپ  
 کیا ہوا تھا اور مجھے اصل خط دکھلایا گیا تھا۔ میں نے اپنی  
 واقفیت کیلئے اس خط کا ترجمہ کر لیا تھا، استثناء کے ذریعہ جنہوں نے  
 تقریر کے اس خلاصے پر دستخط کیے تھے، میرے ساتھ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر  
 کے مکان پر نہیں گئے تھے۔ خط میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ تقریر کا خلاصہ  
 پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مشورے پر مرتب کرنا چاہیے۔

یہ خط ۲۸ جون ۱۹۳۹ء کا لکھا ہوا تھا۔ اس کا  
 نمبر سی، آر پی، بی، ۷۸ ایل (CRPB 78 L) تھا۔ یہ خط  
 ۲۸ جون کو ہی گجرات پہنچا تھا۔ خط میں یہ ہدایت بھی درج تھی  
 کہ اس خط کو خفیہ تصور کرنا چاہیے۔ اس بنا پر میں نے کسی  
 دوسرے پر نہیں افسر کو اس بات کی اطلاع نہیں دی کہ میں نے  
 تقریر کا خلاصہ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مشورے سے  
 مرتب کیا ہے۔ کیونکہ مجھے اس سے ڈرہو گیا تھا کہ مجھے ترقی



دی جائے گی، اور مجھے کام کی عمدگی کی سالانہ سند دی گئی تھی  
 اس لیے میں نے تقریر کے خلاصہ کو مسخ کرنے پر کوئی اعتراض  
 نہیں کیا، اس سلسلے میں مجھے نفع انعام بھی دیا گیا تھا، لیکن  
 مجھے یہ بات یاد نہیں کہ انعام کی صحیح رقم کیا تھی؟

شہادت کے دوران دیوان چمن لال نے چند کاغذات لدھا رام کو دیے  
 جنہیں گواہ نے عدالت میں پیش کیا۔ ان کاغذات میں گواہ نے اپنے اس  
 نظریہ کی وضاحت کی تھی، جس کی بنا پر اب وہ پولیس کی ملازمت سے مستعفی  
 ہو چکا تھا، اس استغنیے کو عدالت نے پروسیکیوٹرنگ انسپکٹر کے کہنے پر  
 ایکڑ بٹلی، ڈبلیو ۶ کر لیا، جو حسب ذیل ہے:

جناب عالی!

میں اڑھائی سال سے محکمہ پولیس میں کام کر رہا ہوں  
 میری ڈیوٹی پولیس پوڈ ٹرکی ہے۔ میں کئی دفعہ اپنے شمیر کے  
 تفاوت کا مکرر یاد رہا ہوں، وہ شخص اس لیے کہ انسران بالاکھی  
 پر اہمیت پڑ گئی کرتے ہوئے ان کو خوش رکھوں۔ مگر آخر کار مجھے  
 اپنے شمیر سے بیدار کیا اور میں اپنے شمیر کا خون نہ کر سکا،  
 جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں آج عدالت میں بالکل درست  
 درست، اصل اور قدرتی چیز پیش کر رہا ہوں۔ چنانچہ سپر  
 عطاء اللہ شاہ بخاری کے مقدمے کے اصل حالات حسب

ذیل ہیں:



آزیدیل سرکنڈر حیات وزیر اعظم پنجاب کی طرف سے  
 چند ایک مراسلات ان کے "پی، اے" کی معرفت سپرنٹنڈنٹ  
 پولیس گجرات کو پہنچے جن میں سے بعض حکموں پر میری  
 تعمیل کرائی گئی۔

سب سے پہلی چٹھی مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۶۸ء میں  
 سید عطاء اللہ بخاری کی نگرانی کے لیے تحریر تھا، جس میں مسٹر  
 بی، ایس، ابراہیم سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات کو لکھا گیا تھا کہ سید  
 عطاء اللہ شاہ بخاری سکونت ناگڑیاں ضلع گجرات جب تہہ زاری  
 درود میں پہنچے، تو اس کی تمام حرکات و سکنات کی نگرانی کی جائے  
 اور ایک اچھے ہوشیار پولیس کی ڈیوٹی اس کے ساتھ لگا دیا  
 جائے، وہ محتاط ہو کر اس کی نگرانی کرے، اور نگرانی کنندہ کا  
 نام وغیرہ اس چٹھی میں درج کیا جائے۔ اس چٹھی کی تعمیل میں  
 سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا اور  
 بذریعہ چٹھی نمبر ۱۰۶۰ مورخہ ۱۱ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی طرف سے  
 مندرجہ ذیل جواب وزیر اعظم کے پی، اے کی معرفت بھیجا گیا۔  
 جناب عالی! تعمیل حکم حضور عالی نشان ہو گئی ہے اور  
 ایک اچھا ہوشیار پولیس افسر کی نگرانی کے لیے منتخب کیا گیا ہے  
 جس کا نام لکھنا ہے۔ وزیر پروردگار کا شکر ہے۔  
 انور بیگ خان



اس کے بعد مندرجہ ذیل چٹھی پی، اسے سرسکندر حیات  
 کی طرف سے ۱۱ جون ۱۹۳۹ء کو سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات  
 کے نام آئی، اس چٹھی کا نمبر C.B.P. 86376 تھا، آپ کو تحریر کیا  
 جانا ہے کہ ہمیں تھوڑے عرصے پر اطلاع ملی ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ  
 بخاری تھانے ضلع گجرات میں پوزیشن وزارت کے خلاف  
 پوزیشن سے کے لئے جا رہا ہے۔ آپ ایک ہوشیار با اختیار  
 رپورٹ کو حکم دینے کہ وہ اس کی تقریروں کے نوٹ لکھ کر آپ کے  
 سامنے پیش کرے، اور ممکن ہو تو بہت کثرتاً لفظ لکھے جاویں  
 اس حکم کو نہایت خفیہ حکم تصور کیا جائے، اور بعد کے لئے تعمیل رپورٹ  
 ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔ سرورہی ہے۔

اس چٹھی کے جواب میں مورخہ ۲۴ کو چٹھی ۱۵۶.۵ کے  
 ذریعے سپرنٹنڈنٹ گجرات نے سرسکندر حیات خان کو ان کے  
 پی، اسے کی معرفت اس مضمون کی چٹھی لکھی :

”جواب حکم B.S.I.L. عرض کی گئی ہے کہ لدھارام رپورٹ  
 کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے اور اس کو خاص ہدایت کی گئی ہے کہ وہ  
 عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں کے نوٹ لیتے وقت کثرتاً  
 طور پر لکھے، اور ہمارے روبرو پیش کرے اور پیرغازقی میں  
 ایک جلد ہو سکتی ہے جس میں کہ اسے خاص ہدایت کی  
 گئی ہے کہ وہ کھٹے طور پر نوٹ کرے جو کہ ڈائری ہے۔“



ارسال ہوگی۔

اس چٹھی کے بعد موضع پیر غازی وغیرہ میں جلسے ہوئے جس میں شاہ صاحب نے بالکل مذہبی تقریریں کیں۔ میں نے ان کو کشادہ لکھنا موزوں نہ سمجھا، کیونکہ ان میں کمی بیشی کر کے مقدمہ چلانے کی گنجائش نہ تھی۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے میری ٹیلی کی۔ میں نے جواب میں کہا کہ تقریریں بالکل مذہبی تھیں ان کا کشادہ لکھنا بے سود تھا۔

اس کے بعد سر سکندر حیات کے پرنٹل اسسٹنٹ نے ۲۸ جون ۱۹۳۹ء کو چٹھی نمبر  $\frac{C.R.P}{B.7806}$  کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ ضلع گجرات کو لکھا۔

”ڈائری خفیہ از موضع پیر غازی اور مدینہ منورہ چکی ہے، چونکہ ان میں مذہبی لیکچر تحریر ہے، جس میں اتنی گنجائش معلوم نہیں ہوتی، لہذا آئندہ ڈائری کوئی بھی ہو، جس میں پولیٹیکل اظہار ہو اس میں تقریر کو اس طرح پر بعد لینے کے لیے حکم پریسیکوشننگ انسپکٹرنایا جائے کہ وہ تقریر زبردستہ ۱۲۱ تقریرات ہندیا کسی قتل کی تبلیغ کے جرم میں مثلاً  $\frac{۳۰۲}{۱۱۶}$  کا مرتکب ہو سکے، اور یہ بھی خیال رکھا جائے کہ ساتھ ۱۲۴ الفاضل بھی قائم رہے اور گواہان خاص طور پر معتبر اور اچھے پولیس کے اثر والے ہوں، اس حکم کو نہایت خفیہ تصور کیا جائے۔“



اس حکم کی وصولی کے بعد مورخہ ۲۸ کو شاہ صاحب نے  
 ولد موسیٰ ضلع گجرات میں تقریر کرنے کے لیے آنا تھا۔ چنانچہ  
 حسب سابق مجھے رپورٹ لینے کے لیے متعین کیا گیا،  
 شاہ صاحب نے تاریخ مقررہ پر لالہ موسیٰ میں تقریر کی، اور میں نے  
 اس تقریر کے شمارے ہینڈ نوٹ لیے اور ان میں کچھ کشادہ  
 جگہ موجب ہدایت افسران ہالارکھی اور تقریر کے لوگ ہینڈ  
 نوٹ کے بغیر ہی گجرات واپس آیا اور پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کو  
 شمارے ہینڈ نوٹ دکھائے اور پڑھ کر سناٹے پر پروسیکیوٹنگ  
 انسپکٹر نے کشادہ جگہ کو کافی خیالی کیا اور مجھے کہا کہ میں اس  
 تقریر کو لانگ ہینڈ میں لکھ دوں۔ میں نے تعمیل حکم پی، آئی  
 صاحب کی پی، آئی صاحب نے لانگ ہینڈ کی عبارت میں  
 اپنے حسب منشا تبدیلیاں اور اضافے کئے، اس کے بعد  
 چونکہ ۲۸ تاریخ والی کاپی کی تحریر تبدیلیوں اور اضافوں کے  
 باعث مشکوک ہو گئی تھی، اور اسے عدالت میں پیش نہیں کیا  
 جاسکتا تھا، اس لیے پی، آئی صاحب نے حکم دیا کہ نئی کاپی پر  
 تبدیل شدہ عبارت شمارے ہینڈ اور لانگ ہینڈ میں تحریر  
 کی جائے۔

نئی کاپی مورخہ ۲۸ کو صاحب سپرنٹنڈنٹ بہار اور  
 پولیس کے سینو سے حاصل کی گئی، اور اس پر تمام عبارت



شارٹ ہینڈ اور لانگ ہینڈ فورٹ کرنے کے بعد ۲۰۰۰ والی  
 اصل کاپی کو بحکم پی، آئی صاحب نڈر آئٹس کر دیا، اور اس نئی  
 کاپی کی بنا پر مقدمے کی منظوری حاصل کی گئی، اور یہ مقدمہ چلا یا  
 جا رہا ہے۔ اصل ڈائری اور موجودہ ڈائری ذبحی کے پسند  
 ایک اختلافات میں یہاں نوٹ کرنا ہوں، جن سے مسلم  
 ہو سکے گا کہ کس طرح حکام بالا کے احکام کی ناجائز تعمیل کی گئی ہے  
 موجودہ ڈائری میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے۔

(۱) ساڈیاں پیشیاں سے نکاح تے ساڈے نکاح سے  
 فیصلے شیطان فرنگی کر داسے، تے ساڈی شریعت واکوئی خیال  
 تے لحاظ نہیں کر دے۔

(۲) یہ ان بے ایمان فرنگیوں اور سکندری کی متعہ پانہ چال ہے۔  
 (۳) میں جبران ہوں کہ یہ فرنگی، خدا ان کو غارت کرے  
 کیوں نہیں جانتے؟

(۴) میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زیادہ نہیں، صرف بختنے آؤں  
 یہاں موجود ہیں، میرے ساتھ ہو جائیں میں اس حکومت کا  
 تینتہ پلٹ دوں، ان کے پرچے اڑا کر رکھ دوں اور ان دستوں کو  
 بھریں جا کر ایسا دھکا دوں کہ نظر نہ آئیں، بختے اس وقت بھی  
 اگر تہارا حوصلہ ہو اور تیرو کمان دینغ بکف ہو کر ان فرنگیوں کے  
 خون کی نہریں بہا دوں، ان کے خون سے سمندر لال کر دوں۔



ان کے خون سے زمین سیراب کرووں، جس طرح بیزید نے حسینؑ کی  
 فوج کو تہ تیغ کیا تھا، اسی طرح ان شیطانوں کو کارت دوڑنے سے  
 سے کام لو، اور ان بے ایمان کافروں کو نکال دو۔  
 تلف شدہ ڈاکٹر کی ہیں جو چھپ کر پھرتے تھے:

(۱) ساڈے نکاح سے تھے سیاڑی بیٹیاں دسے نکاح سے  
 فیصلے پھر مسلم کرن، ساڈی شریعت واکوئی خیال تے لحاظ  
 نہ ہووے۔

(۲) نہیں، بلکہ یہ سکندر اور یونینسٹ پارٹی کی مہربانی اور خیال ہے

(۳) میں چیران ہوں کہ باوجود سردار دھنا سنگھ کی مسجد  
 بنوانے پر بھی سکندر صاحبان کے دل سے کدورت اور پڑا خیال  
 کیوں نہیں جاتا، اور یہ اتفاق کیوں نہیں کرتے۔

(۴) یہ الفاظ صرف پی، آئی صاحب نے حکم سر سکندر حیات خاں  
 مندرجہ اپنی طرف سے لکھوائے، جو بالکل جھوٹ ہیں اور ایک  
 بے گناہ مہستی کو گناہ عظیم کا موجب بناتے ہیں۔ یہ الفاظ قطعاً  
 مفرد نے اپنی تقریر میں استعمال نہیں کیے۔

اس طرح مقدمہ تیار کرنے کے بعد اور  $\frac{302}{116}$  تعزیرات  
 ہند کا مواد مہیا کرنے اور ساتھ ہی  $\frac{122}{153}$  کا خیال رکھنے کے بعد  
 سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات نے سر سکندر حیات کو ان کے پی، اے  
 کی مندرقت اپنی چھٹی نمبر G. 106 مورخہ ۲۹/۱۱/۵۷ میں اپنی کارکردگی اور



تعمیل ارشاد کی حسب ذیل اطلاع دی:

”جناب عالی!

مورخہ ۲۸/۳۹ کو عطاء اللہ نے لالہ موسیٰ میں تقریر کی، جس کے متعلق رپورٹ کو خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی۔ مطابق ہدایت پی، آئی صاحب کے پاس ڈاٹری کو بھیجا گیا، اور اس میں گنیشن نہ ہونے کی وجہ سے ڈاٹری اور مرتب کی گئی۔ جس میں قانونی اغراض کو مد نظر رکھتے ہوئے کمی بلندی کی گئی، اور ایسے الفاظ ایجاد کیے گئے کہ جن پر فوراً ۳۰۲/۱۱۷ تعزیرات ہند عائد ہوتا ہے، اور بعد شہادت استغاثہ ۲۱ تعزیرات ہند بھی قائم ہو سکتا ہے۔ ۳۰۲/۱۱۷ تعزیرات ہند کے لیے صرف الفاظ تبلیغ قتل اقوام انگریز اور پبلک میں کافی اشتعال لکھا گیا ہے، لہذا بموجب حکم تعمیل ہو کر رپورٹ عرض ہے۔“ وزیر اعظم سے لے کر نچلے افسروں تک کی تمام کارروائی کا حال مذکورہ بالا شرط و کتابت اور جعلی ڈاٹری نوٹس سے ظاہر ہے۔ اس پر مزید کسی تنقید کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی منصف مزاج انسان اس بارے میں کسی تنقید کا محتاج ہوگا۔

اب میرے سامنے کئی روز سے یہ سوال درپیش ہے کہ آیا میں اس طرز عمل کو قبول کرتا جاؤں؟ تو کہ اتنا



جارتی ہے اور جس کے ذریعے دنیاوی طور پر سائڈہ اور ترقی کی امید ہے، اور اس جعلی ڈائری کی ترتیب میں جو خدمت مجھ سے لی گئی ہے، اس کے صلے میں ۹۰ روپے کو پچیس روپے نقد انعام اور ایک عدد سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد مزید ترقی و انعام و اکرام کے لالچ میں جیسا کہ مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ میں ضمیر فروشی کرتا جاؤں یا دوسروں کے خون سے ہاتھ رنگین کرنے سے باز نہ آؤں خواہ اس میں دنیاوی زرو مال کی کمی ہی کیوں نہ ہو، میرے دل نے بیحد کشمکش اور شب و روز کے غور و فکر کے بعد یہی فیصلہ کیا ہے کہ میں بڑے بڑے افسران کا آلہ کار بن کر اپنے ضمیر کا خون نہ کروں اور جس حکم میں اس قسم کی بے ایمانی اور ضمیر فروشی کے بغیر ترقی کا راستہ نہیں مل سکتا۔ اس کو خیر باد کہتا ہوں اپنے گناہوں سے توبہ کروں اور اپنے آپ کو خدا کے چہرے سے پر چھوڑ دوں۔ اندر میں حالات میں ملازمت سے مستعفی ہوتا ہوں۔“

لدھارام بقلم خود

مندرجہ بالا بیان کے بعد گواہ پر مفصل تہدیح کی گئی اور یہ کہ اس نے نوٹ بک کس طرح حاصل کی تھی۔ اس سلسلے میں لدھارام نے بیان میں کہا: ”میں نے ۲۴ نومبر ۱۹۳۹ء کو مقدمہ کی پہلی سماعت کے



موقع پر جب شاہ صاحب کو دیکھا تو میرے دل میں خیال  
 پیدا ہوا کہ میں ایک بے گناہ شخص کو مصیبت میں پھینسا رہا ہوں  
 مجھے خدا کے سامنے اس فعل کا جواب دینا ہو گا۔ چنانچہ  
 میں نے یہ تہمت کر لیا کہ اگر کسی وجہ سے آج میری شہادت  
 نہ ہو سکی تو میں اس راز کو جو ابھی تک میرے سینے میں محفوظ  
 ہے، طشت ازبام کر دوں گا، لیکن اگر آج میں شہادت سے  
 نہ بچ سکا، تو گو اہی دینے کے بعد خود کشتی کر لوں گا۔ میں  
 ۳۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کو رخصت پر چلا گیا تھا، اور آج اس  
 مقدمے کی سماعت کے موقع پر حاضر ہوں۔ میں آج ہی  
 لاہور سے کرائے کی ایک موٹر کار میں یہاں پہنچا ہوں۔ میں  
 تنہا آیا ہوں۔ میں نے دو آنے تین پانی ٹینی میں کے حساب سے  
 کرایہ ادا کیا ہے۔ میں ڈبرائیٹور کا نام نہیں جانتا، لیکن وہ  
 جیل کے دروازے کے باہر موجود ہے۔ میں گزشتہ  
 اڑھائی سال سے محکمہ پولیس میں ملازم ہوں۔  
 مجھے چند خفیہ خطوط بھی دکھائے گئے، اگر  
 عدالت مجھے اس بات کا یقین دلا دے کہ ان خطوط کے  
 مضامین کو منظر عام پر لانے کی پاداش میں مجھ پر مقدمہ  
 نہیں چلایا جائے گا، تو میں انہیں منظر عام پر لانے کے  
 لیے تیار ہوں۔



گواہ نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا :

”میں اس سے پہلے اپنے ضمیر کو ذبح کرنا نہیں ہوں،

لیکن اللہ ہمارے لئے تیار نہیں ہوں۔“

اس کے بعد گواہ نے اس بات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا کہ میں

کس طرح اس عظیم بین شہادت دینے سے گریز کرتا رہا۔ میز پر ویسٹمنگٹن لیکچر

مٹنا بھی یہ تھا کہ میں شہادت نہ دوں۔ کیونکہ انہیں کسی طرح میرے

اداؤں کا پتہ چل گیا تھا۔ گواہ نے کہا :

”میں ۲۸ دسمبر ۱۹۳۹ء کو پروفیسر ویسٹمنگٹن لیکچر کے

مکان پر گیا۔ جہاں مجھ سے کہا گیا کہ تمہیں تار کے ذریعے

چھٹی لینی چاہیے۔“

شاہ صاحب کے وکیل کی جرح کے جواب میں گواہ نے کہا :

”میں ایک یا دو پڑھ سال سے پولیس رپورٹ کی

چینیت سے کام کر رہا تھا۔ مختصر نوپس کی کتابیں پولیس کے

دفتر میں رہتی ہیں، جب ایک کتاب ختم ہو جاتی ہے تو اسے

پولیس کے دفتر بھیج کر دوسری منگوا لی جاتی ہے، مجھے حکم دیا

گیا تھا کہ شاہ صاحب کی تقریر کے خلاصہ کو پروفیسر ویسٹمنگٹن لیکچر

کے پاس لے جاؤں۔ مجھے وزیر اعظم کے حکم میں یہ ہدایت

کی گئی تھی کہ شاہ صاحب کی تقریر کا خلاصہ لکھتے ہوئے الفاظ کے

درمیان خالی جگہ چھوڑنا چلا جاؤں۔ یہ خطبہ میں مذکور رہا۔“



ہدایت درج تھی۔ وزیر اعظم کے پرنسٹن اسٹنٹ کی جانب سے  
 تھا۔ ایسے تمام خطوط جو پولیس سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں  
 موصول ہوتے ہیں، ایک رجسٹر میں پورج کر لیے جاتے ہیں،  
 یہ رجسٹر صیغہ راز میں ہوتا ہے اور کسی ایسے شخص کو جس سے  
 اس امر کا کوئی تعلق نہ ہو، نہیں دکھایا جاتا۔ میں ان خطوط کا  
 خلاصہ اس لیے اپنے پاس رکھتا ہوں کہ اس میں میرے لیے  
 ہدایات درج تھیں۔“

اس موقع پر گواہ نے خطوط سے متعلق اپنی یادداشتیں پیش کیں،  
 اور اپنے بیان کو مزید جاری رکھتے ہوئے کہا:

”وہ نوٹ بک جس میں شاہ صاحب کی تقریر کا صحیح  
 خلاصہ درج تھا، ۲۸ دسمبر کو پراسیکیوٹنگ انپکٹر نے اپنے  
 مکان پر جلادی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، شاہ صاحب نے  
 اپنی تقریر میں کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی، جس کی بنا پر  
 ان کے خلاف ۳۲ اور ۱۲۱ قانون ضابطہ فوجداری کے  
 تحت مقدمہ چلایا جاسکے۔“

بیان کے آخری حصے میں گواہ نے کہا:

”لاہور سے گجرات آتے ہوئے آج راستہ میں مجھے  
 یہ بات معلوم ہوئی کہ میری گرفتاری کے لیے جہلم یا گجرات  
 سے وارنٹ جاری ہوئے ہیں۔ جب میں ڈسٹرکٹ جیل کے



احاطہ میں دیوان چمن لال سے بلا، تو ان سے امداد کی درخواست  
کی، اور عدالت کے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے چند کاغذات  
اور ایک خط انہیں دے دیا۔

یہ میرا استغفی تھا، جب میں ڈسٹرکٹ جیل کی عدالت کے  
کمرہ میں داخل ہو رہا تھا، تو دیوان چمن لال نے عدالت کے  
سامنے استغفی اور دو سے خطوط مجھے واپس کر دیے۔

میں مجسٹریٹ کے ساتھ ساتھ سب جیل تک آیا ہوں  
کیونکہ میں حفاظت کا متمنی ہوں۔ عدالت کے کمرہ میں داخل  
ہونے سے پہلے میں نے دیوان چمن لال صاحب سے کہا تھا کہ  
وہ عدالت سے درخواست کریں کہ وہ مجھے بطور گواہ پیش  
ہونے کے لیے اپنی حفاظت میں لے لیں۔

۲۸ دسمبر ۱۹۳۹ء کو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے مجھ سے  
دوسری ڈائری تیار کرنے کے لیے کہا تھا کہ اس مسودہ کے  
جس پر حرفوں پی، آئی لکھے ہوئے ہیں، صفحہ ۲۴ پر جن لوگوں کے  
دستخط موجود ہیں، وہ ان کی موجودگی میں دوبارہ دستخط کرا سکیں۔

۸ جنوری ۱۹۴۰ء کو اپنی ملازمت پر واپس آ رہا تھا کہ  
پراسیکیوٹنگ انسپکٹر مجھے وزیر آباد ریلوے سٹیشن پر ملے۔ مجھے  
یاد نہیں کہ اس وقت میرے ساتھ کوئی تھا یا نہیں۔ بند انار  
میرا عزیز بہن اور لاہور کے قیام کے دوران میں اسی کے



پاس ٹھہرائے گا۔

اس شہادت کے بعد مقدمہ ۲۳ جنوری پر ملتوی ہو گیا۔

شہادت کے بعد جب لدھارام عدالت سے باہر آیا تو بخشی آنند رام اسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس نے ان سے ایک نوٹس کی تعمیل کرائی، جس میں تحریر تھا کہ چھٹی منسوخ ہو جانے کے بعد کیونکہ تم بروقت اپنے فرانسز کی ادائیگی کے لیے حاضر نہیں ہوئے، اس لیے تمہیں معطل کیا جاتا ہے۔

لدھارام :- ”میں مستعفی ہو چکا ہوں۔“

اس طرح مقدمہ کے حالات و واقعات نے ایک نئی شکل اختیار کر لی، دوسری صبح کے اخبارات نے اس مقدمہ کو علی سرخیوں سے شائع کیا تو لاء اینڈ آرڈر کے تحفظ کے لیے سرکاری تاون اپنی حفاظت میں لیس ہو کر سامنے آ گیا۔ ۱۳ فروری ۱۹۴۰ء کو ایڈووکیٹ جنرل مسٹر سلیم نے ہائیکورٹ میں درخواست دی کہ ”اس مقدمہ کو ہائی کورٹ میں منتقل کر دیا جائے، کیونکہ لدھارام گواہ استغاثہ نے وزیر اعظم پنجاب کو جو لاء اینڈ آرڈر کے مالک پپیا، اس مقدمہ میں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ لہذا کسی ماتحت عدالت پر اس معاملہ کا فیصلہ نہیں چھوڑا جا سکتا۔“

پنابچہ جسٹس اسکیمپ نے درخواست کی سماعت کے بعد یہ مقدمہ ہائیکورٹ میں منتقل کر دیا۔

ماتحت عدالت سے فارغ ہو کر لدھارام گواہ کو یقین تھا کہ پولیس انہیں گرفتار کرے گی، لیکن امیر شریعت کے وکیل دیوان چمن لال ایڈووکیٹ نے



لدھارام کو اپنی تحویل میں لے لیا، اور اس سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی کار کے قریب لے آئے کہ اتنے میں ڈی، آئی، جی پولیس نے کہا، "میرے پاس لدھارام کے دفتر ۲۹ کے وارنٹ ہیں اور انہیں گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔" دیوان جمن لال نے کہا، "آپ انہیں گرفتار نہیں کر سکتے، کیونکہ اب وہ ملازمت سے مستعفی ہو چکے ہیں۔"

پولیس آفیسر کو گمان ہوا کہ ممکن ہے کوئی قانونی شق ایسی ہو کہ میں انہیں گرفتار نہیں کر سکتا، ابھی وہ اسی اڈھیڑ بن میں تھے کہ دیوان جمن لال جلدی سے لدھارام کو اپنی کار میں بٹھا کر لے اڑے۔ پولیس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا؟

## لدھارام کی تلاش

پنجاب پولیس نے اپنے مجرم کی تلاش میں مجالس احوار کے دفاتر سیاسی کارکنوں کے مکان اور دیگر پولیٹیکل پارٹیوں کے ٹھکانوں پر مسلسل چھاپے مارے، مگر نامرادیوں کے سوا انہیں کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر لدھارام کہاں غائب ہو گیا؟ اپنے تمام وسائل کے باوجود پنجاب پولیس اس سے بے خبر رہی۔

## ہائی کورٹ میں

ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر سر ڈگلس ہیگ اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ مسٹر سکندر حیات، خاں کے درمیان تعلقات خوش گوا



تہیں تھے۔ احرار ہنٹوں نے اس سے استفادہ کرنے کے لیے دہلی کے مشہور چارٹرڈ اکاڈمنٹس مسٹر آرمز کی معرفت چیف جسٹس سے ملاقات کی راہ نکالی، نیز سر ڈگلس اینگ نے بھی کسی محفل میں اس ارادے کا اظہار کیا کہ ”اگر آپ مجھے مطمئن کر دیں کہ سر سکندر حیات نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے خلاف ذاتی رنجش کی بنا پر وہ پردہ سازش کر کے مقدمہ چلایا ہے تو میں سید صاحب کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گا۔“

پہنچے مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، ڈاکٹر عبدالقوی لقمان کی معیت میں صبح پانچ بجے ٹیکسی کار کے ذریعے جسے ایک سکھ ڈرائیو کر رہا تھا، سر ڈگلس اینگ کی کوچھی کے عقبی دروازے پر پہنچے۔ سر ڈگلس اینگ پہلے سے منتظر تھے۔ وہ مولانا کو اپنے خاص کمرہ میں احترام سے لے گئے۔ ڈاکٹر عبدالقوی لقمان کے توسط سے مولانا اور سر ڈگلس اینگ کے درمیان گفتگو ہوئی۔ مولانا نے سر سکندر حیات کے پرسنل اسٹنٹ کے خطوط کی تصاویر دکھائیں۔

گویہ ملاقات بڑی محتاط اور مخفی طریق سے تھی، لیکن سی، آئی، ڈی کو پتہ چل ہی گیا کہ احرار ہنٹوں اور اینگ کے درمیان ملاقات ہوئی ہے۔ آخر ابراہیم ۱۹۳۰ء کو لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس اینگ اور رائے بہادر جسٹس رام لال پر مشتمل ڈویژنل بینچ کے روبرو ذی وقفہ ۱۲۴ الف بغاوت، ذی وقفہ ۱۵۳ ملک معظم کی رعایا کے درمیان منافرت پھیلانے، ذی وقفہ ۳۰۲ - ۱۱۷ تعزیرات ہند قتل کی انکجینٹ وغیرہ الزامات کے تحت مقدمہ پیش ہوا۔ اس موقع پر امیر شریعت کو لاہور سنٹرل جیل سے پولیس کی خاصی تعداد کے



حراست میں بغیر ہتھکڑی کے ہائی کورٹ میں پیش کیا گیا۔

اس موقع پر سینکڑوں کی تعداد میں لوگ عدالت کے صحن میں جمع تھے۔  
عدالت کے باہر اوہ ہائی کورٹ کے صحن میں پولیس کا کڑا پہرہ تھا۔

سرکار کی طرف سے مسٹر محمد سلیم ایڈووکیٹ جنرل اور مسٹر منیر احمد سینئر  
ایڈووکیٹ جنرل عدالت میں موجود تھے جبکہ امیر شریعت کی طرف سے میاں

عبد العزیز، دیوان چمن لال، مسٹر کے، ایل گابا بیرسٹر، مسٹر بدرالاسلام ایڈووکیٹ  
مولانا منظر علی انظر ایڈووکیٹ اور میر عبدالقیوم وکیل لائل پور پیر وکار تھے۔

اس مقدمہ میں استغاثہ کی طرف سے ۱۱-۲۱ راج کی کارروائی کے

دوران چھ سرکاری گواہان نے عدالت میں بیان دیے۔ آخری اور اہم گواہ

لدھارام تھا، جس کے لیے مقدمہ یکم اپریل پر ملتوی کر دیا گیا۔

## لدھارام

پانچ فٹ چھ انچ قد، سفید رنگ کے ساتھ دوہرا اور گھٹیل جسم،  
نوبھورت نقش و نگار، یہ تھا جو بیس سالہ نوجوان مسٹر لدھارام، والد کا نام  
امیر چند نارنگ، اور یہ ضلع سرگودھا کے چک ۴۶ میں پیدا ہوئے، اور  
ساتن دھرم ہائی سکول گجرات سے میٹرک کرنے کے بعد لاہور ڈی ایس وی  
کالج سے ایف اے تک تعلیم حاصل کی، گجرات پولیس میں بطور ہیڈ کانسٹیبل  
بھرتی ہوئے۔ اوپر کے افسروں میں اس قدر اعتماد حاصل کیا کہ ضلع کی ہر  
سیاسی ضرورت کے لیے انہیں استعمال کیا جاتا رہا۔



۱۱ جنوری ۱۹۴۰ء کو جب وہ پہلی بار امیر شریعت کے مقدمہ میں حیت  
 پورٹر کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوئے اور عدالت انہیں منحرف  
 گواہ قرار دے دیا، تو دیوان جن لال اور میاں عبدالعزیز انہیں لاہور لے  
 آئے۔ وہ قریباً ایک ہفتہ مولانا مظہر علی انظر کے مکان واقع ریلوے روڈ میں  
 روپوش رہنے کے بعد کیلاش پور (سہارن پور سے ۹ میل دور) پھر کیتھل،  
 ہردوار کے قریب جنگل میں چھپے رہے۔

## عدالت میں

ہائیکورٹ میں اٹھارہ دن التوا کے بعد یکم اپریل کو مقدمہ کی کارروائی  
 از سر نو شروع ہوئی۔ اس روز دھارام کی شہادت تھی۔ عدالت کے وسیع  
 صحن میں ہزاروں انسانوں کا اجتماع تھا۔ عدالت میں داخلے کے لیے پاس  
 جاری کیے گئے تھے۔ مگر ہجوم کی زیادتی کے باعث پاس بند کرنے پڑے۔  
 کمرہ عدالت سے باہر اور اندر پولیس کا اہم انتظام تھا۔ ٹھیک نو بج کر پتالیس  
 منٹ پر امیر شریعت کو پولیس کی مرچیت میں کار پر عدالت میں لایا گیا تو ہجوم  
 اس قدر بے قابو ہوا کہ پولیس کو اس پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ مقدمہ کی کارروائی  
 ٹھیک دس بجے شروع ہوئی۔

ایڈووکیٹ جنرل مسٹر سلیم نے عدالت سے کہا:

”سابقہ پیشی کے بعد دھارام کے نام صحن جاری کیے

گئے تھے لیکن صحن کی تعمیل نہیں ہو سکی بہتر کوشش کے بعد بھی



پتہ نہیں چل سکا کہ لدھارام کہاں ہے؟

اس پر میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ نے عدالت سے کہا:

”میں عدالت سے درخواست کرنا چاہتا ہوں، مجھے معلوم

ہوا ہے کہ لدھارام لاہور میں ہی ہے۔ اور میرے ایک

دوست نے کہا ہے کہ لدھارام کو احاطہ عدالت میں

دیکھا گیا ہے۔“

میاں عبدالعزیز کی درخواست پر لدھارام کی تلاش کے لیے عدالت کی

کارروائی نصف گھنٹہ ملتوی کر دی گئی۔

ڈس جج بینتیس منٹ پر بھورہ سے رنگ کی ایک کار عدالت کے عین

سامنے آکر رکی، جس پر لدھارام سوار تھا۔ پولیس کی خواہش تھی کہ لدھارام کو

عدالت میں داخل ہونے سے پیشتر گرفتار کر لیا جائے، لیکن احرار رضا کار

چاہتے تھے کہ لدھارام ایک دفعہ عدالت میں چلا جائے۔ اس کشمکش میں کچھ

وقت صرف ہوا، اور آخر کامیابی احرار کارکنوں کو ہوئی، اور لدھارام گرفتار

عدالت میں داخل ہو گیا۔

عدالت کی دوبارہ کارروائی ڈس جج کرنیا لیس منٹ پر شروع ہوئی

اور لدھارام کا بیان ہوا۔

چیف جسٹس مسٹر نیگ کے سوال و جواب کے بعد ایڈووکیٹ جنرل

مسٹر سلیم نے عدالت سے گواہ پر جرح کرنے کی اجازت چاہی، جس کے جواب

میں لدھارام نے حسب ذیل بیان دیا۔



## لدھارام کا بیان

دس بج کر ۵۴ منٹ پر کارروائی دوبارہ شروع ہوئی۔ سب سے پہلے  
 لدھارام کا بیان ہوا۔ لدھارام تقریباً ۲۴ سال کا مضبوط نوجوان ہے۔ اس  
 نے سوا سنی رنگ کا کوٹ، چوڑی دار پاجامہ اور گلابی رنگ کی قمیص پہنی ہوئی  
 تھی۔ پاؤں میں سفید کینوس کے بوٹ تھے اور چھوٹی چھوٹی موچکیں رکھی ہوئی  
 تھیں۔ ایک ہانڈ کی کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی تھی، جب وہ کمرہ عدالت میں  
 داخل ہوا، تو بہت سے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اس لیے چیٹ جس کو  
 کہنا پڑا کہ اگر ذرا بھی شور ہوا، تو کمرہ عدالت و زیٹروں سے خالی کر دیا جائے گا۔  
 لدھارام ولد امیر چند نارنگ نے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ میری عمر قریباً  
 چوبیس بچپن سال ہے۔ میں پہلے ملازم تھا اور اب مستعفی ہو چکا ہوں۔ میں  
 انگریزی جانتا ہوں، لیکن بول نہیں سکتا۔

مسٹر سلیم :- جب ۲۸ جون کو سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لالہ موسیٰ میں

تقریر کی تھی، کیا آپ وہاں موجود تھے؟

لدھارام : پولیس ڈپوٹر کی حیثیت سے۔

س : شاہ صاحب نے جو تقریر کی، کیا آپ نے اس کے نوٹ لیے؟

ج : جی ہاں میں نے نوٹ لیے۔

س : لائگ ہیمنڈ ہیں نوٹ لیے یا شارٹ ہیمنڈ ہیں؟

ج : ورنیکلر شارٹ ہیمنڈ ہیں۔



س : کیا تم نے تمام تقریر کے نوٹ لیے تھے؟

ج : جو کچھ میں لکھ سکتا تھا لکھا۔

س : کیا تم تمام تقریر لکھ سکتے تھے یا اس کا زیادہ حصہ؟

ج : میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے جو کچھ سمجھا وہ لکھا۔

س : جو کچھ آپ نے لکھا کیا یہ وہی تھا جو شاہ صاحب نے کہا تھا؟

ج : دیکھو دیر تک خاموش رہ کر جب تک آپ اس سوال کو صاف

نہ کریں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

س : میرا مطلب یہ ہے کہ شاہ صاحب نے جو کچھ کہا کیا وہی آپ نے

لکھا تھا؟

ج : جو کچھ میں نے سمجھا کہ شاہ صاحب نے کہا ہے وہی میں نے لکھا۔

س : جب آپ نے یہ نوٹ لکھے لیے، تو کیا آپ نے کسی سے دستخط کرا

لیے تھے؟

ج : جی ہاں، میں نے غلام حسین، رولڈ سنگھ (تیسرا نام ذرا سوچ کر)

مقبول حسین شاہ اور فیروز خان کا نیشنل کے دستخط کرا لیے تھے۔

س : کیا اس کے بعد ان شہادت ہیئرڈ نوٹوں کے آپ نے اسی وقت

لانگ ہیئرڈ نوٹ بنائے؟

ج : اسی وقت نہیں۔

س : تو کیا آپ نے لانگ ہیئرڈ نوٹ تیار کیے؟

ج : گجرات میں پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے گھر آکر لانگ ہیئرڈ نوٹ لکھے،



اور اُسے دے دیے۔

س: کس تاریخ کو لکھے؟

ج: جس دن تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لیے تھے اُس رات اور دن

کے بعد میں نے ۲۸ جون کو لالہ موسیٰ میں نوٹ لیے تھے، رات بھر

دہیں رہا، ۲۹ کو بھی وہیں رہا۔ ۳۰ جون کو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پیش کئے

س: چیف جسٹس، کس جگہ پیش کئے؟

ج: پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر تقریباً دوپہر کے بعد۔

س: یہ لانگ ہینڈ نوٹ علیحدہ کسی کاغذ پر لیے یا اسی نوٹ بک میں جس میں

شارٹ ہینڈ نوٹ لیے تھے؟

ج: علیحدہ کاغذ پر لکھ کر اسے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کو دیا۔

س: کیا وہ ترجمہ جو آپ نے شارٹ ہینڈ نوٹ سے لانگ ہینڈ نوٹ

میں کیا درست تھا؟

ج: شارٹ ہینڈ نوٹوں کے مہل بنی لانگ ہینڈ نوٹ بالکل درست تھے۔

س: جس نوٹ بک میں آپ نے شارٹ ہینڈ نوٹ لیے اس میں کوئی

خالی صفحہ بھی رکھا؟

ج: میں دونوں طرف نوٹ لکھتا گیا۔

س: کیا آپ عام طریقے پر اسی طرح شارٹ ہینڈ نوٹ لیتے تھے؟

ج: عام طور پر دونوں طرف ہمیں لکھا جاتا۔ کسی جگہ درمیان میں خالی

صفحہ چھوڑ دیے جاتے ہیں کسی جگہ نہیں۔



س: آپ کتنے عرصے سے پورٹنگ کر رہے ہیں؟

مسٹر جسٹس رام لال: آپ یہ سوال کس لیے دریافت کر رہے ہیں؟

مسٹر سلیم: اس لیے کہ اپنے پہلے سوال کا ٹھیک جواب حاصل کروں۔

زیادہ کہہ کر آپ نے پھر سوال دہرایا؟

لدھا رام: میں قریباً ایک سال سے پورٹنگ کر رہا ہوں۔

مسٹر سلیم: کیا تم نے اس سے پہلے بھی کسی جلسے میں نوٹ لیے؟

ج: جی ہاں میں نے کئی جلسوں میں نوٹ لیے۔

س: جب آپ دوسروں کے نوٹ لیتے تھے تو صفحے کے ایک طرف

لکھتے تھے یا دونوں طرف؟

ج: اگر اچھا اور ایسا مقرر ہوتا جو عام طور پر مشہور ہوتا اور یہ خیال ہوتا کہ

وہ ایسی تقریر کرے گا جو قابل اعتراض ہوگی تو جگہ چھوڑ دیتے۔

چیف جسٹس: مسٹر سلیم آپ سادہ اور مختصر سوال کیوں نہیں کرتے؟ جس سے

سارا جواب مل جائے۔

مسٹر سلیم: میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ دوسری تقریروں کے معاملے میں

کہیں جگہ چھوڑ لیتے تھے تو اس کا خاص سبب ہوتا تھا؟

ج: جی ہاں شادٹ ہینڈ نوٹوں کے ساتھ کسی دفعہ لونگ ہینڈ نوٹوں کے

لیے علیحدہ کاغذ چھوڑ دیا جاتا، تاکہ جب مقدمہ پیش ہو تو زیادہ اشتہار ہو سکے۔

چیف جسٹس: تم جو شادٹ ہینڈ نوٹ ایک منٹ پر لیتے تھے کیا اس کے لونگ

ہینڈ نوٹ اس جگہ پر جو خالی چھوڑ دی جاتی تھی آجاتے تھے؟



ج ۱ سارے نہیں آجاتے تھے، بلکہ ہم ضروری حصے لکھ لیتے تھے تاکہ انہیں یاد رکھ سکیں۔

مسٹر سلیم: آپ نے کہا۔ ہے کہ کئی حالتوں میں آپ خالی صفحے چھوڑ دیتے تھے اس کا کیا سبب تھا؟

ج: جب ہمیں پتہ لگ جاتا تھا کہ گورنمنٹ نے مقدمہ چلانے کی اجازت دیدی ہے تب جگہ خالی چھوڑ لیتے تھے۔

مسٹر سلیم: میرا سوال یہ ہے کہ جن تقریروں کے نوٹ لیتے وقت آپ نے خالی صفحہ نہیں چھوڑا، اس کا سبب کیا ہے؟

ج: جن حالتوں میں تقریریں قابل اعتراض ہوتی ہیں، ان میں ہی خالی جگہ چھوڑی جاتی ہے۔

س: جگہ چھوڑنے کا فیصلہ آپ تقریر کے نوٹ لیتے وقت کرتے تھے یا بعد میں؟

ج: تقریر کے دوران میں ہی جب اس نتیجے پر پہنچیں۔

چیف جسٹس: اب سوال یہ ہے کہ جب آپ لالہ موسیٰ میں پہنچے تو کیا آپ کا خیال تھا کہ شاہ صاحب قابل اعتراض تقریر کریں گے؟

لدھیارام: نہیں، مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ شاہ صاحب قابل اعتراض تقریر کریں گے یا نہیں۔

مسٹر سلیم: (ایک نوٹ بک جو کمرہ عدالت میں موجود تھی گواہ کو دکھا کر) اس کتاب کے ۱۶ سے ۳۳ صفحات تک جو شارٹ ہینڈ نوٹ



درج ہیں وہ کیا تمہارے لکھے ہوئے ہیں؟

لدھارام: یہ بھی میرے لکھے ہوئے ہیں۔

مس: جو کچھ آپ نے لانگ ہینڈ میں لکھا کیا وہ اس شارٹ ہینڈ کا ترجمہ ہے؟

جی ہاں اس کتاب میں جو شارٹ ہینڈ نوٹ ہیں ان کے مطابق

لانگ ہینڈ نوٹ درست ہیں۔

مس: کیا آپ نے سارے کے سارے شارٹ ہینڈ نوٹوں کا ترجمہ

لانگ ہینڈ نوٹوں میں کیا تھا؟

چینٹ جیٹس: یہ سوال پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟

مسٹر سلیم: یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ ترجمہ صحیح ہے یا غلط۔ (اس مرحلے پر پھر

مسٹر سلیم نے یہی سوال دہرایا کیا)

لدھارام: جی ہاں جو کچھ میں نے شارٹ ہینڈ میں لکھا ہے اس کا ترجمہ

سارے کا سارا لانگ ہینڈ نوٹوں میں کیا۔

مسٹر سلیم: کیا یہ وہی شارٹ ہینڈ نوٹ ہیں، جو آپ نے لالہ موسیٰ میں ۲۸

جون کو ملزم کی تقریر کے لیے تھے؟

لدھارام: یہ وہ نوٹ ہیں جو میں نے جلسے میں لیے تھے۔

## جرح کی اجازت

اس مرحلے پر مسٹر سلیم نے درخواست کی کہ مجھے گواہ پیر جرح کرنے کے

اجازت دی جائے، کیونکہ گواہ منحرف ہو گیا ہے۔ میاں عبدالعزیز نے اعتراض



کہ اس مرحلے پر کوئی وجہ نہیں کہ گواہ کو منحرف قرار دیا جائے۔ کیونکہ یہ ثابت نہیں ہوا کہ وہ بھٹوٹ بول رہا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ سچ بول رہا ہے۔ فاضل جہان نے فیصلہ کیا کہ ایڈووکیٹ جنرل کو جرح کرنے کا حق ہے۔ میسز عبدالعزیز سے انہوں نے کہا کہ کسی گواہ کے منحرف ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بھٹوٹ بول رہا ہے ایک سچے گواہ کو بھی منحرف قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ اس نے استغاثہ کی مرضی کے مطابق بیان نہیں دیا خواہ استغاثہ بھٹوٹ ہے یا سچا۔ مسٹر سلیم نے گواہ پر جرح شروع کی۔

س: یہ شارٹ ہینڈ نوٹ آپ نے کہاں لیے؟ جو آپ کہتے ہیں کہ اصلی نوٹ نہیں ہیں؟

ج: میں نے لالہ موسیٰ سے واپسی پر گجرات میں پرائیویٹنگ انسپکٹر کے مکان پر یہ شارٹ ہینڈ نوٹ لکھے جو بٹھے دکھائے گئے ہیں، ۱۰ مارچ کو کو جب میں نے یہ نوٹ لکھے تو پرائیویٹنگ انسپکٹر کے مکان پر ایک اور آدمی راجہ نماں نائب محرر لالہ موسیٰ پولیس اسٹیشن بھی موجود تھا۔

س: آپ نے ان نوٹوں کی کہیں سے نقل کی یا کسی نے لکھوائے تھے؟

ج: پرائیویٹنگ انسپکٹر صاحب جو کچھ مجھے دکھاتے رہے ہیں، اسی کو شارٹ ہینڈ میں لکھا گیا۔ میں پہلے لانگ ہینڈ ترجمہ پرائیویٹنگ انسپکٹر کے پاس پہنچا چکا تھا اسی کو دیکھ کر اس میں تبدیلیاں کر کے وہ سب مجھے دکھاتے رہے۔

س: کیا ان تبدیلیوں کے متعلق پرائیویٹنگ انسپکٹر نے اپنے پاس نوٹ



لکھ کر رکھے ہوسے۔ تختے یا وہ زبانی تبدیلیاں کرانے جاتے تھے؟

ج: اس وقت میرے لانگ ہینڈ نوٹس کے علاوہ اور بھی ایک کاغذ تھا،  
لیکن مجھے یہ نہیں دکھایا گیا کہ اس کاغذ پر کیا لکھا ہوا تھا۔ لیکن اتنا نظر  
آ رہا تھا کہ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ دوسری طرف سے انگریزی کے  
ٹائپ شدہ حروف نظر آ رہے تھے۔ لکھاتے وقت وہ دوسرے  
کاغذ کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے۔ شارٹ ہینڈ کے بعد پراسیکوٹنگ  
انسپیکٹر کے مکان پر لانگ ہینڈ بک ترجمہ بھی لکھا گیا۔ لانگ ہینڈ ترجمہ  
علیحدہ کاغذ پر بھی لکھا۔ اسی دن پراسیکوٹنگ انسپیکٹر کے مکان پر نوٹ بک  
پر لانگ ہینڈ لکھنے کے بعد علیحدہ کاغذ پر لانگ ہینڈ ترجمہ کی نقل کی  
دوسری دفعہ جب لانگ ہینڈ کی نقل کی گئی تو کاربن پیپر کے ذریعے  
دو کاپیاں بنائی گئیں۔ ایک اصل اور دو کاربن والی کاپیاں،  
دوسری نوٹ بک پر جو بعد میں تیار کی گئی میرے سامنے گواہوں نے  
دستخط نہیں کیے۔ اصل نوٹ بک جس میں جلسے کی تقریر کے  
نوٹ تھے۔ پراسیکوٹنگ انسپیکٹر کے سامنے میز پر رکھی ہوئی تھی وہ  
شارٹ ہینڈ نوٹ اور لانگ ہینڈ ترجمہ پراسیکوٹنگ انسپیکٹر کے  
سامنے چھوڑ گیا تھا۔

## نوٹ بک جلا دی گئی

اصلی شارٹ ہینڈ نوٹ بک میرے سامنے پراسیکوٹنگ انسپیکٹر کے



مکان پر جلادی گئی، اور اصلی نوٹوں کے لانگ ہینڈ نوٹوں کے ترجمے کو بھی میرے سامنے جلا دیا گیا، یہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کارہائشی مکان تھا میٹنگ سے پہلے ہی مجھے ہدایت دی گئی تھی کہ پیر غازی میں جس تقریر کے ٹارٹ ہینڈ نوٹ لینے مقصود ہیں ان نوٹوں کے درمیان وقفے چھوڑ دینا۔ ہدایات کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ پنجاب کے وزیر اعظم کی ایک چھٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نجات کو موصول ہوئی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری آپ کے علاقے میں آ رہا ہے، وہ یونینسٹ پارٹی کے خلاف منافرت پھیلانے آ رہا ہے۔ اس کی تقریر اس طریقے پر لی جائے کہ وفات ۲۰۲ - ۱۱۷ اور ۱۵۳ کی زد میں آجائے۔ تقریر کے ٹارٹ ہینڈ نوٹ لینے پر ایسے شخص کو لگایا جائے جو تعلیم یافتہ ہو، اور گواہ بھی ایسے ہونے چاہئیں جو پولیس کے زیر اثر ہوں۔“

ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ :

ایک چھٹی ایسی تھی جس پر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے میرے دستخط کرائے، وہ چھٹی ہدایات سے متعلق تھی اور دستخط اس لیے کرائے تھے کہ بعد میں میں یہ نہ کہہ سکوں کہ ہدایات نہیں ملی تھیں، جس خط پر وزیر اعظم کی ہدایات تھیں وہ مجھے نہیں دکھایا گیا تھا، پہلی دفعہ مجھے ۲۸ جون سے دو تین ہفتے پہلے ہدایات دی گئی تھیں۔ ۲۸ جون کو جب میں تقریر کی رپورٹ کیلئے ایمر میاں کو روکے ہوئے والا تھا



تو مجھے بلا کر کہا گیا کہ تقریر کی رپورٹ جلد از جلد لے کر شارٹ ہینڈ نوٹ پر ایسی کیوٹنگ انسپکٹر کے پاس پہنچا دوں۔ جب دو بیانیں ہفتے پہلے ہدایات دی گئیں اس وقت مجھے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بلا یا تھا۔ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس انگریزی میں بات کرتے تھے۔ حضورؐ ہی بہت انگریزی پیری سمجھ رہے، آتی تھی باقی نہیں آتی تھی۔ پھر پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے ایس۔ پی کی موجودگی میں ہدایات دیں کہ پیر غازی (لالہ موسیٰ) میں میٹنگ ہونے والی ہے وہاں سید عطاء اللہ شاہ بخاری تشریح کرنے والے ہیں، اس کی تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لیتے وقت خالی جگہیں چھوڑتے جانا۔

س : کیا اس وقت آپ کو بتایا گیا تھا کہ شارٹ ہینڈ نوٹوں میں جگہیں کیوں چھوڑنی ہیں؟

ج : اس وقت تک مجھے نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ جگہیں کیوں چھوڑنی ہیں۔ لیکن یہ بات تو پھر آدھی سمجھ سکتا ہے کہ جب سپرنٹنڈنٹ پولیس سمجھ چکے تھے تو مجھے ہدایات دی گئیں۔ پیر غازی میں جو جلسہ ہونے والا ہے اس کے نوٹوں میں خالی جگہ رکھی جائے۔

ایک سوال پر گواہ نے کہا کہ جگہ شارٹ ہینڈ نوٹوں میں چھوڑنی تھی۔

س : کیا یہ ہدایات دی گئیں تھیں کہ جہاں آپ کا خیال ہو جگہ چھوڑ دو یا کو خاص جگہ چھوڑنے کے لیے کہا گیا تھا۔

ج : کہیں ایک لائن کہیں دو لائنیں۔



س : میرا سوال یہ ہے کیا قطعی سہولت دی گئی تھی کہ کس طرح جگہ خالی چھوڑی جائے؟

ج : نہیں، خاص طریقے کی ہدایت نہیں دی گئی تھی۔

س : یہ ہدایات کس کی تقریروں کے متعلق تھیں؟

ج : سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر کے متعلق۔

س : تقریر کہاں کرنی تھی؟

ج : پیر غازی میں۔

س : کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کو جگہ چھوڑنے کے متعلق کیوں ہدایت کی گئی تھی؟

ج : مجھے پتہ نہیں۔

س : آپ کو پتہ نہیں تھا اور آپ نے کسی سے خیال بھی ظاہر نہیں کیا؟

ج : نہیں۔

س : آپ قیاس بھی نہیں کر سکتے تھے؟

ج : قیاس تو ہر شخص کر سکتا ہے ایک معمولی سا ملازم بھی۔

## عدالت سے تحفظ کی درخواست

س : کیا پہلا موقع تھا جب آپ نے اس طرح جگہ خالی چھوڑی؟

ج : اگر عدالت مجھے تحفظ دے تو میں اس سوال کا جواب دے

سکتا ہوں۔



چیف جسٹس : آپ کو تحفظ دی جاتی ہے، لیکن اگر ہمیں خیال ہو کہ آپ کا جواب غلط ہے تو مقدمہ چل سکتا ہے، اگر درست ہوا تو نہیں۔

لدھارام : میری عرض یہ ہے کہ میں جن واقعات کے متعلق جواب دوں گا، اس میں مقدمہ چل کر مزا ہو سکتی ہے۔

مسٹر سلیم : مائی لارڈ میری درخواست ہے کہ یہ کارروائی میں لکھا جائے کہ گواہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس سوال کا جواب دے۔ اس میں سب کچھ آجاتا ہے۔

میاں عبدالعزیز : لیکن اس صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گواہ جواب دینے سے انکار کر دے۔

چیف جسٹس : محض یہ سوال دریافت کیا جائے کہ کیا گواہ کو پہلے بھی یہ ہدایت ملی تھی۔

مسٹر سلیم نے یہی سوال کیا جس کے جواب میں گواہ نے کہا کہ مجھے اس سے پہلے بھی اسی طرح ہدایات ملی تھیں۔

مسٹر سلیم : آپ کو ہدایت کب ملی تھی؟

اس مرحلے پر وکیل صفائی میاں عبدالعزیز نے درخواست کی کہ اس سوال کے جواب میں گواہ کو تحفظ دیا جائے۔

چیف جسٹس : یہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ گواہ پہلے کہہ چکا ہے کہ اسے پہلے بھی ہدایات ملتی رہی ہیں۔

میاں عبدالعزیز : لیکن اس معاملہ میں گواہ کو ضرور تحفظ ملنا چاہیے۔



پتین جسٹس : صرف اس خاص سوال کے جواب میں تحفظ دیا جائے گا۔  
 مسٹر سلیم : (گواہ سے) سید بنجادی کے جلسے کے متعلق آپ کو جو ہدایات دی گئی  
 تھیں، کیا اس وقت بھی کوئی چٹھی آئی تھی؟  
 ج : چٹھیاں تو کئی آتی رہتی ہیں۔

مسٹر جسٹس رام لال : کیا اس خاص جلسے کے متعلق کوئی چٹھی دکھائی تھی؟  
 لدھا رام : جی ہاں۔

مسٹر سلیم : اصلی چٹھی دکھائی گئی تھی یا اس کی نقل؟

ج : اس کا ترجمہ کیونکہ اس پر لکھا ہوا تھا یہ بہت خفیہ ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا۔ میں نے اصلی خط نہیں  
 پڑھا بلکہ نقل جو سپرنٹنڈنٹ پولیس کا ریڈہ اپنے رجسٹر میں درج کرنا ہے  
 وہی پڑھی۔

مسٹر سلیم : رجسٹر میں جو درج تھا اس میں کیا لکھا تھا؟

ج : مجھے یاد نہیں رہا جو کچھ مجھے یاد ہے وہ کہہ چکا ہوں اور وہ یہ کہ  
 جگہ خالی رکھی جائے اور تقریر کے نوٹوں کی ایک کاپی پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کو  
 دی جائے۔

مسٹر جسٹس رام لال : کیا سارا رجسٹر پڑھا تھا یا محض وہ نقل؟

ج : ترجمہ جو کچھ تھا وہ پڑھا، اور اس خط کے نمبر بھی علیحدہ نوٹ کر لیے۔  
 ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ  
 مستقبل میں اپنی رہنمائی کے لیے لکھا تھا۔ ایک اور سوال کے جواب



میں کہا کہ میں نے یہ نقل ریڈر کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی اجازت سے لی تھی۔ اور میں اسی طرح اکثر نقل لیا کرتا تھا۔

چیف جسٹس: آپ نے جس تحریر کی نقل لی تھی وہ بہت تھوڑی تھی یا زیادہ؟  
گواہ: کچھ خط تھے جن پر تھوڑی تھوڑی عبارت تھی۔

چیف جسٹس: دس دس سطریں یا بیس بیس سطریں تم نے کتنی دیر میں نقل کیں؟

لدھارام: تین چار منٹ ہیں، میں نے پیرغازی کے جلسے کے متعلق ہدایات نقل کیں۔

چیف جسٹس: کیا سپرنٹنڈنٹ پولیس اس وقت موجود تھے؟  
گواہ: وہ دوسرے کمرے میں بیٹھے تھے۔

مسٹر سلیم: مطلب یہ ہوا کہ بعض اوقات نقل کرتے وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس موجود ہوتے تھے اور بعض اوقات نہیں۔

گواہ: کئی اوقات ریڈر کو ہدایت کی جاتی تھی کہ دوسرے کمرے میں لے جائے۔

نقصیہ رجسٹر

چیف جسٹس: یہ رجسٹر بہت نقصیہ ہے؟  
گواہ: جی ہاں۔

چیف جسٹس: اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو نہیں بتایا جاتا تھا؟



گواہ : جس کے متعلق ہدایت ہوتی تھی اُسے بتا دیا جاتا تھا۔  
 چیف جسٹس : سوال یہ ہے کہ ایک سترہ دوپہ ماہوار تنخواہ پانے والے کا نیٹیل کو  
 سپرنٹنڈنٹ پولیس وہی خفیہ تحریریں کیونکر دکھا سکتے ہیں؟  
 گواہ : میں چند اور باتیں بھی اس سلسلے میں بیان کرنا چاہتا ہوں، کیوں کہ  
 وہ کام میں نے کرنا تھا۔

مسٹر سلیم : آپ نے کہا تھا کہ آپ نقل کرتے وقت نمبر بھی نقل کر لیتے  
 تھے، یہ کیوں؟

گواہ : اس کے متعلق نقل کرتے وقت کوئی خیال نہیں ہوتا۔  
 س : جو نقل آپ کے پاس تھی اس کے متعلق آپ کو ہدایت تھی کہ اسے  
 محفوظ رکھا جائے یا نہیں؟

ج : اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاتا تھا۔  
 چیف جسٹس : سوال یہ ہے کہ جب تم نقل کر لیتے تھے تو کیا یہ بتلا دیا جاتا تھا کہ  
 اسے جس طرح چاہو استعمال کرو، اسے اپنے پاس رکھو یا نہیں؟

میاں عبدالعزیز : (اٹھ کر) اس وقت گواہ ان کے اعتماد میں تھا۔  
 گواہ : جو کچھ میرے متعلق لکھا ہوتا تھا اس کے متعلق ہدایت ہوتی تھی کہ اپنی  
 یادداشت کے لیے نقل کر لو۔

س : جب آپ کو چھٹی دکھائی جاتی تھی یا ہدایت دی جاتی تھی تو ہمیشہ اس کی  
 نقل دی جاتی تھی؟

ج : نہیں ہمیشہ نقل کر لیتا تھا۔ ایک اور سوال پر گواہ نے کہا کہ



میں نقل اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور محفوظ رکھتا تھا۔

## لکڑی کا بکس

مسٹر سلیم: تمہم فرض کرتے ہیں کہ کئی مقدمات کے متعلق بھی ہدایات کی نقلیں آپ کے پاس ہوں گی؟

ج: جی ہاں میرے پاس پولیس اسٹیشن گجرات میں ہیں جنہیں میں اپنے رہائشی کو ادھر میں اپنے ایک صندوق میں چھوڑ آیا ہوں۔

چیف جسٹس: اسے تالا لگایا تھا؟

گواہ: تالا لگایا تھا مگر وہ پہلے سے ہی خراب تھا، قریباً تین چار ماہ پہلے سے۔

چیف جسٹس: کیا ان کاغذات کو خفیہ رکھنے کے لیے بکس ملا تھا؟

گواہ: جی ہاں۔ گواہ نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ اس صندوق میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا بکس تھا جس میں وہ کاغذات رکھے ہوئے تھے، اس میں تالا لگا ہوا تھا۔ اس کی چابی ابھی تک

میرے پاس ہے۔

چیف جسٹس: لاؤ دیکھیں۔

لدھا رام نے اپنی جیبیں ٹیٹے لے کر بعد کہا کہ میں نے اپنی تمام چابیاں

اپنے ایک دوست خواجہ کو دی ہوئی ہیں، وہ یہیں موجود تھے۔

اس کے بعد خواجہ کو (جس کا پہلا نام گواہ نہیں جانتا تھا) بلایا گیا۔



اُس نے چابیاں گواہ کو دیں۔ گواہ نے چابیاں چیف جسٹس کو دے دیں اور اس بکس کی چابی بتائی۔ گواہ نے یہ بھی بتایا کہ خواجہ سے میری گزشتہ پندرہ بیس دن کی واقفیت ہے۔ مزید کہا کہ جلال الدین ہیڈ کانسٹیبل کے پاس بھی اس بکس کی اسی طرح کی چابی ہے۔ اس کے بعد گواہ کو کچھ دستاویزات دکھانی گئیں۔ انہیں دیکھ کر گواہ نے ایک پیرا دیکھ کر کہا کہ یہ پیرا میں نے رجسٹر سے نقل کیا تھا۔

مسٹر سلیم: اس سے پہلے جوسی۔ آر۔ پی لکھا ہے اس سے کیا مراد ہے؟  
گواہ: مجھے معلوم نہیں۔

چیف جسٹس: شاید اس کا مطلب کانفیڈیشنل رپورٹ آف پولیس ہے۔

### مختصہ چھوٹ

مسٹر سلیم: کسی پر سی ایل پی لکھا ہوتا ہے؟

چیف جسٹس: (ازراہ مذاق) کانفیڈیشنل لائٹرز جھوٹ ہو سکتا ہے (تہقیر)  
اس مرحلے پر چیف جسٹس نے میاں عبدالعزیز سے کہا کہ آپ اپنی جرح میں اس بات کو ضرور صاف کیجئے کہ اس قدر خطرناک ادارہ کانفیڈیشنل ہدایات کو ایک سترہ روپے کے کانسٹیبل کو نقل کر کے ساتھ لے جانے کی اجازت کس طرح دی گئی ہمیں اس کا یقین نہیں ہوتا۔ میاں عبدالعزیز نے کہا، "مائی لارڈ! میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔" گواہ نے مسٹر سلیم کی مزید جرح سے جواب میں کہا کہ:



۲۸ جون کو میں ہدایت حاصل کر کے پیرغازی والی تقریر کے نوٹ  
 لینے گیا تھا۔ ہدایات مجھے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے گجرات میں دی تھیں  
 ایس پی اپنے کمرہ میں ہوگا، لیکن اس وقت ہم دونوں کے سوائے  
 کوئی وہاں موجود نہ تھا، اس وقت مجھے یہی ہدایات دی گئی تھیں کہ  
 تقریر کے نوٹ لینے ہی پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس واپس آنا  
 اس کے علاوہ اس دن کوئی مزید ہدایات نہیں دی گئی تھیں لیکن  
 مجھے یہ معلوم تھا کہ تقریر *at the end of the day* ہوگی۔ کیونکہ ایسی باتیں تو قیافہ  
 سے ہی معلوم ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے مجھے کہا جا چکا تھا کہ جگہ خالی  
 پھوڑوں یا نہ چھوڑوں۔ مجھے محض یہ ہدایت تھی کہ جس وقت نوٹ  
 لے آؤں فوراً پراسیکیوٹنگ افسر کے مکان پر پہنچ جاؤں

مسٹر سلیم: اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو یہ ہدایت نہیں کی گئی تھی جس سے یہ

معلوم ہو کہ اس میں بناوٹ کی جائے گی؟

ج: مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ اس میں بناوٹ کی جائے گی۔

س: کیا آپ کو شبہ تھا یا بتایا گیا تھا؟

ج: ایسی باتیں ہمیشہ ہوتی رہتی ہیں، مجھے بتایا نہیں گیا تھا۔

س: کیا اس تقریر کے متعلق خاص ہدایت کی گئی تھی؟

ج: مجھے فون پر بلا کر ہدایت کی گئی تھی کہ لانگ ہینڈ نوٹ نہ کرنا۔

س: کیا یہ بتایا گیا تھا کہ کوئی خالی جگہ نہ چھوڑنا؟

ج: مجھے نہیں بتایا گیا تھا۔



س : جس نوٹ بک میں آپ نے نوٹ لیے وہ گجرات سے لی تھی؟ —  
جب آپ لالہ موسیٰ گئے تھے کیا آپ کو خیال تھا کہ نوٹ بک جلائی  
جائے گی؟

ج : مجھے معلوم نہیں تھا۔

س : کیا آپ کو یہ ہدایات دی گئیں کہ فوراً آجائیں؟

ج : مجھے یہ ہدایت تھی کہ جتنی جلدی فارغ ہو جاؤ واپس آ جاؤ۔

س : کب فارغ ہو گئے تھے؟

ج : اور بھی کئی تقریریں تھیں بشہزادہ آزاد نے بھی تقریر کی تھی اس  
پے دوسرے دن شام کو فارغ ہوا۔

س : ۲۸ جون کی شام کو آپ نے کس وقت تقریر کے نوٹ لیے؟

ج : مجھے یاد نہیں — ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ نوٹ  
لینے میں غالباً دو اڑھائی گھنٹے لگے تھے۔

س : لالہ موسیٰ سے گجرات آنے تک کتنا وقت لگا؟

ج : غالباً بیس کچیس منٹ — ایک اور سوال پر کہا کہ غالباً دونوں شہروں  
میں دس گیارہ میل کا فاصلہ ہے۔

س : کیا جس رات نوٹ لیے تھے اس رات سوئے بھی تھے؟

ج : جی ہاں۔ میں تھا نہ لالہ موسیٰ میں سو گیا تھا۔ وہاں اور سپاہی بھی تھے  
جنہوں نے مجھے کہا تھا کہ شاید کل جلسہ ہو، اس لیے مجھے لالہ موسیٰ ہی میں

ٹھہرنا چاہیے۔ (اس مرحلے پر کارروائی لینچ کے لیے ملتوی ہو گئی)



پنج کے بعد کارروائی شروع ہوئی تو مسٹر سلیم نے جرح جاری رکھتے ہوئے لدھارام سے پوچھا :

س : "۲۸ جون کے جلسے میں جس میں عطاء اللہ شاہ بخاری نے تقریر کی، کیا آپ نے کسی دوسری تقریر کے نوٹ لیے ؟

گواہ : جی ہاں میں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کے علاوہ ایک دو اور اصحاب کی تقریروں کے نوٹ لیے جن کے نام مجھے یاد نہیں۔

س : جب آپ نے نوٹ لیے اس وقت دن میں کچھ باقی تھا ؟

ج : نہیں، جلسہ نوبت کے رات کے بعد شروع ہوا۔

س : کیا ان تقریروں کے نوٹ اسی نوٹ بک میں لیے تھے ؟

ج : جی ہاں۔

س : کیا آپ نے دوسرے دن یعنی ۲۹ جون کو کسی اور تقریر کے نوٹ لیے تھے ؟

ج : نہیں۔

مسٹر جسٹس رام لال : کیا اس دن لالہ موسیٰ میں کوئی جلسہ تھا ؟

ج : ایک جلسہ تھا جسے مسٹر سلیم نے منع کیا تھا۔

مسٹر سلیم : آپ لالہ موسیٰ سے گجرات کیسے گئے ؟

ج : ۲۹ جون کی شام یا ۳۰ جون کی صبح، لیکن مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ کیونکہ اس واقعے کو آٹھ نو ماہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔

س : آپ نے پہلے کہا تھا کہ آپ کو ہدایت ہوئی تھی کہ تقریریں نوٹ



کرنے کے بعد فوراً چھپو، تو کیا آپ کو یاد نہیں کہ ۲۹ جون کی شام کو گئے  
یا ۳۰ جون کی صبح کو؟

گواہ مجھے یاد نہیں، لیکن یہ یاد ہے کہ ۲۹ جون کو پراسیکیوٹنگ انسپر  
کے پاس گئے۔

سٹر سلیم: اگر آپ ۲۹ جون رات کو گجرات جاتے تو کہاں رہتے؟

ج: گجرات جاتے تو قحمانہ میں رہ پوسٹ دسے کر رہتے رہتا۔

س: پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس کس وقت گئے؟

ج: وہ پیر کے بارہ بجے کے بعد مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ غالباً تقریباً اور  
چار بجے کے بعد وہ بیان کیا ہوں گا۔

س: جب آپ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر سے ملے تو کیا نوٹ پاس جس میں آپ نے

ان تقریروں کے نوٹ لیے تھے، وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے اور

اسے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس لے کر دیا تھا؟

ج: جی ہاں،

س: جب آپ نے نوٹ پاس لے کر، تو کیا ٹھکانہ ہینڈلڈ نوٹ چھپ کر

ٹھانے تھے یا لانگ ہینڈلڈ میں لکھ کر؟

ج: میں نے نوٹ ہینڈلڈ بنا لئے اور اس کے بعد انہیں انسپکٹر کو

پیش کر دیا۔

س: کیا ان کی موجودگی میں لانگ ہینڈلڈ بنا تیار کیے؟

ج: جی ہاں، پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کی موجودگی میں تیار کیے۔



س: جب آپ نے لانگ ہینڈ نوٹ بنا سٹے تو کیا آپ کی موجودگی میں  
انہوں نے پڑھا؟

ج: جی ہاں۔

س: کیا انہوں نے پڑھنے کے بعد کہا کہ یہ سلی بجنس نہیں ہے یا ہے؟  
ج: انہوں نے کہا کہ بوکچہ میں بولوں اس کے نئے سرے سے شارٹ ہینڈ  
نوٹ لکھو، ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ پراسیکیوٹر لانگ  
ہینڈ نے میرے لانگ ہینڈ نوٹ دو تین مرتبہ پڑھے اور اس کے بعد  
لکھنا شروع کیا۔

س: آپ نے جو نوٹ لکھے ان میں کتنا عرصہ لگا؟

ج: قریباً چھ سات گھنٹے۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ  
شارٹ ہینڈ نوٹ لکھوانے اور لانگ ہینڈ نوٹ بنوانے کے لیے  
پہلی شارٹ ہینڈ نوٹ باک جلائی گئی، تو دوسری تقریروں کے متعلق  
کیا ہوا؟ گواہ نے کہا کہ اگر کوئی جج نے فقط دسے تو میں جواب دے  
سکتا ہوں کیونکہ ان کے سامنے میں عدالت فیصلہ دے چکی ہے۔  
میاں عبد الحمید: دو سے مقدمے میں جو شہزادہ آزاد کے خلاف ہوا، گواہ  
بہرحال ہوتی ہے، اس لیے گواہ کی درخواست ہے کہ اگر وہ اس کے متعلق  
بچان جو بھی بیان دے گا وہ اس کے خلاف استعمال نہیں کیا جائیگا  
اس پر گواہ نے کہا کہ جو شہادت میں نے جہلم میں شہزادہ آزاد کے خلاف  
دی تھی وہ پراسیکیوٹر لانگ ہینڈ کے کہنے پر دی تھی۔



مسٹر سلیم : سوال یہ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ دوسری تقریروں کے نوٹوں کے متعلق کیا کیا گیا؟

گواہ : ان پر دستخط بھی تھے۔

چیف جسٹس : سوال یہ ہے کہ اس نوٹ تک میں دوسری تقریروں کے نوٹ بھی تھے۔ جب اس نوٹ تک کو جلا دیا گیا تو ان تقریروں کے نوٹوں کا

کیا بنا؟

گواہ : انہیں بھی دوبارہ لیا گیا اسی لیے تو سات گھنٹے صرف ہوئے تھے۔ مسٹر سلیم : جب آپ سید صاحب کی تقریر کے نوٹوں کا ذکر کر رہے تھے، تو دوسری تقریروں کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

گواہ : اس لیے کہ میں پروٹیکشن لینے کے بعد ہی کر دوں۔

مس : جو جو تقریریں ہوئیں کیا ان سب کو دوبارہ نوٹ میں لیا گیا تھا؟  
گواہ : جی ہاں۔

مس : جب آپ نے ان تقریروں کو دوبارہ کر لیا تو کیا انہیں اصل کے مطابق لیا یا ان میں بھی تبدیلی کرائی گئی؟

گواہ : اگر مجھے یقین دلایا جائے کہ اس بیان پر میرے خلاف مقدمہ نہیں چلے گا تو میں بتا سکتا ہوں۔

میاں خبیب العزیز : یہ حفاظت تو پہلے دی جا چکی ہے۔

گواہ : کچھ لفظ سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر کے نکال کر شہزادہ آزاد کی تقریر میں ڈال دیے گئے تھے۔



چیف جسٹس : تاکہ شہزادہ آزاد کو سزا ہو جائے — تو کیوں یہ لفظ ان کی تقریر میں ڈالے گئے؟

گواہ : اس لیے کہ اگر ساری تقریر کو بنایا جاتا تو یہ خیال ہوتا کہ بناوٹی ہے شہزادہ آزاد کی تقریر میں سے یہ الفاظ کہ ٹوانوں نے ہزاروں روپوں کے کتے خریدے سے نکال کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کے ٹیوٹوں میں ڈال دیے گئے۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہا، کہ

اس دائرے میں جو جعلی بنائی گئی، اگر سارے قابل اعتراض الفاظ ڈالے جاسکتے تو معلوم ہو جاتا کہ ساری جعلی ہے، اس لیے وزارت کے متعلق بھی کچھ حجتہ ملا دیا گیا کیونکہ خط میں لکھا ہوا تھا کہ سید عطاء اللہ شاہ یونیورسٹی پارٹس کے خلاف پریپرینڈ کر رہا ہے۔

مشر حکیم : آپ کا یہ خیال ہے کہ ایک تقریر کے چند حصے دوسری تقریر میں ڈالے گئے تاکہ یہ معلوم نہ ہو کہ ساری تقریر جعلی ہے۔

گواہ : جعلی نظر نہ آئے اور دوسرے یہ کارکردگی دکھانے کے کہ میں یونیورسٹی وزارت کا اتنا ہمدرد ہوں۔

چیف جسٹس : وہ الفاظ جو شہزادہ آزاد کی تقریر سے نکال کر سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر میں ملنے گئے وہ قابل اعتراض تھے یا نہیں؟

گواہ : ہو سکتا ہے۔

چیف جسٹس : یہ الفاظ بہت صاحب کی تقریر سے نکال کر آزاد کی تقریر میں ڈالے گئے وہ قابل اعتراض تھے یا نہیں؟



گواہ : ہوں گے، مجھے پتہ نہیں۔

چیف جسٹس : کیا آپ کے خیال میں دونوں نے قابل اعتراض تقریریں کی تھیں؟  
گواہ : نہیں۔

چیف جسٹس : ہو سکتا ہے تمام تقریریں قابل اعتراض نہ ہوں، چند الفاظ ہی  
قابل اعتراض ہوں؟

گواہ : جہاں تک پورا خیال ہے نہیں۔

چیف جسٹس : اگر نہیں تو ایک تقریب کے الفاظ دوسرے کی تقریب کے الفاظ  
میں کیوں ڈالے گئے؟

گواہ : ایک آدھ لفظ ایک تقریب سے لیا جاتا تھا اور کچھ اپنے پاس سے  
لا لیا جاتا تھا۔

مسٹر جسٹس رام لال : یعنی پورے جملے نہیں، بلکہ چند الفاظ ہی ملائے  
جاتے تھے؟

گواہ : جی ہاں۔

مسٹر سلیم : آپ نے کہا تھا یہ دستخط جو اس کے نیچے ہیں آپ کی موجودگی میں  
نہیں کیے گئے تو پھر کس نے کیے تھے؟

گواہ : یہ ان لوگوں کے دستخط تھے جو میں نے بتائے ہیں یا پراسیکیوٹرنگ  
انسپیکٹر کے کہنے پر مقبول حسین شاہ کو بگایا گیا تھا، اس نے اپنے دستخط  
کیے اور وہ سرسید فیروز خان کے نام پر اس نے خود دستخط کیے تھے  
یاد نہیں کریں نے کون سے دستخط کیے تھے، ایک ہی یاد ہے کہ



دونوں میں سے ایک میں نے رکھے۔

مسٹر سلیم، فیروز خاں کو کیوں نہیں بلایا گیا؟

گواہ : وہ مل نہیں سکا تھا۔

س : مقبول حسین کب آیا؟

ج : جس دن یہ نوٹ تیار کیے گئے اس کے تین چار دن بعد گجرات سے آیا تھا۔

س : اس دوران میں یہ مبینہ جعلی ڈاٹری کس کے پاس رہی؟

ج : پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس۔

مسٹر جسٹس رام لال : آپ کو کب واپس ملی؟

گواہ : زسٹ پندرہ دن کے بعد۔

چیف جسٹس : جب آپ کو پہلی دفعہ جعلی دستاویز بنانے کے لیے کہا گیا تو

کیا آپ نے پروٹسٹ کیا؟

گواہ : جی ہاں! میں نے پروٹسٹ کیا تھا، لیکن میرے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا

جس نے ایک دفعہ غلطی کی تھی تو اُسے معطل کر دیا گیا تھا۔

پوچھنے کا ارادہ

چیف جسٹس : کیا تم نے درخواست میں کہا تھا کہ میں جھوٹی شہادت دینا

نہیں چاہتا؟

گواہ : اگر میں لکھتا تو نہ معلوم مجھے کیا دھکے کھانے پڑتے، اور نہ معلوم



پولیس مجھ سے کیا ساؤک کرتی — اس مرحلے پر مسٹر سلیم نے ایک سوال دریافت کرنا چاہا، جس پر لدھارا رام نے کہا کہ میری ایک اور درخواست بھی ہے، میں تہیہ کیے ہوئے تھا کہ شہادت دینے کے بعد خودکشی کروں گا۔ اس کے لیے میں نے سنگھیا خریدی۔ آپ بدشک اس دوکان سے دریافت کر سکتے ہیں۔ میرے والد، میری والدہ اور گھر کے تمام آدمیوں کو اس کا علم ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میرے دل میں کیا تھا۔

مسٹر سلیم: یہ تو معمولی بات تھی کہ جھوٹی شہادت نہ دو اور خودکشی نہ کرو۔ گواہ: جی ہاں معمولی بات تھی لیکن مجھے پتہ تھا اگر وہاں آواز پہنچاتا تو اس عدالت میں بھی جہاں میری آواز نہ پہنچ رہی ہے پہنچ نہ سکتی۔ مسٹر جسٹس رام لال: یہ پوچھنا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر تمہارا ضمیر بیدار تھا تو تم نے یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا کہ سچ بولو گا؟ گواہ: ابھی لیے تو میں اس سچ بولنے پر مجبور ہوا ہوں۔

میاں عبدالعزیز: پوزیشن یہ ہے کہ اس وقت پر وٹسٹ نہیں کیا، کیوں کہ پیسٹ کا فکرنما۔ انٹو عدالت میں مشکل تھا، اس لیے عدالت بالا میں اسے سمٹت ہو گئی۔ ہے کہ سچ بولے۔

مسٹر سلیم نے گواہ سے ترحیم بادی دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس نوٹ بک میں جو آپ کے خیال میں سچ ہے کیا ہے اور تقریریں کے نوٹ بھی لکھے گئے؟ گواہ: جی ہاں۔



نشر منیم: پہلے ہی اس میں نوٹ تھے؟

گواہ: مجھے خیال نہیں۔

س: جب آپ کو یہ نوٹ ہیک دی گئی تو کیا آپ کو یہ خیال نہیں

ساتھ کچھ صفحے لکھے ہوئے تھے؟

ج: صفحے تھے جو پھاڑ دیے گئے اور یہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

س: مطلب یہ کہ جب آپ کو یہ نوٹ ہیک دی گئی اس وقت اس میں

شارٹ ہینڈ کے نوٹ تھے؟

ج: جی ہاں کچھ لکھا تھا۔

س: یہ نوٹ آپ نے لکھے تھے یا کسی اور نے؟

ج: میرے ہی تھے۔

س: کب پھاڑے گئے، آپ کا موجودگی پر۔

ج: جی ہاں۔

س: پھاڑنے کے بعد جو صفحے بچے کیا وہ خالی تھے؟

ج: جی ہاں۔

س: جو صفحے خالی بچے انہیں کیوں نہیں پھاڑا گیا؟

ج: انہیں پھاڑنے کی وجہ سے بدل سکتی، ان کی تاریخیں بہت پہلے کی تھیں،

اس کے بعد ہی گئی تھیں اور ان کے نوٹ لیکر بچے تھے کسی نوٹ لکھیں جن

چنگی تھیں۔

س: آپ نے یہ پھاڑا اور شاہ بخاری کے نوٹ اسی پر کیوں نہیں لکھے



نئی کاپی کیوں لی؟

ج: نئی کاپی اس لیے لائی گئی تھی کہ جعلی رپورٹ بنائی جاسکے گی۔

س: گویا یہ شبہ آپ کو تھا؟

ج: میرا بھی خیال تھا اور عام طور پر ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

س: اگر بات شک ہونے پر آپ نے کہا تھا کہ ایسا نہ کرو نئی کتاب لاؤ۔

ج: میں نے نہیں کہا تھا۔

س: گویا یہ خیال آپ نے دل میں رکھا؟

ج: نہیں۔

س: اس کا مطلب کیا ہوا؟

ج: خیال تھا کہ اس راز سے کیا ظاہر ہوتا ہے، اس سے جو بھی کاپی آئے

اسے مگالیا جاسکے۔

س: گویا وہاں بہت سی کاپیاں پڑی ہوتی تھیں؟

ج: کورٹ انپیکٹر کے پاس نہیں انگلش سٹینوگرافر کے پاس ہوتی ہیں۔

س: مگر آپ کورٹ انپیکٹر کے گھر گئے تھے وہاں کاپیاں پڑی ہوتی تھیں؟

ج: نہیں، وہاں ویسنگم، سٹینوگرافر کو بلایا گیا کہ ایک نوٹ بک لاؤ۔

س: کیا اسے بتایا گیا تھا کہ کیوں نوٹ بک لاؤ۔

ج: نہیں۔

س: گویا وہ ایک نوٹ بک لے آیا؟

ج: تین چار نوٹ بک لے آیا۔



س : کیا وہ خالی تھیں ؟

ج : کوئی خالی تھیں کئی لکھی ہوئی۔

س : کیا کوئی ایسی تھی جو بالکل خالی تھی، اور جس میں نوٹ لکھے ہوئے نہیں تھے ؟

ج : میں نے تین کاہیاں دیکھی تھیں۔ ایک کے متعلق پراسیکیوٹر نے انسپکٹر نے کہا کہ یہ موزوں ہے۔ میں نے دوسری کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

س : (نوٹ بک دکھا کر) کہاں سے کاغذ پھاڑ لیے گئے تھے ؟

ج : (دیکھ کر) شروع سے پھاڑ لیے گئے تھے۔

س : ایسے کس نے پھاڑ سے تھے ؟

ج : میں نے خود اس دن پھاڑ سے تھے۔

س : آپ کہتے ہیں کہ اس کتاب میں اور تقریروں کے نوٹ بھی ہیں وہ سبلی ہیں یا اصلی ؟

ج : ان میں اصل ساندی نہیں کی گئی۔

س : آپ نے کہا تھا کہ میری تین نوٹ بک تب آپ کے پاس پہنچا  
سولہ دن کے بعد آئی تو لاڈلک ہینڈ نوٹ لکھے تھے ؟

ج : جی ہاں۔

س : جو پلاگ کاغذ پر لاڈلک ہینڈ نوٹ لکھے تھے وہ بھی آپ کے حوالے  
کر دیے گئے ؟



ج : پہلے اسے پولیس اسٹیشن کو بھیجا گیا اور مجھے کہا گیا تھا کہ لالہ موسیٰ  
تھانہ سے لے آؤ، مجھے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے جانے کا حکم دیا تھا۔

س : آپ کو وہ لانگ ہینڈ نوٹ کب ملے؟

ج : مجھے تاریخ یاد نہیں۔

س : آپ کے پاس کتنے عرصے تک رہے؟

ج : یہی دو تین دن۔

س : اس کے بعد آپ نے کس کو دیکھا؟

ج : عبدالحمید بیٹو گرافر تھانہ گجرات کو۔

س : تاریخ یاد ہے؟

ج : نہیں۔

س : کیا اس دن عطاء اللہ شاہ بخاری کی پیشی تھی؟

ج : نہیں۔

س : آپ نے یہ نوٹ عبدالحمید کو دے دیے تو کیا پھر واپس لیے؟

ج : ہاں، میں نے واپس لیے، اور نقل تیار کر کے اسی دن انہیں

واپس دے دیا۔

س : تاریخ کیا تھی؟

ج : غالباً ۸ نومبر۔

س : آپ نے کس کے پاس انہیں دیکھا؟

ج : پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس، انہوں نے مجھے چند حصوں کو بھیج دیا۔



کہے دیا اور کہا کہ گواہوں کو یاد کراؤ۔  
 س : کیا وہ جتنے تم نے گواہوں کو پڑھ کر سنا ہے؟  
 ج : جس گواہ کے متعلق جو جو جتہ منتر تھا وہ اس کو لکھ دیا۔  
 س : کیا اس دن مقدمہ ملتوی ہو گیا تھا؟  
 ج : جی ہاں۔

س : کیا گواہوں نے کہا ہے کہ ہمیں ۱۱ نمبر کو بیان بتایا گیا تھا اور آپ  
 ۸ نمبر کہہ رہے ہیں؟

ج : مجھے پختہ یاد نہیں یہ تاریخ وہ تھی جب سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیل  
 میں آچکے تھے۔

س : تاریخ ملتوی رہنے کے بعد لانگ ہینڈ نوٹ کہاں گئے؟

ج : میں نے سینوگرافر عبدالحمید کو واپس کر دیا۔

س : کیا پھر کبھی اس سے واپس لیے؟

ج : نہیں، میں نے دوبارہ واپس نہیں لیے۔

س : کسی سے بھی نہیں؟

ج : نہیں۔

س : گویا اس کے بعد آج تک آپ نے کبھی ان لانگ ہینڈ نوٹوں کو

نہیں دیکھا؟

ج : جی ہاں دیکھا ہے۔

س : کب؟



ج : جب پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے کہا انہیں دوبارہ بنانا ہے، تاکہ جو جلی  
 دستخط بنائے ہوئے ہیں انہیں ٹھیک کیا جائے، کیونکہ شاید عطاء اللہ  
 شاہ بخاری جو کافی بااثر مولوی ہے، گواہ غلام حسین اور رولڈ سنگھ پر  
 دباؤ نہ ڈالیے، اس لیے ان دونوں کے دستخط کر دیے جائیں۔

س : تاریخ کیا تھی؟

ج : ۲۸ دسمبر تھی۔

س : کس طرح آپ کہتے ہیں کہ یہ ضرور ۲۸ دسمبر ہی تھی؟

ج : میرا خیال ہے کہ ۲۸ دسمبر ہی تھی۔

## گفتاری اور رہائی

کورٹ کا اجلاس ساڑھے تین بجے ختم ہونا تھا، اس وقت تین بج کر  
 ۲۵ منٹ ہو گئے تھے۔ آنریبل چیف جسٹس نے میاں عبدالعزیز دیکل صفائی  
 کو بتایا کہ لدھارام کی گفتاری کے دو بلا ضمانت وارنٹ آئے ہیں، اب سوال  
 یہ ہے کہ موجودہ مقدمے میں شہادت کے لئے ہمیں لدھارام کی ضرورت ہے  
 استغاثے کو بھی اور آپ کو بھی۔ یہ وارنٹ جن مقدمات کے سلسلے میں جاری کیے  
 گئے ہیں ان کا اس مقدمہ سے کوئی تعلق نہیں۔

میاں عبدالعزیز: مافی اللہ ڈیرری یہ درخواست ہے کہ جب تک لدھارام کا  
 بیان ختم نہ ہو جائے اسے پولیس کے حوالے نہ کیا جائے اس وقت راجی  
 میں اسے ضمانت پر رہا کیا جائے۔



چیف جسٹس: کیا یہ مناسب ہو گا کہ اسے جو ڈائٹنل حوالات میں بھیج دیا جائے۔  
 میاں عبدالعزیز: نہیں جناب۔ میری درخواست ہے کہ جیت تک اس کی  
 شہادت ختم نہیں ہوتی اسے ضمانت پر دیا گیا جائے۔  
 چیف جسٹس: یہ مقدمہ نہایت سخت ہے اور اس میں اس کی حاضری کی  
 ضرورت ہے۔

میاں عبدالعزیز: اس کے لیے زیادہ ضمانت لی جاسکتی ہے، اگر اس کا  
 یہاں کوئی ضمانتی ہوا تو ضمانت دے گا، پانچ دس ہزار جتنی چاہیں۔  
 مانگ لیں۔

چیف جسٹس: پانچ ہزار کی ضمانت طلب کی جاتی ہے۔

اس حکم پر لدھارام کو ڈاکٹر عبدالقوی لقمان ایم بی بی ایس کی پانچ ہزار  
 کی ضمانت پر دیا گیا اور مقدمہ کی کارروائی دوسرے دن پر ملتوی کر دی۔  
 مہر اپریل کو ملٹی کورٹ کے ڈویژن پنچھٹے استوائی کے چیف گواہ  
 لدھارام کو ناٹائل اعتبار گواہ قرآنہ سیتھ سٹے ۵ اپریل (۶۱۹۴۰) کو امیر شریعت کے  
 باعث بری کر دیا، اور لدھارام کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گجرات مسٹر سورا اللہ خان اور  
 چودھری نسیم لال مجسٹریٹ درجہ اول کی عدالت میں سے جاری شدہ وارنٹوں کی  
 بنا پر گرفتار کر لیا گیا۔

اس کارروائی کے بعد چیف جسٹس نے امیر شریعت سے براہ راست

سوال کیے،

سوال: کیا آپ نے ۲۸ جون کو لاہور میں کوئی تقریر کی؟



ایمپریٹریٹ : جی ہاں۔

سوال : کیا اس تقریر میں کہا تھا کہ مسلمانوں کی سلطنت اب نہیں رہی مسلمانوں کو چاہیے کہ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیں ؟

جواب : میں نے کہا تھا کہ ہندوستان کی حکومت مسلمانوں کے ہی ہاتھ سے گئی ہے ، لہذا اب مسلمانوں کو آزادی وطن میں حصہ لینا چاہیے۔

سوال : کیا آپ نے کہا تھا کہ ہماری بیٹیوں کے نکاحوں کے متعلق فیصلے یہ شیطان فرنگی کرتے ہیں اور شریعت کی کوئی پروا نہیں کرتے ؟

جواب : ایسے غیر شریکانہ الفاظ میں نے کبھی اپنی زبان سے استعمال نہیں کیے ہیں نے کہا تھا کہ وطن آزاد ہونے پر ہمارے مذہبی معاملات یعنی نکاح اور طلاق وغیرہ کے فیصلے بھی غیر مسلموں کی بجائے ہمارے مذہبی نقطہ نگاہ سے شریعت کے مطابق ہوں گے۔

سوال : کیا آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ موہن داس نے انگریزوں کی مقصدی چال میں آکر لکھ دیا ہے کہ اوزنگ زیب بارہ من جینورہ و زانہ اتا تھا۔

جواب : چونکہ یہ جلسہ کانگریس کا تھا اور میں کانگریس کے پلیٹ فارم سے بول رہا تھا لہذا ہندو مسلم اتحاد کے ضمن میں میں نے یہ کہا تھا کہ بعض مقصدیوں نے یہ غلط رنگ میں مشہور کر دیا ہے کہ اوزنگ زیب بارہ من جینورہ جیلا کرتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو وہلی کے قرب و جوار میں ایک ہی ہندو نظر نہ آتا۔ حالانکہ اس وقت بھی وہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور اب بھی ہے۔



سوال: کیا آپ نے کہا تھا کہ اگر آپ میرے ساتھ ہو جائیں تو میں حکومت کا تختہ الٹ دوں، اور ان انگریزوں کو ایسا دھکا دوں کہ سمندر سے باہر واپس نہ آسکیں؟

جواب: میں نے اپنی زندگی میں یہ الفاظ کبھی استعمال نہیں کیے اور نہ ہی میں نے یہ کہا کہ انگریزوں کو اس طرح قتل کر دو، جس طرح یزید نے حسین کی فوج کو قتل کیا۔ میں پچھلے تین سال سے عدم تشدد کا پرچار کر رہا ہوں، ہتھیاروں سے ڈھا کہ اور شملہ سے بمبئی تک میں نے کروڑوں انسانوں میں عدم تشدد کا پرچار کیا۔ میں عدم تشدد کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا ہوں۔ اس قسم کے لغو الفاظ میں نے کبھی استعمال نہیں کیے، اور نہ آئندہ زندگی میں کر سکتا ہوں۔ جہاں تک حسین اور یزید کا تعلق ہے، آپ کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں نے اپنے کو یزید کہا اور انگریزوں کو حسین، ایسا پرگز نہیں ہو سکتا۔ کوئی مسلمان اپنے آپ کو یزید نہیں کہہ سکتا۔ اس موقع پر حسینہ جیش نے میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ سے امیر شریعت کے مندرجہ بالا آخری فقرے کی وضاحت چاہی۔

میاں عبدالعزیز: شاہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ میں غیر اسلامی الفاظ کبھی استعمال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ الفاظ استعمال کر کے میں اپنے کو یزید اور انگریزوں کو حسین کہوں گا، نہ ہی میں بروا منت کر سکتا ہوں کہ کوئی مسلمان اپنے کو یزید کہے۔

جیش رام لال: (امیر شریعت سے) کیا اس کے سوا کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟



امیر شریعت انہیں کچھ نہیں کہتا چاہتا۔

مسٹر سلیم ایڈووکیٹ جنرل نے چیف جسٹس کی اجازت سے امیر شریعت سے  
مندرجہ ذیل سوالات کیے۔

”کیا آپ نے کہا تھا کہ وہ کون تھا کافر (غلام احمد)؟“

میاں عبدالعزیز: (مسٹر سلیم سے) مگر اس کا اس مقدمہ سے کیا تعلق؟  
جسٹس رام لال: مسٹر عبدالعزیز! آپ جانتے ہیں کہ لدھا رام کی شہادت کی کیا  
وقت ہے؟ (فقہیہ)

مسٹر سلیم نے اپنا سوال پھر دہرایا، جس پر چیف جسٹس نے امیر شریعت  
سے براہ راست سوال کیا:

”کیا آپ نے کہا تھا کہ وہ کافر ہے، جس نے انگریزوں کو پانچ صد  
گھوڑ سواروں سے مدد دی تھی، وہ کون ہے، غلام احمد؟ سوال  
یہ ہے کہ یہ کوئی تاریخی واقعہ ہے؟“

میاں عبدالعزیز: نہیں مائی لارڈ! یہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں۔

امیر شریعت: (چیف جسٹس سے) میں نے ہزاروں مرتبہ مرزا غلام احمد کو کافر  
کہا، کہتا ہوں اور کہتا ہوں گا۔ یہ میرا مذہب ہے۔ باقی مرزا غلام احمد کی  
اپنی کتابوں میں درج ہے، جس میں انہوں نے گورنمنٹ کو اپنی  
وفاداری کا یقین ان الفاظ میں دلایا تھا کہ ان کے دادا نے ۱۸۵۷ء  
میں پانچ سو سواروں سے گورنمنٹ کی مدد کی تھی! اس کے سوا میں  
کچھ نہیں کہہ سکتا۔“



## دوسرا مقدمہ

ہائی کورٹ کا فیصلہ سننے ہی ہجوم نے امیر شریعت زندہ باد والدھارام  
زندہ باد کے نعروں سے اس فیصلے کا استقبال کیا۔

لدھارام کو پولیس نے گرفتار کر لیا، اور امیر شریعت کو راولپنڈی میں زیر  
دوسرے مقدمہ ۱۲ اور ۱۵ کے لیے روک لیا گیا۔

(۳ جون ۱۹۳۹ء کو امیر شریعت نے نواں محلہ (راولپنڈی) میں ایک  
تقریر کی، جسے فرنگی قانون نے پسند نہ کیا اور انہیں ۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ضابطہ  
منظف گڑھ کی ایک گمنام بستی سے (ذیروندہ ۱۲۱) (تہ غیب قتل) ۱۲ الف (حکومت  
خلافت بغاوت) ۱۵۳ (ملک معظم کی حکومت کے دو فرقوں کے درمیان منافرت  
پھیلانا) گرفتار کر لیا گیا۔ یہ مقدمات منور ذی رسماعت تھے کہ لالہ موسیٰ میں مندرجہ  
مقدمات کی بنیاد ڈالی گئی، چنانچہ ۵ اپریل ۱۹۴۰ء کو جیسے ہی امیر شریعت  
ہائیکورٹ سے رہا ہوئے، دوسرے مقدمے کی بنیاد بھی حکومت کی ریتی دی  
نایت ہوئی، اور اس قدر جلدی کر گئی کہ قانون اپنی ساری قوت کے باوجود  
درویش سے مات کھا گیا۔

۳ جون ۱۹۴۰ء کو لاہور سشن جج کے جواب میں امیر شریعت نے کہا:  
"اس مقدمے کی حقیقت بھی وہی ہے جو مقدمہ گجرات کی  
تھی، جس میں ہائیکورٹ نے جھٹھے بڑی کیا۔ یعنی جس طرح ایک جعلی  
تقریر پیش کر کے گجرات میں مجھ پر مقدمہ بنایا گیا، اسی طرح جو



تقریر محترم عدالت میں پیش کی گئی ہے، وہ بھی اسی طرح گھٹا اور بڑھا کر میرے بعض جملوں کو خلاف ترتیب سے پیش کیا گیا ہے جس سے میری تقریر کا مقصد اور مفہوم ضائع ہو گیا، جو نیکی برباد گناہ لازم کے مصداق ہے۔

پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے قیام کے بعد یونینسٹوں اور حرار کے تعلقات کشیدہ رہے ہیں۔ ہماری یہ کوشش رہی کہ ہم بہتر حکومت قائم کریں، کینٹنمنٹ انتخابات کی صورت میں تمام پنجاب میں پھیل گئی، ہم نے یونینسٹ امیدواروں کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے کیئے اور انہوں نے ہمارے امیدواروں کو شکستینے کی کوشش کی، اس سلسلے میں میں نے اور میرے رفیقوں نے تمام اضلاع کا دورہ کیا۔ یکم، دو، تین جون کو پنڈی گھیب ضلع کیمپور میں کانفرنس ہوئی، جس میں میں شریک ہوا، اور میرے رفیقوں میں مولانا منظر علی انظر ایم، ایل اسے بھی شریک ہوئے، حسن اتفاق پیرلال بادشاہ آف مکھڑ کانفرنس میں شریک ہوئے اور ایک اجلاس کی انہوں نے صدارت بھی فرمائی۔ دوسرے اجلاس میں انہوں نے یونینسٹ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی جو با اتفاق پاس ہو گئی۔

کانفرنس میں تمام علاقے کے بڑے بڑے زمیندار، علماء، صوفیاء اور نوجوان شامل ہوئے۔ ۲ جون کو اڑھائی بجے کانفرنس ختم ہوئی۔ مولانا منظر علی انظر اور میں لاہور جاتے ہوئے راولپنڈی پہنچے، چونکہ



شہید گنج ایچی ٹیشن کے بعد میں نے راولپنڈی آنا جانا چھوڑ  
 دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام پنجاب میں سب سے زیادہ  
 مجلس احرار کی مخالفت اسی شہر میں ہوئی۔ میری رائے تھی کہ راولپنڈی  
 میں کوئی سیاسی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس ماحول میں بھی  
 چند دوست ایسے تھے جو ہماری رائے سے اتفاق کرتے تھے  
 اور ان کی خواہش تھی کہ میں یہاں راولپنڈی (تقریر کروں  
 میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ تقریر نہ کروں، لیکن جب  
 دوستوں کا اصرار بڑھا تو میں نے گھڑی سامنے رکھ کر ایک گھنٹہ  
 ۵۵ منٹ تقریر کی۔

میری تقریر کا مقصد صرف مجلس احرار پر سے ان الزامات کا  
 ہٹانا تھا، جو مسجدوں اور بازاروں میں عام جلسوں کے اندر  
 مجلس احرار پر لگائے جاتے تھے۔ مثلاً یہ کہ یہ لوگ کانگریس کے  
 ذریعہ خرید عمامہ ہیں اور ہندوؤں سے مل کر ہندوستان میں  
 ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہیں۔

ہماری جماعت میں علماء بھی ہیں، اور میں خود ۱۹۳۰ء  
 سے لے کر آتا آن جمعیتہ علماء۔ بے ہند کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر  
 ہوں۔ جب بازاروں میں علماء کے خلاف نعرے لگائے  
 جاتے تھے اور مولوی کا غلط مذہب "نامیہ" سالہ علامہ  
 عنایت اللہ مشرقی کا لکھا ہوا ٹکے ٹکے میں پکتا تھا۔



میں نے اپنی تقریر میں علماء کی صحیح روش ان کا  
 صحیح مذہب اور صحیح پالیسی کا بیان کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ  
 اس سلسلہ میں ۱۸۵۷ء سے لے کر اس وقت تک کی  
 عدم تشدد اور تشدد کی تاریخ میں نے بیان کی اور ثابت  
 کیا کہ صحیح مذہب اور پالیسی وہی ہے جس پر مجلس احوار  
 اور جمعیت علماء کا بندہ ہیں۔ چنانچہ ہم پر جو الزام تھا، کہ  
 ہم نے اپنے ضمیر کو بیچ کر اور کانگریس سے مل کر بجائے  
 اسلامی حکومت کے ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہیں،  
 میں نے یہ بیان کیا کہ ہمارے بزرگوں کا دماغ اس  
 خیال سے خالی نہیں کہ ہندوستان میں ایک دفعہ پھر  
 اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے  
 ہنگامے میں علماء شریک ہوئے اور ناکامی کے بعد کچھ  
 لوگ شہید ہوئے، اور ہزاروں انسانوں نے وطن عزیز  
 کے نیسے جانیں دیں، مغل شہزادوں کا خون بہایا گیا  
 ان مصیبتوں کے بعد بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، اور  
 اسلامی حکومت قائم کرنے کا خیال شکست کھا گیا۔  
 اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں علماء کی ایک جماعت  
 نے بھی ارادہ کیا کہ مسلم راج قائم کرنے کے لیے تحریک  
 شروع کی جائے اور اس میں بھی شکست کھائی۔



چنانچہ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ

دیوبندی مالٹا سے رہا ہو کر تشریف لائے۔ دہلی میں ملک کے

مختلف حصوں سے پانچ سو سے زائد علما، کا اجتماع ہوا اور

یہ طے پایا کہ تشدد کا راستہ غلط ہے اور موجودہ دور میں اسلامی

حکومت کا قیام تقریباً ناممکن ہے، لہذا کانگریس کے ساتھ

شامل ہو کر اور تمام قوموں سے مل کر ملک کو آزاد کرائیں، اور

جمہوری حکومت قائم کریں، چنانچہ اس وقت سے ہم (احرار)

اس عقیدے پر قائم ہیں، اور اسی راستے کو صحیح راستہ سمجھتے ہیں

عدالت عالیہ! یہ میری تقریر کا مفہوم تھا جو میں نے سرجون

کو راولپنڈی میں کی تھی“

عدالت کے ایک سوال پر امیر شریعت نے کہا :

میں نے کہا تھا، خواہ ہمیں قتل ہونا پڑے، تباہ ہونا

پڑے یا بچا لسی پر چڑھنا پڑے، ہم یہاں بھی اسی طرح

کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، جس طرح دوسرے صوبوں

میں حکومتیں قائم کر کے برطانوی اقتدار کو کم کیا گیا ہے۔

میرا بیس برس سے یہ سیاسی کردار ہے کہ جب بھی

مجھ پر حکومت نے مقدمہ بنایا، جو لفظ میں نے کہا اس کا

اقرار کیا۔ میں نے ایسی بات کبھی نہیں کہی جس پر مجھے بعد میں

افسوس ہوا اور اس کے لیے عدالت میں جھوٹ بول کر جان



بچانی پڑے۔ میں جھوٹ بول کر زندہ رہنا نہیں چاہتا۔“

اس مفصل اور تحسیری بیان کے بعد سشن جج لاہور مسٹر ڈی فالٹنا نے اپنے چار اکیسروں کی رائے کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے امیر شریعت کو، جون ۱۹۴۰ء کو باعزت طور پر بری کر دیا۔ نیز اسی روز شام کو لاہور ریڈیو پر امیر شریعت کی بریت کا بھی اعلان کیا گیا۔ اور دوسرے دن برلن ریڈیو کے انڈیکس نے کہا کہ

”ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے سب سے بڑے

بانگی مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو صوبے کی سب سے بڑی

عدالت نے بری کر دیا ہے۔“

نیوز جرنل شعبہ نشر و اشاعت نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تصاویر ہوائی جہاز کے ذریعے اپنے ملک میں تقسیم کیں۔

## رہائی کے بعد

یورپ میں دوسری بڑی لڑائی کے بادل اس تیزی سے برس رہے تھے کہ توپوں کے دھانوں سے نکلتی ہوئی آگ تہذیب یورپ پر مسکرا رہی تھی۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء میں قرار داد پاکستان کے بعد ہندو مسلمانوں کے درمیان سلگتی ہوئی آگ شعلے دینے لگی تھی، اور گذشتہ ربع صدی کی فرقہ وارانہ کشمکش فیصلے کے آخری موڑ پر پہنچ گئی تھی۔ انہی دنوں ملک کے انشور تذبذب کے نائن لینے عقل و خرد کے گوشوں میں بیٹھے تھے کہ امیر شریعت قریباً



نوماہ جیل خانے میں گزار کر رہا ہوئے۔

غیر ملکی قانون کے محافظ سر سکندر جیات خان کے دامِ تزویر کی تمام  
کرہاں ان خود نوٹ کر قانون کو شرمندہ کرنے لگیں۔ اقتدار نے اپنے منہ پر  
کئی ٹھانچے مارے، جس سے اُس کا اپنا چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ اور اپنے  
اس خون کی سرخیوں میں ڈوبتے ہوئے سُوج کی طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے  
غربت اب ہو گیا۔

امیرِ شریعت<sup>7</sup> مقدمات سے بری ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے  
والدِ محترم سے ملنے ناگہاں چلے گئے۔

ان دنوں امیرِ شریعت<sup>7</sup> انچاس سال کے پیٹھے میں تھے مصائب و  
آلام میں گزارے ہوئے برسوں نے دائرہ ہی اور سر کے بالوں میں سپیدی کو  
اس قدر تیزی سے جنم دیا کہ وہ قبل از وقت بوڑھے دکھائی دینے لگے۔ دوسرے  
قوائے جہانی بھی مشین کے پرزوں کی طرح ڈھیلے ہو چکے تھے۔ اندرونِ حجاز  
۱۹۳۵ء میں جس بیماری کا آغاز ہوا تھا، اُس کی جڑیں بدستور پھیلتی جا رہی تھیں  
اس طرح سے گھر کا سکون بھی میسر نہ تھا، اور اکثر جماعتی احباب کے چیلانوں  
میں جانے کے باعث جماعتی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی انہیں کے کندھوں پر  
آن پڑا تھا۔

دل اور دماغ جب باہم متصادم ہوں تو آدمی فکر کے ایسے دورِ اسے پر  
کھڑا ہوتا ہے، جہاں سے فرد کے تمام دروازے مسدود ہو جاتے ہیں اور  
جنون اپنا دامن شوق و اچھے ہر موڑ پر آدمی کا استقبال کرتا ہے، ایسے موقعے پر



آوارہ ذہن آدمی کا مقصد حیات سے بھٹک جانا بڑی بات نہیں لیکن امیر شریعتؒ نے ۱۹۲۱ء میں جس سفر کا قصد کیا تھا اور صعوبتوں کو دعوت دی تھی، ان سے وابستگی کی تمام کڑیوں کو اپنے ہاتھوں سے گرہ دیتے رہے۔

کئی دن والد صاحب کے ہاں ٹھہرے ان کی دعائیں لیں اور پھر تازہ دم ہو کر سفر پر چل دیے۔ حالانکہ ٹلکی حالات اور اہلیہ کی بیماری راستے روکتے رہے، لیکن وقت کا مسافر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔

## حضرت رائے پوریؒ سے وابستگی

دوسری جنگ عظیم کے باعث ہندوستان کے ہنگامی قوانین نے سیاسی کارکنوں کے محاسبے کو اس قدر تنگ کیا ہوا تھا کہ اپنے قدموں کی آواز پر بھی دشمنوں کا گمان ہوتا تھا، اور ہر قدم بھونک بھونک کر رکھنا پڑتا تھا، ایسے حالات میں امیر شریعتؒ نے لاہور پہنچ کر جماعتی کاموں کا جائزہ لیا اور ضروری احکامات دے کر اپنے مرشد حضرت مولانا عبدالقادر کی خدمت میں حاضری کے لیے رائے پور (ضلع سہارن پور) چلے گئے۔

(امیر شریعتؒ نے ۱۹۳۷ء کے دم توڑتے ہوئے دنوں میں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے ہاتھ پر لاہور میں مولانا عبداللہ فاروقی کے مکان پر بیعت کی تھی، اس سے پیشتر امیر شریعتؒ، سید پیر عمر علی شاہ صاحب گولڑوی کے دامن سے وابستہ تھے، ان کی وفات کے بعد ایک عرصہ اپنے روحانی پیشوا کی تلاش میں رہے اور اس غرض کے لیے میاں شیر محمد کی خدمت میں



شرق پورہ (شیخوپورہ) بھی گئے در ان سے عرض کیا۔

تو کہ کیمیا فروش نظر سے بقلب ماکن

حضرت میاں شیر محمد صاحب نے دو گھنٹہ مراقبہ کے بعد فرمایا :

”شاہ جی! آپ کوئی دوسرا گھر تلاش کریں، میرے امن

میں اتنی وسعت کہاں کہ آپ کو پناہ دے سکے“

واپسی پر میاں صاحب امیر شریعت کو اپنے جلو میں گاؤں کی آخری

سرحد تک چھوڑنے آئے۔

حضرت مولانا عبدالقادر مودع و صمدی سیدہ ضلع سرگودھا کے ایک ممتاز

دینی گھرانے میں پیدا ہوئے اور تکمیل علم کے بعد برصغیر کے مشہور روحانی

پیشوا حضرت شاہ عبدالرحیم (رحمۃ اللہ علیہ) کے آستانے سے وابستہ ہو گئے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز خلفاء میں سے تھے،

ان کا ظاہری اور باطنی علوم میں بہت بڑا مقام تھا، انہوں نے حضرت مولانا

عبدالقادر کی سعید روح کا جائزہ لے کر ان پر ایسی توجہ فرمائی کہ انہیں جذب و

سلوک کی تمام منزلیں طے کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ حضرت نے انہیں اپنا

خلیفہ منتخب کیا، اور پھر شیخ طریقت شاہ حضرت شاہ عبدالرحیم کے وصال کے بعد

حضرت عبدالقادر ان کے جانشین مقرر ہوئے، پھر ایسے فتافی شیخ ہوئے کہ اپنا

وطن ترک کر کے دم واپس سے کچھ دن پیشتر تک رائے پور میں قیام کیا، آخر

۱۶ اگست ۱۹۶۲ء کو لاہور میں اللہ کو پیاسے ہو گئے، انا للہ وانا الیہ اجعون،

امیر شریعت اور ان کے مرشد کے درمیان احترام کی ایک اونچی دیوار



حائل تھی۔ لیکن اس کے باوجود حضرت رائے پوری نے امیرِ شریعت سے محبت کا  
رشتہ اس قدر مضبوط استوار کر لیا تھا کہ پیرِ طریقت کے دل میں اپنے مُرد کیلئے  
بے پناہ لگاؤ تھا۔

کسی سیاسی یا مذہبی تحریک میں شامل ہونے یا شروع کرنے سے پیشتر  
اول اپنے ضمیر سے پھر پیرِ طریقت سے مشورہ کرتے۔ جب دونوں راہیں ہم آہنگ  
ہوتیں تو پھر نتائج سے بے نیاز ہو کر میدان میں نکل آتے۔

## قانون کی شکست

سیاسیات کی بادِ سموم کے باعث ہندوستان کی فضا نے اس قدر  
گرمی پیدا کر دی تھی کہ جس دل و دماغ میں احساس کی آگ جل رہی تھی، اُس  
کے لیے گوشہ تنہائی میں بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا، چنانچہ ان دنوں اتحادی اور  
محوری فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آراء تھیں، اقوامِ یورپ کی اس  
جنگ نے ایشیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کانگریس  
نے اس لڑائی کے خلاف انفرادی ستیہ گرہ شروع کیا، تو ہندوستان میں  
ڈیفنس رولز آف انڈیا ایسے ہنگامی قوانین کا نفاذ ہو چکا تھا۔ محبتِ وطن لوگ  
جیل خانوں میں مقفل کر دیے گئے۔

امیرِ شریعت نے انہی دنوں انگریزوں کے خلاف جلتے ہوئے دلوں کی بھٹیوں  
میں جذبات و نفرت کا ایندھن بھرا، وہ ہندوستان کے ہر کوچہ و بازار میں گئے  
اور لاکھوں انسانوں کے اجتماع سے خطاب کیا۔



پنجاب میں سرسکندر حیات خان کی فوجی حکومت برطانوی سامراج کے  
 دشمن سے لاہور ہائی کورٹ میں شکست کھا چکی تھی۔ قانون اپنی پوری گرفت  
 کے باوجود امیر شریعت تک نہ پہنچ سکا۔ لیکن امیر شریعت مجلس احرار کی جنگ  
 کے خلاف تحریک کی بڑی بے باکی اور چابکدستی سے سارے ہندوستان میں ہنمانی  
 کرتے رہے۔ حکومت کی پوری مشینری ان کے تعاقب میں رہی، امیر شریعت  
 اپنے رضا کاروں کو فوجی بھرتی کے خلاف سول نافرمانی پر اکساتے رہے۔ گاؤں  
 قصبات اور شہروں کے ہزاروں عوام اس تحریک کے تحت جیل خانوں میں گئے  
 ملتان اور مظفر گڑھ کا ضلع خصوصیت کے ساتھ اس تحریک بجاہ راست متاثر ہوا۔  
 جاپان جنگ میں شریک ہو چکا تھا اور دوسری طرف جرمن فوجیں جنرل  
 روئیل کی کمان میں سکندریہ کے ساحل تک بڑھ آئی تھیں، اسی میں ۱۹۴۲ء  
 کی عمر کا جام لبریز ہو چکا تھا اور ۱۹۴۳ء کی شمعوں نے آگے بڑھ کر اپنا اقتدار  
 قائم کر لیا تھا۔

اپنے ماضی کی طرح ہندوستان ان دنوں بھی سیاسی طور پر دو دھڑوں  
 میں منقسم تھا۔ رجعت پسند، انگریزی حکومت کے معاون تھے، اور انتہا پسند گروہ  
 اس موقع کو غنیمت جان کر غیر ملکی حکومت کے خلاف بغاوت کو اپنا دین سمجھتا تھا  
 چنانچہ اول الذکر گروہ فوجی بھرتی کے لیے گاؤں گاؤں گھوم پھر کر سادہ لوح عوام کو  
 انگریزی اقتدار کی بقاء کے لیے دوسری جنگ عظیم کی آگ میں بھونکنے کے لیے  
 خوبصورت وردی، بندوق اور مفت راشن کا لالچ دے کر بھرتی کر رہا تھا۔  
 والدین کو جب معلوم ہوتا کہ ہمارا لڑکا فوج میں بھرتی ہو گیا ہے تو وہ



پریشان ہو کر امیر شریعت کے پاس آتے، امیر شریعت پہلے تو انہیں سخت  
 مست کہتے، پھر ان سے مجلس احرار کے لیے پانچ روپے چنہ وصول کرتے  
 اور اُس کی رسید اُس لڑکے کے نام کاٹتے جو فوج میں بھرتی ہو کر ٹرننگ کیلئے  
 جا چکا تھا۔ ساتھ ہی جماعت کے طبع شدہ نام پر اس لڑکے کے نام حسب ذیل  
 خط لکھتے :

”عزیزم.....!“

سلام مسنون۔ تمہارا چنہ برائے مجلس احرار بڑی پابندی  
 سے پہنچ رہا ہے، شکریہ! اپنی جماعتی ذمہ داریوں کو خوب اچھی  
 طرح نبھانا، فوج کے اندر رہ کر جماعت نے جو ڈیوٹی تمہارے  
 سپرد کی ہے اُسے خیال سے انجام دینا۔

فقیر، عطاء اللہ شاہ بخاری

یہ خط جب فوجی افسروں کے پاس پہنچتا تو وہ متعلقہ لڑکے کو بلا کر دریافت

کرتے، ”تمہارا عطاء اللہ شاہ سے کیا تعلق ہے؟“

سو لجر: ”میں تو انہیں جانتا بھی نہیں صاحب!“

آفیسر: ”تم اُس کی جماعت کو چنہ بھی دیتے ہو؟“

سو لجر: ”نہیں صاحب!“

آفیسر: ”لیکن تمہارے نام اُس کا خط اور چنہ سے کی رسید کیسے آگئی؟ چلو

تمہیں فوج کی ملازمت سے علیحدہ کیا جاتا ہے؟“

گویا خط پہنچنے کے چوتھے روز بعد لڑکے اپنے گھر واپس پہنچ جاتا، اور گھر والے



امیر شریعت کو دعائیں دیتے۔ انگریز جوانوں کو مجاذ جنگ پر مصروف تھا امیر شریعت<sup>7</sup> کی ان حرکات سے چین بہ چسپ ہو، لیکن اندرون ملک وہ حالات سے مجبور تھا کہ اپنے کسی سیاسی حریف کو قانونی گرفت میں لیتا۔ اس طرح سے سینکڑوں نوجوانوں کو انگریز کی فوج سے نکالنے کا سہرا امیر شریعت کے سر ہے، اور یہ سلسلہ اختتام جنگ تک جاری رہا۔

## حکومت الہیہ

(سنہ ۱۹۴۷ء کی لاہور قرارداد کے بعد اقوام ہند کے خیالات نئے زاویوں سے دیکھے جانے لگے۔ ہندو کے جذبہ نفرت نے مسلمان کو اس سے متنفر کر دیا تھا، دلوں کی باتیں زبانوں پر آکر فضاؤں میں پھیل چکی تھیں، جس کے باعث ہر روز کے حالات نئے واقعات کو جنم دے رہے تھے۔ دوسری طرف جنگ عظیم کے متوقع نتائج کے پیش نظر غیر ملکی اقتدار کا زوال صاف دکھائی دے رہا تھا، ایسے میں احرار رہنماؤں کو یقین تھا کہ مستقبل قریب میں ہندوستان کے نقشے پر کوئی نیا سوریج طلوع ہوگا، اور ہو سکتا ہے کہ یہ سوریج اسلام کا سوریج ہو، برائی نیکی کی ضامن بن جائے، لہذا آنے والے کل کے لیے آج سے راستہ ہموار کرنا چاہیے۔ چنانچہ مئی ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا احرار ورکنگ کمیٹی نے سہارن پور میں سول نافرمانی کی قرارداد جو کہ ۱۹۴۲ء میں واپس لے لی گئی تھی، کی جگہ حکومت الہیہ کی قرارداد منظور کی۔ نیز فیصلہ کیا کہ مجلس احرار ہندوستان کے موجودہ فرقہ دارانہ فیصلوں سے الگ رہے گی اور ہندوستان کے آئین میں اگر



کوئی تبدیلی آئی تو مسلمان اپنے لیے حکومتِ الہیہ کا نظام پسند کریں گے، کیونکہ  
اس سے پیشتر انگریز کا نعرہ تھا۔

”خلقتِ خدا کی، حکم بادشاہ (ملکِ معظم) کا،“

لیکن سہارن پور کی قرارداد کے بعد مجلسِ احرار کا نعرہ تھا۔

”خلقتِ خدا کی اور حکم بھی خدا کا!“

(إِنَّ أَوْلَىٰ حُكْمٍ إِلَّا لِلَّهِ)

ان دونوں نعروں کے درمیان خاصا ٹکراؤ رہا، مگر قانون شکنی کی نوبت نہ آئی۔

جماعت کی اس نئی قرارداد نے امیرِ شریعت کی ذمہ داریوں میں مزید

اضافہ کر دیا تھا۔

مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان ان دنوں زوروں پر تھا، ہندوستان کے  
مسلمانوں کی اکثریت اس کے حق میں تھی، لیکن امیرِ شریعت کی رائے مسلم لیگ کے  
نعرے متضاد تھی، وہ تقسیمِ ملک کے بعد کے نتائج کو اپنی بصیرت کی روشنی  
میں ناپسند کرتے تھے، چنانچہ اس کے خلاف وہ حکومتِ الہیہ کے حق میں  
عوام سے کہتے :-

”کسی زمین کو حاصل کرنے سے پیشتر اللہ کا نظام اپنے

دلوں پر قائم کریں۔ فرنگی کی ڈیڑھ سو سالہ غلامی سے جو دل زنگ آلود

ہو چکے ہیں، انہیں ایمان کی کسوٹی پر پرکھیں تاکہ کفر کے نظام

حکومت کی جو آلائشیں اس پر جم چکی ہیں وہ صاف ہو جائیں

اس کے علاوہ اگر آپ نے کوئی زمین حاصل کر لی، تو جو



۱ نظام آپ قائم کریں گے، وہ انسانوں کا بنا ہوا ہوگا جس کی ہر شق کفر کے آئین سے ماخذ ہوگی۔“

امیر شریعت نے انہیں خیالات کا اظہار سارے ہندوستان میں کروڑوں انسانوں کے اجتماعات میں کیا۔

حکومت الہیہ کی قرارداد سے ہندو اور انگریز کے بعد مسلم لیگ سے متعلق مسلمان بھی امیر شریعت سے اختلاف کرنے لگے۔ اگرچہ مجلس احمدیہ کا عسکری نظام ہندوستان کے اکثر صوبوں میں قائم تھا، تاہم مسلمانوں کی غالب اکثریت جو مطالبہ پاکستان کی حامی تھی۔ امیر شریعت کے عوامی جلسوں میں ہر جگہ اپنی ناراضگی کا اظہار کرتی، لیکن یہ مخالفین کی رائے کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتے۔

## مولانا گل شیر کی شہادت

فردیہ ویا تو ہیں، غصے اور انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے دونوں انجام سے بے خبر ہوتے ہیں۔

موضع ملہو والی ضلع کیمپور کے مشہور عالم دین مولانا گل شیر اپنے ضلع کی حدوں سے نکل کر میانوالی اور جہلم کے درے کناتے تک اپنی منفرد طرزِ خطابت، خلوص، جرات اور طبیعت کی سادگی کے باعث مسلمانوں کے دلوں پر راج کرتے تھے، وہ سیاسیات سے الگ تھلگ فقہ اسلامی کی وکالت کے لیے شب و روز غیر اسلامی ذمہ و رواج سے منع کرتے، غیر مسلموں سے لین دین میں مسلمان



خودتوں کو روکتے، گاؤں گاؤں پھر کر اپنے اس موقت کی وضاحت میں قرآن کریم

سنا تے۔ آزادی وطن کے ضمن میں کانگریس سے اتحاد پر مجالس احرار ایسی سیاسی جماعتوں

سے سخت متنفر تھے۔ اگر کہیں احرار رہنماؤں سے ڈبھیڑ ہو جاتی تو مولانا گل شیر

احرار رہنماؤں کو ایسا کہتے کہ انہیں اپنا پچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔

۱۹۳۸ء میں مولانا گل شیر حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔

واپسی پر ان کے طریق زندگی میں اس قدر انقلاب آیا کہ فوج محمدی کی

سٹیج پر مجلس احرار اور امیر شریعت کی بار بار تعریف ہونے لگی۔ اس تبدیلی سے

عوام کے لیے یہ بات ایک سوال بن گئی کہ ایسا ایسی کیسے ہو گیا؟ مگر مولانا

گل شیر نے یہ راز چھپائے رکھا۔ آخر ۱۹۳۹ء میں جب وہ مجلس احرار میں

شامل ہوئے تو مجلس احرار کے ایک اجلاس میں مولانا نے کہا:

"میں ہمیشہ سے امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ

شاہ بخاری اور ان کی جماعت کو ہندوؤں کی زبرد

سمجھتا تھا۔ اپنے اس عقیدے کے تحت میں نے

اپنے علاقے میں ان حضرات کی سخت مخالفت کی،

جہاں کہیں میرا بس چلا میں نے اس جماعت کے

پاؤں نہیں جمنے دیے، لیکن گذشتہ سال حج کے

موقعہ پر میں طواف کعبہ سے فارغ ہو کر نماز عصر

سے ذرا پہلے نیند میں تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا

جیسے رویا میں مجھ سے کوئی کہہ رہا ہے:

مولانا گل شیر کی اپنی رضا کارانہ غیر سیاسی تنظیم تھی۔



تم مجلس احمدیہ میں شامل ہو جاؤ۔ تم مجلس احمدیہ  
 میں شامل ہو جاؤ۔ تم مجلس احمدیہ میں شامل ہو جاؤ۔  
 اس فقرے کے مسلسل تکرار سے میری آنکھ کھل گئی،  
 اور میں نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ میں اس حکم پر ضرور  
 عمل کروں گا۔ الحمد للہ کہ اب میں اس مجاہد جماعت  
 کے ایک رضاکار کی حیثیت سے ہمیشہ حق کے لیے  
 کفر سے نبرد آزما رہوں گا۔

اسی سال مولانا گل شیر، امیر شریعت، مولانا حبیب الرحمن، قاضی احمد  
 اور خواجہ عبدالرحیم عاجز کو میانوالی کے ضلع میں اپنے ساتھ لے گئے۔ میانوالی  
 واپسی پر امیر شریعت نے مولانا گل شیر کا ہاتھ پکڑ کر لاہور کے ایک عظیم اجتماع میں  
 کہا: "آج میں اپنے نالاک ہونے کے لیے آیا ہوں۔"  
 فقط "جنا" میانوالی کے علاقے میں بہادر اور جرات مند پر بولا جاتا ہے یعنی  
 آج میں اپنے ہمراہ ایک اور بہادر کو لے کر آیا ہوں۔

ان دنوں ملک میں مجلس احمدیہ فوجی بھرتی کے خلاف تحریک چلا رہی تھی  
 مولانا گل شیر بھی گرفتار ہو کر جیل چلے گئے، وہاں ہو کر آٹے تو نواب آف کالاباغ  
 کی اپنی رعایا سے ٹکڑے ہو چکی تھی، مولانا نے وہاں کے غریب عوام کا ساتھ دیا،  
 اور اس تحریک کو سارے پنجاب میں پروا دی۔

مولانا گل شیر کی مقبولیت اب پنجاب کے قصبوں تک پہنچ چکی تھی  
 شہرت کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی جرائم میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کیمپس اور







اپنی کھوج میں کیوں ناکام رہا؟ میانوالی کی زمین کے ذرات اس راز ہائے  
درون پر وہ کو کب چاک کریں گے؟

قریب آئے ہیں یاد روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر

جو چپ رہے گی زبانِ نجر لہو پیکار سے گا آستیں کا

اس حادثہ جانگاہ کے بعد امیر شریعت اپنا مجوزہ پروگرام ملتوی کر کے کمپبل پورہ اور  
میانوالی کے سفر پر روانہ ہو گئے، جہاں انہوں نے وہی باتیں کہیں، جو مولانا  
گل شیر کے قتل کا باعث بنی تھیں۔

## تحریک پاکستان

ہٹلر کی فوجیں جیسے جیسے برطانوی سلطنت کا سورج غروب کرتی ہوئی  
آگے بڑھتی گئیں۔ ایشیا کی سیاست اسی قدر متاثر ہوتی گئی۔ مجلس احرار ان  
دنوں کانگریس اور مسلم لیگ کے تصادم سے بالآخر کہ اپنی پالیسی پر گامزن تھی۔  
ہندوستان کے مسلمان دو دھڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مطالبہ پاکستان زور  
پکڑتا جا رہا تھا، سرکاری دفاتروں میں ہندو کی تنگ نظری نے کلرک قسم کے  
مسلمان کو بھی مسلم لیگ کا ممبر بنا دیا تھا۔ کانگریس پر قابض فرقہ پرست ہندو نے  
نیشنلسٹ مسلمان کو بھی کانگریس سے جلیحدگی پر مجبور کر دیا تھا۔ دوسری طرف  
مسلم لیگ میں رحبت پسند اور تن آسان لوگوں کے ہجوم نے پاکستان کا  
نعرہ کچھ اس انداز سے بلند کیا کہ متعینہ راہ پر چلتے ہوئے مسافروں کو بھی راستے  
کی لکیریں گڈنڈ نظر آنے لگیں۔



سال ۱۹۴۷ء کے آخری ایام برطانوی سلطنت اور غلام ہندوستان کے  
 ماہین کشمکش کے آخری اور انتہائی نازک دن تھے۔ متحدہ ہندوستان نے لیگ اور  
 کانگریس کے ٹکراؤ سے ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ایک نئی کروٹ لی، جبکہ بمبئی میں گاندھی  
 جناح ملاقات سے پاکستان کے نعرے میں نئی بہار آئی۔ مسلمان من جیتا القوم  
 مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے، لیکن امپیرٹریلیٹ یہ سب کچھ دیکھتے  
 اور سننے ہوئے بھی حکومت الہیہ کی وضاحت میں ایسے مصروف ہوئے  
 کہ انہوں نے مجلس احرار کی سہارن پور والی قرارداد کے دوسرے حصے پر  
 عمل کرتے ہوئے مسلم لیگ اور کانگریس کے جھگڑوں میں الجھنا غیر مناسب  
 سمجھا، اور اس طرح یہ سال بھی گزر گیا۔

نئے سال کے طلوع ہوتے ہی دوسری جنگ عظیم کے برستے ہوئے  
 بادلوں کے دامن خشک ہو رہے تھے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو امریکہ نے جاپان کے  
 ایک خوبصورت شہر ہیروشیما پر ایٹم بم دے مارا۔ جرمنی اس سے پیشتر اتحادیوں  
 کے سامنے سپر انداز ہو چکا تھا۔ اس طرح جنگ کے خاتمہ پر جہاں اور بہت سی  
 تبدیلیاں آئیں، وہاں لندن کی کنزرویٹو پارٹی نے ایکشن مار کر حکومت کا  
 چارج لیبر پارٹی کے سپر ونگر دیا۔ برطانیہ کی نئی حکمران پارٹی نے چونکہ اپنے  
 ووٹروں سے ہندوستان میں نئی تبدیلیوں کے عنوان پر ووٹ لیے تھے،  
 لہذا ہندوستان کو جلد سے جلد آزاد کرنے کے منصوبے بنانے شروع کیے۔  
 بعد از جنگ کے حالات نے باوجود بیکہ اتحادیوں کی فتح ہوئی تھی، برطانیہ کو  
 دنیا کی تیسرے درجہ کی طاقت بنا دیا تھا۔ ہندوستان کے سیاسی حالات بھی



برطانیہ کے حق میں نہیں تھے۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے مصلحت کا تقاضا تھا کہ برطانیہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہندوستانیوں کی رائے پر چھوڑ دے۔ چنانچہ ان دنوں برطانوی دانشوروں کے اکثر وفد ہندوستان آئے، جن میں کرپس مشن "خاص طور پر قابل ذکر ہے جس نے مسلم لیگ اور کانگریس راہنماؤں سے گفتگو کی۔

## قائد اعظم سے ملاقات کی خواہش

(عالمی سیاسیات میں برطانیہ کی پوزیشن ڈوبتے سُدوج کی طرح سہاگے تلاش کر رہی تھی۔ بدیں حالات یقین ہو چکا تھا کہ اب انگریز ہندوستان کو تقسیم کئے بغیر دم نہیں لے گا۔ چنانچہ امیر شریعت نے دہلی میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر محمد علی جناح (قائد اعظم) سے مخاطب ہو کر کہا:

"پاکستان کی تیئوری میرے بار بار سوچنے پر بھی سمجھ

میں نہیں آئی۔ میں جس قدر اس پر سوچتا ہوں اسی قدر خود ہی

کھو جانا ہوں۔ لیکن اگر آپ کہتے ہیں کہ مسلمان قوم اور خود

ہندوستان کی نجات بھی اسی میں ہے، تو اس سلسلے میں میرے

چند خدشات ہیں۔ اگر آپ مجھے ملاقات کا موقع دیں، اور

میرے خدشات دور کر دیں، تو پھر آپ آرام سے بمبئی بیٹھ

جائیں، میں آپ کے ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے حصول

پاکستان کے لیے ہندو اور انگریز دونوں سے نپٹ لوں گا۔



دیکھئے مسٹر جناح! یہ دس کروڑ مسلمان قوم کے مذہب اور ان کے مستقبل کی زندگی کا سوال ہے۔ یہ دس کروڑ عرب نہیں آئے، بلکہ اسی کفر گڑھ سے خواجہ معین الدین چشتی<sup>7</sup> (اجمیری) حضرت خواجہ مجدد الف ثانی سرمنہدی<sup>7</sup>، حضرت علی ہجویری<sup>7</sup> (داتا گنج بخش) حضرت نظام الدین اولیاء (دہلی) حضرت پیران کلیر<sup>7</sup> جیسے دلی، قطب، ابدال اور شب زندہ دار لوگوں نے اپنی ریاضت و عبادت سے راجپوتانہ ایسے کفر گڑھ میں بیٹھ کر انہیں مسلمان کیا تھا۔ اگر ہندو اور انگریز کی ملی بھگت سے ان دس کروڑ مسلمانوں کو کسی طرح کا نقصان پہنچا تو اس کی ذمہ داری

آپ پر ہوگی“

اسی مجمع میں آپ نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:  
 ”میں نے اپنی عمر کا ایک تہائی حصہ فرنگی سے لڑ کر اس کے جیل خانوں میں گزارا ہے۔ مگر جو بات ایک دفعہ سمجھ نہیں آگئی ہے پھر اس سے منہ نہیں موڑا، اور انگریز جیسی جاہر سلطنت کے سامنے کھڑے ہو کر وہی کچھ کہا جس سے میرا ضمیر مطمئن تھا۔ میں مسٹر جناح کا بے حد احترام کرتا ہوں، میری ان کی سیاسی لڑائی ہے ذاتی نہیں۔ آج میں آپ لوگوں کو گواہ کر کے یہ بات کہتا ہوں کہ اپنی بات سمجھنے کے لیے اگر شیخ مسٹر جناح کے قدموں پر اپنی یہ سفید دائرھی بھی رکھتی پڑی، تو خدا کی قسم میں اس سے گریز



نہیں کروں گا۔ لیکن بات سمجھے بغیر ان کی ہاں میں ہاں ملاسنے پر تیار

نہیں ہو سکتا۔ چاہے میری قوم میرے خلاف ہو جائے۔

اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار امیر شریعت نے قریباً سا سے

ہندوستان میں کیا۔ مگر قائد اعظم کی طرف سے کوئی جواب وصول نہ ہوا، تا آنکہ ملک

میں ۱۹۴۶ء کے نئے انتخابات کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ یہ ۱۹۴۵ء کے وسط کا

واقعہ ہے۔ دسمبر ۱۹۴۵ء کے آخر تک انتخابات کے نتیجے سامنے آئے تو مسلم لیگ

ہندوستان میں اتنی فی صد کامیاب رہی لیکن امیر شریعت کے خدشات بدستور

ذہن میں رہے، جن کا اظہار وہ کبھی کبھار نجی محفلوں میں بھی کرتے، لیکن اس اس پر

کہ شاید الیکشن سے فارغ ہو کر قائد اعظم انہیں بلائیں گے۔ بالآخر امیر شریعت کی

اس خواہش کو ٹھکرا دیا گیا۔

## دوسری قرارداد مجلس احرار

ہندوستان کے سیاسی حالات و واقعات دیکھتے ہوئے برطانیہ کی نئی

حکومت نے جس کے سربراہ مسٹر ایٹلی تھے۔ ۱۹ فروری ۱۹۴۶ء کو برطانوی پارلیمنٹ

میں اعلان کیا کہ کابینہ کے تین وزراء کا ایک وفد ہندوستان جا کر وہاں کی مختلف

سیاسی پارٹیوں سے گفتگو کرے گا۔ اس اعلان کے پیش نظر ہم ۲۵ مارچ

(۱۹۴۶ء) کو برطانوی وفد ہندوستان پہنچ گیا، جس کی قیادت وزیر ہند مسٹر لارڈ

ہیتھکاک کر رہے تھے۔ امیر شریعت نے جب یہ خبر اجراء میں پڑھی، تو

۲۵ مارچ کو لاہور پہنچ کر صوبہ مجلس احرار شیخ حسام الدین کے



مشورے سے ۲۷ مارچ کو لاہور مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیا۔ ممبران احرار ورکنگ کمیٹی سے پاکستان سے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کرنے کے بعد امیر شریعت نے حسب ذیل قرارداد پیش کی :

(الف) آل انڈیا مجلس احرار اسلام کی ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس

موجودہ اہم سیاسی مسائل کے متعلق ایک بار پھر اپنی پوزیشن واضح اور غیر مبہم طور پر ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

(ب) جہاں تک مسلم لیگ کے نظریہ پاکستان کا تعلق ہے

مجلس عاملہ کسی صورت میں بھی اس سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ ہم

تقسیم ہند کے نظریہ کا تجزیہ محض اقتصادی اور معاشرتی اصولوں

پر نہیں کرتے، پاکستان کے قبول کرنے کا مطلب ملت اسلامیہ

ہندوستان میں منتشر کرنا ہوگا۔ پنجاب (کانا مکمل صوبہ)

سرحد، سندھ اور بلوچستان ہندوستان کے ایک سرے پر

اور بالکل دوسرے سرے پر مشرقی بنگال اور آسام کے کچھ اضلاع کو

پاکستان بنایا جا رہا ہے۔

ملت اسلامیہ ان دو حصوں میں بٹ کر نہیں رہے گی، بلکہ

اس سے ایک قابل قدر حصے پر ہندوستان میں دوامی غلامی مسلط

رہے گی، ان دو پاکستانی ریاستوں میں مؤثر غیر مسلم اقلیت موجود

رہے گی۔ بین پاکستان کی یہ دونوں ریاستیں جغرافیائی اعتبار

سے ایک دوسرے کی کسی بیرونی حملے کے وقت امداد نہیں کر



سکیں گی، اور ان دو ریاستوں کے درمیان ہندوؤں کو دنیا کی  
 سب سے بڑی سلطنت سوئپ دی جائے گی جس میں مسلم اقلیت  
 کی پوزیشن حدودہ جو غیر مؤثر رہے گی۔

مزید یہاں اب مسٹر جناح نے نواب زادہ لیاقت علی خاں  
 کے نظریہ کو اپنا لیا ہے اور سکھوں کی علیحدہ سلطنت بنانے کا  
 حق تسلیم کر کے پنجاب میں جمناسے لے کر راوی بلکہ چناب تک کا  
 علاقہ مغربی پاکستان سے علیحدہ ہونا درست قرار دے دیا ہے۔  
 اس روش کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بنگال اور آسام کے صوبوں کی  
 بھی اسی طرح قطع و برید ہوگی جس سے مغربی پاکستان کی طرح  
 مشرقی پاکستان بھی پہلے سے زیادہ بے وقعت اور اقتصاداً لاجاز  
 سے بے حال ہو جائے گا۔

ان نفوس حقیقتوں کے بعد کوئی ذی شعور جماعت جو  
 مسلمانوں کے تحفظ حقوق کا دعویٰ کرتی ہے اس مہلک نظریہ  
 سے متفق نہیں ہو سکتی۔

مجلس عاظمہ اس حقیقت کا اعلان کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ  
 یہ تمام خلاف آئین و اخلاق سرگرمیاں اور حدود حق رائے دہندگی  
 مسلم لیگ کی وقتی کامیابی کی ضامن ہوئیں مسلم لیگ کی قیادت  
 مسلمانوں کو ایک منظم قوم اور بے ہنگام گروہ کی حیثیت دینا  
 چاہتی ہے۔ لہذا یہ اجلاس ایک بار پھر اعلان کرتا ہے کہ



۳ مسلم لیگ کی قیادت قطعی غیر اسلامی ہے۔ اس کا عمل آج تک  
 ملت اسلامیہ کے مفاد کے منافی رہا ہے۔ مرکزی اسمبلی اور  
 صوبائی اسمبلیوں میں اسلامی قوانین کی مخالفت اس کا مستقل  
 شعار ہے۔ اس لئے مسلمان سیاسی، مذہبی، تمدنی راہنمائی کی  
 توقع مسلم لیگ کی غیر اسلامی قیادت سے نہیں کر سکتے، اور  
 مسلم لیگ کے کسی فیصلے کو اسلامی ہند کا فیصلہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔  
 اپنی سے اس قرار داد کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے امیر شریعت نے کہا:  
 رفقاء محترم! گذشتہ سال کے وسط میں میں نے دہلی  
 ۱ میں پاکستان سے متعلق اپنے خدشات اور دہلی اطمینان کے لیے  
 جناح صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے پاکستان کی  
 تقیوری سمجھائیں۔ اگر ان کا نظریہ درست نکلا اور مجھے ذہنی اطمینان  
 ہوا تو میں انشاء اللہ حصول پاکستان کے لیے انگریز اور ہندو  
 دونوں سے ٹکرا جاؤں گا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ جناح صاحب نے  
 میری حقیر گزارش کو درخور اعتنائہ سمجھا۔ آج میں نے درکنگ کمیٹی  
 کے سامنے اپنے خدشات کا اظہار کر دیا ہے۔

۱ میں صرف آئینی سمجھوتے میں ہندوستان کی تجارت نہیں  
 سمجھتا، اور نہ ہی میرے نزدیک الیکشن کی ہار جیت ملک یا قوم  
 ۲ کے لیے نفع بخش ہو سکتی ہے۔ میں تو بس ہندوستان میں انگریزوں سے  
 ۱ ایک ایسی لڑائی دیکھنے اور لڑنے کا متمنی ہوں کہ جس میں گھربار تباہ



برباد کر کے پھانسیاں لگنے کا پروگرام ہو، بس یہی پروگرام آزادی  
 ہند کے مسئلے کو حل کر سکتا ہے۔ جماعت کو ایکشن نہیں لڑنا  
 چاہیئے تھا بلکہ کوئی اور ٹھوس پروگرام سامنے رکھ کر کام کرنا چاہیئے۔  
 پاکستان کے بارے میں گزشتہ سال سے میں نے

جس جگہ بھی تقریر کی، پاکستان کو مسلمانان ہندوستان کے لیے  
 ہلک بلکہ ہلاکت آفرین اور ہلاکت خیز بتایا ہے اور دلائل سے  
 یہ باتیں ثابت کی ہیں۔ میری سمجھ میں پاکستان کے حق میں کوئی دلیل  
 بھی تو نہیں آئی۔ اس وقت قوم کی زندگی اور موت کا سوال ہے  
 میں نہیں کہتا کہ میری رائے مان لی جائے، سب کو یہی اس پر  
 ٹھنڈے دل سے غور سے کرنا چاہیئے۔ اگر کسی کے پاس میرے  
 دلائل کے خلاف کوئی واضح اور ٹھوس دلائل ہوں تو مجھے اپنی

تجویز پر اب بھی ضد نہیں ہے۔“

امیر شریعت کی اس تقریر کے بعد ورکنگ کمیٹی نے جمعیت العلماء ہند کی  
 حسب ذیل سہارن پور والی قرارداد کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ منظور کر لیا۔  
 ”جمعیت العلماء ہند کے نزدیک تمام ہندوستان کے لیے  
 عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً یہ ضرورت مفید ہے کہ وہ  
 حسب ذیل نکات پر اتفاق کر لیں اور اس بنیاد پر حکومت  
 برطانیہ کے سامنے منفقہ مطالبہ پیش کریں :

(الف) ہمارا نصب العین آزادی کامل ہے۔



(ب) وطن کی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہوگا۔ مسلم کلچرل، تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے، جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

(ج) ہم ہندوستان میں کامل آزادی اور خود مختاری کے حامی ہیں، غیر محدود داخلی اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے، اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں، اور ان کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

(د) ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے، مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی مالک نوکروں و نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی غالب اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو، ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہ ہوگی یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصولوں پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی و تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔

۱: مرکزی ممبروں کی تعداد کا یہ تناسب ہو، ہندو ۴۵، مسلمان ۴۵، اور دیگر اقلیتیں ۱۰۔

۲: مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی



۱  
۱۲ اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت پر مخلصانہ اثر اندازہ قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش ہو تو پاس نہ ہو سکے گی۔

۱۳ : ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم و غیر مسلم جموں کی تعداد مساوی ہو، اور جس کے جموں کا نقرہ مسلم و غیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے۔

۱۴ یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے اختلافات کا آخری فیصلہ کرے گا۔ نیز تجویز نمبر ۲ کے تحت اگر کسی بل کے مسلمانوں کے خلاف ہونے، نہ ہونے میں مرکزی اکثریت مسلم ارکان کی ۱۲ اکثریت کے فیصلے سے اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ سے کرایا جائے گا۔

۱۵ : محکمہ قضا کا قیام

۱۶ : ہندوستانی فوج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی نمائندگی ہوگی۔ تاکہ کسی قوم کی زیادہ نیابت دوسری قوم کیلئے خوف و ہراس کا باعث نہ رہے۔

۱۷ : مرکز کی طرف سے پسماندہ صوبوں میں تعلیم و صنعت کے مستقل عطیہ جات۔



۷ : آئینوں کے لیے صوبوں میں ویٹو کا طریقہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

۸ : ہندوستان میں مختلف ملتوں کے کلچرل، زبان، مذہبی

تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی عقائد، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں، اوقاف آزاد ہوں گے۔ حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔

۹ : دستور اساسی میں اسلامی پرسنل لاء کی حفاظت

کے لیے خاص دفعہ رکھی جائے گی، جس میں تشریح ہوگی، کہ

مجالس قانون ساز اور حکومت کی جانب سے ان میں مداخلت

نہ کی جائے گی اور پرسنل لاء کی چیزیں مثلاً احکام نکاح، طلاق،

رجعت، عدت، خیار، بلوغ، تفریق زوجین، خلع منہن و

مفقود، نفقہ زوجیت، حضانت، ولایت، نکاح و مال

وصیت، وقف وراثت، تکفین و تدفین و قربانی وغیرہ،

۱۰ : مسلمانوں کے ایسے مقدمات کرنے کے لیے جن میں

مسلمان رکن کا فیصلہ ضروری ہے، مسلم تاضیوں کا تقرر کیا جائیگا۔

اور ان کو اختیارات تفویض کیے جائیں گے۔

مجلس احرار کی یہ تاریخی قرارداد دودھس نرائج کی حاصل تھی۔

وقتی اور خودی اثرات سے بے نیاز ہو کر اسرارہ ہنماؤں نے اپنی

وانسبت میں مسلمانان ہندوستان کے مستقبل کو ایسی قرار داد کے ذریعے

محفوظ سمجھا۔



## دہلی کا آخری اجلاس

ورکنگ کمیٹی کے اجلاس سے فارغ ہو کر حضرت امیر شریعتؒ اپنے رفقاء مولانا حبیب الرحمن، شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری کی معیت میں ۲۷ مارچ (۱۹۴۶ء) کو دہلی روانہ ہو گئے، جہاں انہوں نے مختلف الخیال رہنماؤں سے بات چیت کی۔

ان دنوں دہلی میں برطانوی مشن مسلم لیگ اور کانگریسی رہنماؤں سے سیاسی مذاکرات میں مصروف تھا، ۳۰ مارچ کو جمعیت العلماء ہند کے رہنماؤں سے ان کی دعوت پر امیر شریعتؒ کی گفتگو ہوئی، جس میں مجلس احرار کی قرارداد کا بھی ذکر آیا۔ اور آخر میں جمعیت کے ناظم اعلیٰ مولانا حفظ الرحمن سہاروی نے مجلس احرار کی قرارداد کو مسلمانان ہند کے لیے پسندیدہ قرار دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی انہی دنوں ملاقات ہوئی۔

۲۶ اپریل (۱۹۴۶ء) کو رات گیارہ بجے اردو پارک (دہلی) میں امیر شریعتؒ نے ایک کثیر اجتماع سے خطاب کیا۔ یہ آخری اجتماع ہے، اس کے بعد امیر شریعتؒ پھر کبھی دہلی نہیں جاسکے۔ اس اجتماع میں قریباً پانچ لاکھ انسانوں نے شرکت کی۔ چشم دہلی نے پیشتر ازیں اتنا بڑا اجتماع کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت مولانا حسین احمد مدنی نے کی، اور ایچ سیکرٹری کے فرائض شیخ حسام الدین نے انجام دیے، جب کہ عوام کے سنبھالنے کا انتظام احرار رضاکاروں کے ذمے تھا، اجتماع کے چاروں طرف احرار رضاکاروں کے



ذاتے مظاہر اجتماع کے چاروں طرف، احمد ادریش لالہ وگل کی سی بہاریں دکھائے ہیں  
 تھے۔ اسٹیج پر مولانا حبیب الرحمن، ماسٹر تاج الدین انصاری اور جمعیت العلمائے ہند  
 کے راہنما موجود تھے۔

اپانک انسانی سمندر میں ایک لہر اٹھی، ایک ارتعاش پیدا ہوا۔  
 یلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ شوق دیدتھیس کے لیے سرگردان ہوا کہ امیر شریعتؒ  
 نذر باد کے نعروں نے جلسے کے امن و سکون کی ساری طنائیں توڑ دیں۔  
 عوام اپنے محبوب راہنما کی زیارت کے لیے سر اپا نیاز اٹھ کھڑے ہوئے،  
 شاہجہان کی مسجد کے مینار اور لال قلعہ کی دیواریں جو دیدتھیں۔ آسمان ستاروں کی  
 روشنی میں دنیا کی اندھیر گدی میں روشن چراغوں کو آخری بار ٹٹھماتے دیکھ کر  
 مسکرا رہے تھے۔

امیر شریعتؒ پر تشریف لائے کہ ایک دوسرا قافلہ آن پہنچا۔ اس میں  
 برطانوی مشن سے سربراہ وزیر ہند لارڈ پٹیک لانس مولانا آزاد اور پنڈت  
 جواہر لال نہرو نمایاں تھے، اسٹیج اس وقت بین الاقوامی شخصیتوں سے بارونق تھا  
 ٹھیک بانہ بچے حضرت امیر شریعتؒ نے قرآن کریم کی تلاوت شروع کی،  
 الفاظ جیسے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ قرآن حکیم اپنے معانی و مطالب  
 آپ سے آپ واضح کرنا جانا حضرت امیر شریعتؒ کے گلے کی علاوت اور  
 طرز بیان سے ایسا محسوس ہوتا جیسے آیات خداوندی کا نزول ہو رہا ہو۔  
 لاکھوں انسانوں کے اجتماع میں ہو کا عالم اس خاموشی کو کبھی کبھار آسمان پر  
 ستاروں کی انگڑائیاں توڑ رہی تھی۔



”میں تو صرف بخاری صاحب کا قرآن سننے

کے لیے حاضر ہوا تھا، اب میں اجازت چاہتا

ہوں۔ برطانوی مشن کی آمد کے باعث میں زیادہ

مصروف ہوں۔“

یہ سختے پنڈت جو اہر لال نہرو کے الفاظ جو انہوں نے امیر شریعت

کے اختتام قرآن پر مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہے اور واپس چلے گئے

امیر شریعت نے انسانی سمندر کے بحر بیکراں پر ایک نظر ڈالی، اور خلاف معمول

خطبہ مسنونہ سے پہلے فرمایا:

”آپ حضرات درود شریف پڑھیں“

پھر فرمایا: ”درود شریف پڑھیں“ تیسری بار بھی عوام سے یہی مطالبہ کیا،

لوگ حیران تھے کہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا، آج یہ نئی رسم کیوں؟!

اس سوال کے جواب میں خود ہی امیر شریعت نے فرمایا:

”میں نے یہ حرکت اس لینے کی ہے کہ اتنے بڑے عظیم

اجتماع کی موجودگی کے باوجود صبح یا رات لوگ اخباروں میں کہیں گے

کہ رات عجم کو چار پارچے لاکھ کا تھا، مگر اس میں مسلمان کوئی نہیں تھا

اس لینے میں نے درود شریف پڑھوا لیا ہے تاکہ دوستوں کو

اندازہ ہو جائے کہ اس مجمع میں مسلمان ہیں یا یہ عجم مسلمانوں

کا ہے“

اس پر تمام مجمع کشت زعفران بن گیا



خطبہ مسنونہ کے بعد تقریر کرتے ہوئے حضرت امیر شریعت

نے کہا :-

”حضرات! مجھے آج کوئی تقریر نہیں کرنی، بلکہ چند حقائق ہیں،

جنہیں بلا تہید عرض کروں گا، اس وقت آئینی اور غیر آئینی دنیا میں

خواہ اس کا تعلق ایٹمیہ سے ہو یا یورپ سے جو بحث چل رہی ہے،

وہ یہ ہے کہ آیا ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت سے جدا کر کے برصغیر کو

دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، قطع نظر اس بحث کے مجھے پاکستان

بن جانے کا اسی قدر یقین ہے جتنا کہ اس بات پر کہ صبح سورج مشرق

سے طلوع ہونے والا ہے، لیکن یہ پاکستان وہ پاکستان نہیں ہوگا، جو

اس وقت کے دش کروڑ مسلمانان ہند کے ذہنوں میں موجود ہے، اور

ہیں کے لیے آپ بڑے خلوص سے کوشاں ہیں، ان مخلص نوجوانوں کو

کیا معلوم کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

بات جھگڑے کی نہیں، سمجھنے اور سمجھانے کی ہے! تحریک

پاکستان کی قیادت کرنے والوں کے قول و فعل میں بنیادی تضاد ہے!

اگر آج مجھے کوئی اس بات کا یقین دلا دے کہ کل کو ہندوستان کے

کسی قصبے کی کسی گلی میں شریعت اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے، تو

میں آج ہی اپنا سب کچھ چھوڑ کر آپ کے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہوں

لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ اپنی اڑھائی من کی

لاش اور چھ فٹ قد پر اسلامی قوانین نافذ نہیں کر سکتے، جن کا اٹھنا



بیٹھنا، جن کا سونا، جاگنا، جن کی وضع قطع، رہن سہن، بول چال،

لباس، غرض کوئی چیز اسلام کے مطابق نہ ہو، وہ ایک قطعہ زمین  
اسلامی قوانین کس طرح نافذ کریں گے؟

گلہاڑی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر امیر شریعت نے مشرقی اور مغربی پاکستان  
کے نقشے سمجھاتے ہوئے کہا:

"ادھر مغربی پاکستان ہو گا، ادھر مشرقی پاکستان، درمیان

چالیس کروڑ ہندو کی حکومت ہو گی۔ لالوں کی حکومت، لالے دولہ

والے، لالے ہاتھیوں والے، ہندو اپنی عیاری اور مکاری سے پاک

کو ہمیشہ تنگ کرے گا۔ اسے کمزور بنانے کی ہر کوشش ہو گی۔ آپ

درباؤں کے پانی روک دیے جائیں گے، آپ کی معیشت تباہ کر دی

کوشش کی جائے گی، اور آپ کی حالت یہ ہو گی کہ بوقت ضرورت

مشرق پاکستان، مغربی پاکستان کی اور مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان

کرنے سے قاصر ہوں گے۔ پاکستان پر چند خاندانوں کی حکومت ہو گی اور

یہ خاندان زمینداروں، صنعت کاروں کے خاندان ہوں گے، جو

من مانی کارروائیوں سے عوام اناس کو پریشان کر کے رکھ دیں

غریب کی زندگی اجیرن ہو جائے گی، امیر دن بدن امیر تر ہو جائیں گے،

اور غریب، غریب تر۔۔۔"

رات کافی بھیک چکی تھی، حضرت امیر شریعت اپنی سیاسی بصیرت اور سوچ

کے موتی بکیر رہے تھے مستقبل سے نا آشنا مسلمان منہ کھولے انجانے



ت سے سن رہا تھا۔ ہندو سے خطاب کرتے ہوئے امیر شریعت نے کہا:۔  
 "پاکستان کی بنیاد ہندو کی مسلمان دشمنی پر استوار ہوئی ہے  
 ۱ دولت سے پیار کرنے والے ہندو نے، گائے کی پوجا کی،  
 پیل مہاراج پر پھول چڑھائے، پھوٹیرا کے بلوں پر چاول  
 ۱ ڈالے، سانپ کو اپنا دیوتا مانا۔۔۔ لیکن مسلمان سے ہمیشہ  
 نفرت کی۔۔۔ اس کے سائے تک اپنا دامن بچائے رکھا،  
 پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ بڑے سے بڑے ہندو نے اچھوتوں  
 پر اپنے مدروں کے دروازے سے کھول دیے۔۔۔ لیکن مسلمان  
 سے اس قدر نفرت کی کہ اس کے لیے دل کے دروازے  
 کبھی وا نہ کیے۔۔۔ آج اسی نفرت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اپنا  
 ۱ الگ وطن مانگنے پر مجبور ہوا ہے۔۔۔ کانگریس یہ سب کچھ دیکھ کر  
 بھی مصلحتاً خاموش رہی، اگر کانگریسی رہنما، ہندو مہاسبھا۔ آر پی ایل  
 ۱۱ اور اسی قسم کی فرقہ دارانہ تحریکوں کو اپنے اثر سے ختم کر دیتے تو مسلم لیگ  
 کے پینے کی یہاں کوئی گنجائش نہ ہوتی، مگر میں کیا کروں، یہ  
 ۱ کوڑھ کانگریس کے اندر سے پھوٹا ہے۔ جو بیماری جسم کے اندر  
 سے پیدا ہو، اس کا علاج باہر کے اثرات کیسے کر سکتے ہیں۔  
 ۱ کانگریس نے ہمارے ساتھ بھی نباہ نہ کیا۔ اگر مسلم لیگ سے  
 بگاڑی تھی، تو نیشنلسٹ مسلمان کی بات ہی مان لی ہوتی۔ لیکن  
 آج اس قدر قربانیوں کے باوجود فرنگی کو اپنا ثالث مان رہے ہو۔



اسے کاش! ہم سے نہیں تو مسلم لیگ ہی سے بنائی ہوتی،  
تاکہ آپس میں بیٹھ کر کوئی معاملہ طے کر لیا جاتا۔

آخر میں امیر شریعت نے زور دار آواز میں کہا:

”مسلم لیگ اور کانگریس دونوں میری بات سنو اسے

اجاب جمع ہیں میسر در دہل کہہ لے

پھر التفاتِ دل دوستان رہے نہ رہے

یاور کھو! اگر تم باہم مل بیٹھ کر کوئی معاملہ طے کر لیتے تو الگ الگ

رہ کر بھی شیر و شکر رہتے، مگر تم نے فرنگی سے اپنا انصاف مانگا ہے

وہ تم دونوں کے درمیان کوئی نہ کوئی ایسا فساد ضرور پیدا کر

جائے گا کہ تم دونوں قیامت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتے!

آج تلواروں اور لالچوں سے لڑتے ہو، تو آنے والے کل کو

توپ اور بندوق سے لڑو گے۔ تمہاری اس نادانی سے

انسانیت کو جو نقصان ہوگا، عورت کی جو توہین ہوگی اور شرافت

حس برمی طرح برصغیر میں زخمی ہوگی، اس کے لیے تم دونوں مجرم

ہو گے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، سہ

اب تو جاتے ہیں میکے سے میر

پھر ملیں گے اگر خدا لایا!

امیر شریعت کی یہ تقریر قریباً ساڑھے پانچ گھنٹے جاری رہی، تا آنکہ شاہی

اذان کی آواز بلند ہوئی اور صبح کی نماز اسی پنڈال میں ادا کی گئی۔



## امیر شریعت کشمیر ہیں!

امیر شریعت ہندوستان کے تمام سیاسی رہنماؤں سے برصغیر کے حالات پر گفتگو میں مئی کے آخر تک مصروف رہے۔ حالات ان دنوں عاجلانہ طور پر آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر صبح کا سوچنے والے واقعات ڈھال رہا تھا۔ مجلس احرار کے رہنماؤں کی نگاہیں کانگریس، مسلم لیگ اور برطانوی مشن کی ایک ایک حرکت کو احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ آخر یہی بہتر سمجھا کہ مسلم حقوق کے معاملات میں کانگریس کے مقابل مسلم لیگ کو ذمہ داری سونپ دی جائے۔ اس فیصلہ کے بعد احرار رہنما وقتی طور پر گوشہ تنہائی میں خاموش جا بیٹھے۔

انہی دنوں امیر شریعت اپنے حرم محترم سمیت کشمیر چلے گئے اور سری نگر سے پندرہ میل دور سوپور نامی گاؤں میں خواجہ غلام محمد بٹ کے ذاتی مہمان ہوئے۔ امیر شریعت کی قیام گاہ لب ٹرک ایک اوسط دہجے کے دو منزلہ مکان پر تھی۔ ہندوستان کے ساتھ ساتھ کشمیر کے حالات بھی انقلاب کی ہنگامہ آرائیوں سے نبرد آزما تھے۔ سری نگر کے درمیان بہتا ہوا دریا سے جہلم کا پانی کشمیری حریت پسندوں کے خون سے نہ جانے کتنی بار اپنی رنگت تبدیل کر چکا تھا۔ ڈوگرہ شاہی سے نجات کے لیے کشمیری غلام اپنی آخری پونجی داؤ پر لگا چکا تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس کی سیاسی ضرورتیں یہاں بھی اپنا جادو چلا رہی تھیں۔ لیکن امیر شریعت سوپور میں رہ کر بھی واقعات و حالات سے اس قدر انجان رہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ امیر شریعت کشمیر میں ہیں۔ اس گمنامی کے باعث صبح سے شام اور



رات سے سویرا ہونے تک ذکر الہی میں مصروفینا رہتے، البتہ دن کے کسی حصے میں  
 میزبان کی دوکان پر آجھٹنے اور اخبارات پر ایک نظر ڈالتے، حالات سُغتے اور پھر  
 رہائش گاہ پر چلے جاتے۔ ان دنوں مولانا ابوالکلام آزاد بھی گلرگ (کشمیر) میں  
 قیام پذیر تھے۔ انہیں جب پتہ چلا کہ حضرت امیر شریعت سر سید نے گمبھ میں موجود ہیں تو  
 اس تہنّا کے ساتھ راقم کے توسط سے ملاقات کی خواہش کی۔

”شاہ جی سے کہنا، زندگی اور موت کے مابین اب کوئی فاصلہ نہیں رہا  
 حالات نے دونوں کو جس ڈگر پر ڈال دیا ہے، جانے اس سفر میں کس کی  
 جیت ہو؟ اس لیے بہتر ہے کہ وقت نکال کر مل جائیں۔“  
 گلرگ سے واپسی پر راقم نے امیر شریعت کو جب یہ پیغام دیا، تو  
 بے اختیار رونے لگ پڑے اور اس قدر روئے کہ دائرہ ہی آنسوؤں سے  
 بھیگ گئی۔

خیالات کی ہم آہنگی بھی کیا چیز ہے؟ برسوں کی رفاقت کے بعد ایک  
 منزل کے دو راہی وقت کے باجلائے فیصلے کے ہاتھوں جب بے بس ہوئے اور اپنے  
 ارادوں میں شکست نظر آنے لگی تو اپنی تہنّاؤں کی ساری عمارت اپنے آنسوؤں کی  
 نذر کر دی۔

## عبوری حکومت میں احرار کو شمولیت کی دعوت

ہندوستان کے سیاسی حالات بڑی تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہے تھے  
 برطانوی حکومت فیصلہ نہ کر سکتی تھی کہ ہندوستانیوں کو ان کے حقوق جلد سے جلد منتقل



کر دیے جائیں۔

کانگریس اور مسلم لیگ کے باہم عبوری حکومت میں مساوی نمائندگی کی بحث چل رہی تھی، کانگریس اپنے نمائندوں میں ایک مسلمان کو شامل کرنا چاہتی تھی لیکن مسلم لیگ غیر مسلم لیگی مسلمان کو نمائندہ ماننے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس بحث نے جب طول کھینچا تو بالآخر والسراٹے ہند لارڈ وول نے ۱۶ جون ۱۹۴۶ء کو بہر حال عبوری حکومت بنانے کا اعلان کر دیا۔

ذیقین میں بحث جاری تھی کہ اسی دوران کانگریس نے مجلس احرار کو بھی دعوت دی کہ وہ عبوری حکومت میں شامل ہو جائے۔

غالباً کانگریس کا منشا تھا کہ اگر مسلم لیگ کسی طرح بھی عبوری حکومت میں شامل ہونے کے لیے راضی نہ ہو تو مجلس احرار کو شامل کر لیا جائے۔ احرار راہنماؤں نے امیر شریعت کے مشورے سے جو ان دنوں کشمیر میں تھے کانگریس کی اس پیشکش کا جواب حسب ذیل دیا:

۱: ملک کی موجودہ حالت کے پیش نظر مجلس احرار یہ

ضروری سمجھتی ہے کہ کانگریس، مسلم لیگ سے باوجود وسیع اختلافات

کے کوئی ایسا عارضی سمجھوتہ کر لے جس پر مسلم لیگ کے نمائندے

عارضی حکومت میں شامل ہو کر کام کر سکیں تاکہ متحہ ہندوستان کی

جدوجہد آزادی کسی نہ کسی مرحلہ پر کامیاب ہو جائے۔

۲: اگر مسلم لیگ عارضی حکومت میں شامل ہونے کے

لیے کسی طرح بھی رضامند نہ ہو تو مجلس احرار اس شرط پر عارضی



حکومت میں اپنا نمائندہ وزیر بھینے کو تیار ہے کہ مجلس احرار کا  
نمائندہ مجلس احرار کی ہدایت کے مطابق کام کرے گا۔

۳: مجلس احرار کا نمائندہ اس کا پابند نہ ہوگا کہ وہ سیاسی

سمجھوتے یا عدم سمجھوتے کی بنا پر صرف کانگریس ہی کا ساتھ دے۔“

مولانا ابوالکلام آزاد نے مجلس احرار کی اس شرط کو جو کانگریس ہائی کمانڈ کی

دعوت کے جواب میں تھی، کانگریس ورکنگ کمیٹی میں پیش کیا۔ سردار پٹیل نے

اس مشروط پیش کش کی سخت مخالفت کی، بنا پر یہ مجلس احرار نے بلا شرط عارضی

حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

مسلم لیگی حلقوں میں اور خاص کر نواب زادہ لیاقت علی خان تک جب یہ

بات پہنچی تو انہوں نے احمد شاہ بخاری کے ذریعے شیخ نسام الدین کو جو ان دنوں

مجلس احرار کے صدر تھے، مبارکباد کا نام بھیجا کہ مجلس احرار نے ملک کے سیاسی

سمجھوتے کے بارے میں ایک صحیح قدم اٹھایا ہے۔“

## کشمیر سے واپسی

(قریباً تین ماہ کے بعد جب امیر شریعت کشمیر سے واپس آئے تو برطانوی

وفد حالات سے مات کھا کر واپس جا چکا تھا) لیکن ملک کے سیاستدان اپنی اپنی

بساط پر نئے مہرے چن رہے تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ اقتدار کی کشمکش میں

مصروف تھیں۔

غیر ملکی حکومت کا بھینتا ہوا چراغ دو دو محفل بنا ہوا تھا، ۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو



میرٹھ میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر سردار ولبھ بھائی پٹیل نے  
اپنی تقریر کے دوران کہا :

” آج ۱۹۳۲ء کے حالات نہیں ہیں، کانگریس پہلے سے

بہت زیادہ مضبوط ہے، وہ زیادہ توانائی اور آسانی سے اپنے

دشمنوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ موجودہ فرقہ وارانہ لڑائی اگر ختم نہ

ہوئی، تو ان لوگوں کو جن پر حملے کا خدشہ ہے میں کہوں گا کہ وہ تلوار  
سے اپنی حفاظت کریں۔ ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ خنڈوں سے

اپنی حفاظت کے لیے اپنے کو منظم کریں۔ پولیس اور فوج پر

انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ تلوار کا جواب تلوار ہے۔ میں لوگوں پر

زور دیتا ہوں کہ وہ حفاظت خود اختیار ہی کے لیے طاقت کا

استعمال کریں۔

میں عوام کو یہ مشورہ اس لیے دے رہا ہوں کہ مرکز

میں اس وقت کوئی گورنمنٹ نہیں، انتقالِ اختیارات کے

اس مرحلے میں حکومت مغلوج ہو چکی ہے۔“

سردار پٹیل کی یہ تقریر کانگریس کی آئندہ پالیسی کی آئینہ دار تھی۔ اخبارات کے

ذریعے جب یہ تقریر امیر شریعت تک پہنچی تو ان کے ذہن میں ہندو ارادوں کا سارا

نقشہ کھینچ گیا، وہ پارٹی سے مشورہ کے بعد متحدہ پنجاب کے اضلاع میں دورے سے

کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

پنجاب میں ان دنوں مندروں میں جن سنگھ اور کالی پارٹی ایک ساتھ



سامراجی کے طریقہ استعمال کی مشق کر رہی تھی۔ ہندو سکھ دہلیتے اور اکھاڑوں میں ورزش کرتے۔ ہندو محلوں کے سامنے آہنی دروازے لگا دیے گئے۔ اس طرح اندرون خانہ مسلمانوں سے مقابلے کی پوری تیاری ہو رہی تھی۔ دیوالیوں اور دستی بموں سے قریباً تمام ہندو محلوں کو مسلح کر دیا گیا تھا، لیکن جذباتی مسلمان جسے مسلم لیگ نے صرف نعروں سے لیس کیا تھا، آنے والے خطرناک ہندو منصوبوں سے نا آشنا تھا۔ مسلمان نے ہمیشہ جذبات کی رو میں سانس لی اور محض تدبیر کے سہارے تقدیر بنانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ قوموں کی تقدیر تدبیر سے نہیں شمشیر سے بنتی ہے۔ (امیر شریعت نے اس پر آشوب دور کو اپنی بالغ نظری سے بھانپ کر اقبال سے راولپنڈی تک کے مسلمان نوجوانوں سے کہا:

”عزیز من! وقت آ گیا ہے کہ اپنے تمام مذہبی اور سیاسی

اختلاف کو بھلا کر صرف اپنی آبرو بچانے کی تدبیریں سوچیں، ہمسایہ قومیں تمہارے مٹانے کی فن کر رہی ہیں۔ سیکھوں کے گوردوارے

ہندوؤں کے مندر جنگی قلعے بن گئے ہیں، سامانِ حرب سے لیس

ہمسایہ قومیں تمہارے خون کی پیاسی ہیں۔

میں نے گذشتہ تیس سال سے تمہیں ایک طرف انگریز

کے خلاف اکسایا، تو دوسری طرف اپنے بازو پر بھروسہ کرنے کا

سبق بھی دیا۔ عزیز من! تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے یہ بھی کہا تھا

کہ اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیتیں پیدا کرو! قومیں جب

قصاص لینے پر آتی ہیں تو لحاظ نہیں کرتیں، مگر تم نے میری



ایک نہیں سنی۔ آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔

سو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا

کئے جاؤ مے خوار و کام اپنا اپنا

یاد رکھنا اگر اب بھی تم نے فیصلہ کرنے میں ڈھیل کی تو دریائے

بیاس اور ستلج پانی کی بجائے تمہارے خون سے بہیں گے۔

جو کچھ میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں، دشمن جو منصوبے باندھ چکا ہے

خدا نہ کرے، اگر ایسا ہوا تو پھر مسلمانوں! تمہاری عزت و آبرو کا

خدا حافظ۔ وقت تمہیں مہلت نہیں دے گا۔ اٹھو! حالات

سے مقابلے کے لیے کفن بردوش ہو جاؤ۔ اپنے گھروں میں

جس قدر سامان حرب جیسا کیسا ہو جمع کرو، اور اپنی حفاظت

کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ۔ یہ میری آخری گزارش ہے، پھر خدا

جانے میں زندہ رہوں یا تم میں سے کوئی حالات کی نذر ہو جائے۔

یہ وقت زیادہ لمبی چوڑی تقریروں کا نہیں کہ میں تمہیں صبح تک

بٹھائے رکھوں، جاؤ اپنے اپنے گھروں میں جو کچھ میں نے کہا

ہے، اس کے لیے تیاری کرو۔“

(اس قسم کی تقریریں امیر شریعت نے پنجابی اور اردو زبان میں پنجاب کے

شہروں، قصبوں اور دیہاتی آبادیوں کے عام اجتماعوں میں کیں۔ اس کے ساتھ

وہ محلوں میں خفیہ اجلاس بلکہ مسلمان نوجوانوں کو حالات و واقعات سے آگاہ

کرتے۔ نیز مخیر حضرات کو اکسالتے کہ وہ صوبہ سرحد سے اسلحہ منگوا کر نوجوانوں میں



تقسیم کریں اور استعمال کی تربیت بھی سیکھیں، فوجی پیشروں کی خدمات حاصل کریں، تاکہ اسلحہ کے استعمال کی تربیت دے سکیں۔ جالندھر اور امرتسر جیسے مرکزی شہروں میں اسلحہ کی درآمد دسمبر ۱۹۴۶ء کے آخر تک جاری رہی۔ مجلس افسرار کے ذمہ دار کارکن اور با اعتبار مسلم لیگی اس اہم کام میں امیر شریعت کے معاون تھے۔

۱۹۴۶ء

۱۹۴۶ء میں سلطان حیدر علی والی ممبئی نے آزادی وطن کیلئے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جو جہاد شروع کیا تھا، ۱۹۴۶ء کا سال اس مہم کا آخری سال تھا۔ ایک سو اسی برس کی طویل جدوجہد کے دوران مجانب وطن کو غیر ملکی سامراج سے نبرد آزما ہونے میں جن سنگلاخ وادیوں سے گذرنا پڑا، تاریخ کا ایک ایک ورق اس خونچکان داستان کو مستقبل کی امانت سمجھ کر سمیٹ چکا ہے۔ برطانوی کابینہ کمیشن آج جن جیسے بہانوں سے پاک و ہند کے راہنماؤں کو اپنی بساط پر لیے بیٹھا ہے، یہ اس بگھنٹے ہوئے چراغ کی آڑی لوسے جس نے ۱۸۰ سال برصغیر پاک و ہند میں روشن رہ کر دلوں میں ایسی اندھیر گروی مچا دی کہ نہ اس ملک کا تمدن ہی اپنا رہا اور نہ اخلاق!

پاک و ہند کی از سر نو دیوار میں تعمیر ہونے کا یقین بچتا ہو چکا تھا (ہندوستان کی تمام قومیں اپنے حقوق کی نگہداشت میں چوکس نظر آ رہی تھیں۔ سکھوں کے لیڈر گیانی کرتا سنگھ نے اس انفرافری میں ۱۳ جنوری ۱۹۴۷ء کو ایک پریس بیان میں اعلان کیا:۔



"وزارتی مشن کی سکیم کے مطابق جلد ہی گروپ اسمبلیاں قائم ہو رہی ہیں۔ ان اسمبلیوں میں مسلم لیگ کی اکثریت ہوگی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے گروپ بنا کر پاکستان کا اصول تسلیم کر لیا گیا ہے، ان حالات میں ہندو اور سکھوں کا مفاد اسی بات میں ہے کہ وہ اپنے لیے ایک الگ صوبے کا مطالبہ کریں۔"

پاک و ہند کے دوسرے سیاسی حلقوں کے علاوہ احرار حلقوں میں یہ بیان بڑی معنی خیز نظروں سے اڑھا گیا۔ سکھوں کے اس بیان سے تقسیم در تقسیم کا شبہ ہونے لگا۔ چنانچہ احرار نے ورکنگ کمیٹی کا فوری اجلاس طلب کیا۔ جس میں ۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو لاہور میں جنرل کونسل کا اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ہندوستان کے حالات روز و شب بد سے بدتر ہو رہے تھے۔ ملک میں فرقہ دارانہ فساد کی خبریں دلوں میں بٹی ہوئی آگ کو ہوا سے نہ ہی نکھیں۔ یہ خبریں لندن پہنچیں تو ایوان برطانیہ سے ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو ایک اعلان شائع ہوا۔

"جمہوری کابینہ میں کوئی سا فریق نہیں ہے اور کوئی سائبر ہے"

اس سے متعلق ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم خود (برطانیہ) جون ۱۹۴۷ء تک یعنی زیادہ سے زیادہ اٹھارہ ماہ کے اندر ہندوستان سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں سے رخصت ہوتے وقت حکومت کسی ایسے ادارے کے سپرد کر سکیں، جو کابینہ مشن پلان کے مطابق باہمی سمجھوتے سے قائم ہو۔"



برطانیہ کے اس اعلان نے حالات کو مزید پریشان کرنے میں کافی مدد دی۔

ان دنوں ہندوستان بے یار و مددگار تھا، نہ اس کا کوئی وارث اور نہ ہی اس پر کسی کا راج تھا۔ ۲ مارچ کو پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر خضر حیات ٹوانہ نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ ۳ مارچ کو ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی ہالی سے باہر کرپان کو بے نیام فضا میں لہراتے ہوئے اعلان کیا۔

”جو مانگے گا پاک تان! اس کو دے دیں گے قبرستان!“

تارا سنگھ کے ان الفاظ کی تائید ہندو رہنماؤں نے کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسی شام امرتسر میں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان خونریز فساد کی ابتدا ہوئی۔ حضرت امیر شریعتؒ اس وقت امرتسر میں موجود تھے۔ حالات کا رخ دیکھ کر محلے کے تمام نوجوانوں کو اپنے گھر میں جمع کیا اور انہیں اپنے گھروں کی حفاظت کے لیے تیار رہنے کی تلقین کی اور خود ان کے ساتھ تمام رات تلوار سے مسلح پہرہ دیتے رہے۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا اور رات بھر محلے داروں کی معیت میں گلوالی گیٹ سے باہر جس کے قریب ہی سکھوں کا مرکز تھا، پہرہ دار رہے، آخر ۴ مارچ کو امرتسر میں کریو لگا دیا گیا۔

## تقسیم پنجاب کی مخالفت

سکھوں کے ۳۱ جنوری والے اعلان کے بعد مجلس احرار اپنے اجلاس میں تقسیم پنجاب کی شدت سے مخالفت کر چکی تھی کہ ۱۹ مارچ کو لاہور بریڈلے ہال میں پنجاب سوشلسٹ پارٹی اور مجلس احرار کا مشترک اجلاس ہوا، جس میں حضرت امیر شریعتؒ نے تقسیم پنجاب کی مخالفت میں دو گھنٹے تک اپنے دلائل دیے اور اپنے



خبرداروں کا نام نہ لیا گیا، اور مسلم لیگ پر زور دیا کہ وہ پنجاب کی تقسیم کو کسی صورت میں نہیں منظور کرے، ورنہ مشرقی پنجاب کا مسلمان تباہ ہو جائے گا۔ آخر وہی ہوا، جس کا خدشہ تھا۔ پنجاب کے فسادات کی آڑ لے کر کانگریس نے اعلان کیا۔

”پنجاب اور بنگال کی تقسیم ناگزیر ہے۔“

ہندو مہا سبھا اس کے لیے پہلے سے تیار تھی، گو گاندھی جی نے اس اعلان کی مخالفت کی، لیکن واقعات اس قدر تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے کہ نہ حکومت رہتی تھی اور نہ لیگ، ورنہ بیچارہ ہو چکے تھے، ایسی افراتفری کے دور میں ۱۹۴۷ء کو لگاتار دو بار مجلس اجماع کی جنرل کونسل نے ایک ہزار سے زائد نمائندوں کی موجودگی میں سہ روزہ بحث کے بعد حسب ذیل تاریخی قرارداد منظور کی:

”پنجاب کے حالیہ فسادات میں وحشت و بے پرواہیت بڑھتی جا رہی ہے، آتش زدگی، قتل و خونریزی وغیرہ جرائم کا سیلاب ہے۔ یہ تباہ کن تیزی کے ساتھ بڑھنے لگا ہے اور جس باقاعدگی سے اس خانہ جنگی کو سزا دینے کے لیے صوبہ کے مقتدر اور ذمہ دار غیر مسلم افراد اور جماعتوں نے اس میں حصہ لیا۔ اس کی روشنی میں مجلس اجماع اسلام ہند کی یہ پختہ رائے ہے، کہ یہ اہم ترین صورت تمام برطانوی استعمار کے حالیہ اعلان کا نتیجہ ہے، جس میں قطعی طور پر ہندوستان کی تمام اقتدار کو منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور جس کے باوجود صوبہ کی



غیر مسلم اقلیتوں نے انتقالِ اختیارات سے پیشتر ہی جبر و تزویر  
 سے ایسی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جس سے ہم کو صوبے  
 کی اکثریت اپنے جائز اور آئینی حق کے استعمال سے قاصر  
 اور مجبور ہو کر رہ جائے، اور صوبے کا اقتدار آسانی کے ساتھ  
 غیر مسلم قسطنطنیہ قوتوں کے قبضہ و تصرف میں منتقل ہو سکے، چنانچہ  
 خضر و وزارت کے مستعفی ہونے کے فوراً بعد ڈاکٹر گوپی چند جھارگو  
 سردار پرتاپ سنگھ کیروں، مہر کانگریس ورکنگ کمیٹی، چودھری  
 کرشن گوپال دت، چودھری لہری سنگھ، سیٹھ سدرشن اور  
 مسٹریشپال خانہ پنجاب کانگریس کمیٹی جیسے کانگریسی رہنماؤں نے  
 قومیت متحدہ کے بلند بانگ دعویٰ کو پس پشت ڈال کر  
 ماسٹر تارا سنگھ اور گیانی کرنا سنگھ جیسے اکانی رہنماؤں سے گٹھ جوڑ  
 کیا، اور لنگر لنگوٹ کس کر یہ اعلان کرتے ہوئے نہ ٹرائے، کہ  
 ہم قومیت پر صوبہ میں مسلم اکثریت کو اس کے جائز حق سے محروم  
 رکھیں گے، خواہ اس سے صوبے کے امن اور انسانی جانوں کو  
 کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچے۔

واضح رہے کہ یہ صورتحال اضطراری نہیں بلکہ پہلے  
 سے طے شدہ سکیمنوں اور سازشوں کا بدیہی ردِ عمل ہے جس کا  
 علم ملک کو پہلے پہل اس وقت ہوا تھا، جب ماسٹر تارا سنگھ نے  
 گورنمنٹ ہند اور برطانوی حکومت کو تسلی دینے کے لیے رزنامہ



اُجیت کے کانفی و نمبر میں مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۴۵ء کو ایک  
 توضیحی مضمون اپنے نام سے چھپوایا تھا، اس سے ایک طرف تو  
 اسٹریٹ صاحب کا متنازعہ یہ تھا کہ اُن کی پارٹی کے متعلق انگریز  
 دشمنی کے الزامات کی تردید ہو جائے، اور ساتھ ہی ہندو  
 فسطائیت کو یقین دلایا جائے کہ اکالی سوراؤں نے ہزاروں  
 پیالہ کی امداد سے سکھوں کو بندو قوں وغیرہ سے مسلح کر لیا ہے،  
 تاکہ انگریز کے ملک چھوڑنے پر پنجاب سے مسلمانوں کو بھی زبردستی  
 بے دخل کر دیا جائے۔ دوسری طرف ہندو فسطائیت کے عزائم  
 کا ذمہ دارانہ اعلان اُس وقت ہوا جب میرٹھ کانگریس کے  
 مشترک پلیٹ فارم سے بہار، گڑھ مکتیشہ، کلکتہ اور نواکھلی کے  
 انسانی سوز فسادات کے سلسلے میں ایک طرف تو راشٹریہ  
 میوک سنگھ کی بہیمانہ کارروائیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے صدر  
 کانگریس نے عائد کردہ الزامات کو مذاق میں اُڑا دیا اور دوسری  
 طرف کانگریس کے نفس ناطق سردار پٹیل نے فسطائی گریج میں اعلان  
 کیا کہ مخالفین کو تلوار کا جواب تلوار سے دیا جائے گا جس کے بعد  
 ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اکالی  
 سیناؤں اور راشٹریہ سوادل کی تنظیم کا کام باقاعدگی سے ساتھ  
 شروع کر دیا گیا۔

(جلس عامہ کی رائے میں پنجاب کے حالیہ فسادات بھی



اسی غیر مسلم فسطائی سازش کا قدرتی نتیجہ ہیں، جس کا مقصد محض غیر مسلم  
 اقتدار کو بہر حال ملک پر تسلط و قابض کرنا ہے، خواہ اس کے حصول  
 کے لیے جنگ کے ہولناک سہلاب ہی سے گزرنا پڑھے۔ ظاہر ہے  
 کہ اس صورت حال کو کوئی بھی ذمہ دار جماعت جیسے ملک میں  
 آبرو منداناہ اور مصفاہ زندگی بسر کرنی ہو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔  
 مجلس احرار اسلام ہمیشہ سے ملت کی سر بلندی اور آزادی  
 وطن کی حاجی رہی ہے، اور اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی قربانی  
 اور آبرو منداناہ اشتراک و تعاون کی داعی چلی آئی ہے۔ اب جبکہ  
 حکومت کے انتقال اقتدار کے اعلان سے غیر مسلم فسطائی  
 قوتیں کانگریس کی مشترک وطنی روایات و پالیسی کو نظر انداز کرتے ہوئے  
 اس کے اندر اور باہر حصول اقتدار کے لیے سڑیاں طریقے پر  
 برسر کار نظر آتی ہیں۔ مجلس عالمہ تمام جماعتوں کو توجہ دلاتی ہے کہ  
 وہ اس نہایت نازک مرحلے پر سیاسی اختلافات کو نظر انداز  
 کرتے ہوئے مشترک دشمن کی جاہ خانہ سرگرمیوں کے مقابلے کے لیے  
 زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب ہوں، تاکہ ملت مسلمہ کے  
 ننگ و ناموس اور مستقبل کی حفاظت کی جاسکے۔

مجلس عالمہ کو اگرچہ پنجاب کے حالیہ فسادات میں انسانی  
 مال و جان کے اتلاف کا دلی رنج ہے، جس کی تلافی عرصہ تک نہیں  
 ہو سکتی۔ پھر بھی مجلس عالمہ ان مسلم و غیر مسلم افراد کا شکریہ ادا کرنا اپنا



فرض سمجھتی ہے جنہوں نے سفاکی اور بربریت کے اس دور میں  
 جب انسان انسانیت کے دائرے کو تار تار کر چکا تھا جتنی ہمسائیگی  
 اور انسانی اخلاق کو سر بلند رکھا اور خورتوں، بچوں اور ان کے  
 متعلقین کو پناہ دیں۔

(مجلسِ احرار اسلام کی مجلسِ عاملہ جملہ رضا کارانِ احرار اور  
 کارکنان و ہمدانِ احرار کو بھی مبارکباد دیتی ہے کہ انہوں نے  
 ہر جگہ امن کی بحالی اور مظلومین کی خدمت کے فرائض تابعدار  
 ہر قسم کے خطرات اور حوصلہ شکن واقعات کے باوجود جو انفرادی  
 کے ساتھ ادا کیا، اور مجلسِ توقع رکھتی ہے کہ اس نیک کام کو زیادہ  
 سے زیادہ تیزی کے ساتھ جاری رکھیں گے۔ اس کے ساتھ ہی  
 انہیں یہ بھی واضح کر دینا چاہتی ہے کہ ملتِ اسلامیہ ابھی تک  
 خطرے سے محفوظ نہیں ہوئی۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو  
 جیوشِ احرار کی تنظیم میں پیش از پیش سرگرمی کا اظہار کیا جائے، اور  
 اپنی اپنی جگہ دیگر اسلامی جماعتوں سے اشتراک و تعاون سے اس  
 نیک مقصد کے حصول کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ واضح  
 رہے کہ ابتلاؤں و آزمائشوں کے اس نازک ترین دور میں ملتِ  
 اسلامیہ کی حفاظت ہمارا اولین فرض ہے، جس کی بجا آوری کے لیے  
 سیاسی اختلافات بہر نوع سید راہ نہیں بننے چاہئیں۔)



## عطا اللہ شاہ شہید کر دیے گئے

ایک طرف برطانیہ ہندوستان کو آئین کے ذریعے اُس کے حقوق  
منفصل کر رہا تھا، تو دوسری طرف غیر آئینی سرگرمیاں اُس قدر تیز ہو چکی تھیں کہ  
انسان انسانیت سے ماوراء ہو کر ایسی حرکتوں پر اتر آیا تھا کہ خون انسانی کی  
ارزانی سے انسانیت کا دامن ہمیشہ کے لیے داغدار ہو کر رہ گیا۔ اس ہنگامی دور  
میں ڈاکٹر لارڈ ڈیول کی ناکامی کے بعد ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ مونتگومری نے  
بھارت و پاکستان اپنے ہمد سے کا چارج لیا، اور ساتھ ہی واقعات تیزی کے ساتھ  
آگے بڑھنے لگے۔

امیر قریبیت ان دنوں اپنے بال بچوں سمیت لاہور میں قیام پذیر تھے۔ مشرق  
پنجاب سے اُجمہ کر آئے واپس لوگوں کی خوں آشام داستانیں سن کر اس قدر پتھر دا  
ہو گئے تھے کہ تمام دن دفتر میں خاموش بیٹھے رہتے، نہ کسی سے بات کرتے،  
کوئی مشورہ دیتے۔

ہوا آدنی اپنے وجود میں خود ایک انجن تھا، جس کی مسکراہٹوں سے پہاڑ  
کھا جو بن بکھرتا رہا، جس کے ایک بول پر سینکڑوں خاموشیاں رقص کُناں تھیں  
انسان کے ہر گڑھے ہوئے چھلنے سے آج اسے پتھر کی تصویر بنا دیا تھا۔  
اپریل اور مئی کے مہینے اسی پر آشوب طریق سے گزرے کہ ۳۱  
۱۹۴۷ء کو متحدہ ہندوستان میں برطانیہ کے آخری نمائندے سے لارڈ مونتگومری نے  
لیگی اور کانگریس رہنماؤں کے مشورے پر حکومت برطانیہ کا وہ تاریخی اعلان



جس کی رو سے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، اور ساتھ ہی پنجاب اور  
 بنگال کی تقسیم پر بھی اپنی مہر ثبت کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں اور ہندوؤں  
 نے وہاں کی اقلیتی آبادی کا قتل عام شروع کر دیا۔ انہی دنوں ۳۱ اگست کو  
 امرتسر کے اہل حدیث رہنما مولوی ثناء اللہ کے لڑکے مولوی عطاء اللہ کو ہندوؤں  
 نے اپنے محلہ میں گولی مار کر شہید کر دیا، لیکن اخبارات میں یہ خبر چھپی، کہ سید  
 عطاء اللہ شاہ بخاری کو امرتسر میں شہید کر دیا گیا۔ اس خبر نے پنجاب اور سائے  
 متحدہ ہندوستان کو پریشان کر دیا۔ چنانچہ چنیوٹ کے ملک اللہ دتہ بلوچ نے  
 اس خبر کی تصدیق کے لیے اپنے ایک عزیز کو لاہور بھیجا۔ جیسے ہی اُس نے  
 شاہ جی کو دفتر میں سلامت پایا، وہ باغ باغ ہو گیا، اور اُس نے دوستوں کی  
 تسلی کے لیے امیر شریعت کے ہاتھ کی تحریر چاہی۔ آخر امیر شریعت نے بڑے  
 اصرار کے بعد ۳۰ اگست کو ملک اللہ دتہ کے نام حسب ذیل خط تحریر کیا:

لاہور۔ ۳۰ اگست ۱۹۴۷ء

عزیزان من نذر محمد و ملک اللہ دتہ!

السلام علیکم۔ میں اپنے اہل و عیال اور دوستوں سمیت خیریت  
 سے ہوں، مارچ کے مہینے سے لاہور میں ہوں۔ اب خان گڑھ  
 ضلع مظفر گڑھ میں نواب نصر اللہ خان کے یہاں چلا جاؤں گا۔  
 ارادہ کر لیا ہے۔

امرتسر بالکل تباہ ہو چکا ہے، اور آئندہ مسلمانوں کے  
 وہاں آباد ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس وقت ایک



لاکھ کے قریب مسلمان لاہور پہنچ چکا ہے، اور اب فیروز پور،  
ہشتیار پور وغیرہ کی آمد شروع ہو گئی ہے۔ مشرقی پنجاب کا مسلمان  
اس وقت تباہ ہو چکا ہے، باقی ہو رہا ہے۔

سکھ قوم کی تباہی کو انگریزوں کی اور ہندو کی تباہی حاصل  
ہے، اور وہ تباہی مچا رہی ہے۔ اور نہ جانے کب تک یہ  
سلسلہ باقی رہے۔

میرا ایک مکان خاک میں مل چکا ہے، دوسرا جس میں میں  
رہتا تھا، ابھی تک تو موجود ہے۔ میری زندگی کی ساری کہانی یہی  
میرنی کتابیں اور سامان زندگی وہیں ہے، اللہ کے حوالے ہے  
ابھی تک کوئی صورت سامان برآمد کرنے کی نظر نہیں آتی۔ پہلے  
بھی فقیروں نے کہا، سین اب سر چھپانے کی جگہ بھی نہیں ہے، دعا  
خیر سے یاد کریں۔ ملکی حالات اتنے خرابہ اور اتنے خطرناک اور  
ہیبت ناک ہیں کہ ان سطروں میں بیان نہیں ہو سکتے۔ میں  
انشاء اللہ تعالیٰ کل کراچی میل سے ملتان کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔  
زندگی رہی تو آئندہ ملاقات پر باتیں ہوں گی۔ والسلام  
دوستوں اور عزیزوں کو سلام و دعا۔

سید عطاء اللہ شاہ

مندرجہ بالا خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر شریعت تقسیم ملک کے بعد  
ہوتے والے واقعات سے کس قدر متاثر تھے۔ حالات نے انہیں اس حد تک



یقیناً القلب کر دیا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر آنسوؤں کی جھڑی بانڈھ دیتے۔ اپنے علمی اٹانے کے صالح ہونے کا تو انہیں زندگی بھر احساس رہا۔ جب کبھی علمی مسائل پر بکت پھرتی تو فوراً ان کا ذہن اپنی امرتس صالح ہو جانے والی لائبریری پر جانا اور ساتھ ہی سرد آہ بھر کر خاموش ہو جاتے۔

اچھی کتاب اور بہترین رفیق دور رواں میں کہاں ملتے ہیں۔ زندگی میں ان کا پچھڑ جانا موت سے زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ بشرطیکہ پہلو میں جتاس دل ہو۔  
۱۹۴۷ء کے انسائٹ سوز واقعات نے زندگی کی تمام عبادت کو اس بڑی طرح پریشان کیا کہ امیر شریعت جیسے خودوار انسان بھی دل و نظر پر تیلو نزدیکہ سکے۔

عورت کی عظمت بھی مذہب کے تقدس سے وابستہ ہے جب انسان نے مذہب کی دیواروں پر کھڑے ہو کر عورت کا نیلام شروع کر دیا، تو مذہب کی پاکیزگی کیوں محفوظ رہ سکتی ہے۔ سال ۱۹۴۷ء میں انسان نے اپنی ضرورت کے لیے جن نقشوں کو آدمی کے لہو سے خوبصورت بنا چاہا۔ انہیں نقشوں کی لکیروں پر سے انسان کے اپنے پھسلنے کا احتمال بھی تھا، ایسی ناپائیدار عمارت کی خوبصورتی نگاہوں کو ساکون تو دے سکتی ہے مگر دیوں کی تسلی نہیں کر سکتی۔

امیر شریعت جس نے زندگی بھر عظمت آدم کا احترام کیا تھا، جب وقت کے اس موڑ پر پہنچے، تو آپے سے باہر ہو کر کہہ اٹھے نہ

تو نے یہ کیا غنیمت کیا، جھم کو بھی رسوا کر دیا  
میں رہی تو ایک باز تھا سینہ کائنات میں



## خان گرہ میں قیام

مارچ سے جولائی ۱۹۴۷ء تک امیر شریعتؒ لاہور میں رہے اور اگست کے آخری ہفتے بچوں سمیت ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں خان گرہ چلے گئے۔ اس علاقے کے رئیس لواب زادہ نصر اللہ خان ان دنوں آل انڈیا مجلس احرار کے ناظم اعلیٰ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت کچھ وسعہ دکھایا ہے۔ امیر شریعتؒ کے بہیربان تھے۔ آسوں کے باغات جو اس ضلع کی خصوصیت ہیں۔ امیر شریعتؒ کے لیے اپنی تمام بہاریں لے کر حاضر تھے۔ گھر کا سامان سول، شب و روز خدام کی حاضری سنے گو امیر شریعتؒ سے اجنبیت چھین لی تھی، لیکن دل کا سکون یہاں بھی بیگانہ رہا۔ یہیں سے ۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو صدر مجلس احرار کے نام امیر شریعتؒ نے حسب ذیل تاریخی خط لکھا جس کی بنا پر مجلس احرار کی آئندہ پالیسی وضع کی گئی:

خان گرہ - ۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء

برادر محترم ماسٹر جی! السلام علیکم

طران کی میٹنگ میں حالات کی وجہ سے شریعتؒ ہوسکا، اس کے بعد بیماری آہستہ آہستہ بڑھتی گئی، اور آخر غالب آگئی، نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت نشست و برخاست بھی آسانی سے نہیں کر سکتا۔ تفصیل کیا لکھوں کیا گزری، پچھڑن اور مہینے ستمبر بیمار ہو گئے اور ایک وقت ایسا بھی آگیا کہ ہم عین سے تھوڑی دیر کے لیے



لاٹھ دھو بیٹھے، خیر! اللہ تعالیٰ نے کرم کیا، اب اس کی حالت  
 اچھی ہے، لیکن مہین بہت کمزور ہے اور بنجارہ میں مبتلا ہے۔ رات  
 ننھی ساگر سنت بنجارہ میں تھی۔

یہ ہے میرا مختصر سا حالی، اس وقت میں اپنے بچوں کی خدمت  
 کے قابل بھی نہیں اور گھر میں کوئی دوسرا شخص بھی نہیں جو پرستش  
 احوال کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی سہارا نہیں۔ - سبحنا اللہ  
 و نعم الوکیل۔

ملتان میں آپ کے اجلاس کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں  
 چند باتیں لکھ دیتا ہوں، اگر اجاب کو پسند ہوں تو بہتر ہے۔

۱: لیگ سے ہماری سیاسی کشمکش ختم ہو چکی اور الیکشن کے

ساتھ ہی ختم ہو چکی تھی۔ اس وقت لیگ قوت حاکم ہے مسلمانوں

نے اسے بنایا اور قبول کر لیا ہے۔ پاکستان نہ صرف مسلم لیگ کا

بلکہ کانگریس کا تقسیم پنجاب کے اضلاع کے ساتھ تسلیم کردہ معاملہ

ہے، جس پر حضور برطانیہ کی مہر ثبت ہے۔ اس میں صرف

مسلم لیگ کو ہدف ملامت بنانا آئین شرافت سے بعید ہے۔ اگر

اچھا کیا تو کانگریس اور لیگ دونوں نے، اگر بُرا کیا تو دونوں نے

اب پاکستان بن چکا اور تقسیم پنجاب کو کانگریس نے پیش کر کے

مسلمانوں سے پاکستان کی بہت بڑی قیمت ادا کرائی، اور گرا

رہی ہے۔ ابھی نہ جانے کب تک مسلمانوں کو سود در سود ادا کرنا



پڑھے گا۔

میری آخری رائے اب یہی ہے کہ ہر مسلمان کو پاکستان کی  
فلاح و بہبود کی راہیں سوچنی چاہئیں، اور اس کے لئے عملی قدم  
اٹھانا چاہیے۔ مجلس احرار کو ہر نہیک کام میں حکومت پاکستان کے  
ساتھ تعاون کرنا چاہیے، اور خلاف شرع کام سے اجتناب،  
اعلاح احوال کے لیے ایک دوسرے سے مل کر "المدین فیصلیہ"۔

پہلے پیرا پڑھا چاہیے۔ یہ ارشاد ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا۔  
۱۲ مجلس کا قیام و بقاء بہر حال ایک شرعی امر ہے، تسلیح  
اعتقاد صحیحہ اور تنقید رسومات قبیمہ، اعلائے کلمۃ الحق، اعلان و  
بیان ختم نبوت و اظہار فضائل صحابہ و اہل بیت رضوان اللہ  
علیہم اجمعین مجلس کے فرائض میں سے ہیں خصوصاً اس  
دورِ لادینی میں جنس انسانی کی تمام مشکلات کے لئے شریعت  
محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ہی بطور حل پیش کرنا ہمارا وہ فریضہ  
ہے کہ اگر ہمیں دار و درمن تک بھی رسائی ہو جائے تو الحمد للہ۔  
اس لئے مجلس کے قیام بقا کی بہر حال کوشش رہنی چاہیے۔  
اگر دوستوں کو یہ باتیں معقول و مدلل نظر آئیں، تو ان  
بنیادوں پر آئندہ زندگی کی عمارت استوار کریں، ورنہ جیسے اُن کی

۱۱  
۱۲  
۱۳  
۱۴  
۱۵  
۱۶  
۱۷  
۱۸  
۱۹  
۲۰  
۲۱  
۲۲  
۲۳  
۲۴  
۲۵  
۲۶  
۲۷  
۲۸  
۲۹  
۳۰  
۳۱  
۳۲  
۳۳  
۳۴  
۳۵  
۳۶  
۳۷  
۳۸  
۳۹  
۴۰  
۴۱  
۴۲  
۴۳  
۴۴  
۴۵  
۴۶  
۴۷  
۴۸  
۴۹  
۵۰  
۵۱  
۵۲  
۵۳  
۵۴  
۵۵  
۵۶  
۵۷  
۵۸  
۵۹  
۶۰  
۶۱  
۶۲  
۶۳  
۶۴  
۶۵  
۶۶  
۶۷  
۶۸  
۶۹  
۷۰  
۷۱  
۷۲  
۷۳  
۷۴  
۷۵  
۷۶  
۷۷  
۷۸  
۷۹  
۸۰  
۸۱  
۸۲  
۸۳  
۸۴  
۸۵  
۸۶  
۸۷  
۸۸  
۸۹  
۹۰  
۹۱  
۹۲  
۹۳  
۹۴  
۹۵  
۹۶  
۹۷  
۹۸  
۹۹  
۱۰۰  
۱۰۱  
۱۰۲  
۱۰۳  
۱۰۴  
۱۰۵  
۱۰۶  
۱۰۷  
۱۰۸  
۱۰۹  
۱۱۰  
۱۱۱  
۱۱۲  
۱۱۳  
۱۱۴  
۱۱۵  
۱۱۶  
۱۱۷  
۱۱۸  
۱۱۹  
۱۲۰  
۱۲۱  
۱۲۲  
۱۲۳  
۱۲۴  
۱۲۵  
۱۲۶  
۱۲۷  
۱۲۸  
۱۲۹  
۱۳۰  
۱۳۱  
۱۳۲  
۱۳۳  
۱۳۴  
۱۳۵  
۱۳۶  
۱۳۷  
۱۳۸  
۱۳۹  
۱۴۰  
۱۴۱  
۱۴۲  
۱۴۳  
۱۴۴  
۱۴۵  
۱۴۶  
۱۴۷  
۱۴۸  
۱۴۹  
۱۵۰  
۱۵۱  
۱۵۲  
۱۵۳  
۱۵۴  
۱۵۵  
۱۵۶  
۱۵۷  
۱۵۸  
۱۵۹  
۱۶۰  
۱۶۱  
۱۶۲  
۱۶۳  
۱۶۴  
۱۶۵  
۱۶۶  
۱۶۷  
۱۶۸  
۱۶۹  
۱۷۰  
۱۷۱  
۱۷۲  
۱۷۳  
۱۷۴  
۱۷۵  
۱۷۶  
۱۷۷  
۱۷۸  
۱۷۹  
۱۸۰  
۱۸۱  
۱۸۲  
۱۸۳  
۱۸۴  
۱۸۵  
۱۸۶  
۱۸۷  
۱۸۸  
۱۸۹  
۱۹۰  
۱۹۱  
۱۹۲  
۱۹۳  
۱۹۴  
۱۹۵  
۱۹۶  
۱۹۷  
۱۹۸  
۱۹۹  
۲۰۰  
۲۰۱  
۲۰۲  
۲۰۳  
۲۰۴  
۲۰۵  
۲۰۶  
۲۰۷  
۲۰۸  
۲۰۹  
۲۱۰  
۲۱۱  
۲۱۲  
۲۱۳  
۲۱۴  
۲۱۵  
۲۱۶  
۲۱۷  
۲۱۸  
۲۱۹  
۲۲۰  
۲۲۱  
۲۲۲  
۲۲۳  
۲۲۴  
۲۲۵  
۲۲۶  
۲۲۷  
۲۲۸  
۲۲۹  
۲۳۰  
۲۳۱  
۲۳۲  
۲۳۳  
۲۳۴  
۲۳۵  
۲۳۶  
۲۳۷  
۲۳۸  
۲۳۹  
۲۴۰  
۲۴۱  
۲۴۲  
۲۴۳  
۲۴۴  
۲۴۵  
۲۴۶  
۲۴۷  
۲۴۸  
۲۴۹  
۲۵۰  
۲۵۱  
۲۵۲  
۲۵۳  
۲۵۴  
۲۵۵  
۲۵۶  
۲۵۷  
۲۵۸  
۲۵۹  
۲۶۰  
۲۶۱  
۲۶۲  
۲۶۳  
۲۶۴  
۲۶۵  
۲۶۶  
۲۶۷  
۲۶۸  
۲۶۹  
۲۷۰  
۲۷۱  
۲۷۲  
۲۷۳  
۲۷۴  
۲۷۵  
۲۷۶  
۲۷۷  
۲۷۸  
۲۷۹  
۲۸۰  
۲۸۱  
۲۸۲  
۲۸۳  
۲۸۴  
۲۸۵  
۲۸۶  
۲۸۷  
۲۸۸  
۲۸۹  
۲۹۰  
۲۹۱  
۲۹۲  
۲۹۳  
۲۹۴  
۲۹۵  
۲۹۶  
۲۹۷  
۲۹۸  
۲۹۹  
۳۰۰  
۳۰۱  
۳۰۲  
۳۰۳  
۳۰۴  
۳۰۵  
۳۰۶  
۳۰۷  
۳۰۸  
۳۰۹  
۳۱۰  
۳۱۱  
۳۱۲  
۳۱۳  
۳۱۴  
۳۱۵  
۳۱۶  
۳۱۷  
۳۱۸  
۳۱۹  
۳۲۰  
۳۲۱  
۳۲۲  
۳۲۳  
۳۲۴  
۳۲۵  
۳۲۶  
۳۲۷  
۳۲۸  
۳۲۹  
۳۳۰  
۳۳۱  
۳۳۲  
۳۳۳  
۳۳۴  
۳۳۵  
۳۳۶  
۳۳۷  
۳۳۸  
۳۳۹  
۳۴۰  
۳۴۱  
۳۴۲  
۳۴۳  
۳۴۴  
۳۴۵  
۳۴۶  
۳۴۷  
۳۴۸  
۳۴۹  
۳۵۰  
۳۵۱  
۳۵۲  
۳۵۳  
۳۵۴  
۳۵۵  
۳۵۶  
۳۵۷  
۳۵۸  
۳۵۹  
۳۶۰  
۳۶۱  
۳۶۲  
۳۶۳  
۳۶۴  
۳۶۵  
۳۶۶  
۳۶۷  
۳۶۸  
۳۶۹  
۳۷۰  
۳۷۱  
۳۷۲  
۳۷۳  
۳۷۴  
۳۷۵  
۳۷۶  
۳۷۷  
۳۷۸  
۳۷۹  
۳۸۰  
۳۸۱  
۳۸۲  
۳۸۳  
۳۸۴  
۳۸۵  
۳۸۶  
۳۸۷  
۳۸۸  
۳۸۹  
۳۹۰  
۳۹۱  
۳۹۲  
۳۹۳  
۳۹۴  
۳۹۵  
۳۹۶  
۳۹۷  
۳۹۸  
۳۹۹  
۴۰۰  
۴۰۱  
۴۰۲  
۴۰۳  
۴۰۴  
۴۰۵  
۴۰۶  
۴۰۷  
۴۰۸  
۴۰۹  
۴۱۰  
۴۱۱  
۴۱۲  
۴۱۳  
۴۱۴  
۴۱۵  
۴۱۶  
۴۱۷  
۴۱۸  
۴۱۹  
۴۲۰  
۴۲۱  
۴۲۲  
۴۲۳  
۴۲۴  
۴۲۵  
۴۲۶  
۴۲۷  
۴۲۸  
۴۲۹  
۴۳۰  
۴۳۱  
۴۳۲  
۴۳۳  
۴۳۴  
۴۳۵  
۴۳۶  
۴۳۷  
۴۳۸  
۴۳۹  
۴۴۰  
۴۴۱  
۴۴۲  
۴۴۳  
۴۴۴  
۴۴۵  
۴۴۶  
۴۴۷  
۴۴۸  
۴۴۹  
۴۵۰  
۴۵۱  
۴۵۲  
۴۵۳  
۴۵۴  
۴۵۵  
۴۵۶  
۴۵۷  
۴۵۸  
۴۵۹  
۴۶۰  
۴۶۱  
۴۶۲  
۴۶۳  
۴۶۴  
۴۶۵  
۴۶۶  
۴۶۷  
۴۶۸  
۴۶۹  
۴۷۰  
۴۷۱  
۴۷۲  
۴۷۳  
۴۷۴  
۴۷۵  
۴۷۶  
۴۷۷  
۴۷۸  
۴۷۹  
۴۸۰  
۴۸۱  
۴۸۲  
۴۸۳  
۴۸۴  
۴۸۵  
۴۸۶  
۴۸۷  
۴۸۸  
۴۸۹  
۴۹۰  
۴۹۱  
۴۹۲  
۴۹۳  
۴۹۴  
۴۹۵  
۴۹۶  
۴۹۷  
۴۹۸  
۴۹۹  
۵۰۰  
۵۰۱  
۵۰۲  
۵۰۳  
۵۰۴  
۵۰۵  
۵۰۶  
۵۰۷  
۵۰۸  
۵۰۹  
۵۱۰  
۵۱۱  
۵۱۲  
۵۱۳  
۵۱۴  
۵۱۵  
۵۱۶  
۵۱۷  
۵۱۸  
۵۱۹  
۵۲۰  
۵۲۱  
۵۲۲  
۵۲۳  
۵۲۴  
۵۲۵  
۵۲۶  
۵۲۷  
۵۲۸  
۵۲۹  
۵۳۰  
۵۳۱  
۵۳۲  
۵۳۳  
۵۳۴  
۵۳۵  
۵۳۶  
۵۳۷  
۵۳۸  
۵۳۹  
۵۴۰  
۵۴۱  
۵۴۲  
۵۴۳  
۵۴۴  
۵۴۵  
۵۴۶  
۵۴۷  
۵۴۸  
۵۴۹  
۵۵۰  
۵۵۱  
۵۵۲  
۵۵۳  
۵۵۴  
۵۵۵  
۵۵۶  
۵۵۷  
۵۵۸  
۵۵۹  
۵۶۰  
۵۶۱  
۵۶۲  
۵۶۳  
۵۶۴  
۵۶۵  
۵۶۶  
۵۶۷  
۵۶۸  
۵۶۹  
۵۷۰  
۵۷۱  
۵۷۲  
۵۷۳  
۵۷۴  
۵۷۵  
۵۷۶  
۵۷۷  
۵۷۸  
۵۷۹  
۵۸۰  
۵۸۱  
۵۸۲  
۵۸۳  
۵۸۴  
۵۸۵  
۵۸۶  
۵۸۷  
۵۸۸  
۵۸۹  
۵۹۰  
۵۹۱  
۵۹۲  
۵۹۳  
۵۹۴  
۵۹۵  
۵۹۶  
۵۹۷  
۵۹۸  
۵۹۹  
۶۰۰  
۶۰۱  
۶۰۲  
۶۰۳  
۶۰۴  
۶۰۵  
۶۰۶  
۶۰۷  
۶۰۸  
۶۰۹  
۶۱۰  
۶۱۱  
۶۱۲  
۶۱۳  
۶۱۴  
۶۱۵  
۶۱۶  
۶۱۷  
۶۱۸  
۶۱۹  
۶۲۰  
۶۲۱  
۶۲۲  
۶۲۳  
۶۲۴  
۶۲۵  
۶۲۶  
۶۲۷  
۶۲۸  
۶۲۹  
۶۳۰  
۶۳۱  
۶۳۲  
۶۳۳  
۶۳۴  
۶۳۵  
۶۳۶  
۶۳۷  
۶۳۸  
۶۳۹  
۶۴۰  
۶۴۱  
۶۴۲  
۶۴۳  
۶۴۴  
۶۴۵  
۶۴۶  
۶۴۷  
۶۴۸  
۶۴۹  
۶۵۰  
۶۵۱  
۶۵۲  
۶۵۳  
۶۵۴  
۶۵۵  
۶۵۶  
۶۵۷  
۶۵۸  
۶۵۹  
۶۶۰  
۶۶۱  
۶۶۲  
۶۶۳  
۶۶۴  
۶۶۵  
۶۶۶  
۶۶۷  
۶۶۸  
۶۶۹  
۶۷۰  
۶۷۱  
۶۷۲  
۶۷۳  
۶۷۴  
۶۷۵  
۶۷۶  
۶۷۷  
۶۷۸  
۶۷۹  
۶۸۰  
۶۸۱  
۶۸۲  
۶۸۳  
۶۸۴  
۶۸۵  
۶۸۶  
۶۸۷  
۶۸۸  
۶۸۹  
۶۹۰  
۶۹۱  
۶۹۲  
۶۹۳  
۶۹۴  
۶۹۵  
۶۹۶  
۶۹۷  
۶۹۸  
۶۹۹  
۷۰۰  
۷۰۱  
۷۰۲  
۷۰۳  
۷۰۴  
۷۰۵  
۷۰۶  
۷۰۷  
۷۰۸  
۷۰۹  
۷۱۰  
۷۱۱  
۷۱۲  
۷۱۳  
۷۱۴  
۷۱۵  
۷۱۶  
۷۱۷  
۷۱۸  
۷۱۹  
۷۲۰  
۷۲۱  
۷۲۲  
۷۲۳  
۷۲۴  
۷۲۵  
۷۲۶  
۷۲۷  
۷۲۸  
۷۲۹  
۷۳۰  
۷۳۱  
۷۳۲  
۷۳۳  
۷۳۴  
۷۳۵  
۷۳۶  
۷۳۷  
۷۳۸  
۷۳۹  
۷۴۰  
۷۴۱  
۷۴۲  
۷۴۳  
۷۴۴  
۷۴۵  
۷۴۶  
۷۴۷  
۷۴۸  
۷۴۹  
۷۵۰  
۷۵۱  
۷۵۲  
۷۵۳  
۷۵۴  
۷۵۵  
۷۵۶  
۷۵۷  
۷۵۸  
۷۵۹  
۷۶۰  
۷۶۱  
۷۶۲  
۷۶۳  
۷۶۴  
۷۶۵  
۷۶۶  
۷۶۷  
۷۶۸  
۷۶۹  
۷۷۰  
۷۷۱  
۷۷۲  
۷۷۳  
۷۷۴  
۷۷۵  
۷۷۶  
۷۷۷  
۷۷۸  
۷۷۹  
۷۸۰  
۷۸۱  
۷۸۲  
۷۸۳  
۷۸۴  
۷۸۵  
۷۸۶  
۷۸۷  
۷۸۸  
۷۸۹  
۷۹۰  
۷۹۱  
۷۹۲  
۷۹۳  
۷۹۴  
۷۹۵  
۷۹۶  
۷۹۷  
۷۹۸  
۷۹۹  
۸۰۰  
۸۰۱  
۸۰۲  
۸۰۳  
۸۰۴  
۸۰۵  
۸۰۶  
۸۰۷  
۸۰۸  
۸۰۹  
۸۱۰  
۸۱۱  
۸۱۲  
۸۱۳  
۸۱۴  
۸۱۵  
۸۱۶  
۸۱۷  
۸۱۸  
۸۱۹  
۸۲۰  
۸۲۱  
۸۲۲  
۸۲۳  
۸۲۴  
۸۲۵  
۸۲۶  
۸۲۷  
۸۲۸  
۸۲۹  
۸۳۰  
۸۳۱  
۸۳۲  
۸۳۳  
۸۳۴  
۸۳۵  
۸۳۶  
۸۳۷  
۸۳۸  
۸۳۹  
۸۴۰  
۸۴۱  
۸۴۲  
۸۴۳  
۸۴۴  
۸۴۵  
۸۴۶  
۸۴۷  
۸۴۸  
۸۴۹  
۸۵۰  
۸۵۱  
۸۵۲  
۸۵۳  
۸۵۴  
۸۵۵  
۸۵۶  
۸۵۷  
۸۵۸  
۸۵۹  
۸۶۰  
۸۶۱  
۸۶۲  
۸۶۳  
۸۶۴  
۸۶۵  
۸۶۶  
۸۶۷  
۸۶۸  
۸۶۹  
۸۷۰  
۸۷۱  
۸۷۲  
۸۷۳  
۸۷۴  
۸۷۵  
۸۷۶  
۸۷۷  
۸۷۸  
۸۷۹  
۸۸۰  
۸۸۱  
۸۸۲  
۸۸۳  
۸۸۴  
۸۸۵  
۸۸۶  
۸۸۷  
۸۸۸  
۸۸۹  
۸۹۰  
۸۹۱  
۸۹۲  
۸۹۳  
۸۹۴  
۸۹۵  
۸۹۶  
۸۹۷  
۸۹۸  
۸۹۹  
۹۰۰  
۹۰۱  
۹۰۲  
۹۰۳  
۹۰۴  
۹۰۵  
۹۰۶  
۹۰۷  
۹۰۸  
۹۰۹  
۹۱۰  
۹۱۱  
۹۱۲  
۹۱۳  
۹۱۴  
۹۱۵  
۹۱۶  
۹۱۷  
۹۱۸  
۹۱۹  
۹۲۰  
۹۲۱  
۹۲۲  
۹۲۳  
۹۲۴  
۹۲۵  
۹۲۶  
۹۲۷  
۹۲۸  
۹۲۹  
۹۳۰  
۹۳۱  
۹۳۲  
۹۳۳  
۹۳۴  
۹۳۵  
۹۳۶  
۹۳۷  
۹۳۸  
۹۳۹  
۹۴۰  
۹۴۱  
۹۴۲  
۹۴۳  
۹۴۴  
۹۴۵  
۹۴۶  
۹۴۷  
۹۴۸  
۹۴۹  
۹۵۰  
۹۵۱  
۹۵۲  
۹۵۳  
۹۵۴  
۹۵۵  
۹۵۶  
۹۵۷  
۹۵۸  
۹۵۹  
۹۶۰  
۹۶۱  
۹۶۲  
۹۶۳  
۹۶۴  
۹۶۵  
۹۶۶  
۹۶۷  
۹۶۸  
۹۶۹  
۹۷۰  
۹۷۱  
۹۷۲  
۹۷۳  
۹۷۴  
۹۷۵  
۹۷۶  
۹۷۷  
۹۷۸  
۹۷۹  
۹۸۰  
۹۸۱  
۹۸۲  
۹۸۳  
۹۸۴  
۹۸۵  
۹۸۶  
۹۸۷  
۹۸۸  
۹۸۹  
۹۹۰  
۹۹۱  
۹۹۲  
۹۹۳  
۹۹۴  
۹۹۵  
۹۹۶  
۹۹۷  
۹۹۸  
۹۹۹  
۱۰۰۰



مرضی، میں کسی کی راہ میں حائل نہیں، اب میں تھک گیا ہوں  
ورنہ مفصل بھی لکھ سکتا تھا۔ غریب الدیار

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

## بچی کی وفات

انسان اور مصائب کے رشتے پر سے صدیاں گزر چکی ہیں، کبھی انسان غالب  
آجاتا ہے، کبھی مصائب انسان کو زیر کر لیتے ہیں، لیکن دواؤں کے تعلقات میں بال  
برابر سلجھ جاتی نہیں ہوتی۔

امیر شریعت<sup>7</sup> عوام کی کہانیاں سننے سننے خود مصائب کا پہاڑ بن کر رہ گئے،  
اڑھے ہوئے دلوں پر غموں کا دین بسیرا، مسکراتی ہوئی آنکھوں میں آنسو، سرج و  
پسید پھرے پر موت کے وجہ۔ امیر شریعت<sup>7</sup> کا ان دنوں ایسا ہی حال تھا کہ، فروری  
۱۹۴۸ء کو عزیزی سالہ کا انتقال ہو گیا۔ معصوم بچی جو غم کی اندھیری رات میں گھر کا  
چراغ اور سوگوار دلوں کا کھلونا تھی، اس کی موت نے سائے گاؤں میں صفت ماتم  
بچھا دی۔

نقھی سالہ اس اعتبار سے خوش نصیب رہی کہ باپ اس کے جنازے میں  
شریک تھا، ورنہ اس سے قبل امیر شریعت<sup>7</sup> کی دو بچیاں فوت ہوئیں تو وہ بچاؤوں میں بچنے

پاکستان ۱۹۴۸ء

برصغیر کی سلامتی کا آخری سورج جب اپنی پہنائیوں میں غروب ہوا



تو ہنر وستان تقسیم ہو چکا تھا، ایک ہی دھرتی کی کوکھ سے جنم لینے والے لادے بیٹوں نے اپنی آشناؤں کے لئے ماں کو دو حصوں میں بانٹ لیا۔ آہ! انسان کتنا خود غرض ہے۔

آسمان نے یہ سارا تماشا دیکھا، زمین کے فرات انسانی گناہوں سے لرزہ بر اندام ہو گئے، لیکن خلافتِ ارضی کا وارث تختِ شاہی کی طلب میں ایسا کھویا کہ دامنِ یزواں کی بجائے اشارۃً ابلیس پر رقص کرنے لگا، اور اسی طرح ۱۹۴۸ء اپنے جلو میں گذشتہ سال کی نونِ آشام تاریخ سے گرنو دا رہوا، تو شفق اپنے دامی سے خونِ پورہ ہاتھا، انسانوں کی بے گور و کفن لاشوں نے درندوں کو بھوکے بے نیاز کر دیا۔ انسانیت حیران تھی کہ شاید انسان سے انسان کے انتقام کا یہ آخری سال ہو، مگر نہیں۔

یہ کہہ رہی ہے پلٹ کر نگاہِ یار ابھی!

زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی!

امیر شریعت ۱۹۲۱ء میں برطانوی سامراج سے اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لیے جذبات کا ایک الاؤ سینے میں لے کر نکلے تھے، ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء کو جب یہ مراد بر آئی تو جوانی کے ساتھ ساتھ جذبات کی آگ بھی دھواں سے رہی تھی، وہ جس پودے کو خون کی آبیاری سے تراور دیکھنا چاہتے تھے، جب اس پر بہا آئی تو اسے کانٹوں نے گھیرا ہوا تھا۔ بادِ نسیم منہ نکلتی رہ گئی، مگر بادِ موسم کے تیز جھونکوں نے گل بوٹوں کی تمام پتیاں خزاں کے حوالے کر دیں۔

اس سال امیر شریعت اپنی عمر کے ستاون برس گزار رہے تھے، ہمت



جواب دے چکی تھی، دانت ساتھ چھوڑ گئے تھے، چہرے پر عمر رفتہ کی بگڑی نڈیاں  
 گڈے ہوئے وقتوں کو پکار رہی تھیں۔ جن آنکھوں میں بلا کی شوخی تھی وہ خشک  
 ندی نالوں کی طرح اُداس دکھائی دیتی تھیں۔ ہاتھوں میں تلوار اور گھاڑی کی جگہ  
 معمولی پھڑی نے لے لی تھی، آنکھوں پر عینک خمیدہ کمرے ساتھ پھڑی کے سہارے  
 امیر شریعت جب بازار سے گزرتے تو یوں لگتا جیسے دیک کھائی ہوئی گزشتہ ربع صدی  
 کی تاریخ گذر رہی ہے۔

جس کی آواز سے ایوانِ فرنگ میں زلزلہ آجاتا تھا، ۱۹۴۷ء کے حادثات نے  
 اُسے اس قدر منجمل کر دیا کہ وہ پنجاب کے دورافتادہ گاؤں (خان گڑھ) میں بیٹھا  
 اپنی آواز کو ترس رہا تھا۔

درِ گروہ کی تکلیف کا آغاز بھی انہیں دنوں ہوا۔

قریباً ایک سال خان گڑھ میں خاموش رہنے کے بعد اپریل ۱۹۴۸ء کو  
 امیر شریعت رضا کاروں کے اصرار پر ملتان آئے اور جلسہ عام میں خطاب کرتے  
 ہوئے کہا:

”میرے بزرگوار اور عزیزو!..... ایک سال کا عرصہ ہو گیا

کہ میں نے کسی اجتماع میں تقریر نہیں کی۔ اب بھی خدا شاہد ہے کہ

میں بادلِ شواستہ اٹھ کر آیا ہوں، اس ڈر سے کہ رضا کار ناراض

نہ ہو جائیں۔ ورنہ قریباً تیس سال سے جو کچھ میں نے آپ سے کہا

اگر اسی کو آپ سمجھ لیتے تو کافی تھا۔ لیکن میری تو کوئی سنتا ہی نہیں۔

میرا تو شکاری گتے کا ساحل ہے جو شکار کو دیکھ کر بھونکتا ہے، کیونکہ



وہ جو کچھ اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے، اسی کی آواز لگتا ہے وہ دُڑتا،  
 کوڑتا ہے، بچھڑتا ہے، پھڑکتا ہے کہ شکایت سے پست جاؤں، اور بچھڑتا  
 ہے کہ اپنے مالک سے اس کی خبر کرووں۔ اسی طرح میں دیکھ رہا تھا  
 شکار کو، اور تمہارے دروازے پر بھونکا، بس دروازے پر گسیا  
 اسی نے لاشی رسید کی، "بے ایمان سنے نہیں دیتا" حالانکہ جو کچھ  
 میں دیکھتا تھا، اسی کی صدا لگتا تھا۔

عزیزو! میری صحت خراب ہو گئی ہے، کیونکہ میں سنے  
 حسین و جمیل دنیا اُجرتی دیکھی ہے۔ دلکش و دلفریب دنیا، اچھی دنیا  
 بڑی دنیا، معزز بزرگ، معزز بیٹیاں، عجمت ماب بیٹیاں، سب  
 اُجڑے اور ہم سب کے ساتھ اُجڑے، وہ اُجڑے تو میں بھی اُجڑا،  
 اور سب ایک ساتھ اُجڑے۔ عزیزو! کیا حال بتاؤں! کیسے  
 بتاؤں؟ اگر کسی کا حال مجھ سے بہتر ہو تو بتاؤ؟ اللہ جانے  
 کس پر کیا گزری؟

اس وقت یہاں پر سزا کے دلوں پر کھڑا ہوں، رضا کاروں  
 نے مجھے سزا دی ہے، اور میں نے اس سزا کو قبول کر لیا ہے،  
 تقریر کا ارادہ نہ تھا اور نہ ہے۔ بس گونہی دو ایک باتیں کرنے  
 آیا ہوں۔ صحت تباہ ہو گئی ہے، دراصل ساری بات صحت پر  
 ہوتی ہے۔ دیکھنے کو بوڑھا ہوں آپ کے درمیان، تم کو کفر کیلئے  
 ویسا ہی توانا، کفر کے لئے مجھ سا توانا مان نے آج تک نہیں جانا۔



یہ یعنی، یہ پیری، اُدھر تم زور آور، اور جب آجی پاٹ پکڑ کر میدان  
 میں چھوڑ دیا۔ تم دعا دو تب بھی خوش، بد دعا دو تب بھی خوش  
 پیار کر تب بھی خوش۔ ہم تو اسی میں خوش ہیں جس میں اسپیکر کی  
 خوشی ہے۔ ہمارے اپنی تو خوشی ہی نہیں۔ اب تو اپنا یہ کہہ  
 اللہ کو خوش کروں یا نہ کروں، مگر تم کو ناراض نہ کروں۔ تمہارے لیے  
 یہی اگر جہنم میں چلا گیا تو کیا ہوا، پدمیر سے جاسے سے تم تو  
 خوش رہتے ہو نا۔ بھئی باہر سیدھی سی بات ہے کہ اگر ایسا شخص کے  
 جہنم جانے سے قوم یا ملت بچ جائے تو ایسا کام سبحان اللہ!  
 ہم یہ سمجھیں گے کہ یہ بھی تیرے لیے کر دیا۔

بیماری کی وجہ سے اور کچھ ایسی یاد کی وجہ سے وہی آتے،  
 وہی گلے، وہی زمانہ، وہی کوپتہ، وہی بارش و بہار، سب یاد  
 آتے ہیں تو دل بٹھینے لگتا ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ رہا کاروں کا ڈر تھا جو حاضر  
 ہو گیا ہوں۔ ان کی منتیں کیں کہ بھائی بھئی چھوڑ دو، میں اب نہیں  
 بول سکتا، ممکن ہے کوئی وقت ایسا آجائے کہ میں خود بول اٹھوں  
 مگر انہیں سمجھائے کون؟ جی کی بات ہے، اب وہ بولنے نہیں  
 دیتا۔ تیس سال بولنا۔ باہر، اب خدا سے دعا ہے جس نے تیس  
 سال بولنے کی توفیق عطا کی کہ اب نہ بولواؤ۔

ابھی جو مولانا غلام غوث اور ماسٹر تاج الدین آپ کے



سامنے کہہ گئے ہیں، مجھے بے چین کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔  
 تم راہ سرد بھر کر، کہہ کر بھی بھول جاتے ہو اور اپنا یہ حال ہے تم نے  
 کہا بھولتا ہے اور نہ کسی کا ثنا بھولتا ہے۔ اب اس کا کیا جواب؟  
 کنگھی تو میری جیب میں بھی ہے، تیب بھی چاہتا ہے، سر میں کر لیتا  
 ہوں۔ گو تم نے سر میں بالی نہیں چھوڑے۔ بہت کم رہ گئے ہیں۔  
 اگر دو چار دن زندہ رہا، اور یہی بد عادت باقی رہی تو انشاء اللہ ایک  
 بال بھی باقی نہیں رہے گا۔ ہاں! (سرد آہ بھر کر) تم جیتے رہو۔ ہمارا  
 کیا پوچھنا میرا، فقیرانہ آئے خدا کر چلے، اندر اس کا فیصلہ تو وہاں  
 ہوگا میدان قیامت میں، جہاں سیاہ اور سفید چہرے الگ الگ  
 کر دیے جائیں گے۔

بہر حال اب میں یہ کہوں کہ قرآن کے چار جملے ہیں، مجھے  
 بھی آتا ہے اور وہ تمہیں پسند نہیں۔ جو تم چاہتے ہو وہ میرے  
 پاس نہیں۔ کوئی نئی بات نہیں، وہی ایک بات اسی کتاب کی ہے۔  
 جسے آج کل کی زبان میں فرسودہ نظام کہا جاتا ہے۔ جسے تم کہتے ہو  
 یہ ہمیں فرسٹ نہیں آتا، تو یہ نکاح، یہ طلاق، یہ شادی، یہ قرآنیاں،  
 یہ مسجد، یہ نماز یہ کیسے فرسٹ آئیں۔ پھر تو ہر سے سے چسپلو کہ یہ  
 بیت اللہ ہی ہر سے سے فرسٹ نہیں۔ نہ وجود باری تعالیٰ ہے  
 نہ کوئی نبی ہے، نہ وحی ہے، نہ نزول وحی ہے۔ آتا ہے تو یوں  
 پیدا ہے آؤ، یہ منافقت نہ کرو۔



درمیان میں کسی نے امیر شریعت کا نعرہ لگایا۔

”دیکھئے بھائی امیر! تقریر میں اس قسم کے نعرے نہ لگائیے  
میں درازوں سے بے نیاز تہ چکا ہوں۔ ضرورہ باد کے قابل ہوں  
ترندہ باد کے زائق۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ قبرستان میں  
اذا میں دستے رہا ہوں۔ میں اضطرار ہی طو پر چپ نہیں ہوں  
سوچ سمجھ کر چپ تھا۔ تیس سال پختیار ہوں۔ اب آدھو ہے کہ  
نہ لوگوں کی طبیعت پر خدا نے اپنا اختیار لگایا ہے۔ جی چھپاتا ہے۔  
چپ ہوں۔“

میں تو صرف نوجوانوں کی دلداری کے لیے آیا ہوں۔  
نہ وہ کنگ مکھی کے دباؤ سے نہ ماسٹر صاحب کے کہنے پر، بلکہ  
اُن رضاکاروں کے دباؤ سے جنہیں مجھ سے بھت ہے۔“

حضرت امیر شریعت کی یہ تقریر رات ڈیڑھ بجے تک جاری رہی۔ عوام اور خواجگان دونوں  
رورہے تھے۔

## نفاذ شریعت کا نعرہ

پاکستان کی بنیاد کے ساتھ ہی علماء نے دین پسند طبقہ کو مجتمع کرنے کے لیے  
پشاور میں ۳۰-۳۱-۳۲ ستمبر ۱۹۴۷ء کو نفاذ شریعت منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔  
گھریلو پریشانیوں اور اپنی مسلسل بیماری کے باوجود امیر شریعت سرحدی علماء  
کے فیصلے پر کھپول پڑھا کر سفر کی تیاریاں شروع کیں۔ اسی سلسلے میں سرحد کے مقتدر منہا



پیرمانکی شریف، قائد اعظم کے پاس کراچی پہنچے، اور ان سے تحریری وعدہ لیا کہ  
 پاکستان کا آئندہ نظام حکومت اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ہوگا۔ ان دنوں سرحد میں  
 عبدالقیوم خان کی حکومت تھی۔ کانفرنس کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں کہ حکومت نئے دفعہ ۲۴  
 کے ذریعے کانفرنس کو خلاف قانون قرار دیدیا۔ اس کے نتیجہ میں دین پسند لوگوں کو  
 بہر حال تعجب ہوا، مگر اس کے نتیجہ میں پیرمانکی شریف مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر عوامی لیگ  
 میں شامل ہو گئے۔

## ملتان میں قیام

ملک کے سیاسی حالات ہنوز ابتر تھے، عوام اقتصادی لحاظ سے کمزور سے  
 کمزور تر ہوتے جا رہے تھے۔ ہر آدمی خانگی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ نوزائیدہ مملکت  
 کی سرسبز غیر محفوظ تھیں۔ اس زمانے میں عوام سے نہ تو کوئی بات کہی جاسکتی تھی،  
 اور نہ ہی عوام اس کے لیے تیار تھے۔ ملک کی سیاسی جماعتیں وقتی طور پر اپنا  
 دھجود ختم کر چکی تھیں۔ پھر وہ لوگ، جن کی زندگی خزاں کے خشک پتے کی طرح آوارہ  
 نہیں تھی اس بازار میں کیونکر آتے، جہاں سرد و کان پر جنس انسانی کوڑیوں کے  
 مول تلی رہی ہو۔

امیر شریعت بھی زندگی کی سنگلاخ وادیوں سے گزر کر آئے تھے، ان کے  
 ایکڑ یا جن راہزوں کو اپنے خون سے میرا سب کر چکے تھے وہ راہیں ہنوز تشہہ تھیں  
 لیکن سائیدانہ جن انقلابی مڑوں میں نغمے آلاپ رہا تھا، سالار کارواں کے پاس  
 اتنی مہلت کہاں تھی کہ جس کارواں کو چھوڑ کر غبار کارواں پر توجہ دیتا۔



۱۹۴۸ء کے آخر میں خان گڑھ پھوڑ کر امیر شریعت ملتان کے ایک گنہگار محلہ  
 (ڈبئی شیرخان) میں تیس روپے ماہوار کرایہ کے مکان میں آ بیٹھے اور گوشہ نشینی کا  
 فیصلہ کر لیا، لیکن جماعت کے مستقبل کی پوزیشن ہنوز واضح نہیں تھی، اور وقت کا  
 تقاضا بھی تھا کہ بہار آنے پر گل و گلچیں سے کیونکر بڑتاؤ کیا جائے؟ صیاد سے ہمارے  
 راہ و رسم کن طور و اطوار سے ہوں؟ نسیم صاحبگاہی سے اٹھکیلیاں ہوں تو کس طرح؟  
 اور اگر کبھی بھادو باؤ سمجھ میں آجائے تو آستھیانوں کا دفاع کس دامن کی  
 اوٹ میں بیٹھ کر ہو؟

۱۹۴۹ء

خزاں پر سے کتنے موسم گزرتے ہیں کہ بہار آتی ہے، رات بھر نہ جانے  
 کتنے ستاروں کا نون ہوتا ہے کہ صبح نمودار ہوتی ہے۔ جماعتوں کی تشکیل کا بھی  
 یہی ستاروں ہے، ارادے باندھ کر کئی بار توڑنے پڑتے ہیں، دل و دماغ کو ہم آہنگ  
 کرنے میں آنکھوں کو مساویں بھادوں کی طرح کئی بار برسنا پڑتا ہے، پھر کہیں جا کر  
 یہ کھیتی سیراب ہوتی ہے۔

ہزاروں سال نرس اپنی بے لوری پہ روتی ہے  
 بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ و درپیدا

مجلس آزرار کا آخری شپاسی اجلاس

مجلس آزرار نے ۱۹۲۹ء میں جنم لیا تو یہ غیر ملکی سامراج کے خلاف ایک



نیا محاذ تھا۔ اور ۱۹۴۹ء کے آفتاب نے اترار کی سیاسی زندگی پر جب اپنے  
 سائے ڈالے تو وقت مقتضی تھا کہ سامراج کا سوردج غروب ہو چکا ہے، غلامی کی  
 کڑیاں ٹوٹ کر گر چکی ہیں، فرنگی اپنی بساط پھیل کر سمندر پار جا چکا ہے۔ نیز وہ بادل  
 چھٹ چکے، جن کے دامن میں بگلیاں پرورش پار ہی تھیں۔

اترار دہشتاؤں نے امپریٹریٹ کو مجبور کیا کہ وہ نئی مملکت میں نئے زاویوں سے  
 چلنے کی راہ سنبھالیں، حالانکہ وہ ۲۴ ستمبر، ۱۹۴۷ء کے اپنے خط میں فیصلہ سے  
 چکے تھے تاہم پارٹی نے انہیں مجبور کیا کہ وہ عوام میں آگرا اعلان کریں۔ چھٹ پانچ  
 ۱۲-۱۳-۱۴ جنوری ۱۹۴۹ء کو لاہور دہلی دروازہ کے بیان میں دفاع اترار کانفرنس کے  
 عنوان پر اترار کا آخری اور تاریخی اجلاس ہوا۔ جس میں قریباً پچاس ہزار  
 افراد کارکن اور باہر دی رضا کاروں نے شمولیت کی۔ تقسیم ملک کے بعد اترار کا یہ پہلا  
 اجتماع تھا۔ اس کانفرنس کے آخری اجلاس میں حسب ذیل قرارداد شیخ حسام الدین  
 نے پیش کی :-

اس حیثیت کے پیش نظر کہ تقسیم ہند کے نتیجے کے طوع پر  
 ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود اور مستقبل کی ترقی اور فارغ البالی  
 پاک بن کی قوت اور استحکام ہی میں مضمر ہے۔ نیز بین الاقوامی  
 تسلط حال کرنے کے لیے امریکہ اور برطانیہ ایک طرف اور روس  
 دوسری طرف دنیا کے گوشے گوشے میں کمزور اور پسماندہ اقوام کو  
 اپنے اپنے دھڑے میں شامل کرنے کے لیے ہر قسم کی حیلہ جوئی،  
 لالچ اور دباؤ سے انسانیت کو پھر ایک دفعہ ناقابل تصور تباہی اور



ہلاکت کا شکار بنا رہے ہیں۔ بالخصوص جمعیت اقوام کے پرشے میں  
 یہودی وطن کی تخلیق، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں اقتصادی  
 تحفظات کے نام پر ترکی، ایران، عراق، شرق اردن، سعودی عرب،  
 فلسطین، یمن، شام، مصر، سوڈان اور اٹو وینیشیا وغیرہ اسلامی  
 ممالک کی آزادی، امن اور ترقی کو برابر قربان کیا جا رہا ہے۔

سفید قام اقوام نسلی برتری اور سیاسی اجارہ داری کے  
 تحفظ اور بقا کے لیے جس منظم طریق سے انگریزی زبان بولنے والی  
 قوموں اور مغربی یورپی اقوام وغیرہ کے نعروں کے قریب سے اپنے  
 انسانیت سوز عزائم کو پورا کرتے نظر آ رہے ہیں۔ یقیناً اہلقت اسلام  
 کی سلامتی اور عالمگیری امن کی خواہش رکھنے والے افراد اور گروہ  
 اس صورت حال کو خاموشی سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔

برابرین و فارغ پاکستان احرار کانفرنس کا یہ تاریخی اجلاس  
 اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ایسے نازک ترین وقت میں اسلامیان پاکستان  
 بہت حد تک اس زہر کا تریاق پیدا کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ملت کی  
 رہنمائی اور ترقی کے لیے ان کی داخلی سیاست کو ہر قسم کی سیاسی  
 گروہ بندیوں سے آزا کر کے ایک ہی مشترک پلیٹ فارم کو  
 مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے۔ اس سے ایک طرف ملت اسلام  
 کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی سازشوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے  
 وہاں پاکستانیوں میں صحیح اور سنجیدہ غور پیدا کرنے کی راہیں بھی کھل



جائیں گی، اور کم سے کم مدت میں قوم میں ضبط و نظم اور خود اعتمادی  
 کی نصوص عیاں نہ پیدا ہو سکیں گی۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا  
 جاسکتا، کہ مجلس احرار کے مقاصد میں مذہبی سر بلندی کے ساتھ ساتھ  
 وطن کی آزادی از بس شامل تھی، جو پاکستان کے قیام کے بعد  
 سیاسی طور پر اپنا پورا ہونے لگی ہے۔ لہذا اذ فارغ پاکستان احرار  
 کانفرنس کا یہ اجلاس غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کر دینا اپنا فرض  
 سمجھتا ہے کہ آئندہ سے مجلس احرار اپنی سعی و عمل کو مسلمانوں کے دینی  
 عقائد و رسوم کو درست رکھنے اور نہ صرف ان مسئلہ ختم ہو گئی کی مرکز کی  
 اہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے تبلیغی سرگرمیوں تک محدود رہے گی  
 ہو اور کین و ہمدوان احرار نہایت حال کے موافق سیاسی خدمات  
 سرانجام دینا چاہتے ہیں وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنے  
 روایتی اخلاص اور عملی انہماک سے ملک و ملت کی خدمت میں  
 حصہ دار بن سکتے ہیں۔“

اس قرارداد کی تائید کرنے سے پیشتر حضرت امیر شریعت نے جو پیش مجلس  
 احرار کے عہد سے واروں کو انعام میں تلواریں اور تمغے دیے۔ ان اہم ذمہ داریوں سے  
 فارغ ہو کر امیر شریعت نے اپنی تقریر کا آغاز ایک فارسی کے شعر سے کیا، اور پھر  
 ایک واقعہ دہرایا کہ دہلی میں ایک مجذوب چنلی قبر کے آس پاس اکثر یہ مصرعہ  
 دہرایا کرتا تھا۔

اس لیے مجھ کو تڑپنے کی تمسنا کم ہے



بچے اس کے پیچھے شور مچاتے۔ کس لیے؟ مگر وہ دوسرا مصرعہ زبان پر نہ لانا، لوگ  
 اسے تنگ کرتے، پھیرتے، مگر وہ صرف یہی کہتا، "اس لیے مجھ کو تڑپنے کی تمنا کم ہے۔"  
 ایک روز کچھ نوجوانوں نے اسے گھیر لیا اور مجبور کر دیا کہ وہ دوسرا مصرعہ کہہ سناٹے،  
 عاجز آکر اس فقیر نے کہا،

سعیت دل ہے بہت وسعتِ صبر کم ہے

اس لیے مجھ کو تڑپنے کی تمنا کم ہے

یہ کہا اوروہ ایک آہ کے ساتھ سر دھو کر رہ گیا۔

ایرٹریٹا نے فرمایا۔ "مجھ سے دل کی بات نہ پوچھو۔ میں اپنے

دل کی کہنے نہیں آیا، تمہارے دلوں کی کہنے آیا ہوں۔

بزرگانِ ملت! ابراہانِ عزیز! کافی عرصہ کے بعد آپ

حضرات کی خدمت میں مجھے کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا

ہے۔ میں ناتوان ہوں، وہ نہیں جو آج سے دو یا چار برس پہلے تھا،

اس لیے میری گزارش ہے کہ آپ حضرات اپنی خاموشی سے میری

مدد کریں۔ میں زیادہ بیز تک آپ حضرات کا وقت نہیں لوں گا۔ میں

آپ سے چند ضروری باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ اس وقت کرو پیش

میں جو تارک بادل چھاٹے ہوئے ہیں، نہ آپ ان سے بے خبر ہیں

اور نہ میں۔ انہیں حالات نے مجبور کیا ہے کہ میں آپ کے سامنے

آؤں۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ کوئی نئی بات نہیں، بلکہ آج سے

کافی عرصہ پہلے یعنی ۲۲ دسمبر ۱۹۱۹ء کو مجھ پر ایک تحریر سننے



ذریعے میں نے جماعت کو اپنا پیغام بھیج دیا تھا جو طبع شدہ ہے۔

دسمبر کے آخر میں جب طوفان حوادث ختم ہو چکا تو لاہور میں

ہماری جماعت کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس وقت

بسنزمرگ پر تھا، مسلسل تین ماہ سے بیمار تھا، اور میرے بچنے کی

بہت کم امید تھی، تو اس وقت میں نے اپنے دو عزیزوں کو ابراہیم

نصر اللہ خان اور سردار محمد شفیع کی معرفت ماسٹر راج الدین انصاری

کی خدمت میں یہ خط بھیجا تھا۔

مسلم لیگ سے ہمارا اختلاف صرف یہ تھا کہ ملک کا نقشہ

کس طرح بنے یہ نہیں کہ ملک نہ بنے بلکہ یہ کہ اس کا نقشہ کیونکر بنے

یہ کوئی بنیادی اختلاف نہیں تھا، نہ حلال و حرام کا، نہ گناہ و

ثواب کا، اور نہ مذہب کا، وہ تو ایک نظریے کا اختلاف تھا،

ہم چاہتے تھے کہ پورے چھ صوبے ملیں اور مسلم لیگ بھی چاہتی

تھی، ہمارا اختلاف صرف مرکز کی علیحدگی پر تھا۔

مسلم لیگ بھی فرقہ وارانہ جماعت تھی اور مجلس احرار بھی،

مسلم لیگ میں بھی کوئی غیر مسلم شامل نہیں ہو سکتا تھا، اور نہ ہو

سکتا ہے پس، اختلاف تھا تو اتنا کہ ہم کہتے تھے کہ آزادی مل

جائے، فوراً سنبھل لیں اور اس کے دس سال بعد مرکز سے بھی

علیحدہ ہو جائیں گے۔ مگر لیگ کہتی تھی کہ نہیں۔ مرکز کے ساتھ

ہمارا کوئی الحاق نہیں رہ سکتا۔ وگرنہ تقسیم ملک کے ہم بھی



قائل تھے کہ پس منار مولانا اب بھی موجود ہے، اس میں تقسیم ملک  
 ہی کا قصہ درج ہے، ہم پورے چھ صفحاتوں پر مضمون لکھتے، لیکن  
 کانگریس نے تقسیم در تقسیم کو قبول کیا، اور گائے کا قیمہ کر کے اس کے  
 کو فیتے بنا دیے۔

پس، اب ہمارا مسلم لیگ سے کوئی اختلاف نہیں، نہ پہلے  
 ہمارے اور ان کے درمیان مذہبی اختلاف تھا نہ خدا کا  
 نہ رسول کا، نہ ہم ولی ہیں نہ لیگ والے قطب، اگر لیگ والے  
 گناہ گار ہیں تو ہم کون سے ولی اللہ ہیں۔ ہمارا اور ان کا اختلاف  
 صرف مرکز سے جانبداری پر تھا اور تاریخ کے الفاظ میں یوں کہنا  
 چاہیے۔

دلت سے میری ان کی قیامت کی ہے تکرار  
 بات اتنی ہے وہ کل کہتے ہیں میں آج  
 ہمارا اور لیگ کا اختلاف کوئی کفر اور ایمان کا اختلاف نہ تھا  
 یہ تو بالکل سطحی اختلاف تھا۔

بھائی حسام الدین نے آپ کے سامنے جو قرارداد پیش  
 کی ہے، وہ مجلس احرار کی آئندہ پارلیمنٹ کی آئینہ دار ہے، ہم نے  
 اپنی تین سال کی کمانی حکومت اور مسلم لیگ کے حوالے کر دی ہے۔  
 سپریم بنو مایہ خویش را  
 کانگریس کے سب سے بڑے لیڈر گاندھی جی نے کہا تھا کہ ہندوستان کی



تقسیم گائے کے دو ٹکڑوں کے برابر ہے اور میں اسے کبھی قبول نہیں  
 کروں گا، یہ خبر اخبارات میں آئی تو لیگ نے کہا، نہیں، دو  
 ٹکڑے ہوں گے۔ اب یہ لیگ کا نام ہی کیوں لوں، یہ مطالبہ  
 اسی پرپاشی فی صد مسلمانوں نے کیا۔

چنانچہ گاندھی جی کی زندگی میں مونسٹیشن کے سامنے پندرہ  
 ہرود اور قائد اعظم نے ہندوستان کی تقسیم کو قبول کیا، یعنی کانگریس نے  
 گائے کے دو ٹکڑے کر دیئے، بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ  
 کانگریس نے کیا۔ کون کانگریس؟ بینٹنلزم کی مدنی کانگریس، ایک  
 وطن، ایک تہذیب، اور ایک ملک کا نعرہ لگانے والی کانگریس،  
 اس کانگریس نے ضلعوں کو بٹوایا۔ گنوماتا کے دو ٹکڑے ہی نہیں  
 کروائے بلکہ گائے کا قیمہ قیمہ کر کے اس کے کرفتے بنا دیئے۔

اس موقع پر سب سے انتہا قبیلے بلند ہوئے، تو آپ نے فرمایا  
 یہ وقت مذاق کا نہیں، نوجوانوں کو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت

پیدا کرو، زندہ رہنے کے عزائم سوچو، سپاہی رہو۔

اس موقع پر پودھری غلام عباس جہاں مجلس اجراء نے اپنے اجلاس میں  
 شامل ہونے کی دعوت دے رکھی تھی، پنڈال میں داخل ہوئے، جوشن اجراء نے  
 اپنے روایتی انداز میں ان کا استقبال کیا۔ اس دوران، کشمیر مہاراجے کے نعرے  
 بھی بلند ہوئے۔ اس موقع پر امیر شریعت نے پودھری غلام عباس اور دوسرے  
 نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:



پتو دھری صاحب کی آمد سے بات دوسری طرف چلی گئی،  
 عزیز و اخدا جانے اب آپ کس کشمیر کو لینے کے ارادے کر رہے  
 ہیں یا کس کشمیر کے متعلق سوچتے ہیں؟ ورنہ وہ کشمیر جو ذہنوں میں  
 جنت کا نشان ہے اس کے متعلق میری رائے ہے کہ پڑو گار عالم  
 نے آسمانوں پر اپنی موجودگی میں تیار کروا کے اُسے زمین پر اتار دیا  
 وہ جنت کا ایک ٹکڑا ہے جس پر اب نہیں بلکہ ۱۹۳۱ء سے  
 مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے، اُس زمانے میں ہم نے اسی کشمیر کے  
 متعلق مسلمانوں سے بات کہی تھی، لیکن اُس وقت کے رئیس مسلمانوں  
 نے جن کا دخل فرنگی ایوانوں میں تھا، ہماری بات نہ سنی، اگر اُس  
 زمانے میں جب ہم نے چالیس ہزار کے قریب مسلمانوں کو جیل  
 بھجوا دیا اور بائیس نوجوانوں نے کشمیر کی آزادی کیلئے جہاد شہادت  
 نوش فرمایا تھا، ہماری بات مان لی ہوتی تو آج کشمیر کا نقشہ یہ نہ ہوتا۔  
 خیر۔۔۔۔۔ بہر حال اب آپ بھی سن لیں اور چودھری صاحب بھی  
 کشمیر تو آپ اپنے دماغ سے سے چھکے۔ اگر فائر بندی کی بات  
 نہ ہوتی تو ممکن ہے کوئی بات بن جاتی، مگر اب تو میری بات  
 لکھ کر پیب میں ڈال لو، فرنگی اور ہندو، اب آپ کو کشمیر نہیں  
 دیتے۔ ہاں البتہ اگر کبھی فرنگی کو ضرورت ہو کہ وہ اس مستقل فساد کو  
 ختم کرنا چاہتے تو ممکن ہے اس کا کچھ حصہ آپ کے پاس  
 آجائے۔“



آخر میں آپ نے فرمایا :

”جلس احراء اب مذہبی اور اصلاحی کاموں میں سرگرم  
عمل رہے گی۔ مسئلہ ختم نبوت اس کا بنیادی مسئلہ ہے۔ سیاسیات  
اب ہمارے ہی منزل نہیں، وہ جانے اور مسلم لیگ۔ اس کا یہ مطلب  
نہیں کہ مسلم لیگ کے پاس قوت ہے اور ہم اس قوت سے  
ڈر گئے ہیں، نہیں نہیں بلکہ ننگ کی ضرورت اور حالات کا  
تقاضا ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم متحد ہو کر بغیر کسی اور ذی اختیار کے  
پاکستان کی کوتاہ بنیادوں کی نگہداشت کریں۔ ان الفاظ سے میں  
اس قرار داد کی تائید کرتا ہوں۔“

امیر شریعت کی یہ تقریرات دو بچے کے قریب ختم ہوئی۔

## سیاسیات سے علیحدگی

میران جگ کے بعد سیاسی لڑائیاں ہمیشہ فکر و نظر کے تحت لڑی گئیں، کبھی  
شہرچہ پر چہروں کی اٹھاپٹک سے اور کبھی افراد کی ذہنی کاوش سے، لیکن میران میں  
رات کھانے والے لوگ نہ بڑول ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں بڑول کہا جاتا ہے۔  
امیر شریعت اور ان کے رفقاء نے زندگی کی بساط پر جو بازی لگائی، وہ  
اسلحہ کی لڑائی نہیں تھی بلکہ ایک نظریہ کی جنگ تھی۔ ایک طرف اقتدار، وہ بھی  
غیر ملکی، سمندروں کے پانی اور پہاڑوں کی بلندیاں جن کے پاؤں چھوٹی تھیں۔ موج  
جن کے جلو میں طلوع ہو کر جب شام کو شفق کی پہاڑیوں میں غروب ہوتا تو یہاں بھی



برطانوی پرچم کی اڑائیں ہی اُسے پناہ دیتیں اور دوسری طرف یہ درلین منشن لوگ جن سے اپنے بھی ناخوش، جو اپنی تقدیر کے آپ خالق تھے، لیکن ان کی تدبیروں سے شہنشاہوں کے مقدر بنتے اور بگڑتے رہے وہ آواز دیتے تو اقتدار کی زبائیں گنگ ہو جاتیں۔ ان کی رفتار سے کردار کو کٹی راہیں ملیں، انہیں غیر ملکی راج کے دارتوں نے لوہے کی زنجیروں میں جکڑا لیا۔ ویوانڈہ زبان ان کے جوہلے توڑنے کی کوششیں کیں۔ پھانسی کے تختے ان کے راستے میں بچھاٹے لیکن مردانِ حرم اپنی منزل سے دوڑ نہ رہے اور آخر وقت آیا کہ برطانوی سامراج کا سانس اکھر گیا اور وہ موت کی ایسی گہری غار میں دفن ہوا کہ نشان تک باقی نہ رہا۔

یہ فکر و نظر کی لڑائی کا نتیجہ تھا کہ ان لوگوں کی جیت ہوئی جو ایمان کی قوت سے مسلح تھے، جن کے عزم و ارادوں نے وقت کی سب سے جا بجا کشتیوں سے ٹکرا کر بھی فتح پائی۔

پاکستان دو نظر لوہے میں اٹھانے کی جنگ تھی، نہ کہ مفصل کی جس پر لفظ فتح اور شکست کا اطلاق کیا جائے۔ امیر ٹرلعبیت اپنے مقدر میں کامیاب نکلے کہ برطانوی پرچم منگول ہو گیا۔ بلاشبہ وہ وقتی طور پر وہ اپنی اسٹے کی بازی ہار گئے جس کا انہوں نے ۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کے خط میں اعتراف کیا، لیکن یہ فیصلہ مستقبلی کے ہاتھ میں ہے، کہ امیر ٹرلعبیت کی رائے درست تھی یا ۱۹۴۷ء کو برطانوی آئین۔

۱۴ جنوری کی قرارداد کے بعد امیر ٹرلعبیت سیاسیات سے کنارہ کش ہو کر ملتان میں گوشہ نشین ہو گئے۔ البتہ کبھی کبھار دیہات کے مذہبی اجتماعات میں شرکت کرتے، وہ بھی بڑے اصرار پر، ورنہ مکان کی مرزا نہ بیٹھک میں عبادت الہی میں



سروٹ ریتے، طے واہ لے ہیں آجا۔ تے لڑ پھر گھنٹوں ادنیٰ نہیں جیتیں۔ اسی طرح کی  
ایک بھٹی میں لاہور کے ایک ایڈووکیٹ، بابو عبدالغفور نے امیر شریعت سے  
سوال کیا۔ "شاہ جی! آج کل سیاست کیسی ہے؟"

جواب میں فرمایا۔

"ریاست میں سیاست کیسی، بابو! اپنے بال بچوں کا پیٹ پالو، اگر  
ہو سکے تو نیکی کرتے ہو اور مر جاؤ!"

کسی نے پوچھا۔ "شاہ جی! پہلے آپ مسلم لیگ کی مخالفت کرتے تھے اور اب حمایت؟"  
فرمایا: "بھائی! ان دنوں میں حضرت حسینؑ کی سنت ادا کرتا تھا، اور  
اب حضرت حسنؑ کی۔"

انہیں دنوں لاہور کے حاجی دین محمد، امیر شریعت کی خدمت میں حاضر ہوئے  
تو کرائے کا مکان دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے، اور کہا، "شاہ جی! اگر آپ چاہیں تو لاہور  
شاہ باغ میں زمین خرید کر مکان تعمیر کراؤں۔" جواب میں فرمایا:  
"حاجی صاحب! میرے پاس اتنی رقم کہاں؟"  
حاجی صاحب نے کہا۔ "نہیں تو پھر بیس ہزار روپیہ مجھے سے لے لیں، اور جہاں  
مناسب سمجھیں مکان بنا لیں۔"

امیر شریعت نے مسکرا کر جواب دیا۔ "نہیں حاجی صاحب! شکریہ!"

اسی سال لائل پور سے ایم ہونہ ری کے مالک

بھی نمان آئے کہ شاہ جی کے لیے مکان کا انتظام کیا جائے۔ گو جہانوالہ کے  
دوستوں نے تو زمین بھی خرید لی، لیکن ان سب کو امیر شریعت نے ایک ہی جواب دیا۔



"میں تمام احباب کا ممنون ہوں جو اپنی اپنی جگہ پر میرے لیے رہائش کا انتظام کر رہے ہیں۔ شاید انہیں معلوم نہیں کہ اسی طرح کی کوشش ایک دفعہ نواب بہاولپور نے بھی کی تھی، لیکن اگر بننے کے مکان ہی بنائے ہوتے تو ہر شہر اور ہر بستی میں بنیں سونے کے مکان بنا سکتا تھا۔ لیکن جس نے اپنے امیر کے والے مکان کا کلیم داخل نہیں کیا جو میرا حق بنتا ہے وہ کسی دوسرے کا ممنون احسان کیونکر ہو سکتا ہے۔"

پٹنہ میں میسجے شہرہال کی خاصی جا پڑا دھتی ویاں گیا تو دیکھا کہ اس پر ہندوؤں نے مندر تعمیر کر لیا ہے۔ اس جا پڑا کو میں نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ چلو اللہ کی عبادت ہی کریں گے۔ میرے عقیدے سے پرہیز ہی اپنے رنگ میں ہی رہی۔

بہر حال میں تمام دوستوں کا ممنون ہوں۔ اللہ تعالیٰ

سب کو جزائے شہرہال سے

مدرسہ قائم العلوم قرآن کے مہتمم محمد شفیع صاحب ایک دن امیر شہرہال سے ملنے گھر پہنچے تو دیکھا کہ مہتمموں کو دانہ کھلا کر ہے ہیں۔ مہتمم صاحب سے سوال کیا، "شاہ جی! یہ کام باقی رہ گیا تھا؟"

جواب میں فرمایا:

"پتیس سال تک میں نے آپ لوگوں کو بلایا ہے، مگر

آپ مجھ سے دور بھاگے ہیں۔ اب یہ بے زبان ہیں، ذرا سی



آواز دیتا ہوں تو فوراً چلے آتے ہیں۔ اس دُور کے انسانوں  
سے تو یہ حیوان کہیں بہتر ہیں۔“

غرض اس طرح کی ادبی اور نیم سیاسی گھریلو محفلوں میں اور کہیں  
بکھار شہری آبادی سے دُور دیہاتی عوام میں مذہبی قسم کی وعظ کرتے ہوئے  
امیر شریعت نے ۱۹۵۰ء تک کا زمانہ گزار دیا۔





# استحکام پاکستان

بجائے پاکستان و ہند کے آزاد ہونے ہی برطانوی سامراج کی تمام نوآبادیات  
اپنی آزادی کے لیے پرتولنے لگیں۔ اسلامی ملک اور خاص کر عرب ریاستوں کو  
برطانوی اقتدار نے جن اطوار سے غلام بنا رکھا تھا، وہ آہستہ آہستہ دم توڑ رہے تھے  
انہیں وندوں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خاں کو روس نے  
اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ اس سے پیشتر امریکہ نے بھی وزیر اعظم پاکستان کو  
اپنے ہاں دورہ کی دعوت دے رکھی تھی، جسے لیاقت علی خاں نے فوراً منظور  
کر لیا، اور وہ روس کی بجائے امریکہ چلے گئے۔ یہ ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے۔  
پاکستان کو روس اور امریکہ کی دعوتیں برطانوی مستشار کے خلاف تھیں۔  
جبکہ مصر اور ایران اپنے اپنے ملک سے برطانوی اقتدار کے خاتمے کی



فکر میں تھے۔ ایک نوزائیدہ اسلامی ملک کا برطانوی منشا کے خلاف حرکت کرنا  
تعجب خیز تھا۔

بھارت پاکستان کی بنیادیں بھی ناپختہ تھیں۔ ایک طرف ملکی استحکام متزلزل  
تھا، دشمن پاکستان کی کوتاہ دیواروں سے چھانک رہا تھا، تو دوسری طرف  
انڈین ملک کے حالات بھی موافق نہیں تھے۔ مرزائی جماعت کا اہل حق  
عقیدہ تھا اور ہے کہ

”پاکستان کا وجود عارضی ہے اور کچھ وقت کیلئے  
دونوں قومیں (ہندو، مسلمان) جدا جدا رہیں گی، مگر یہ  
حالت عارضی ہو گی اور ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ  
جلد دور ہو جائے۔“

بہر حال ہم چاہتے ہیں کہ ”اکھنڈ ہندوستان بنے  
اور ساری قومیں باہم شیر و شکر ہو کر رہیں۔“  
(اخبار ”الفضل“ ۵ اپریل ۱۹۴۷ء)

امیر شریعت نے انہی دنوں ملتان میں تقریر کرتے ہوئے کہا:  
”عزیز تو جوانو! میں پورے سے ایک سال سے اراداً تا خاموش  
ہوں، اور نہ اب تقریر کرنے آیا ہوں، ظاہر ہے کہ میں تم سے  
کہوں تو کیا کہوں، جو کہنا چاہتا ہوں وہ تم سنتے نہیں، اور جو  
تم سنتے ہو، وہ میرے بس میں نہیں۔ میں گھر کی چاب دیواری میں  
بند ہوں، جس کے اندر سارا کچھ ہی ہے اور باہر کچھ بھی نہیں



وہ ہے اسلام!

میرے پاس اللہ کی ایک کتاب ہے جسے میں معاشرہ  
انسانی کے لیے ضابطہ حیات سمجھتا ہوں، اور اسی کی تبلیغ گزشتہ  
چالیس سال سے کر رہا ہوں، تم مانتے نہیں ہو اور میں خاموش  
نہیں رہ سکتا۔

جب بھی شہرے کی کوئی بات دیکھتا ہوں تو مجھ سے بروا  
نہیں ہوتا۔ باہر نکل کر بیونکتا ہوں کہ چور دیوار میں توڑ رہے ہیں،  
مگر تم چور کو تو دیکھتے نہیں اٹا مجھے مارنے دوڑتے ہو کہ کم بخت  
سو نے نہیں دیتا۔ مگر کیا کروں عادت سی بن گئی ہے۔

بیماری نے میرا کچھ مر کال دیا ہے، سارا جسم بغاوت پر  
اُتر آیا ہے، ہونی بھی تو کم نہیں اس کم بخت کے ساتھ، بغاوت  
نہ کرے تو کیا کرے۔

مرزا بشیر الدین محمود نے ایک الہام شائع کیا ہے جسے  
آج کل مرزائی ٹھی تیزی سے ہواد سے رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے  
کہ نہیں سنے ایک رو یاد دیکھا ہے جس کے معنی ہیں کہ گاندھی آئے  
ہیں اور حضورؐ کے ساتھ ایک ہی چار پائی پر لیٹنا چاہتے ہیں اور  
فراسی دیر میں اٹھ بیٹھے اور گفت گو شروع کر دی۔

اس الہام کی تعبیر میں وہ خود ہی (مرزا بشیر الدین محمود)  
کہتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان اکٹھے ہو جائیں گے۔ یعنی



ہندوستان اور پاکستان اکٹھے ہو جائیں گے۔“

میں تم سے پوچھتا ہوں، مسلمانو! جس ملک کو دس ہزار

بیشیوں کی آبرودے کر اور چالیس لاکھ مسلمانوں کی بربادی اور

تباہی کے بعد حاصل کیا ہے، اسے پھر ہندوستان کے ساتھ

ملانے کے ارادے ہیں؟

مسلمانو! مرزا ایت کے جی ناپاک ارادے مجھے گھر کی

چار دیواری سے نکال کر تمہارے سامنے لے آئے ہیں، اور نہ اب

میں تھک چکا ہوں، وہی سہی کسز بیماری نے پوری کر دی ہے،

میں ایک عظیم خطرے سے پھر تمہیں آگاہ کرنے آیا ہوں۔ مرزا ایت

کے ناپاک عزائم خدا جانے کیا رنگ لائیں گے۔ انگریز گورنر اپنی

روحانی اولاد کو چناب کے اُس پار جو قیمتی زمین کوٹہ یوں کے بھائی

مے گیا ہے یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ انگریزوں کا یہ خودکاشتم

پودا پاکستان میں بیٹھ کر بھی برطانیہ کی جاسوسی کر رہا ہے۔

میری حکومت نے اگر اس طرف توجہ نہ دی، تو مجھے ڈر ہے

کہ اس ملک پر مرزائیوں کا قبضہ ہو جائے گا، میں اپنے پیارے

وزیر اعظم کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ وہ اس سیاسی ڈرامے پر

خصوصی نظر رکھیں۔“

امیر شریعت کی اس تقریر کو اُس زمانے کے اخبارات نے کافی دلچسپی

شائع کیا۔ امریکی دورے سے واپسی پر خان لیاقت علی خان نے امیر شریعت سے



ینے کی خواہش کی، لیکن انہوں نے یہ کہہ کر وزیر اعظم کو ملنے سے انکار کر دیا کہ:  
 ”یہ کام جماعت کے صدر کا ہے کہ وہ ناکے کسی ذمہ دار  
 آفیسر سے پانچہ سے دار سے ملیں، میں تو ادنیٰ و عا کار ہوں“  
 ان دنوں مجلس احرار کے صدر سائبر تاج الدین تھے، انہوں نے بھی کہا  
 مگر میرٹھ جیت سے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ کام آپ کا ہے۔

## مسلم لیگ کی غلطی

اسی سال ۱۹۴۷ء کی اسمبلی کے انتخابات میں پنجاب مسلم لیگ نے اپنے  
 امیدواروں میں چھ مرزاٹیوں کو شامل کر کے انہیں ٹکٹ دیدیے تھے۔ اس  
 سلسلہ میں مجلس احرار نے ایک پریس بیان میں کہا:

”مجلس احرار براہ راست سیاسیات میں دخل نہیں، اور  
 نہ ہی وہ انکیشن میں حصہ لینا پسند کرتی ہے۔ لیکن مسلم لیگ نے  
 مرزاٹیوں کو ٹکٹ دیدیے ہیں، اب مجلس احرار ان کا مفت ابلہ کرنا  
 اپنا دینی فرض سمجھتی ہے“

اس پر مجلس احرار نے پاکستان کے وزیر اعظم خان یاقوت علی خان سے  
 جو مسلم لیگ کے صدر بھی تھے، برقی اتار کے ذریعے احتجاج کیا، جس کے جواب میں  
 وزیر اعظم نے احرار رہنماؤں کو اپنے ایک ذمہ دار اور با اعتماد ذرائع سے یقین دلایا  
 کہ وہ ان سائقوں کا دورہ نہیں کریں گے، یہاں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر مرزاٹی انکیشن  
 لڑ رہے ہیں۔



انتخابات کے دنوں حضرت امیر شریعت نے اپنی بیماری اور ناتواہمت کے باوجود شب و روز ان قصبات کا دورہ کیا، جہاں مرزائی اسلام اور مسلمانوں کا سالباکس پہن کر الیکشن کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جب اس الیکشن کا نتیجہ نکلا تو تمام مرزائی شکست کھا چکے تھے جس پر مسلم لیگ کو کافی تڑپ ہوئی۔  
 اٹکسٹ اپٹری۔

## والد صاحب کا انتقال

ایران اور مصر کے حالات نے اس تیزی کے ساتھ گروٹ پی کہ برطانوی سامراج کے طوطے اڑنے لگے۔ ایران کے وزیر اعظم ڈاکٹر محمد مصدق نے اینگلو پشین آئیل کمپنی کے مابین معاہدوں کو ختم کر کے تمام وسیع کاروبار کو قومی تحویل میں لے لیا۔ اس سے برطانوی مفاد پر فحاصی ضرب پڑی۔ دوسری طرف مصر کے وزیر اعظم نحاس پاشا اس معاہدہ کے خلاف ہو رہے تھے جس کی رو سے برطانیہ کو نہر سوئز کی حفاظت کے لئے ایک مخصوص علاقے میں اپنی فوج منتعین کرنے کی رعایت حاصل تھی۔

ایشیا میں یہی حالات برطانیہ کے خلاف دہاں کے عوام میں بہادری پھیلا رہے تھے کہ بھارت کی فوجیں پاکستان کی حدود پر متعین کر دی گئیں۔ جنہیں پاکستان کے لئے فوجی خطرہ محسوس کرتے ہوئے وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے بھارت کے وزیر اعظم پنڈت نہرو سے احتجاج کیا اور ساتھ ہی ۷ جولائی ۱۹۵۱ء کو کراچی کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا:



”پاکستان جنگ نہیں چاہتا، لیکن حملہ آور

کے لیے پاکستان کا ”مکّہ“ تیار ہے۔“

یہی ”مکّہ“ بھارت کے خلاف پاکستان کا قومی نعرہ بن گیا، ان تمام اوقات

نے ایران، مصر اور پاکستان کو ایک دوسرے کی دھڑکنیں سننے پر مجبور کر دیا۔

پاکستان، بھارت کی ان جھگی سرگرمیوں کی وجہ سے میدان جنگ بن گیا۔

اور پھر پاکستانی ملک کی حفاظت کے لیے کھن برونش نظر آنے لگا۔ ان دنوں

۱۶ اگست ۱۹۵۱ء کو لاہور موچی دروازہ کے باغ میں پنجاب اسمبلی کے اسپیکر

آنر بیل شلیفہ شجاع الدین کی زیر صدارت ایمر شریعت نے کہا:

”حضرات اور صدر محترم! بزرگان ملت اور برادران عزیز!

جنگ کے متعلق کوئی مشورہ پارلیمنٹ دینا میرے بس کی بات نہیں،

یہ وزارت جنگ جانے لو، محکمہ جنگ، کہ کہاں لڑنا ہے اور

کہاں نہیں، یا کب لڑنا ہے اور کب نہیں۔ یہ کام ہمارا نہیں، لیکن

دعا گوہوں کہ خدا تعالیٰ ہمیں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔

۱۶ اگست کو ہم نے یوم آزادی منایا اور عوام نے دل

کھول کر خوش کا مظاہرہ بھی کیا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ

اس جذبے کو مستقل کر دیں۔

جب کچھ حاصل ہوتا ہے تو خوشی کا اظہار ہوتا ہے، لیکن

خوشی میں اصل چیز کو نہیں بھول جایا کرتے۔

پاکستان کسی چادر دیواری کا نام نہیں، اگر ہماری زندگی



مقتضیات سے عبارت ہے تو پاکستان بھی آپ سے کچھ تقاضا کرنا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جنگ اچھی چیز نہیں۔ لیکن جب گے پر جوابے تو پھر اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر ناگہان کوئی مہیبت آجائے تو اس کا دور کرنا بھی ضروری ہے۔

ہندو ہما سھانے اعلان کیا کہ ہم پاکستان کو بزور شمشیر فتح کریں گے۔ تشکیل پاکستان کے وقت "ٹاپ" اخبار نے بھی لکھا تھا کہ "نی الحال چلو پھر فوت کے ساتھ واپس آئیں گے"۔ اب تو بھارتی فوجیں پاکستان کی سرحدوں پر جمع ہو گئی ہیں لیکن خان ایقت علی خان کے جواب میں پنڈت نہرو نے کہا "ہم تو جنگ نہیں چاہتے، یہ فوجیں ہم نے امن کے لیے جمع کی ہیں"۔ خدا جانے پنڈت نہرو نے یہ نہیں بے خبری میں کہہ دیا ہو۔ لیکن خان ایقت علی خان نے مؤثر دیکھا ہے.... تاہم مجھے یقین ہے کہ جنگ نہیں ہوگی۔ اگر اعلان جنگ ہوا، تو بڑا بڑا سٹوری بھی میدان جنگ میں کھڑے ہو گا۔ مجھے افسوس ضرور ہے کہ میں جوان نہیں لیکن دشمن کے مقابلے میں جوان ہوں۔ میری تمنا ہے کہ بستر پر ایڑیاں دگر کر مرنے کی بجائے میدان جنگ میں جان دوں۔

جنگ اور کشیدہ حالات کے لیے احکامات مختلف ہوتے ہیں۔ اب یہ ہمارا ملک ہے، ذہنیت کو تیار کرنا چاہیے، ہم کسی کے غلام نہیں ہیں۔ یہ قلعہ زمین ہم نے بے پناہ شہدائیوں کے بعد



ماحول کیا ہے۔ اور تیرہ سو سال میں آج تک کسی نے آزادی کیلئے  
 اپنی قیمت ادا نہیں کی جتنی ہمیں کرنی پڑی ہے۔ اب اس پیش قیمت  
 ٹکائیہ قیمت پر پوچھنا ہے کہ لینے تیار رہنا چاہیے۔“

یہ بولنے سے خطاب کرتے ہوئے، آپ نے فرمایا :

”ہوائی جہاز بھی قوت ہے۔ بیاد و پیار سے سسر نکلیں،  
 برین گینس، انقلابیں، بلنگہ یہ سب پتیریں قوت ہیں، انہیں  
 اکٹھا کرو، اپنے فرائض کو سمجھو، حکومت کو مشورہ دو۔ وہ اپنی  
 ذمہ داری خود بخود کرتی ہے، اور خدا کرے زیادہ سے زیادہ  
 محسوس کرے۔“

یوں مجمع کی زیادتی کو دیکھنا نہیں چاہتا، اور نہ ہی پرجوش  
 جلسہ دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ یہاں سے اپنے مقرر کا فیصلہ کر کے  
 اٹھو۔ نو جوانوں پر میدان کارزار کی بات نہیں، اس سے پہلے کی  
 بات ہے۔ لڑائی کے وقت کیا کرنا ہوگا، اس کے لیے اذرا حکام ہیں  
 اپنی توہمنا آئندہ وقت کے لیے تیار کر دو، دیکھو کہ بھٹاؤ،  
 قرآن کے ارشاد کے مطابق اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں  
 پر راتر ساراں مہیا کرو کہ دشمن مر غائب ہو جائے۔ تو تم میں سب  
 کچھ ہے، قوت کے بغیر کچھ بھی نہیں۔“

انہیں بہرہ، حرار کے مہارت کی وضاحت کرتے ہوئے اعلان کیا :  
 ”یہ ٹھیک ہے کہ سہ ماہی پاکستان کی مخالفت کی لیکن



جو کچھ کیا اور جو کچھ سمجھا وہی کچھ کیا۔ ہمارا ضمیر اس وقت بھی  
مطمئن تھا اور آج بھی شرمندہ نہیں۔

آج ہم کسی سے ڈب کہ کچھ نہیں کہہ رہے بلکہ پوری آزادی  
سے کہتے ہیں کہ دفاع وطن کے لیے تیار ہو جاؤ، اور اگر کوئی غدار ہو  
تو اسے کیفر کردار تک پہنچاؤ۔ میں آپ سے کچھ نہیں مانگتا۔ میرے  
پاس نہ دولت ہے نہ ثروت، صرف آپ کی خدمت میں  
پورے غلوں سے اتھا کرتا ہوں۔ آپ کے پاؤں پر سفید وارٹھی کر کے  
پہیل کرتا ہوں کہ آپ اسے منظور کریں! اور وہ یہ کہ ایک جوان بھی  
ایسا نہ رہے جو پیشگی گارڈ کی وردی نہ پہننے ہوئے ہو!

امیر شریعت کی اس تقریر نے سارے لاہور کو میدان کارزار کیسے تیار کر دیا۔  
حالات بوشش جہاد کے جذبات سے آگے بڑھ رہے تھے سارا ملک  
جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ امیر شریعت کراچی، راولپنڈی، پشاور اور لاہور  
کے علاوہ دیہات و قصبات میں بھی جہاد کی تقریریں کر رہے تھے کہ ۱۴ اکتوبر  
۱۹۵۱ء کو راولپنڈی کے ایک عام اجتماع میں خان یاقوت علی خان کو  
گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

اسی سال ۸ دہر شعبان المعظم ۱۳۷۱ھ کے روز امیر شریعت کے والد محترم  
عافظ سید ضیاء الدین شاہ صاحب بخاری اٹھاسی سال کی عمر پا کر اپنے گاؤں ناگڑیاں  
مملح گجرات میں انتقال کر گئے۔ اس وقت حضرت امیر شریعت کی اپنی عمر ساٹھ سال  
کے قریب تھی، لیکن اس مقام پر بھی حضرت امیر شریعت جب کبھی گاؤں جاتے



نوادہ صاحب انہیں مزبور عطاء اللہ کہہ کر نکارتے تھے، یا بڑے سے پیار میں ہوں،  
 زحاقظہ جی کہہ دیتے۔ مگر بقول امیر شریعتؒ ایسا وقت زندگی میں گم ہی آیا۔ کیوں کہ  
 حافظ بیہوشیا والدین شاہ صاحب بخاری درحمتہ اللہ علیہ کی طبیعت میں جلال ہی جلال تھا۔  
 والد صاحب کی موت نے امیر شریعتؒ کی تھمت کو خستہ و پوارہ کی طرح گرادیا۔  
 لیکن پاکستان کے حالات اور مرزائیوں کے بارادوں سنہ اٹھاسی میں  
 والد صاحب کے افسوس کا بہت کم وقت دیا۔

## ایک اہم انکشاف

پاکستان کے وزیر اعظم کی موت کے باوجود پھاروسٹ کے جنگی اراکین نے ہندو  
 قائم ہے۔ اس کے پیش نظر ملک کے دینی انتظامات ہو رہے تھے کہ ۲۲-۷۵ پانچ  
 ۱۹۵۲ء استھ کام پاکستان احرار کانفرنس میں شمولیت کے لیے امیر شریعتؒ  
 سرگودھا پہنچے۔ سارا علاقہ اپنے عجیب و غریب رنگ کی زیادت کے لیے سمندر کی طرح  
 اٹھ آیا تھا۔ آپ کی قیام گاہ پر ایک شخص نے امیر شریعتؒ سے عرض کی میں گفتگو  
 کرنے کو کہا، جسے بڑے اصرار کے بعد امیر شریعتؒ نے مان لیا۔ قریب آدھ گھنٹہ  
 کے بعد امیر شریعتؒ واپس دوستانوں میں آئے تو ان کے چہرے پر پریشانی کے  
 آثار نمایاں تھے۔

کابل اور پٹنہ، سپاہ عینک لگائے دراز قامت یہ کون شخص تھا کہ جب  
 امیر شریعتؒ اس سے مل کر علیحدہ ہوئے تو تحریک ختم نبوت کا آغاز ہو گیا۔ یہ راز حضرت  
 حضرت امیر شریعتؒ کے پاس محفوظ ہے، اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔ البتہ



مخربیک تم نبوت کے بعد مانی کو دیکھتے رہے رہا ہوسے تو اپنے مکان و مکان میں  
بیٹھے پیکاری راقم سے کہنے لگے ،

”جاننا زاتم اس سال سرگودھا کا نفرس میں موجود تھے جب یہ  
آدمی مجھے علیحدگی میں بلا تھا ؟“  
”جی ہاں وہی تھا“

”بھلا وہ آدمی کون تھا اور اس نے کیا کہا تھا ؟“  
”حضرت! یہ تو آپ سے بتایا ہی نہیں تھا“

مسکرا کر فرماتے لگے ”نام تو اب بھی نہیں بتاؤں گا، لیکن تھارو اور  
سرکاری آدمی، اور بتایا یہ تھا کہ راجہ سمنندر علی جو ان دنوں ایران میں پاکستان  
سیفرتھے) اور سرظفر اللہ خاں (جو پاکستان کے وزیر خارجہ تھے) کے درمیان  
حال ہی کی ملاقات میں یہ فیصا ہوا ہے کہ اس وقت ہم دونوں اقتدار پر ہیں  
کیوں نہ حکومت پاکستان سے ایسا قانون پاس کرالیں کہ پاکستان میں کوئی فرقہ  
کسی فرقے کو کافر نہ کہے“

اس کے لیے کوشش شروع ہو چکی ہے، شاہ صاحب! اگر آپ کچھ  
کر سکتے ہیں تو کریں

یہ واقعہ منسلک کے بعد امیر شریعت نے کہا :

”ہمیں یاد ہے کہ میں نے اسی رات بغیر جماعت کے مشورے سے کہ  
سرظفر اللہ کا شہر میں جنازہ نکلوانے کا اعلان کر دیا تھا، اگر اس رات یہ جرحہ  
نہ کرتا، تو تمہیں ہے شک میں کوئی قانون ایسا بن جاتا کہ باطل کو اپنی زندگی کے لیے



## قانون کا سہارا میسر آجانا

سازش عمل میں ہو یا جھوٹی پٹری میں، قانون دونوں جگہوں کو مجرم قرار دیتا ہے۔ راجہ غضنفر علی (ثبیبہ) اور چو دھری سرفراز اللہ خان (مرزائی) اپنی سزائی ذمہ داریوں کی اوٹ لے کر اگر اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاتے، اگر ان کی باہم سازش پاکستان میں کسی قانون کے بنانے کی ترکیب ہوتی، جس کی بدولت سے کفر کو کفر کہنا مجرم قرار دیا جاتا، تو پھر استھکا ہم پاکستان کے لیے صدیوں کی ضرورت پڑتی۔

امیر شریعت کی فراست اور دوسرے ننگے ہوں نے تھوڑی سی تلخی گوارا کر کے یہ زہر بھی پی لیا کہ وطن عزیز کا مستقبل باطل کے ہاتھوں تار بیک ہو جائے۔

## بیٹی کی شادی

گھریلو رسم و رواج اور برادری کے مرد و عورتوں سے انحراف جو شے تیرلانے کے مترادف ہے۔ پھر اُس آدمی کے لیے جس نے عوام کو ہمیشہ مذہب کی راہیں سجھائی ہوں، اس وادی سے گزرنا اور بھی مشکل ہے۔ امیر شریعت کے قدم اس راہ میں بھی نہیں ڈگمگائے، حالانکہ اُن کی برادری بھی تھی اور خاندان کی رسمیں بھی، لیکن تیرملکی سلطنت کے باغی اور اسلام کے داعی نے سماج کے بنائے ہوئے تمام آئین کو ٹھکرا کر اسلام کے ضابطہ حیات کو اپنی عاقبت کے لیے بہتر سمجھا، اور نہ ہی بیٹی کا "وز" تلاش کرنے میں عجلت کی، اور نہ ہی خاندانی حصار میں رہے، بلکہ نیک سیرت،



نیک خصلت اور تقویٰ کے پابند نوجوان کی جستجو میں بیٹی کے بالغ ہونے تک  
اپنی نظروں کو مصروف رکھا۔ آخر اس شخص میں کامیاب نکلے۔ بجز حوادث  
کے باوجود ایسا موتی تلاش کیا کہ جس کی توراہی پر فرشتے وضو کر سکتے ہیں۔

بعد الحکیم ضلع کے ایک گننام سید محمد شفیع شاہ صاحب جن کا  
آبائی وطن پسرور ضلع سیالکوٹ ہے، کے لڑکے سید کبیر احمد شاہ سے اپنی لڑکی کی  
نسبت کر دی۔

وکیل احمد شاہ شادی سے قبل دینی کتب سے فارغ ہو کر بی۔ اے کے  
طالب علم تھے۔ سیرت کے ساتھ مشاطہ فطرت نے انہیں حسن ظاہری سے  
بھی سزاوار ہے۔ بوٹا سا قد، چشم آہو، کھلکی پیشانی، یہ سارا کچھ گندھی رنگ کے  
چہرے پر اس قدر خوبصورت اور دلآویز ہے کہ صنایع فطرت کی بلائیں لینے کو  
جی چاہتا ہے۔

بہتر

بیٹی کا بہتر زمانے کے رسم و رواج میں والدین کے لیے عذابِ نبوی  
سے کم نہیں یہ رسم فرض کی رقم سے پوری کی جائے یا اناٹہ حیات پہنچ کر۔ دونوں  
عمورتوں میں لڑکی کے والدین کا مستقبل تا ایک ہو جاتا ہے۔ لیکن امیر شریعت  
کفر کی اس عمارت کو استغلال کے جن ارادوں سے چکنا چود کیا، اور عزت  
سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چادر میں لپیٹ کر گھر سے رخصت کیا  
بھی ایک جہاد تھا، سو سائٹی کے ان مروجہ رواج کے خلاف جس۔



دو روواں میں نجات مشن ہے۔

انصاف کلائف ہاؤس ڈائمنی پورے کے مالک شیخ گلزار کا بیان ہے کہ :

”شاہ جی اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں کراچی آئے

اور کہا کہ تمہاری ہمیشہ کی شادی کے لیے کپڑا خریدنا ہے بازار

پیدا۔ میں ہزار روپیہ جیب میں ڈال کر شاہ جی کے ساتھ ہو گیا

پانچ سو سے کچھ کم کا کپڑا خرید چکے تو کہا ”بس بیٹا!

میں نے عرض کیا : ”حضرت یہ تو کچھ بھی نہ ہوا“

جواب میں کہا - ”بیٹا! میری گرہ اسی قدر اجازت دیتی ہے

اس پر لبر نہ نے عرض کیا - ”حضرت! پیسے بہت ہیں“

کہا - ”نہیں میرے عزیز! میں تمہیں اس لیے سنا رہا ہوں کہ

تمہارے پاس پیسے بہت ہیں، بلکہ مجھے اس کپڑے کی پہچان

نہیں، اور دوسرا تمہارے ساتھ ہونے سے کچھ رعایت ہو گئی“

پچنانچہ شاہ جی نے تمام رقم اپنی گڑ سے ادا کی“

رسم نکاح مخدوم محترم حضرت مولانا عبدالقادر نے پوری نے ادا فرمائی

اور اسی طرح مارچ کے آخر یا اپریل ۱۹۵۲ء کے شروع میں ائیر ٹرینٹ نے

اپنے جگر گوشے کو آنسوؤں کے زریروں سے آراستہ کر کے گھر سے رخصت کیا۔

شادی کے بعد سید وکیل احمد شاہ نے عربی کا ایم۔ اے کیا اور اس پر

نمر سے پانچ کھد کے لباس میں ملبوس، شرعی و اٹھنی، طبیعت میں سادگی

لیے ہونے پر نوجوان آج میونسپل کالج اوکاٹہ میں پروفیسر ہے۔



## تحریکِ مسلمِ نبوت

۱۸۵۷ء کے بعد غیر ملکی حکمرانوں نے اپنے دائمی استحکام کے لیے ہندوستان کی مختلف اقوام میں منافست کا بیج بویا، اُس کے برگ و بار میں مرزاہیت ایک ایسی تحریک ثابت ہوئی کہ نہ صرف اسلام کے بنیادی ستون ہی متزلزل ہوئے بلکہ ہندوستان کی غیر ملکی غلامی کی عمر بھی طویل ہوتی چلی گئی۔ جیسے جیسے اجنبی راج کا اقتدار بڑھتا گیا، اسی رفتار سے مرزاہیت کو پھینکے کے وسائل میسر آتے رہے۔

اپنی بنیاد کے دو سال بعد مجلسِ احرار نے اس تحریک کے مقابلے کیلئے قادیان میں اپنا دفتر قائم کیا۔ زعمائے احرار کے نزدیک غلامی سے آزادی تک کا راستہ مرزاہیت کی موت کے بغیر طے نہیں ہو سکتا تھا۔ جڑ کاٹنے سے پیشتر درخت کے تنے اور شاخیں کاٹنا ضروری ہوتی ہیں۔

۱۹۲۰ء میں امیرِ شریعتؒ نے مرزا بشیر الدین محمود کو لٹکارا تھا۔ اُس وقت اُن کی یہ لٹکارا فردی حیثیت رکھتی تھی، لیکن ۱۹۳۱ء میں مجلسِ احرار نے جب مرزاہیت کا محاسبہ کیا تو امیرِ شریعتؒ کے لاکھوں مرید اور ہزاروں رضا کاروں کی فعال جماعت اُن کی پشت پناہ تھی۔

۱۹۴۷ء میں انگریزی سامراج کے خاتمے نے یہ اُمید دلائی تھی کہ پاکستان اسلامی ریاست ہوتے ہوئے غیر اسلامی مذاہب کو اس قدر اہمیت نہیں دے گا کہ وہ پورا اور راست ریاست کے نظم و نسق پر حاوی ہو جائیں۔ ان دنوں مرکزی



اور صوبائی حکومتوں کے درمیان مصلحتی سازشوں کا جال اس نیزی سے بچایا جا  
 رہا تھا کہ اندرون ملک کی سیاسی تلبازوں سے حکمران طبقہ قطعاً نا آشنا تھا۔  
 خان یونس علی خان کی موت کے بعد خواجہ ناظم الدین وزارتِ عظمیٰ کی کرسی  
 پر جا بیٹھے، اور اپنی جگہ ملک غلام محمد کو وزیر خزانہ بنائے۔ پاکستان کا گورنر جنرل  
 بنا دیا، اور وزیر خزانہ کی کرسی پر وزیر خزانہ علی کے جواسے کر دی گئی۔ اس عاجلانہ  
 اٹھانے سے پاکستان کی سابقہ خارجہ پالیسی پر بھی اثر کیا۔ شہید وزیر اعظم نے  
 اسلامی ممالک سے جو راہ ورسم پڑھائے تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے اپنی حکومت کا  
 رخ ان سے مختلف کر دیا۔ مصر اور ایران کی حمایت کرنے کی بجائے برطانوی  
 سامراج سے قربت داری کو مقدم سمجھا گیا۔

اس افراتفری میں صوبائی اور مرکزی حکومت کے مابین اختلافات میں  
 کشیدگی شروع ہوئی۔ پنجاب میں میاں ممتاز محمد خان دوٹانہ اور حیدر میں خان  
 عبدالقیوم خان نے من مانی کارروائیاں شروع کر دیں۔ اس طرح سندھ کے گورنر  
 شیخ دین محمد نے صوبے کے وزیر اعلیٰ محمد ایوب کھوڑو اور وزیر مال قاضی فضل اللہ  
 کے خلاف پیروڈا کے تحت مقدمات دائر کر دیے۔ مشرقی پاکستان میں اردو کے مقابل  
 بنگالی زبان کو پاکستان کی قومی زبان بنانے پر ماں کے طلبانے ایچی ٹیٹن شروع  
 کر دی۔ غرض ہر صوبہ کے حاکم اعلیٰ نے اپنی اپنی سیاسی ضرورت کے لیے کبھی الیکشن کا  
 ہنگامہ، کبھی اسٹے کی قلت کا سوال اور کہیں بنگالی اور اردو کے تصادم سے عوام کو  
 مرکزی حکومت کے خلاف اکسایا۔

پاکستان کے ایسے حالات کو مرزا یوں نے اپنے لیے مفید پا کر اگھنڈ بھارت کے



الہامی عقیدے کی تبلیغ شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے مختلف انجیال  
 دہناؤں کو مرزا اہیت کے متعلق سوچنا پڑا۔ امیر شریعت ۱۹۳۹ء میں سیاست سے  
 علیحدگی کے بعد قادیانیت کے استحصال کے لیے ہمہ تن مصروف تھے کہ ۹ مئی  
 ۱۹۵۱ء کو برکت علی ہال لاہور میں ایک کنونشن بلایا گیا، جس میں امیر شریعت بھی  
 شریک ہوئے۔ اس اجلاس کے اختتام پر مرزا اہیت کے ضدت سامنے مغربی  
 پاکستان میں تحریک کا آغاز ہوا لیکن حکومت کے سامنے مطالبات رکھنے کے لیے  
 کنونشن کے مختلف اجلاس لاہور اور کراچی میں ہوئے۔ اس اثنا میں مرکزی اور صوبائی  
 حکومتوں کے باہن حالات نے کسی کروٹیں لیں حکمرانوں کو غافل پا کر مرزا اہی لیڈر  
 مرزا بشیر الدین محمود نے کہنا شروع کر دیا :

۱: "احمدیت کے مخالف، عنقریب مرزا صاحب یا ان کے کسی

جانشین کے سامنے مجرموں کی طرح پیش ہوں گے"

(خطبہ جمعہ بشیر الدین محمود - ۳ جنوری ۱۹۵۲ء)

۲: "احمدیوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ فوجی محکموں کی طرح

گورنمنٹ کے دوسرے محکموں میں بھی بھرتی ہونے کی کوشش کریں

تاکہ تبلیغی پروگرام کو تقویت پہنچے"

(خطبہ جمعہ بشیر الدین محمود - "الفضل" ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء)

بیز مرزا ایوں کو ہدایت کی گئی،

"ایسے حالات پیدا کر دو کہ ۱۹۵۲ء گزرنے سے پہلے پہلے

مؤمن احمدیت کی آغوش میں گرنے پر مجبور ہو جائیں۔" (الفضل، ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء)



مرزا بیوں کی ان اشتعال انگیز تحریروں نے پاکستانی عوام کو  
اس قدر مشتعل کیا کہ وہ وطن عزیز اور ایمان ایسی گرانسب رو دست کو محفوظ  
رکھنے کے لیے تدبیریں سوچنے لگے۔

امیر شریعت کی صحت اور۔۔۔ اُن کا ذاتی معالج (علیم عطار اللہ خان)  
اُنہیں کسی قسم کے سفر کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ لیکن توہین قائم الانبیاء کے  
باعث امیر شریعت اپنی بیماری کو بھول چکے تھے۔ تحریک راجپال کے  
بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ امیر شریعت مرزا ایت کے خلاف اس قدر جذباتی  
ہو گئے تھے کہ اس سے پیشتر انہیں کبھی اتنا متشدد نہیں دیکھا گیا تھا۔

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کے آگے "لَا نَبِيَّ بَعْدِي" کا  
جملہ ہر جمع میں کہتے اور عوام کو تاکید کرتے کہ :

"مقام نبوت ایسے خطرناک سوڑ پر آن پہنچا  
ہے، اگر آج اس کی حفاظت نہ کی گئی، تو  
قیامت کے دن ہم سب کی بخششوں کا کوئی  
امکان نہیں۔"

یہ فقرہ کہتے ہوئے امیر شریعت کی حالت غیر ہو جایا کرتی تھی، وہ آپس سے  
باہر ہو کر غصہ میں کا پینے لگتے۔

مرزا ایت کے خلاف تحریک ہونے میں نہیں ہوئی تھی جس لائق  
امیر شریعت نے مغربی پاکستان کو اپنی تقریروں سے اس قدر مشتعل کر دیا تھا  
کہ تحریک کا سینچا شکل ہو رہا تھا تاہم ایسی بات نہیں تھی کہ یہ حالات کے



بگڑنے کا امکان ہو۔ ۱۶، ۱۸، ۱۸ مئی ۱۹۵۲ء کو جہانگیر پارک کراچی میں  
چودھری سرفراز اللہ خان وزیر خارجہ پاکستان نے مرزا ایوبوں کے سالانہ اجلاس میں  
وزیر اعظم پاکستان کے منع کرنے کے باوجود تقریر کی، جس نے حالات کو زیادہ  
خراب کر دیا۔ لیکن امیر شریعت کی تقریروں نے حالات کو بہت حد تک بہتر بنانے  
تشدد کی طرف سے رخ سوجھ کر محض احتجاجی کر دیا۔ انہیں دنوں

ملتان شہر کے ایک تھانہ (کپ) کے سب انسپکٹر غلام مصطفیٰ نے

جس کے متعلق لوگوں کی رائے تھی کہ یہ مرزائی ہے، ۱۵ جولائی کو عوام کے ایک

جنوس پر لاکھوں چارج کیا تھا، عوام نے تھانہ کے سامنے جمع ہو کر اس کے خلاف

احتجاج کیا، تو اس مجمع پر بلا وارننگ گولی چلا دی گئی۔ دس منٹ تک شہر اڈنڈ

چلانے لگے، جس کے نتیجے میں چھ مسلمان شہید ہوئے اور زخمیوں کی تعداد کہیں

زیادہ تھی۔ اس خوفناک واردات کے خلاف سارے پاکستان میں یوم احتجاج

منایا گیا۔ ۲۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو امیر شریعت نے شہدائے ملتان کو حسب ذیل

الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔ آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

اَحْسِبِ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْا اَنْ يَقُوْلُوْا اِنَّا وَهْمٌ

لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ فْتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

فَلْيَعْلَمُوْا اللّٰهُمَّ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا لِيَعْلَمَنَّ

الْحٰكِمِيْنَ ۝

ترجمہ: کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ محض ایمان لانے سے

ہی نجات حاصل کر لیں گے اور ان کی کوئی آزمائش نہ ہوگی۔



حالانکہ وہ تمام لوگ آزمائے جا چکے ہیں، جو ان سے پہلے  
 گزرے ہیں، پس معلوم کر لے گا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو حق و  
 صداقت پر ہیں اور ان لوگوں کو جو کاذب و مفتری ہیں۔“  
 (آپ نے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہٴ خلافت کا تذکرہ کرتے  
 ہوئے فرمایا)

”جب مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کر کے اسلام کے  
 بنیادی عقیدہ کو گزند پہنچانے کی ناپاک کوشش کی تو حضرت  
 صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کاذب و مفتری سے  
 کسی قسم کا مناظرہ کر کے دعویٰ نبوت کے جواز میں دلیل طلب  
 نہیں کی۔ اگر کیا تو یہ کہ سات ہزار سے زائد حافط قرآن  
 صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین، ناموس رسالت اور تاج و تخت  
 ختم نبوت پر قربان کر دیئے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی متاع دین و  
 ایمان کو ایک عیار اور مکار کی دست برد سے بچالیا۔ اور آئندہ  
 کے لیے ملتِ اسلامیہ کو سبق دیا کہ جو شخص اس قسم کی ناپاک  
 کوشش کرے، اس کے لیے اسلام اور ملتِ اسلامیہ کا فیصلہ  
 کیا ہے؟

لمنان کے غیور اور صاحبِ ایمان مسلمانوں نے بھی اس  
 دہرے پر آشوب میں جبکہ کفر و ارتداد کی سیاہ گھاؤں نے ایمان و  
 ایقان کو پریشان کر رکھا ہے، اسلام کی لاج رکھ لی، اور اپنے



جگر گوشوں کو شمع رسالت پر پروانہ وار نشانہ کر کے ثابت کرنا ہے  
 کہ مسلمان آج بھی فخر و عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت ناموس کی  
 خاطر گویوں کی بارش میں مسکرا سکتا ہے۔  
 رُتبر شہید ناز کا کر جان نبیؐ  
 قربان جانے والے کے قربان جانیئے

خدا کی نعمتیں بچھاؤ ہوں تم پر شہیدان ناموس رسالتؐ،  
 سلام ہو تم پر ان سے ختم المرسلین کی عزت و آبرو پر قربان ہو نبیوں  
 مبارک ہیں ان کے والدین کہ ان کے نذرانے سرکار رسالتؐ  
 میں شرف قبولیت حاصل کر گئے۔

یوں تو اس دنیا میں ہزاروں نیچے جہنم لیتے ہیں اور مر  
 جانتے ہیں۔ ہزاروں کلیاں کھلتی ہیں اور بادِ سموم کے پھیپڑوں کی  
 تاب نہ لا کر مرتبھا جاتی ہیں۔ مگر وہ موت جو حقی اور راستی کی راہ میں  
 آئے، حیاتِ جاودا بن کر آتی ہے۔

جو موت آئے تو زندگی بن کے آئے  
 قضا کی نرالی ادا چاہتا ہوں

## مجلس عمل کا قیام

صدر مملکت بننے کی خواہش میں ملک، غلام محمد گورنر جنرل، خواجہ ناظم ال  
 کی کیمپٹ پر اپنا اثر بڑھا رہے تھے، اور اس میں وہ خاصے کامیاب رہے۔



کیبنٹ کے پاریمانی اختیارات آہستہ آہستہ گورنر جنرل کے ہاتھ میں آگئے اور  
فیصلوں کی تمام ذمہ داری گورنر جنرل کے قبضے میں چلی گئی۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں  
کی اس باہم کھینچا تانی نے مرزا ایتھ کے خلاف تحریک کو زیادہ موادی۔

پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کی نواب افتخار حسین

آف ممدوٹ سے اندرون خانہ چل رہی تھی۔ نواب ممدوٹ نے صدر کے

عبد القیوم خان سے دولتانہ کے خلاف سمجھوتہ کر لیا تھا، دوسری طرف دولتانہ

مرکزی حیثیت حاصل کرنے کی غرض سے خواجہ ناظم الدین کے خلاف ابھرتی ہوئی

مرزائی مسلمان ایچی ٹیشن کو اراوتانہ نظر انداز کر رہے تھے۔

یہ تھاپس منظر جس نے عوام میں یہ تاثر دیا کہ مرزا ایتھ کی مخالفت تحریک

دولتانہ کی پیداوار ہے۔ حالانکہ دولتانہ مرکز سے اور نواب ممدوٹ سے اپنا

سیاسی انتقام لے رہے تھے۔

ایسے حالات میں مرزائیوں کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوازیوں نے عوام کو موقعہ دیا

کہ وہ حکومت سے مرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا

مطالبہ کریں۔ جہانگیر پارک میں ظفر اللہ خان کی تقریر کے بعد کراچی میں ۲۲ جون ۱۹۵۲ء کو

آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن طلب کیا گیا۔ جس میں دو دن کی مسلسل بحث کے بعد

حسب ذیل قرارداد کی تشکیل کی گئی۔

۱:— مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

۲:— چودھری ظفر اللہ وزیر خارجہ کو اس کے عہدے سے الگ

کر دیا جائے۔



۳۔۔۔ مرزا بیٹوں کو تمام کلیدی آسامیوں سے ہٹا دیا جائے۔  
 ان مطابقت کی تصدیق کے لئے ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو لاہور برکت علی ہال  
 میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کا پھر اجلاس ہوا، جس میں حسب ذیل حضرات کی  
 ایک مجلس عمل مرتب کی گئی۔

۱۔۔۔ مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری صدر جمعیتہ علمائے پاکستان

۲۔۔۔ مولانا امین احسن اصلاحی (جماعت اسلامی)

۳۔۔۔ ماسٹر تاج الدین انصاری (احرار)

۴۔۔۔ شیخ حسام الدین (احرار)

۵۔۔۔ مولانا عبدالملکیم ستاسمی (جمعیتہ علمائے اسلام)

۶۔۔۔ مولانا محمد طفیل (جمعیتہ علمائے اسلام)

۷۔۔۔ مولانا محمد بخش مسلم (جمعیتہ علمائے پاکستان)

۸۔۔۔ مولانا غلام محمد نونم (حزب الخفاف)

۹۔۔۔ مولانا غلام دین (حزب الخفاف)

۱۰۔۔۔ مولانا داؤد غزنوی (جمعیتہ اہلحدیث)

۱۱۔۔۔ مولانا عطارد اللہ حنیف (جمعیتہ اہل حدیث)

۱۲۔۔۔ مولانا نصر اللہ خاں عزیز (جماعت اسلامی)

۱۳۔۔۔ حافظ کفایت حسین (ادارہ تحفظ حقوق شیعہ)

۱۴۔۔۔ مظفر علی شمسی (ادارہ تحفظ حقوق شیعہ)

۱۵۔۔۔ مولانا نور الحسن شاہ بخاری (تنظیم اہل سنت والجماعت)



۱۶۔ صاحبزادہ فیض الحسن راجن سجادہ نشینان پنجاب

۱۷۔ مولانا عبدالغفور ہزاروی راجن سجادہ نشینان پنجاب ✓

۱۸۔ علامہ علاؤ الدین سدیقی (نامزد)

۱۹۔ مولانا اختر علی خاں (نامزد)

۲۰۔ مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش (نامزد)

جلس عمل سنہ ۲۳ جنوری ۱۹۵۳ء کو وزیر اعظم پاکستان سے مل کر انہیں اپنے مطالبات پیش کئے اور ایک ماہ کا نوٹس دے دیا۔ کہ اگر ۲۲ فروری ۱۹۵۳ء تک مجلس عمل کے متذکرہ مطالبات منظور نہ کئے گئے تو مجلس اپنے مطالبات منوانے کے لیے راست اقدام کرنے پر مجبور ہوگی۔

اس دوران دوسری جماعتوں کے مقررین کے علاوہ امیر شریعت نے پنجاب، سندھ اور حیدرآباد میں تقریریں کر کے مسئلہ ختم نبوت کو عوام کے سامنے بڑی وضاحت سے بیان کیا۔ اس ضمن میں پشاور کے چوک یادگار کی ایک تقریر کے اقتباس خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مفتی محمد مولانا عبدالقیوم پوپلزی کی صدارت میں تقریباً ساٹھ ہزار نفوس کی حاضری میں امیر شریعت نے فرمایا:

”اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کا

بہاں ذکر کیا ہے، وہاں ہر نبی کے بعد آنے والے دو گروہوں سے نبی کی

پہلے اطلاع دے دی۔ چنانچہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنے

بعد آنے والے نبی کی بشارت دیتے رہے۔ حتیٰ کہ یہ سلسلہ نبوت

خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک آن پہنچا۔



آپ نے فرمایا کہ مَا صَاحِبَانِ مُحَمَّدًا يَا أَحَدِيْ مَنْ  
 رَجَا لَكُمْ وَلِحَيْثُ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَخَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ ه  
 حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کے باپ  
 نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں کے خاتم  
 کرنے والے ہیں۔

اگر حضور کے بعد کسی اور نبی سے آنا ہوتا اور یہ سلسلہ نبوت  
 جاری رہتا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ اعلان نہ فرماتے  
 کہ اِنَّا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لِاَنْسَبِيْ بَعْدِي ، یعنی میں آخری  
 نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

یہ ناچارہ مدینہ رحمت و دو عالم، خاتم الانبیاء کی شان اقدس  
 پر انتہائی کمینہ اور گستاخانہ حملہ ہے کہ ایک انگریز کا پروردہ  
 اٹھ کر یہ اعلان کرے کہ قرآن پاک کی وحی الہی میں میرا نام  
 محمد رکھا گیا اور رسول بھی۔ (ایک غلطی کا ازالہ)

امیر شریعتؒ نے فرمایا:

”اگر میں آج یہ اعلان کروں کہ میں مشائخ اعظم ہوں تو کیا

تم برداشت کرو گے؟“

سامعین: ”ہرگز نہیں!“

امیر شریعتؒ: ”اگر تم اپنے ایک ذنیوی لیڈر کا مقام کسی دوسرے شخص کو

دینے کی اجازت نہیں دیتے تو پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ



برطانیہ کا پچھٹو، تاجدارِ مدینہ حاتم الما بنیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ  
 علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرے کہ میں  
 محمد ہوں۔

اسی اصول اور ضابطے کے مطابق ہم اپنی حکومت سے  
 مطالبہ کرتے ہیں کہ چونکہ مرزا ایٹوں نے حضور پر نور کے بعد مرزا  
 غلام احمد کو اپنا نبی تسلیم کر کے اپنا تعلق سرکارِ مدینہ سے توڑ لیا ہے  
 اسلامی آئین کے مطابق حضور کے بعد کسی دوسرے نبی کو ماننے  
 والے مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔“

امیر شریعت نے فتاویٰ الہام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

مرزا بشیر الدین محمود کہتا ہے کہ موجودہ ملکی تقسیم غلط ہے، یہ تقسیم

ختم کرانے اور دونوں ملکوں کا باہمی افتراق دور کرانے کی وہ ہر ممکن

کوشش کریں گے۔ اس عارضی تقسیم کو کسی نہ کسی طرح ختم کیا جائے گا،

اور ہند و پاکستان کو پھر اکٹھا ہندوستان بنایا جائے گا۔“

”جو آزادی ایک لاکھ ماؤں، بہنوں کی عزت و آبرو و قربان

کن کے اور دس لاکھ مسلمانوں کا خون بہا کر اور ایک کروڑ

مسلمانوں کی حیات پر باوی کے بعد حاصل کی گئی ہے اس کو

عارضی آزادی سمجھنے والا ملک و ملت کا بدترین دشمن نہیں، تو

اور کیا ہے؟“

یہ بصیرت افزوہ تقریرات ایک بجے تک جاری رہی۔



## راست اقدام

۲۳ جنوری ۱۹۵۳ء سے ۲۲ فروری ۱۹۵۳ء تک واقعات۔  
 کسی کو نہیں لیں۔ صوبائی اور مرکزی حکام نے مجلس عمل کے رہنماؤں کو دھمکایا بھی  
 اکثر کارکنوں پر مقدمہ سنا بھی دائر کئے۔ اخبارات پر تدریجی لگائی گئی، سب  
 مزایا کے خلاف عوام کا غم اُبلتے ہوئے لاوے کی طرح تیز تر ہوتا چلا گیا  
 تا آنکہ ۲۲ فروری کا سورج طلوع ہو گیا۔

خدا اور رسول کے نام پر حاصل کی ہوئی مملکت کے حاکموں پر مسلمانوں  
 یقین تھا کہ کچھ بھی ہو اپنا سر زمین پر تخت ختم نبوت تک پہنچنے والے پاؤں سلا  
 نہیں رہ سکتے۔ وہ ہاتھ جو سزناج ابلے اور کے گریبان تک پہنچنے کی گستا  
 کرے گا نسل کر دیا جائے گا۔ وہ آنکھ پھوڑتی جائے گی جس کے ارادوں  
 برائی جھلک رہی ہوگی۔ مگر اپنی گریبوں کے لیے لڑنے والے حاکموں  
 پیغمبر خدا علیہ السلام کی نبوت کو لاوارث قرار دے کر اُس سے ان  
 بے اعتنائی برتی کہ ۲۲ فروری کا دن اُمیدویاس کے درمیان گذر گیا، اس  
 پیشتر لاہور سے کراچی روانہ ہونے ہوئے امیر شریعت نے دہلی دروازہ کے رخ  
 میں اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ:

”عزیزان من! مرزا بیستہ بیستہ فتنے کی پرورش برطانیہ نے  
 کیا ہے، اگر افغانستان ہوتا تو اس فتنے کا بھی کا فیصلہ ہو گیا ہوتا  
 امیر حبیب اللہ پور کی ہزار ہزار رحمت ہو جس نے افغانستان کی



حدود میں مرزا ایتھ کو داخل نہ ہونے دیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے امیر حبیب اللہ کو ایک خط لکھا کہ میں نبی بن گیا ہوں، تم مجھے پر ایمان لاؤ۔

امیر حبیب اللہ نے مرزا غلام احمد قادیانی کو جو اسب دیا ایں جا بیٹا۔ مرزا غلام احمد وہاں کیسے جاتا ہے اور اگر چلا جاتا تو کچھ نہ کچھ ہو جاتا، اور مرزا غلام احمد کا دماغ درست ہو جاتا۔

آج یہ اجتماع نابینا کی اجتماع ہے۔ مرزا ایتھوں اور سب ظفر اللہ کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے منعقد ہوا ہے یہ اجتماع مجلس عمل کے زیر اہتمام ہو رہا ہے۔

میں خواجہ ناظم الدین صدر مسلم لیگ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مسلم لیگ کو قوم کی واحد نمائندگی کا دعویٰ ہے۔ آج لاہور کے تمام مسلمان جمع ہیں جو مرزائی و زہرہ خارجہ کے خلاف عدم اعتماد اور اپنی بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔

یہ وہی جلسہ گاہ ہے جہاں کئی سیاسی تحریکات سکنے جنم لیا، اور پھر ان چڑھیں۔ نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں بھی غالباً اسی باغ میں نابینا کی اجتماع ہوا تھا۔ اور آج مرزا ایتھوں کو اقلیت قرار دینے اور مر ظفر اللہ کو اس کی ذمہ داریوں سے علیحدہ کرنے کے لیے بھی اسی باغ میں اجتماع ہو رہا ہے۔

میں کہتا ہوں خواجہ ناظم الدین صدر مسلم لیگ کی حیثیت سے



اس رخ میں ایک جلسہ منعقد کریں اور اسٹا بیان لاہور کو اس میں شرکت کی دعوت دیں۔ جلسہ کی سدارت خواجہ صاحب خود کریں، لہ پھر ظفر اللہ کے متعلق عوام کا ووٹ حاصل کریں، ان ہاتوں کا فیصلہ آج ہی ہو جائے گا۔ اگر خواجہ صاحب کے فرمان پر کوئی آدمی بھی نہ آیا تب بھی فیصلہ ہو گیا، اور اگر لوگوں نے اگر ظفر اللہ کے خلاف عدم اعتماد اور بیزاری کا اظہار کر دیا تب بھی فیصلہ ہو گیا۔ خواجہ صاحب نے پھلی دفعہ ایک تقریر میں کہا تھا کہ کسی کے پیچھے ہجوم کا ہو جانا، کسی جلسے میں زیادہ حاضری اور کثیر اجتماع اس امر کی دلیل نہیں کہ اسے عوام کا اعتماد حاصل ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ خواجہ صاحب ساری زندگی تو اسے دلیل اور مدار قرار دیتے رہے، وہ اب کیوں گریز فرما رہے ہیں؟ اور اگر اجتماع دلیل نہیں اور کسی کے ساتھ اکثریت کا ہو جانا مدار نہیں تو پھر مسلم لیگ کو واحد نمائندگی کا حق کیسے حاصل ہے؟ اور پھر آپ کس واحد نمائندہ جماعت کے صدر اعظم ہیں؟

امیر شریعت نے آئی جی پولیس میاں انور علی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”کیا میاں صاحب نے ’الفضل‘ میں شائع شدہ مرزا محمود کا خطبہ یا بیان پڑھا ہے؟ اگر نہیں پڑھا تو اب پڑھیں، اور اس کے ساتھ ساتھ ان پرچوں کو بھی پڑھیں جن میں ’الفضل‘ نے ’خونی ملاکے‘ آخری دن لکھ کر علمائے کرام کو قتل کی دھمکی دی تھی“



## ”فضل کی عبارت

”ہاں آخری وقت آن پہنچا ہے، اُن خلمائے حق کے خون کا بدلہ  
 لینے کا جن کو یہ علماء قبل کرتے آئے ہیں۔ اب اُن کے خون کا بدلہ لیا  
 جائے گا۔“

۱:- سید عظیم اللہ شاہ بخاری سے، (۲) ملا بدایونی سے،

(۳) ملا اعجاز الحق سے، (۴) ملا محمد شفیع سے، (۵) ملا سودووی

پانچویں سوار سے، ”فضل“ ۱۵ جنوری ۱۹۵۲ء

آپ یہ اقتباس پڑھ کر سنا رہے تھے کہ مجمع سے ایک آواز آئی۔ حکومت  
 اس وقت کہاں سو رہی تھی؟

”حکومت تو وہیں سو رہی تھی جہاں اب ہے، لیکن تم کہاں

سو رہے ہو؟“ اس مشین کے پوز سے ہوتے ہیں نے پنجاب کے

وزیر اعلیٰ میاں دولتانہ سے ملاقات کی اور ڈیڑھ گھنٹے تک

عامہ کی وساطت سے صاحب ”فضل“ کو یہ اقتباس پڑھ کر سنایا تو

میاں صاحب نے ایکشن لینے کا وعدہ کیا۔“

آخر میں امیر شریعت نے فرمایا:

”مجلس عمل کا جو وفد خواجہ ناظم الدین سے ملا تھا، اس

وفد کے سامنے خواجہ صاحب مرزائی وکیل کی حیثیت سے پیش

آئے اور غلطی بروزی کا جھگڑا لے بیٹھے۔

میں پوچھتا ہوں، خواجہ صاحب ایک وزیر ہیں، انہیں



شیخ الاسلام کس نے بنایا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے، خطا عمر شہیر احمد عثمانی  
 کا وفات کے بعد خواجہ صاحب نے جو شیخ الاسلام کے فرانس  
 بھی انجام دینے لگ گئے ہیں؟

عوام سے خطاب کرتے ہوئے ایمر شریعت نے کہا:

”تم ناموس مصطفیٰ کا تحفظ کرو، میں تمہارے کتھے پائے کو  
 تیار ہوں، میں تمہارے سوڑے پراؤں کا میں کہتا ہوں صلیب لگانے  
 پاکستان بنایا، ملک تقسیم کرایا ہے، یہ انجمن احمدیہ نے نہیں بنایا۔  
 مرزا محمود اور ظفر اللہ کا پاکستان سے کیا تعلق؟ یہ دم بیدہ مسلمان  
 برطانیہ آج پاکستان میں زندہ رہتے ہیں۔ ہم ان کو عسکرانہ  
 سرگرمیاں ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔“

## گفتاری

۲۲ فروری کے بعد مجلس عمل نے راست اقدام کے طریق کار پر غور کر  
 سکے لیے ۲۶ فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں اپنا ایک اجلاس منعقد کیا جس کی صدارت  
 مولانا ابوالحسنات نے کی اور حسب ذیل قرارداد منظور کی:

”۵۔ رجسٹری کے کنوینشن میں مرکزی حکومت کو رجسٹر دینے کا  
 فیصلہ کیا گیا تھا۔ وہ چونکہ مجلس عمل کے ایک وفد نے اس  
 حکومت کے حوالے کر دیا تھا اور ۲۲ فروری کو اس نوٹس کی مباد  
 ختم ہو گئی ہے، بلکہ مزید پارہ نہ باقی گذر چکے ہیں، اس لیے اب



پرامن راست اقدام کی شکل کا فیصلہ کیا جانا ضروری ہے۔  
 راست اقدام کی شکل کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ پانچ رضا کار  
 ایسے قبضہ سے اٹھائے ہوئے ہوں گے جن پر یہ اہانتا نسبت  
 ہوں گے۔

شاہراہ عام پر سے نہیں بلکہ چھوٹی سڑکوں پر سے ہوتے ہوئے  
 وزیر اعظم کی کوٹھی پر جائیں گے۔ اگر وہاں سنتری ان رضا کاروں کو  
 روکنے کا توہہ اس سبب کہیں گے کہ وہ وزیر اعظم کی خدمت  
 میں مطالبات پیش کر سنے اور ان کو تسلیم کر سنے کی درخواست کر سنے  
 آئے ہیں، اور وہ اسی صورت میں واپس جائیں گے کہ وزیر اعظم  
 ان مطالبات کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیں۔

اگر یہ رضا کار گرفتار کر لیے جائیں گے تو مجلس عمل پانچ  
 رضا کاروں کا ایک اور دستہ بھیج دے گی اور یہ سلسلہ پرامن  
 طریقے پر اُس وقت تک جاری رہے گا جب کہ مطالبات تسلیم  
 نہ کیے جائیں گے۔

گورنر جنرل کی کوٹھی پر بھی اسی قسم کا پہرہ لگایا جائے گا، تاکہ  
 یہ نہ سمجھا جائے کہ اس تحریک کا رخ محض خواجہ ناظم الدین کی طرف ہے  
 کہ وہ بنگالی ہیں۔

مولانا ابوالحسنات محمد احمد اس متحرک تحریک کے پیچھے  
 ڈکٹیٹر مقرر کیے گئے اور انہیں گرفتاری کی صورت میں اپنے



جانشین کی نامزدگی کا اختیار دے دیا گیا۔ یہ بھی قرار دیا گیا کہ  
 اسی دن شام کو آرام باغ میں جو جلسہ عام ہوا اس میں عوام  
 کو مشورہ دیا جائے کہ وہ حسب معمول اپنے کاروبار میں مصروف  
 رہیں اور رضا کاروں کے ساتھ نہ جائیں۔

۲۶ فروری کو آرام باغ میں مجلس عمل کا عظیم اجتماع ہوا جس میں راست اقدام  
 کمیٹی کے منتخب ارکان کے علاوہ حضرت امیر شریعت<sup>7</sup> نے حسب ذیل تقریر کی۔  
 خطبہ مسنونہ کے بعد آپ نے فرمایا:

”مرزائی افسروں نے اپنے عہدوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے  
 اسلامیان پاکستان کو کافر اور مرتد بنانے کی ایک ہم گیر تحریک کے  
 ساتھ ساتھ اپنے الہامی عقیدے کی بنا پر پاکستان کو ہندوستان  
 سے بلاسنے کی ناپاک تحریک بھی شروع کر رکھی ہے۔ بھولے اور  
 سادہ لوح مسلمان اقتصادی بد حالی اور معاشی الجھنوں سے تنگ  
 آکر ان کے دام ترویج کا شکار ہو رہے ہیں، اور اس طرح  
 مرزائیوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

۱۴ اگست ۱۹۵۲ء کو پاکستان کے وزیر اعظم نے اپنے ایک  
 آرڈی ننس کے ذریعے سرکاری ملازمین پر پابندی عائد کی تھی کہ وہ  
 کسی مخصوص فرقہ کے عقائد کی تبلیغ نہیں کر سکتے۔

مرزائی افسران نے اس آرڈی ننس کا جو مذاق اڑایا وہ  
 حکومت اور عوام دونوں کے سامنے ہے۔



سب سے پہلے مرزا علی وزیر خارجہ سر ظفر اللہ نے اس قانون کی مخالفت کرتے ہوئے بیان دیا کہ ہم اپنے مذہبی عقائد اور منیر کی تبلیغ سے باز نہیں رہ سکتے، اس کے بعد میاں نصیر احمد فاروقی چیف سیکرٹری حکومت سندھ، خان بہادر ڈاکٹر سید احمد سیرٹھٹھٹھ ڈاٹر سینی ٹوریم، کرنل سید بشیر حسین شاہ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جانت اور ان کے علاوہ دوسرے مرزا علی انسران نے کئی بار کھلے جلسوں کی صدارتیں کر کے کفر و ارتداد کی تبلیغ کی، اور سرکاری احکام کا کھلم کھلا منہ پڑھایا لیکن ان کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دراصل حکومت خود مرزا ایتھ کی تبلیغ کو راہ ہی ہے۔

ان کے مقابلے اگر مسلمان اپنے ذہنی عقائد اور اسلام کو اپنا کی تبلیغ کریں تو اسے سرکاری انڈر ڈال کر بند کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی قومیں اور باب اقتدار سے اپنے مطالبات کرتی ہیں۔ اور حکومتیں انہیں تسلیم بھی کرتی ہیں مگر ہمارے اور یہ سب اقتدار عجیب ہیں، پوری قوم متفقہ طور پر ان سے مطالبہ کر رہی ہے لیکن ارباب اقتدار کے بہرے کانوں تک قوم کی کوئی آواز نہیں پہنچ رہی اور وہ ملت اسلامیہ کی آواز کو سنی اٹھاتی کر رہے ہیں۔ مسلمانان پاکستان نے تاج و تخت ختم نبوت کے تحفظ کے سلسلے میں مرزا ایتھوں کو اقلیت قرار دینے اور مرزا علی وزیر خارجہ کو وزارت سے



برطرف کرنے کے متعلق حکومت سے جو مطالبات کئے تھے اور باپ  
 اقتدار ان مطالبات کو تسلیم نہیں کر رہے ہیں اور مختلف حیلوں بہانوں  
 سے مختلف قسم بنوات کی تحریک کو دبانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔  
 بنگلہ تریوں محسوس ہونا ہے گویا خواجہ صاحب ناظم الدین بھی مرزا  
 بشیر الدین امروہ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ یہ بھی تو مرزا ایڑوں کے متعلق  
 پلوہی قوم کے مطالبات کو دہ خور اکتنا نہیں سمجھ سکتے۔ بچے غصہ صی  
 علقوں سے معلوم ہوا ہے کہ خواجہ ناظم الدین اور مرزا ایڑوں کے  
 درمیان کوئی رشتہ ناٹے بھی تو چکے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو مسلمان کسی  
 قیمت پر بھی بوجہ ہلاکت نہیں کریں گے، کیونکہ مسلمان قوم کے حکمران  
 وہی ہونے لگے ہیں جو مسلمانوں اور غیر عربی کے غلام۔ جو عربی کے  
 باغی کا فرار مرزا چنگھان قوم کے حکمران نہیں رہ سکتے۔

تشریح کے لئے میں آپ نے غصے اور جذباتی لہجے میں فرمایا:

"ال مسلم باپٹر کنوینشنی نے حکومت کو ایک ہاؤس ڈیا جس کی  
 میعاد چار دن ہر سے شتم ہو چکی ہے۔ ایک ماہ کے مسل صبر آزما اول  
 قوم کے باوجود حکومت نے جس بے اعتنائی کے ساتھ مسلمانوں  
 پاکستان کے ساتھ سلطنت کو ٹھکرایا یہ اس حکومت کے ذوال  
 کی بھائی ہے۔"

عوام سے غلطیہ کرتے ہوئے:

"اپنے حضرات میرزا زنگی کے گرد بیٹھ کر مجلس میں گالیوں کو جانے دے۔"



یہی نے جس کام میں ملحقہ و ملما، اپنے ضمیر سے مطمئن ہو کر ڈالا پھر چاہے  
 راستے میں جو آئے ہیں نے؟ سے ہمیشہ ٹھکرادیا، انگریز جیسی جس پر  
 سلطنت جب حیرت سے مطالبہ کے سامنے نہیں ٹھہر سکی تو اس ملک کے  
 حکمران، جنہوں نے یہ ملک اللہ اور رسول کے نام پر حاصل کیا تھا  
 اور آج اسی ملک میں وہ اپنے قوانین اور حکومت کے زور پر  
 پھر صلی اللہ علیہ وسلم کی تہذیب کے منکسب ہو رہے ہیں، کیوں کہ  
 ٹھہر سکتے ہیں۔

۴ ہر زوری کے لئے تو ایسا ہی ہم حکومت کے فیصلے کے مدنظر  
 رہے، مگر وہ خاموشی تماشائی کی طرح ہمارے جذبات کا امتحان  
 لیتی رہی۔ اس رات کے بعد قوم جو قدم اٹھائے گی، اس کی  
 ذمہ داری پھر حکومت پر ہوگی۔ مسلمان ناموس مصطفیٰ کے تحفظ کے لئے  
 اپنی جان تک کی بازی لگانے سے ہدیغ نہیں کریں گے۔

اس اجتماع میں غیر ملکی پریس اور فوٹو گرافرز کے علاوہ امریکن ایلیٹی کے  
 ارکان بھی موجود تھے۔ امیر شریعت کے اندازہ خطابت، طرز تکلم کو دیکھ کر انہوں نے  
 یہ ساختہ کہا:

”اگر یہ شخص امریکہ میں ہوتا تو تمام عمر امریکہ کا صدر رہتا۔“

آرام باغ کی اس تقریر سے فضا تھرہر کر بندھ کے ایک دوپہر سے نئے صودی عرب  
 اپنے ایک دوہنت کو نسط کے درپے اظہار عادی۔

”اگر یہ تاریخ کو آرام باغ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی



تقریباً سنہ ۱۹۵۳ء کو شاید میں گمراہ ہو جاتا۔ الحمد للہ کہ ان کی تقریب نے مجھے

گمراہی سے بچا لیا۔ سزا دینا تریب تھا کہ میں مرتد ہی ہو جاتا۔

رات دو بجے کے قریب یہ اجتماع ختم ہوا۔ تمام رہنما دفتر تحفظ ختم نبوت (سید و سیدہ کی راجی)

میں آرام کرنے کے لئے چلے گئے، ابھی وہ نیند سے آنکھ کھولی تھیں کہ

پولیس کی بھاری جمعیت نے دفتر کی تمام عمارت کو اپنے محاصرے میں لے لیا

کراچی کے ذمہ دار پولیس افسروں نے رہنماؤں کو جو اس وقت دفتر میں موجود تھے

گرفتار کر لیا۔ یہ بے پروہی صبح چار بجے کا واقعہ ہے جس میں حضرت امیر شریعت اور

ان کے رفقاء مولانا سید ابوالحسنات قادری، دانش تاج الدین انصاری، صاحبزادہ

فیض الحسن، مولانا اعلیٰ حسین اختر، سید مظفر علی شمسی اور مولانا عبدالمجید جو سہر قابل ذکر تھے

امیر شریعت کی گرفتاری کے بعد مغربی پاکستان سے سینکڑوں افراد کو گرفتار

کیا گیا۔ ان کے ملک سے بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ ہر شہر میں حکام اور عوام

کے درمیان تصادم ہوا، منڈیاں بند ہو گئیں، شہروں میں ہڑتال کر دی گئی، ہڑتال

عمارت کو نقصان پہنچا یا گیا، ریل کی پٹریاں اکٹھا کر دی گئیں، ایسی حالات کو دیکھتے

ہوئے اور مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور فریج کے جو اسے کر دیا گیا۔

## کراچی چل

زندگی کا سفر طویل ہو کہ محقر، انسان اس راستے سے گزرتے وقت ان

موڑوں یا صوبوں سے ناواقف ہوتا ہے، جہاں کبھی تو اس کا جہاں تار تار ہوتا

ہے اور کبھی خود آبلہ پا ہو کر صحرا کی ویران و خشک وادیوں کو ٹکھڑے رنگارنگ



موتیں کر دیتا ہے، اسکا چہرہ زار کی بہاریں پھر نسیم صبح کا ہی کو جب زندگی کا پیغام دیتی  
ہیں تو نہ صرف گئی بوٹوں میں نکھار پیدا ہوتا ہے بلکہ آشیانوں میں طیور بھی لڑو گل  
سے ہمکلام ہو کر فضاؤں میں جھومنے لگتے ہیں۔

یہ سارا کچھ انسان کے عزم پر موقوف ہے، اگر اس میں پختگی نہ ہو تو جو مصلح  
کی بندی بھی انسان کو بہتی کی طرف لے جاتی ہے۔

۳۳ برس ہوئے کہ امیر شریعت صرف ایمان کو زیادہ بہت کر  
عزم و ارادے کے پیرہن میں گھر سے نکلے تھے، اس طویل سفر میں قدم قدم پر  
جن مشکلاخ و اویدوں سے اُن کا گذر ہوا، اُس منزل کا ہر موڑ گواہ ہے اور اس  
راستے کی ہر شے شہادت دے گی کہ باوجود عزم کے تند و تیز چوٹکے بھی اس  
مرد وہ دیش کے عزم و استقلال کی دیوار پر نہ گرا سکے۔

سفینہ برگ گئی بنا لے گا، قافلہ مہربانوں کا

ہر لمحہ موجوں کی ہمو کشاکش تگر یہ دیدیا سے چاہے ہو گا

مگر تکبیر شتم نبوت سے پیشتر کئی سال ہوئے امیر شریعت کے تمام جسمانی  
اعضا، اُن سے بغاوت کر چکے تھے، آنکھوں کی بیٹائی مدغم پڑ چکی تھی کہ پھر تک  
لگانے کے عادی ہو گئے۔ و انت ایک ایک کر کے جواب دے گئے  
اور اُن کی جگہ اجنبی و انتوں نے سنبھال لی، درد گروہ کے ایسے مریض ہوئے  
کہ معالجہ نے خوراک سے چاہل ہمیشہ کے لیے نکال دیے، تجیز معمرہ کے باعث  
کوئی کئی گھنٹے پریشان پڑے رہتے پھر ان سب کی بڑھاپے نے اس قدر  
حوصلہ افزائی کی کہ ہر مرض بذات خود بغاوت کا علم لے کر اٹھ کھڑا ہوا، اور



نقاہت کے آثار اس تیزی سے ابھرے کہ پھرے کی پھریاں صاف دکھائی دیتے  
 تھیں، اور امپریٹریٹ تاریخِ ماضی کے کھنڈات کے سوا کچھ باقی نہ رہا  
 حالات میں وہ کہ اپنی پہلی خانہ میں لائے گئے۔

تینار سے رات پھر کے سفر سے تھک کر آؤنگے، سہمے سے اکتانہ  
 کی سیاہ چادری پر آسمان کی روشنی قندیلوں کی طرح سجائی گئی تھی  
 کہ موزن نے انھیں **مَنْ يَرْجُو الْغَيْثَ يَنْتَظِرْهُ** کا اعلان کر کے مسجد کے میناروں کو گواہ  
 بنایا کہ اس نے سوئی ہوئی انسانیت کو تلاش اور امداد کے لیے کوشش کر رہا ہے  
 انسان سے کہ اپنا اثاثہ حیات ضائع کر کے ایسا سویا ہے کہ صوفیوں کو اس کی  
 اس کا بیدار ہونا مشکل نظر آ رہا ہے۔

مولانا ابوالحسن کی امامت میں اسیرانِ ختم نبوت نے جیل خانہ میں صبح کی  
 پہلی نماز ادا کی اور پروردگار عالم کے حضور دعا کی۔

”اے رب العزت! ہمارا کوئی حرم اس کے سوا نہیں  
 کہ ہم نے اپنے اصل اللہ علیہ وسلم کی آبرو باقی رہے، ہم نہیں یا نہ ہو  
 مگر تیرے فریاد لوگوں نے ایوانِ سلطنت میں پہنچا کر ہمارے فریاد  
 پر ہمارے ہاتھی ہونے کی ہر شے کی سہ، مگر تو لوگوں کا جاننے والا  
 ہے کہ ہمارے لڑائی اپنی ذات، اپنے کسی منصب کے لیے نہیں  
 بلکہ تیرے ارشاد کی تعمیل میں ہے کہ

”الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ

مِنْ دِينِي وَرَضِيْتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا“



رہنماؤں کی آنکھوں میں آنسو، دلوں میں جذبات، کاٹھن ان اٹھ آیا،  
 امیر شریعتؒ کی سفید ہاتھی پر گرجے ہوئے آنسو پھولوں پر شبنم کی بہاویں دکھائے  
 تھے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل خان عنایت اللہ خان جید، ابا ری نے امیر شریعتؒ اور ان کے  
 رفقاء سے کہا: آپ حضرات جرن کو ٹھٹھیاں میں لٹے گئے ہیں، یہ وہی خوش بخت  
 کوٹھڑیاں ہیں جہاں ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شوکت علی  
 ڈاکٹر سیف الدین کھلو بناؤت کے جرم میں رہ چکے ہیں، یہ سنتا تھا کہ انگریزی اقتدار اور  
 جوہر دستم کی ساری تاریخ نقش بہ دیوارہ بنا کر ابھرائی جیل خانے کی ایک ایک اینٹ  
 پس دیوارہ زخاں کی کہانی بیان کرنے لگی۔ امیر شریعتؒ نے جیل خانے کے دیوارہ کو  
 مخاطبہ کرتے ہوئے کہا:

”اسے اونچی دیوارہ، آہنی دیوارہ! تم گواہ نہ بنا کہ اگر مولانا  
 حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقاء وطن عزیز کی  
 آزادی کے لئے ۱۹۲۱ء میں تمہارے مصائب جیل سکتے ہیں، تو  
 ۱۹۵۳ء میں عطاء اللہ شاہ اور اس کے ساتھی بھی حسرت اللہ نبیاء  
 علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آبرو کے لئے تمہارے مصائب و آلام سے  
 خائف نہیں ہوں گے۔“

امیر شریعتؒ کے ان الفاظ پر سپرنٹنڈنٹ جیل اور دوسرے افسران بہت متاثر ہوئے  
 کراچی جیل میں گورنر کوری طور پر کلاس کا اعلان نہیں کیا گیا تھا تاہم خود ایک  
 اوسپنچے درجے کی ٹی آر بی اور سپرنٹنڈنٹ جیل کے بہتر رویے سے وقت اچھا گزرتا رہا۔  
 امیر شریعتؒ، دیوبند کی، ابا الحسن قادری، مدنی، فاضل الحسن بریلوی، تاج الدین انصاری



دیوبندی اور مظفر علی شمس شیدہ، عقیدہ ختم نبوت کی طفیل یہ سب امیران ختم نبوت  
پانچ وقت کی نماز مولانا ابوالحسنات کی امامت میں پڑھتے رہے، مگر تو کسی کا مذہب  
مخالف ہوا اور نہ ہی کسی کے عقیدے میں فرق آیا، بلکہ ان کی باہم رفاقت نے  
اکثر شبہات کا ازالہ کر دیا۔

امیر شریعت کے اخلاق اور تواضع نے مولانا ابوالحسنات کو ان کا  
اس قدر گرویدہ کیا کہ وہ بے اختیار کہنے لگے :

”شاہی! آپ تو اس دور کے ولی ہیں، مجھے تو آپ سے متعلق  
بہت کچھ کہنا تھا۔ کین آپ سے قرابت عادی نے میری  
سادہ سی غلط فہمیاں دور کر دیں، اللہ علیہ“

امیر شریعت یہ سن کر مسکرائے اور ”اللہ شکر اللہ“ پڑھنے لگے۔

### حکام کے برخاست

اس دور ان ایک روز سپرنٹنڈنٹ جیل، وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین کا  
پیغام لے کر آئے۔

”آپ کی گرفتاری کے بعد ملک بھر میں تشدد کی جو تحریک  
جلی نکلی ہے اس کے نتیجے میں سرکاری اور غیر سرکاری املاک  
کو جو نقصان پہنچ رہا ہے آپ اس سے لاتعلقی کا اظہار کریں،  
تاکہ ملک میں امن قائم ہو۔“

اس کے جواب میں امیر شریعت نے کہا :



خواجہ صاحب کو میری طرف سے کہہ دو، صبح پر قبضہ  
 کر لینے کے بعد آپ جسم کو ٹرپتے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔  
 یہ سن کر سپرنٹنڈنٹ جیل اپنا سامنے لے کر چلے گئے۔

گرفتاریوں سے قریباً پندرہ دن بعد لاہور سے سی، آئی، ڈی کے دو  
 ذمہ دار افسر کراچی جیل میں رہا بنیایان ختم نبوت سے ملنے آئے اور کہا  
 ”اگر آپ حضرات یہ کہہ دیں کہ تحریک ختم نبوت، دولتانہ  
 کے ایما پر چلائی گئی ہے تو حکومت آپ کو رہا کرنے کے لیے  
 تیار ہے۔“

ملکی ہے نگہت بلو بہاری کی اس پیش کش پر لو اسیران بلا قفس کی  
 تہلیوں سے آذادی پرواز کے شوق میں موسم محل سے نامہ و پیام کرتے، کہ  
 امیر شریعت<sup>7</sup> درمیان میں بول اُسٹھ:

”یہ جھوٹ ہے، دولتانہ ایک دنیا دار انسان ہے، اور  
 تحریک ختم نبوت پاک جذبات کی محرک، اس کی ذمہ داری کسی  
 فاسق و فاجر پر نہیں ڈالی جاسکتی، جاؤ اپنی حکومت سے کہہ دو  
 یہ تحریک بس نے چلائی ہے، اور اس کا ذمہ دار بھی میں ہوں۔“

امیر شریعت<sup>7</sup> کے یہ تیور دیکھ کر سی، آئی، ڈی کو اپنے ارادے کی ساری بساط

الٹنی پڑی۔  
 سکھر جیل

تحریک اپنے شباب پر تھی، عوام اور حکومت کے درمیان کھیلاؤ بڑھ



رہا تھا۔ محلاتی سازشوں کے جال صوبائی سیاست کو اپنی لپیٹ میں سے چکے  
 تھے۔ پاکستان کے گورنر جنرل ایک عظیم عہدہ جو تحریک ختم نبوت سے پیشتر خواجہ  
 ناظم الدین کی حکومت کے گروسائزس کا ایک منضبط ہالہ تیار کر چکے تھے جس کے  
 باعث سندھ مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے ممبر اور صوبائی مسلم لیگ کے صدر کی  
 حیثیت سے محمد ابوب کھوڑو، خواجہ ناظم الدین سے بغاوت کر چکے تھے، سرحد  
 پہلے سے باغی تھا، تحریک ختم نبوت نے پنجاب کے حالات بھی گورنر جنرل کے  
 حلقے میں ہموار کر دیے اور خواجہ ناظم الدین کے خلاف ان کی اندرونی سیاست بھی  
 کامیاب ہو کر رہی کہ انہوں نے، ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو یکایکی خواجہ ناظم الدین کی  
 حکومت کو برخاست کر دیا، اس سے پیشتر پنجاب کے وزیر اعلیٰ مسٹر دولتانہ کی  
 معزولی پر خواجہ ناظم الدین سے دستخط کر لیے گئے تھے۔

خواجہ ناظم الدین کی جگہ مسٹر محمد علی بوگرہ کو جو ان دنوں امریکہ میں پاکستان کے  
 سفیر تھے، نیویارک سے بلوا کر پاکستان کا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔

یہ سارا کچھ اس ڈرامائی انداز میں ہوا کہ خود سنا کون کو بھی اپنی معزولی کا علم نہ  
 ہو سکا، جیسے خواجہ ناظم الدین نے اپنی برطرفی کا اعلان ریڈیو پر سنا۔

حکام بالا ان کھیل تماشوں میں مصروف تھے۔ شہری عوام، پولیس اور فوج  
 سے دست و گریباں تھے کہ ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو حضرت امیر شریعت اور ان کے  
 ساتھ مولانا ابوالاعلیٰ مصلح، صاحبزادہ فیض الحسن، مظفر علی شمسی، عبدالرحیم جوہر کوہاچی  
 سے سکھر جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

منترئی پاکستان میں جیل خانوں کو اپنے اندرونی ناچول کے باعث خوف



ہر اس کا مرکز قرار دیا گیا ہے یا جن کے تاثر کو براٹم پیشہ عناصر نے قبول کر لیا ہے  
 پناہ مانگی، اسی میں سرحد کی ہری پور جیل، پنجاب میں ساہیوال اور میانوالی کے  
 جیل خانے، بلوچستان میں مچھ جیل اور سندھ میں سکھر کا جیل خانہ مشہور ہیں۔  
 آخر الذکر جیل خانہ کو دریاٹے سندھ سے نکلی ہوئی نہر پر تعمیر کیا گیا ہے،  
 جس کی وجہ سے پتھر اور کھٹل اس ہندی خانے کی خاص سوغات ہیں۔ موسم گرما میں  
 سندھ کی تپتی ہوئی ہریت بادِ سموم کے ونوں جب آگ اگلتی ہے تو سارا سندھ  
 جہنم کردہ معلوم دیتا ہے اس پر بھی سکھر جیل کی پیداوار کھٹل اور پتھر محدود نہیں  
 ہوتی۔ حالانکہ پنجاب کی گرم ہوائیں ان بلاؤں کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔ لیکن سکھر کا جیل خانہ  
 اپنی ان خصوصیات کے ساتھ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت امیر شریعت اور ان کے رفقاء جب اس جیل میں داخل کئے گئے  
 تو موسم گرما اپنے شباب میں قدم رکھ رہا تھا، سندھ کے ریگستانوں میں بالوریت  
 کے گھروڑوں سے بادِ سموم کی اٹھکیلیاں سستی کے قدموں کی تلاش میں سرگرداں  
 تھیں، لیکن پتوں کو لے جانے والے اونٹان نشانوں کو بھی سمیٹ کر لے گئے تھے  
 مگر حقیق ہے کہ ہنوز تلاشِ محبوب میں بگولوں کا روپ و حمار سے صراوٹ کے وام  
 نازار کردہ ہے۔

موسم کے اس جلاؤ میں امیر شریعت کو قانون و اعد سیاسی انتقام کے پلے جٹے  
 جذبات سے سکھر کے جیل خانہ میں ڈال دیا گیا۔

خوراک

بغیر ملکی حکمرانوں نے اپنے سیاسی رفیقین سے جیل خانوں میں ہمیشہ نثرِ اغت کا



برتاؤ کی، تعلیم، شہرت، خاندانی رکھ رکھاؤ، سزا دیتے وقت وہ ابن سب کے  
 پس منظر میں ایک نظر جھانک بیٹے تھے اور سیاسی مجرم کے قاتی اور اجتماعی حقوق  
 ہمیشہ بحال رکھنے، لیکن ۱۹۵۳ء کے مسلمان حکمرانوں نے مذہبی رہنماؤں سے جو  
 سلوک کیا، ماضی قریب کی تاریخ کا اس قدر گھٹا تاباں ہے کہ اس کی پیروی سے  
 سوائے شرمندگی کے اور کچھ نہیں۔

حضرت امیر شریعت ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ جیل خانے گئے تو انگریزی قانون  
 نے انہیں اپنے خیال میں بغاوت کا مجرم قرار دیا تھا، اس پر بھی انہیں پیدائشی  
 قیدیوں کی خوراک دی گئی۔ نیز ۱۹۳۴ء تک وہ جب بھی اسیر فرنگ ہوئے، انہیں  
 اسی درجے کا مستحق سمجھا گیا، لیکن ۱۹۵۳ء کی تحریک نہ تو حکومت کے خلاف تھی اور نہ ہی  
 اسے ملکی بغاوت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ خاص مذہبی نوعیت کی تحریک کو بغاوت  
 کہنا اسلام کے بنیادی اصولوں سے عدم واقفیت کے مترادف تھا، مگر اس دور کے  
 مسلم لیگی حکمرانوں نے صرف ذاتی وقار کے لیے اس تحریک کے قیدیوں سے جیل خانوں  
 میں ایسا برتاؤ کیا کہ جیل مینول (Manuol) کہہ لیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔  
 سکھر جیل کا بلاک نمبر ۴ جس کا رقبہ اپنی وسعت کے اعتبار سے ان قیدیوں  
 کی حیثیت کے مطابق نہیں تھا، لیکن حکام جیل نے انہیں یہیں رکھنا مناسب سمجھا  
 اس کے صحن میں نہ تو سائے کے لیے درخت تھا اور نہ پانی کا معقول انتظام،  
 ہر قیدی کو نہانے کے لیے صرف ایک لوٹا پانی ملتا تھا، نو قیدی نو لٹے پانی کے  
 ایک قیدی کے نہانے کا انتظام کرتے، اور اس طرح ایک آدمی کی باہی نو دن  
 کے بعد آتی تھی۔ خوراک میں چاول کے آٹے کی روٹی، گھاس پھوس کی تھیل کے



ترکے کی سبزی مسور کی والی، قریباً پندرہ دن یہی خوراک دی جاتی رہی کیونکہ  
 بی کلاس کے کاغذات آنے میں دیر ہو گئی تھی، حالانکہ قیدی کی ایک جیل سے دوسری  
 جیل میں تبدیلی کے ساتھ ہی اس سے متعلقہ کاغذات بھیج دیے جاتے، مگر ختم  
 نوٹ تحریک کے قیدیوں سے امتیازی سلوک کے پیش نظر حکام کی یہ حرکت  
 بھی اپنی جگہ عجیب رہی، اس غفلت اور سی کلاس خوراک کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت  
 امیر شریعت کی بیماری (شوگر اور دیگر دہ) میں اس قدر اضافہ ہوا کہ آخر کو  
 یہی امراض بان لیوا ثابت ہوئیں۔ کیونکہ حکماء کی تاکید تھی کہ چاول کبھی استعمال  
 نہ کریں۔ لیکن چاول کے آٹے کی روٹی بہر حال کھانی پڑی، اور بہتر خوراک کے  
 کاغذات پہنچنے تک، امیر شریعت اپنی رہی یہی تو انانی بھی ضائع کر بیٹھے اور مسور کی  
 وال کا بیٹائی یہ بھی اتر ہوا۔ ان دنوں سکڑی ہوئی کادو چو حرارت ۱۲۷ ڈگری تک پہنچ  
 چکا تھا۔ چیل میں پانی کی قلت، سامنے کی کمی اور خوراک کی بے ضابطگی، ایسی  
 بے اعتدالیوں کو دیکھ کر حضرت امیر شریعت سکھر کے جیل خانہ کو سفر (جہنم)  
 کہا کرتے تھے۔

## محمد علی بوگرہ کی آمد

تحریک ختم نبوت کے باعث پاکستان کی سیاست میں عاجلانہ طور سے اکثر  
 ایسی تبدیلیاں آئیں کہ عوام اور خود حکمران پارٹی کو بھی اس کا یقین نہیں تھا، مثلاً  
 صوبہ سرحد کے خان پروان کا وجود مسلم لیگی حکمرانوں کے لیے دشمنی کا انتہائی  
 بلند مقام رکھتا تھا۔ لیکن سیاسی ضرورت نے اس دشمنی کو دوستی میں راتوں رات



بدل دیا۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان نے اپنی کابینہ کے رکن سکندر مرزا کے مشورے پر ڈاکٹر خان کو حکومت کے قریب کر لیا۔ عبدالقیوم خان پہلے سے ہی محمد علی بوگرہ کی وزارت میں داخل ہو چکے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ سرحد کی سیاسی جیتلین ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ لیکن پنجاب کے امن کی باگ ڈور تحریک ختم بیوث کے رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی، اور وہ سب کے سب جیل خانوں میں تھے۔ چنانچہ اس کام کے لیے گورنر جنرل پاکستان نے اپنے نامزد وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کو سکھر جیل میں بھیجا۔

”آپ حضرات اگر اپنی تحریک کے سلسلے میں حکومت کے روبرو معذرتہ کر دیں تو آپ کو رہا کر دیا جائیگا۔  
میں اسی کام کے لیے آپ سے ملنے آیا ہوں۔“

وزیر اعظم پاکستان کے یہ الفاظ حضرت امیر ٹرولیت اور ان کے ہم اسیران قفس کے لیے نئے نہیں تھے، اس سے پیشتر اس قسم کی پیشکش کراچی جیل میں سابق وزیر اعظم کی طرف سے بھی ہو چکی تھی۔

امیر ٹرولیت نے محمد علی بوگرہ کو تہایت مشتعل کر دیا:

”آپ حضرات کو ہماری اس قدر فکر کیوں ہے؟“

صوبہ اپنا اپنا ہے جہاں اپنا اپنا

کیے جاؤ میٹھا رو! کام اپنا اپنا“

وزیر اعظم پاکستان امیر ٹرولیت کا یہ شعر سن کر عقوڑی دیو پر ٹھہرے

اور واپس چلے گئے۔



## بھوپت ڈاکو

جب بڑائی اپنی منزل پر پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے، تو نیکی اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے۔

بڑائی گفتار میں ہو کہ کردار میں، انسانیت کے لیے سب قاتل ہے، جب اس میں زندگی سرایت کرتی ہے تو اچھا بدلا آدمی بھی آدمیت سے محروم ہو کر سماج کی نظر میں آدمی نہیں رہتا۔ بلکہ اس کا ہر کردار سوسائٹی میں بڑائی کی تخم ریزی کرتا ہے، اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ بڑائی کا ہر بیج کاٹنا بن کر اس کے اپنے حلق میں پیوست ہو جاتا ہے اور یہی نیکی اور بڑائی کا سنگم ہے، اگر کاٹنا حلق سے نیچے اتر جائے تو بچھیں اور بڑائی کا خالق بن کر اہلیس کے بھی پر کترے لگتا ہے ورنہ مرثیت اچھی ہو تو کاٹنا اگلے دینے میں دیر نہیں لگتی۔

۱۹۴۷ء کے بعد بھارت کی سرحدیں کوڑوں کے دانشوروں نے اپنی غلط کاریوں کے باعث انسانوں کیلئے جہنم کہہ رہا دیکھا۔ بھوک، اغلاس اور فقر پرستی نے آدمی کو آدمیت سے اس قدر بیگانہ کر دیا کہ پھر اس دھرتی کی کوکھ سے چور، ڈاکو اور قاتلوں نے جہنم لینا شروع کیا۔ بھوپت ڈاکو اسی دور کی پیداوار ہے، راجپوتانہ کا علاقہ اس کی زد میں تھا۔ اس پاس کی خشک پہاڑیاں اس کی آماجگاہ تھیں۔ دولت مندوں کو لوٹ کر ان کا سراپہ مغربوں میں تقسیم کرنا اور اس کے لیے اس کی قتل و غارتگری نے تمام راجپوتانہ کے امراں کو ہراساں کر دیا تھا۔ بھارت کا قانون، پولیس اور فوج اپنی ساری قوت کے باوجود بھوپت ڈاکو کو اس کی



غیر آئینی حرکات سے روک نہ سکی۔ حالانکہ راجپوتانہ کے پتھر اور ریت کے ذرات تک حکومت کے معاون تھے، اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں بھوپت ڈاکو کی چنگی کھا رہی تھیں، مگر بڑائی عزم انسانی کی ہمراہی میں اس قدر توانا ہو چکی تھی کہ حکومت کے ذرائع بھی اُسے شکست دینے میں ناکام رہے۔

۱۹۵۳ء کے شروع میں بھوپت ڈاکو اپنے غیر آئینی افعال کے باعث بھارت سے بھاگ کر پتھر پاد کے راستے پاکستان میں داخل ہوئے ہی حیدر پور گرفتار کر لیا گیا، اسے سکھر جیل میں امیر شریعت کے برابر والے اہلے رکھا گیا تھا۔

جیل خانے کی..... آئینی دیواریں توڑ کر بھوپت ڈاکو ہر روز امیر شریعت سے کسی نہ کسی طرح ملنے آجاتا اور پیروں بیٹھا رہتا، اس کی مسلسل اور پیہم بیٹھک نیز حضرت امیر شریعت کے اخلاقی اور روحانی اثر نے بھوپت ڈاکو کو امیر شریعت کا گرویدہ بنا دیا۔

سکھر جیل کے مہائب نے امیر شریعت کو اس قابل نہیں رہنے دیا تھا کہ وہ اپنی صحت کے سوا کسی دوسرے کی فکر کرتے، مگر اسلام کے اس عظیم مبلغ نے اس جہنم کردہ میں بھی اپنے فرائض سے کوتاہی نہیں کی۔ قرآن کریم اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے روزانہ درس نے بھوپت ڈاکو کو انسانیت کی وہ راہیں دکھائیں جس سے بھٹکے، اُسے برسوں گزر چکے تھے۔ گناہوں کی وہ آگ جس نے بھوپت کی آدمیت کو جلا کر رکھ کر ڈالا تھا، اور اُسے اپنے انسان ہونے پر شبہ ہونے لگا تھا۔ اسی آگ کی ایک ایک چنگاری رُشد و ہدایت کے پھول بوسلنے لگی، وہ اسلام کو



اس نذر بچھا چکا تھا کہ ممکن ہے مسلمان ہو جانا، مگر بھارت گورنمنٹ نے اپنے مجسٹرم کا پاکستان گورنمنٹ سے مطالبہ کر لیا، اور بین الاقوامی قانون کے مطابق بھوپت ڈاکو کو بھارت سرکار کے حوالے کر دیا گیا۔

## لاہور سنٹرل جیل

مسلم لیگی حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی اور عوام کے مذہبی جذبات کے باعث ۱۹۵۳ء میں جو کچھ ہوا، وہ تمام تاریخ کے دامن میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ امروز و فردا میں جب بھی یہ گرہ کھلے گی تو حقیقت شفاف پانی کی طرح نظر آئے گی۔

۱۹ جون ۱۹۵۳ء کو گورنر پنجاب نے آرڈی ننس نمبر ۳، ۱۹۵۳ء صادر کیا جس کی رو سے ان واقعات کی تحقیقات مفسود منتی، جن کے باعث ۱۹۵۳ء میں مسلمان اور مرزا بیٹوں کے درمیان ہڈگامہ ہوا تھا۔ چنانچہ چیف جسٹس مسٹر محمد منیر (صدر تحقیقاتی عدالت) اور مسٹر ایم، آر، کیانی (ممبر تحقیقاتی عدالت) پر مشتمل ایک ڈویژن بنی مقرر کیا جس نے یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو اپنی کارروائی کا آغاز کیا۔

تحقیقاتی عدالت نے دیگر جماعتوں کی طرح مجلس احرار کو بھی فریق قرار دیا، احرار رہنماؤں نے جو ان دنوں لاہور سنٹرل جیل میں مجسوس تھے، تحقیقاتی عدالت کے ذریعے حکومت مغربی پاکستان سے مطالبہ کیا کہ مجلس احرار کے نمائندہ رہنما چونکہ مختلف جیلوں میں بند ہیں ان سے باہم مشورہ ضروری ہے، لہذا ان سب کو لاہور سنٹرل جیل میں اکٹھا کیا جائے تاکہ تحقیقاتی کمیشن کے راستے میں الجھاؤ پیدا نہ ہو۔ احرار نے اصرار کے اس مطالبے میں جیسے جیسے تاخیر ہوتی گئی، تحقیقاتی کمیشن کا اصرار بڑھتا رہا،



تاریخ ۲۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو سکھر جیل کے ایمران جن میں امیر شریعتؒ کے علاوہ مولانا ابوالسنان، مظفر علی شمس، صاحبزادہ فیض الحسن اور دوسرے رہنما شامل تھے۔ لاہور سنٹرل جیل میں لائے گئے۔

لاہور کا یہ تاریخی جیل خانہ جس کی جگہ اب "شاوہان کالونی" آباد ہے، اپنی تاریخ کا واحد جیل خانہ تھا، اس کی ایک ایک کوٹھڑی ایک ایک بارک حریت پسندوں پر کیے جانے والے ظلم و جور کی داستانیں سناسکتی تھیں۔ اس کی آنکھوں نے ان فوجیوں کو پھانسی چڑھنے دیکھا تھا، جی کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ غیر ملکی سامراج کے خلاف صف آراء تھے، اس کے کانوں نے بیڈنی کی وہ آوازیں سنی تھیں، جو رضا کاروں کو ٹکفلی سے باندھ کر صرف اس جرم میں مارے جاتے کہ وہ اپنے ملک میں غیر ملکی سامراج پسند نہیں کرتے تھے۔ لاہور سنٹرل جیل کی اونچی دیواروں نے ان فوجیوں کو بھڑکے سے بھڑکے اور..... مرتے ہوئے دیکھا تھا جو جیل خانے کے غلط نظام کی اصلاح چاہتے تھے، آزادی وطن کے جرم میں تڑپ تڑپ کر مرنے والے تماشہ دیکھتا تو اس بندی تماشے کا روزگار مشغلہ بن گیا تھا۔

اگر یہ حقیر کی تقسیم میں انگریز کا دخل نہ ہوتا تو لاہور سنٹرل جیل قومی عجائبات کے عجیبو غریب نمونہ بن جاتی، مگر.....

منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے  
۱۹۴۶ء کے مشہور مقدمہ بنگال کے بعد امیر شریعتؒ پہلی بار اس جیل میں آئے تھے، قفس کے دیواروں کو دیرینہ جرم کو دیکھ کر اس قدر بے قابو ہو کر اسیرانی قفس بھی اپنی تیلیاں توڑ کر موسم بہار کا مزہ لینے لگے۔ امیر شریعتؒ



اکثر نفا، بیشتر سے اس جیل میں موجود تھے، جن میں شیخ حسام الدین، مولانا محمد علی  
جالندھری، مولانا محمد حیات ان سب کو دیوانی احاطے میں رکھا گیا تھا۔ امیر شریعت  
اور مولانا ابوالحسنات بھی یہیں رہے۔

سنٹرل جیل میں امیر شریعت کی آمد سے محض چل عشاق ہیں رونق آگئی، گو  
امیر شریعت کے پاس دل زندہ کے سوا اب کوئی دولت باقی نہیں تھی۔ صحت  
عمر رفتہ کے... ساتھ رخصت ہو چکی تھی۔ یہی سہی کسٹر سکھر جیل نے پوری کر دی  
تقابست کے باعث امیر شریعت کا پڑ بہا چہرہ پت چہرے کے موسم کی طسرح اپنا  
ہنگ و روغن صنایع کر چکا تھا، تاہم وہ اپنی گراں بہا دولت کہ "زندگی زندہ ولی کا نام ہے"  
کے سہارے جنگل میں منگل بنا کر اسیران ہم قفس کے ساتھ وقت گزارنے لگے۔

## موقف اور اعتماد

عوامی زندگی میں مسفروں پر اعتماد اسی قدر لازمی ہے جس قدر انسانی  
اعضا، پر بھروسہ کرنا ضروری ہے، اور نہ تو نگہ کا نظام چل سکتا ہے اور نہ ہی سیاسی  
جماعتیں زندہ رہ سکتی ہیں۔

امیر شریعت نے صاحب رائے اور قادر الکلام ہونے کے باوجود جماعتی  
زندگی میں رضا کاروں تک کو اپنے بھروسے میں لیا اور قافلہ ہائے حیات کے ایک  
ایک فرد پر اعتماد کی ایسی عمارت استوار کی کہ ہر آدمی کو اپنے اعتماد کا وارث  
قرار دے دیا۔

تحقیقاتی عدالت کے روبرو مجلس احرار اور مجلس تحفظ ختم نبوت کا موقف



واضح کرنے کا سوال آیا، تو مشترکہ رہنماؤں کا ایک خصوصی اجلاس جیل میں منعقد ہوا جس میں مختلف اجاب نے اپنا اپنا نظریہ بیان کرنے ہوئے تحقیقاتی کمیشن کے ساتھ تعاون پر زور دیا، اجلاس میں دوستوں کی رائے سن کر امیر شریعت نے ایک سروراز کے ساتھ فرمایا:

”آپ دوست جو فیصلہ چاہیں، کریں میں اس سے انحراف نہیں کروں گا، آپ حضرات کی باتوں نے میرے دماغ کو متاثر کیا ہے، لیکن میں اپنے دلی کو کیا کیوں یہ میرا ساتھ نہیں دے رہا۔ دل گو اسی دیتا ہے کہ یہ کمیشن ہمارے ساتھ انصاف نہیں کرے گا بلکہ ارباب حکومت نے ہمیں سزا کرنے کے لیے ایک خوبصورت چال چلی ہے۔“

اگر میری مانو، تو ہمیں کمیشن سے عدم تعاون کا اعلان کر دینا چاہیے، پھر جو ہو گا دیکھنا جائے گا۔

ویسے آپ لوگوں نے شہید گنج ۱۹۴۶ء کے انتخاب کے موقع پر بھی میری بات نہیں مانی تھی اور آخردہی ہو کر رہا جس کا میں نے انہیں کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اب بھی آپ میری بات نہیں مانیں گے۔ تاہم اگر آپ حضرات اس پر مصر ہیں، تو پھر ہمیں مشروط تعاون پر آمادگی ظاہر کرنی چاہیے کہ ہمارا اصل فریق مخالف چونکہ قید و بند سے باہر ہے، اس لیے باتوں سے بھی ہمارے ساتھ یہاں لایا جائے تاکہ مقدمہ کی پیروی کے لیے ہم



ہم دونوں کے وسائل اور ذرائع یکساں ہوں، یا پھر ہمیں آزاد کر دیا جائے تاکہ ہم بھی اپنا موقف آزادانہ ماحول میں واضح کر سکیں۔ ایک فریق کو آزاد اور دوسرے کو سلاخوں میں بند کر سنے، عملی صورت ہی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ارباب حکومت اپنا فیصلہ صادر فرما چکے ہیں۔ میری مانگ، تو اپنی زندگی کا بقیہ صحیحہ قید و بند کی نظر کر دو، اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دو۔ وہ بہتر کار ساز ہے۔ لیکن اگر آپ حضرات اس کے لیے آمادہ نہ ہو سکیں تو میں آپ کے فیصلے کا پورا اہتمام کروں گا اور انشاء اللہ اس پر عمل کروں گا۔ ہمارے ہاں تو جماعت نام ہے چند دوستوں اور

ساتھیوں کی رفاقت کا۔“

امیر شریعت کی اس تقریر کے باوجود اجلاس نے فیصلہ کیا کہ مجلس اصرار کو متوقع نتیجے سے بے پروا ہو کر من ہیٹ، الجماعت تحقیقاتی عدالت کے سامنے اپنا وقت پیش کر دینا چاہیے۔

## سکھریل کا تذکرہ

سجھ کی زندگی اسیرانِ بلا کے لیے عجیب و غریب ہوتی ہے، گاہ یہ لوگ نزاں میں بھی بہاروں کا سماں پیدا کر لیتے ہیں، اور گاہ ان کی زندگی میں ایسا موڈ آتا ہے کہ گھروں کی باہر بہاروں کا موسم بھی ویران کر دیتی ہے۔ اسی قسم کی ایک محفل آرائی میں امیر شریعت نے دوستوں کے اصرار پر سکھریل کے واقعات بیان



کرتے ہوئے فرمایا :-

”کراچی کے ارباب اختیار نے ہم ٹوڑھوں (مولانا ابوالحسن) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کے ساتھ کہا سلوک کیا، اور پھر سکھر جیل کے افسروں کی اخلاق باخستگی اور ان کی سرد مہری کے واقعات سنائے اور کہا کہ چون جولاہی کی ہلاکت خبریاں، سکھر جیل، پھر اس کے رحم دل اور ذرہ نواز ارباب اختیار، بس یہ تو میرے اللہ میاں کا فضل و کرم ہوا کہ ہم وہاں سے زندہ اور سلامت آ گئے ہیں، اور نہ ان لوگوں سے اپنی جانب سے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔“

چاول اور نامعلوم اشیاء کے امتزاج سے جو سخت سے سخت روٹی تیار ہو سکتی تھی وہ ہمارے لئے مہیا کی جاتی تھی۔ ساگ پات کی جگہ گھاس پھوس اور مسلسل مسور کی وال، یہ ہمارے لئے سب سے بہتر نیراک تھی اور یہ تقاضات افزا مقام۔ پیتے ہوئے مختصر قبر نما کمر سے جن سے معمولی ہوا کا گزرتا بھی مشکل سے ہو سکے، یہ بھتی ہماری قیام گاہ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان تکلیف دہ اور دلگداز حالات میں میری صحت کا نتیجہ ناس ہو گیا۔ جسم پر پہلے گرمی سے دانے نمودار ہوئے پھر وہ سخت پھوڑے بن گئے، جنہوں نے میرے بدن میں اس طرح آگ لگادی جس طرح کہ دیکھتے ہوئے انگارے جسم پر رکھ دئے گئے ہوں۔  
متحدہ ہندوستان میں میں نے سخت سے سخت چیلنج دیکھے ہیں



اور سفاک سے سفاک جیل کے انگریز افسروں سے نبیؐ اسطر پڑا ہے اور بعض افسروں سے تو ایسی ٹھنی کر رہانی تک اکھاڑہ چارہا، بسکٹ سکھر جلی میں ہمارے ساتھ کچھ ایسا زالا ہی سلوک ہوا ہے۔

میں قید و بند کے مصائب بیان کرنے کا عادی نہیں ہوں، بلکہ ان کا تذکرہ محبوب سمجھتا ہوں۔ لوگ حوالات میں ایک رات کاٹ آئیں تو باہر آ کر اخبارات کے نمبر نکالتے ہیں اور زنداں کی ساعتیں منٹوں میں حساب لگا کر بیان کی جاتی ہیں۔ بابو ایہ پرو پیگنڈہ سے کی دنیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے تو ہمارے لئے جیل خانہ ایک گلشن بنا دیا ہے۔ پھولوں تک رسائی کانٹوں سے اٹھنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ ایسے ہی گلشن زندگی میں ہم تمنجیوں اور تنگیوں کے بعد ہی ثمر مراد پا سکتے ہیں۔ سبحان اللہ! انہوں نے کتنی بلند بات کی ہے۔ رَبِّي السَّجِينُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَ بِهَا لِئَلَّا يَأْتِيَ الْعِلْمَ فِي الْيَوْمِ الْأَخِيرِ۔ اسے میرے پروردگار یہ قید خانہ مجھے اس سے کہیں زیادہ محبوب ہے۔

جدھر وہ مجھے بلاتا ہے میں۔

یوسف علیہ السلام کے ذکر سے مجھے ڈمڈم جیل یاد آگئی، ۱۹۳۰ء کے ایام اسیری میں ایک رات میں سورۃ یوسفؑ کی تلاوت کر رہا تھا، چاندنی رات پورے نکھار پر تھی، فضا میں ستارے اور ماحول دم بخود۔ ایسے میں تلاوت قرآن مجید میں رات کا کچھ سماں بیت گیا۔ اتنے میں داروغہ جیل پنڈت رام جی لال نے مجھے



بیچھے سے پہرا۔ مراد دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی  
بارش ہو رہی تھی۔ کہنے لگا، "شاہ جی! خدا کے لئے بس کر دو میرا  
دل قابو سے باہر ہو رہا ہے، اب مجھ میں روکنے کی سکت نہیں ہے۔  
بھائی! قرآن پڑھا جائے تو آج بھی اس کے اعجاز دکھائی دیتے ہیں  
خیر!۔ تو ذکر سکھ جیل کا ہو رہا تھا، میری تو بھلی پوچھے میں تو

سرد گرم چٹیدہ تھا اور پوری زندگی جیل یاریل کی نظر ہو گئی ہے،  
یہ بڑے میاں (مولانا ابوالحسنات) بے چارے سے اس وادی پرخار  
میں پہلی بار قدم رنجہ ہوئے تھے، مجھے ان کا بڑا احساس رہا لیکن  
ماشاء اللہ ان کو تو میں نے اپنے سب مہتیوں سے صابر و شاکر پایا۔"

مولانا مجاہد الحیمینی کا کہنا ہے کہ شاہ جی کے ان ارشادات کے بعد میں نے  
استقبالیہ شاہ جی کی خدمت میں عرض کیا، "آپ حضرات کے ساتھ اس قسم کے  
افسوسناک سٹوک کا محرک کہیں انپیکٹر ہیزل جیل نمائند جات (جو مرنا ہی تھا) کا انتقامی  
جذبہ تو نہیں ہے؟" اس پر شاہ جی نے ایک بار میری جانب دیکھا، اور پھر  
نیا موشن ہو گئے۔

## اسیران مارشل لاء

تخریب ختم نبوت میں جن لوگوں کو مارشل لاء کے تحت سزائیں ہوئیں  
وہ سب کے سب لاہور سنٹرل جیل میں ہی مبعود اسیری گزار رہے تھے ان کی  
خواہش ہوتی کہ حضرت امیر شریعتؑ سے ملاقات کریں، چنانچہ ایک دن صبح ناشتے پر



بیٹھے ہی تھے کہ دیوانی احاطہ کے انچارج نے امیر شریعتؒ سے عرض کی کہ۔  
 اسیرانِ مارشل لا، شوقِ دید میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ امیر شریعتؒ ننگے پاؤں اور  
 ننگے سران لوگوں سے ملنے کے لیے بے محابہ احاطہ کے دروازے پر پہنچ گئے،  
 قیدیوں نے ہتھکڑیوں اور پیرٹیوں کی جھنکار سے امیر شریعتؒ کا استقبال کیا۔  
 امیر شریعتؒ نے اسیران کو گلے لگایا، اور ان کے آہنی زنجیروں کو پوسہ  
 دیا اور پھر اٹک بار آنکھوں اور غمناک ہجے میں فرمایا:

”آپ لوگ میرا سرمایہ نجات ہیں، میں نے دنیا میں آپسے کچھ  
 روٹی اور پیٹ یا کسی مادی مناد کے لیے نہیں پکارا۔ لوگ اس کے بیٹے  
 بھی بڑی بڑی قربانیاں کرتے ہیں، میں نے تو آپ کو اپنے نانا حضرت  
 خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عزت و ناموس کے تحفظ کی دعوت  
 دی ہے۔ اور آپ لوگ عرف اور صرف اسی مقدس مقصد کے لیے قید بند  
 اور طوق و سلاسل کی یہ صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔“

آپ میں سے ایسا کوئی نہیں، جو سیاسی شہرت یا ذاتی وجاہت  
 چاہتا ہو۔ آپ جیل میں بھی غیر معروف ہیں، اور جب اس دیوانہ زندان سے  
 رہا ہوں گے، تو باہر آپ کا استقبال کرنے والا اور پھولوں کے ہار ڈال کر  
 نعرے لگانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔

نیت اور ارادے کے اعتبار سے جس کی آمد اس مقصد کے لیے  
 ہوتی ہے وہ یہی مقصد سے کرواپس چلا جائے گا۔ میرے لیے اس سے بڑا  
 سرمایہ افتخار اور کیا ہو سکتا ہے۔“



کسی ایک قیدی نے ایک دوسرے قیدی کا تعارف کرتے ہوئے کہا،  
 ”شاہ جی! تحریک میں اس کا بھائی گولی کا نشانہ بن چکا ہے،  
 اس کے لیے دعا فرمائیں“

امیر شریعت نے تحریک کے دوران حکومت کی طرف سے تشددانہ کارروائیوں کی  
 مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

”بھائی! ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت یا عوام تشدد پر  
 اتر آئیں، اور کوئی ناخوشگوار صورت نمودار ہو جائے۔ میں  
 نے کراچی جیل میں جب ناہور اور دوسرے مقامات پر گولی چلنے  
 کے واقعات سنے، اور معلوم ہوا کہ کئی بوڑھے باپوں کی لاشیاں  
 لوٹ گئی ہیں، ماؤں کے چراغ گل ہو گئے ہیں اور کئی سہاگ  
 اچڑ گئے ہیں تو مجھے اس کا بڑا صدمہ پہنچا اور میں نے کہا تھا۔  
 ”کاشش! کوئی بچھے یا ہرے جائے، یا ارباب اقتدار تک  
 میری یہ آرزو پہنچا دی جائے کہ تحفظ ناموس رسول کے سلسلہ میں  
 اگر کسی کو گولی مارنا ضروری ہو تو وہ گولی میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی  
 کر لو کیونکہ میں اس جرم کا سب سے بڑا مجرم ہوں۔ اور کاشش!  
 اس سلسلہ میں اب تک بھتیگی گولیاں چلائی گئی ہیں وہ جھے ٹھنڈی پر  
 باندھ کر مادی جائیں۔ مگر... حج ہر مدعی کے واسطے وارورسن کہاں!“

داستان پارہ نمبر

جیل خانے کی محدود دنیا میں بھی حضرت امیر شریعت اپنی اجنبی آپا تھے۔



عبادت الہی جیل خانے میں ان کا سب سے بڑا مشغلہ تھا۔ چنانچہ نماز فجر سے فارغ ہو کر قرآن حکیم کی تلاوت کرتے یا درود و وظائف اور ذکر الہی میں منہمک رہتے۔ تہجد کے وقت جب کبھی آپ اللہ اللہ کا ذکر یا لہجر کرتے یا دوسرے اوقات میں تلاوت قرآن مجید کرتے تو خود ہی وجد میں آجاتے اور اپنا روایتی لب و لہجہ اختیار کرتے تو سکوتِ زنداں میں ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ یہ ریاضت سے فراغت پاتے تو داستانِ پادینہ کے ورق اُلٹنے لگتے۔ اسی طرح ایک دن جیل کے باورچی فتح دین کا ذکر آگیا۔ اس باورچی نے اگرچہ کھانا پکانے میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی، لیکن مولانا ابوالحسن تہجد میں امیر شریعتؒ ہر فن مولاؒ کہا کرتے تھے باورچی کی ایک نہ چلنے دیتے اور ہر روز نئی ہدایت جاری فرما دیتے تھے۔ اس موقع پر امیر شریعتؒ نے مختلف باورچیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ:

”بیس سترہ ایک بار انگریزوں کے خلاف خاندانوں کی تحریک عدم تعاون بھی چلائی تھی۔ مجھے جہاں کہیں سے اطلاع ملتی کہ اس انگریز افسر کے خاں کوئی مسلمان ملازم خانساماں کی خدمات انجام دے رہا ہے تو میں اسے عدم تعاون پر آمادہ کرتا، چنانچہ اس سلسلے میں امرتسر میں ایک خانساماں کا نفرنس بھی منعقد کی جس کے اچھے اثرات مرتب ہوئے۔“

”تحریکِ خلافت کے دنوں امرتسر میں میں نے زنان بازار کی کے خلاف مہم چلائی تھی، جس کے نتیجے میں اس بازار کی اکثر عورتوں نے شادی کر لی، اور کچھ دنوں گناہ کے کاروبار سے تائب ہونے کا



اعلان کر دیا۔ اس طرح سے کٹرہ رام باغ جہاں دن سوتے اور  
راتیں جاگتی تھیں، گندگی سے پاک ہو گیا۔“

دوسری ایک محفل میں فرمایا:

”ایک دفعہ کسی سفر کے لیے امرتسر پہلو سے اسٹیشن پر پہنچا

تو گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی، اور ایک ڈبے کے سامنے

عوام کی خاصی بھیڑ جمع تھی۔ دیکھا تو چارہ گورے (فرنگی) پورے

ڈبے پر قابض ہیں۔ حالانکہ اس میں بچاؤ مسافروں کی گنجائش تھی

مگر وہ کسی ہندوستانی کو اس میں بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔

ان دنوں میرے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا ہوتا تھا، اور

اس نسبت سے لوگ مجھے بچاؤ ڈنڈے والا کہا کرتے تھے،

میں نے آگے بڑھ کر ڈنڈے کے زور سے ڈبے کا دروازہ کھولا

اور اندر داخل ہو کر وہی ڈنڈا گورے سپاہیوں پر اس انداز سے

لہرایا کہ وہ خوفزدہ ہو کر چاروں کسے چاروں ایک کونے میں

سہم کر بیٹھ گئے اور پھر میں نے تمام مسافروں کو اس ڈبے میں

بٹھا دیا، اور خود برابر اسے کمرے میں جا بیٹھا۔ غالباً مجھے

انیا لہنگہ چانا تھا۔ اس دوران ہر اسٹیشن پر جہاں گاڑی رکتی

میں نیچے اتر کر ایک نظر گوروں پر ڈالتا، اور ساتھ ہی ڈنڈا ہوا

میں لہراتا۔ مگر وہ اسی کونے میں ڈبے پر سے رہے میں انگریزی

نہیں جانتا تھا، وہ پنجابی نہیں سمجھتے تھے، مگر ڈنڈے کے قربان



جایے کہ آفس نے بگڑے ہوئے کام کو سوار دیا۔“

کبھی کبھار صحت اجازت دیتی اور موڈ میں ہوتے تو گراؤنڈ میں والی بال یا

کوئی دوسری IN DOOR GAME کھیلنے چلے جاتے۔ بہر طور موسم باد بہاری سے بے نیاز ہو کر خزاں کے یہ دن بھی بہار کی طرح کھٹتے رہتے۔

ساون بہاروں کے بھیگے ہوئے دن اسپران قفس کے لیے بہاروں کی

ساری یادیں تازہ کر دیتے ہیں۔ برستے ہوئے بادلوں سے دلوں کی دھڑکنیں

تیز ہونے لگتی ہیں۔ ایسے میں نکہت باد بہاری کی تمام آرزوئیں اونچی دیواروں سے

مڑ مڑا کر رہ جاتی ہیں۔ بہار لالہ دگل جب صحن چمن میں اٹھکیلیاں کرتی ہے تو نسیم

سحر کا ہی قفس کی اوٹ سے جھانکنے والوں کا مذاق اڑاتی ہے۔ لیکن اسے کیا خبر کہ

یہ دیواریں گر بھی سکتی ہیں، یہ تیلیاں اُٹھ بھی سکتی ہیں۔ جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں

ان کے مقام سوا ہوتے ہیں۔ وہ قفس کی تیلیاں اور جیل خانے کی دیواروں کو

اپنے راستے کی رکاوٹ نہیں سمجھتے، ہاں! زمانے کی آزمائشیں ہیں جو وقت کے

ساتھ ساتھ ڈھلتے سوج کی طرح اپنا مقام بدلتی رہتی ہیں مگر دوام انہیں کو حاصل

نہ ہا، جن کے عزم کی دیواریں کوتاہ نہیں ہوتیں۔

ایسے ہی برسات کے موسم میں ایک دن کا ذکر ہے کہ امیر شریعتؒ ایک ایک

کتابِ زندگی کے ورق پلٹنے لگے ہختہ یادوں کی بھولی بسری کہانیاں ایک ایک

کر کے یاد آنے لگیں تو امیر شریعتؒ مسکرا دیے، بوڑھے جسم کی جوان آنکھوں میں

روشنی کا سیلاب آیا، اور اپنے ارد گرد دیکھنے لگے، جیسے وہ کسی واقعہ کا گواہ تلاش

کر رہے ہوں، پھر آپ سے آپ گویا ہوئے:



”۱۹۲۳ء میں میری زندگی میں ایک عجیب واقفہ پیش آیا، نواب جان  
 کے معصوم بیٹے افضل کو میری گود میں، دیا گیا۔ ناپاک دامن میں  
 پرورش پانے والا معصوم، گناہوں کی بستی سے بغاوت کر کے  
 ایمان کی اوٹ میں امان چاہتا تھا۔“

نواب جان اس بازار کی جنس تھی جہاں عورت تاش کے پتوں کی طرح  
 تقسیم ہوتی ہے، حسن اس کے چہرے پر ہی نہیں آواز میں بھی تھا، جب وہ لہجہ  
 سے آواز کا جاؤ بکھیرتی تو ہوائیں جھولیاں بھر کر اُسے کائنات میں پھیلاتیں۔ اس  
 حسن بے پروا کی بلائیں لینے والوں میں کچھ پرہیزگاروں کے بھی نام آتے ہیں۔  
 نواب جان کی تتاؤں کا آخری سہارا تھا۔ اگرچہ دولت کیاں بھی نواب جان کی دولت  
 میں شامل تھیں، لیکن تیرہ سالہ افضل اب ماں کے گدے سے اوردنا پاک دامن پر  
 پاؤں رکھنا بھی گناہ سمجھتا تھا، اسے خاندانی بغاوت کے جرم میں گھر سے نکالی جائے  
 گیا، اور وہ امیر شریعت کی جھولی میں آگرا۔

انسان بھی کہاٹھے ہے، ابرائی کا رخ کرنا ہے تو راستے کی ہر شے کو  
 کرتی ہے، اور جب نیکی کی طرف مڑتا ہے تو اپنے بھی پر اٹے ہو جاتے ہیں۔  
 امیر شریعت کا کہنا ہے کہ:-

”جب میں اس سٹڈ اس کے قریب پہنچا تو گناہ آلود دامن  
 میرے گرد جال بننے لگے، اتنی تاحی رنگا میں میرے تعاقب میں نہنے  
 لگیں۔ پورا اپنی تمام وسائل سمیٹ کر میری دشمنی پر آمادہ ہو گئی،  
 لیکن افضل اولاد کی طرح دل کے حرم میں مقیم رہا۔“



بیٹے کی ناراضگی سن کر ماں کی ماتا کو سیدھا کر دیا۔ لیکن افضل کہاں سے  
مطالعہ تھا کہ وہ یہ وہند انوک کر کے شرافت کی پناہ میں بیٹھ جاسے، اور میری  
دونوں بہنوں پر بھی ازدواجی زندگی سے منسک کر دے۔

میں ہوں سے تنگی ہمارے زندگی شاید نیکی کی اس آواز پر لبیک کہتی، مگر برسوں  
سے نمادانی پیشہ قدم قدم پر کاوشیں ڈال رہا تھا، ہمیں راستے سے ہٹانا عورت  
کے بس کا رنگ نہیں تھا۔

ماں کی ماتا اور نمادانی وقار، نواب جان اس دور لہے پر کھڑی تھی، کہ  
حالات بگڑتے چلے گئے۔

امیر شریعت فرماتے ہیں :

"ایک دن میں میلسی رخلع ملتان جہاں نواب جان کا گھر تھا  
سے دس میل دور قصبہ فتح پور سے واپس آرہا تھا، مجھے اس درخت  
کے پھولوں کے پھولوں میں علاقے کے زمیندار، وکلاء اور نواب جان  
کے رشتے دار جمع ہیں کہ جیسے ہی میں میلسی میں داخل ہوں، مجھے  
افضل کے اغوا میں جمع گھر کے زبیر استاد اور پارچا پتہ چوری کرنے  
کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے۔"

مولانا خدابخش نے جو شہر کی جامع مسجد کے امام تھے

مجھے یہ قصہ سنایا تو میں نے کوچران سے کہا "تو انکے قصے سے بچو"

سب دوست بہران ہوئے جیسے ہی تانگہ تھانے کے قریب پہنچا۔

انچادریج تھانہ، وکلاء، علاقے کے رؤساء میرے ذہنی اور سیاسی



حریف جن میں صلح کا مال افسر بشیر احمد تارڑ بھی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سب کے سب سلام کرنے لگے۔ میں نے سب سے باہر چلے آئے، میں نے کہا۔ ”مجھے منافق قسم کا سلام قبول نہیں۔ میں آگیا ہوں، تم اپنی کارروائی جاری رکھو۔“ یہ کہہ کر میں اپنے میزبان کے گھر جو نواب جان کے گھر کے برابر تھا، چلا گیا، افضل اس وقت بھی میرے ساتھ تھا۔“

جب واقعات اس موڑ تک آن پہنچے تو نواب جان نے اپنے عزیز واقارب سے کہا۔ ”میں شاہ صاحب کے خلاف تھا۔ میں کوئی رپورٹ درج کرانا نہیں چاہتی، وہ سینہ میں اور درویش بھی یہ کہہ کر نواب جان نے امیر شریعت کے نام ایک دستی خط لکھا، جس کا مفہوم کچھ اس طرح سے تھا۔“

پیرسائیں!

السلام علیکم۔ میں اور میرا خاندان برسہا برس سے گناہوں کی زندگی گزار رہا ہے، افضل بھی میری اسی گناہ کی کمانی کا نتیجہ ہے۔ جس دامن پر گندگی کے چھینے پڑ چکے ہوں وہ دامن اس قابل ہے کہ آپ تک رسائی حاصل کر سکے۔

امیر شریعت نے اسی وقت جواب میں کہا:

”عجب وثواب انسانی زندگی کا خاصہ ہیں، موت و حیات کے درمیان کئی موڑ آتے ہیں، جہاں انسان پھسل کر سنبھلتا ہے اور سنبھل کر پھسلتا ہے۔ ثبات صرف اسی ایک ذرات گرائی کیلئے ہے۔“



میں تیرے حالات سے نا آشنا ہوں۔ اتنا ہی جانتا ہوں  
 اور وہ بھی تیرے بیٹے کی زبانی سنا ہے کہ تو گناہ کی زندگی میں  
 مبتلا ہے، اور اپنی اولاد کا مستقبل بھی خراب کر چکی ہے۔  
 حاشا وکلا مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ ندامت کے آنسوؤں سے  
 بھیگی ہوئی چادر میں لپیٹ کر اگر تو میرے مولا کریم کے سامنے  
 توبہ کی بھیک مانگے گی تو تیری بھولی خالی نہیں آئے گی میں بھی  
 تیرے لئے دعا کروں گا۔“

اس خط کے جواب میں دوسرے دن نواب جان کا ایک اور دستخط آیا۔

پیرسائین! السلام علیکم

اگر ندامت کے آنسوؤں سے گناہ کے داغ دھل سکتے  
 ہیں تو میں ساری رات گھر والوں سے چوری باوجود روتی رہی  
 ہوں۔ میرے ایسے گناہ کی گھنٹی کہ کون اٹھائے گا۔ تاہم آپ  
 حکم کریں کہ میں کسی سے نکاح کر لوں، جبکہ میرے گرد حوص ہوں  
 کے انسانوں کی بے شمار دولت جمع ہے اور میرے خاندان  
 کے لوگ اس دولت کے پجاری ہیں۔

پیرسائین! مجھے ان کے چنگل سے نجات کیلئے وقت  
 کی ضرورت ہے، میں کو شش میں کرتی ہوں، آپ دعا کریں۔ میرے  
 انفس سے کہنا، وہ بھی ماں کا گناہ معاف کر دے۔ میری تجویز  
 سے وہ واقف ہے۔“



اس خط کا امیر شریعت کے منظر حواسب دیا۔

"انسان کو نیکی کرنے کی توفیق تو اللہ تعالیٰ دیتے ہیں، سلام کا

بند ادنیٰ مستغ ہوئے کی حیثیت سے میں تیرے پیروں کا گویا

پروردگار تجھے نیکی کی راہ پر چلنے کی توفیق دے گا (آئین)

تو جس گناہ سے، پسندیدہ یا نفاق سے

ادویٰ کیا کرے گی کھڑی دین کے دن؟"

خطوط کے پروردگار یا درواشت پر مبنی ہیں، نہ تو ان کی نقل امیر شریعت کے پاس

تھی اور نہ ہی کسی دوسری جگہ یہاں گناہ کو نکالنے کا انداز تھا جو امیر شریعت نے

بیان کیا، جن پر خطوط کی عبارت ترقیب دی گئی ہے۔

نوابہ جان کی یہ کہانی دونوں اور بیعتوں میں نہیں، سائوں میں جا کر

ختم ہوئی، اور اس میں کئی موڑ آئے۔ آخر ہوا یہ کہ امیر شریعت کی دعا میں کام لیں، کہ

ضلع ملتان کی اس مشہور طوائف سے بیعت کا بہانہ کرنا اور سابقہ زندگی سے توبہ کر کے قبیل

میل سے کہ ایک زیندار خدائش بستہ سے شادی کر لی جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا،

یہ زیندار ۱۹۴۶ء میں انتقال کر گیا۔ نوابہ جان سے اپنی دونوں لڑکیوں کے نکاح بھی

شریعت کے مطابق کرے۔ افسوس اپنی اس کہانی واپس چلا گیا اور آج دونوں

ماں بیٹی ملیسی میں مقیم ہیں افسوس حکمہ نہریاں پڑا ہی ہے۔ اور اسی ضلع میں کہیں

تعمیرات

آخری سائش

ایام امیری پڑانی یادوں کے انہیں گھنڈہ رات پر سے کوہِ دہشتہ پہر



ی اپنے بیٹے دونوں کی کہانیاں سنانے میں مصروف تھا کہ انہیں دونوں حضرت  
 ناخبر داؤد غزنوی ایک تحریری بیان سے کر لیا اور سنٹرل جیل میں رہتا دس سے ملے  
 رکھا: "مجھے وزیر اعلیٰ صوبہ مغربی پاکستان ملک فیروز خاں نون سے بھیجا ہے اگر آپ  
 نرات اس بیان پر دستخط کر دیں تو حکومت آپ کو رہا کرنے کو تیار ہے"

بیان کا متن :

"تخریب ختم نبوت کو چلانے کا ہمارا اس طرح کا کوئی ارادہ نہیں  
 تھا اور نہ ہی آئندہ ہم ایسی کسی تحریک کے چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں ماضی  
 قریب میں جو کچھ ہوا اس میں عوام کا زیادہ دخل تھا۔

ہم حکومت کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ ہم ایسی کوئی تحریک  
 نہیں چلائیں گے جس سے ملک کا امن خطرے میں پڑ جائے۔"

مولانا داؤد غزنوی سے یہ تحریر لے لی گئی اور جواب کے لئے انہیں دوسرے  
 کو کہا گیا۔ مولانا ابوالحسنات، صاحبزادہ فیض الحسن اور تحریک کے دوسرے  
 رہنما مولانا داؤد غزنوی کی اس تحریر کو اپنے انداز سے سوچتے اور پڑھتے رہے لیکن  
 امیر شریعت کا انداز الگ رہا۔ انہوں نے رات بھر اس پر انقبض سے مشورہ کے بعد  
 فیصلہ کیا کہ اس تحریر پر دستخط کرنے سے بہتر ہے کہ ہم جیل کے غیر اخلاقی قیدیوں کے ہاتھوں  
 قتل ہو جائیں۔ یہ تحریر ہماری سیاسی اور مذہبی موت کے مترادف ہے چنانچہ دوسرے  
 دن مولانا داؤد غزنوی تشریف لائے تو حضرت امیر شریعت نے ان سے کافی  
 تلخ کلامی کی۔

تخریب ختم نبوت کے خلاف اپنے اور بیگانوں نے جو سازشیں کیں یہ سازش



اُس کی آخری کڑی تھی۔ دشمنوں کا یہ جال جو دوست کے ہاتھ سے پھیلا یا گیا تھا، اپنے  
اسی زور پر تار تار ہو کر رہ گیا، اور ہر مخالف جس نے تحریک ختم نبوت سے کو سبوتاژ کرنے کی  
کوشش کی۔ آپ سے آپ بندھنوں میں اُلجھتا چلا گیا۔

جماعت اسلامی کے رہنما جو تحریک کی نیو اٹھانے میں برابر کے شریک تھے،  
جب عتاب ملو کیتھ نظر آیا تو عزیز مصر کی بیوی کی طرح سارا گناہ حضرت یوسف  
کی جھولی میں ڈال کر اپنی پاک دامن کے گواہ تلاش کرنے لگے مجلس احرار کو اس  
تحریک کا جرم ٹھہرا کر جماعت اسلامی کے بزدل رہنماؤں نے اپنی جرات کو اس  
بڑی طرح داغدار کیا کہ تحریک کے ساتھ اپنی طاقت پر بھی چھینٹے ڈال لئے۔

اسی طرح تحریک ختم نبوت میں پنجاب کے ہر سیاست دان نے خواہ اس کا  
تعلق حکومت سے تھا یا دوسری سیاسی جماعتوں سے، عوام کے دباؤ کی وجہ سے اس  
تحریک سے ملوث ہونے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان دنوں سید حسین شہید سہروردی  
سابق وزیر اعظم پاکستان اپنی جماعت (عوامی لیگ) کو عوام میں متعارف کرانا چاہتے تھے  
اور اس غرض سے انہوں نے اس تحریک کے رہنماؤں سے جیل میں رابطہ قائم کیا  
تاکہ تحقیقاتی عدالت میں احرار کی قانونی امداد کر سکیں۔ لیکن ان کا محتارہ اس قدر  
زیادہ تھا کہ مجلس احرار اس کی مستعمل نہیں تھی اور دوسری طرف مولانا مظہر علی اظہر نے  
جنہوں نے معمولی رقم پر سارا مقدمہ لڑا

یہ قصہ چل رہا تھا کہ میاں محمود علی قصوری بار ایٹ لا، رہنما نیشنل عوامی پارٹی  
کو خیال آیا اور وہ بھی اس ٹوہ میں رہے کہ آیا حکومت نے تحریک ختم نبوت کے  
نظر بندوں پر ان کی ابتدائی معیاد نظر بندی (چھ ماہ) کے ختم ہونے پر دوسرے نوٹس



تعمیل کرانی ہے؟ اور جیسے ہی انہیں حکومت کی اس آئینی کمزوری کا علم ہوا، اور ساتھ ہی پتہ چلا کہ کراچی میں گرفتار ہونے والوں سے بھی دوسرے نوٹس کی تعمیل نہیں کرانی گئی تو انہوں نے آگے بڑھ کر اپنا سیاسی داؤ کھیلنا، مولانا ابوالحسنات، صاحبزادہ فیض الحسن اور اسٹریٹج الدین کی طرف سے لاہور ہائی کورٹ میں ایک رٹ دائر کر دی جس کی سماعت جسٹس رحمان نے کی اور نظر بندوں کو انتظامیہ کی کمزوری کا فائدہ دیتے ہوئے ۸ فروری ۱۹۵۳ء کو رہا کر دیا۔ اسی ضابطے کے تحت ۱۸ فروری ۱۹۵۳ء کو حضرت امیر شریعتؒ اپنے دوسرے رفقاء کے لاہور سنٹرل جیل سے رہا کر دیے گئے۔

## نئے سفر کا آغاز

بلاشبہ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے اور مبارک ہیں وہ لوگ جنہوں نے اس کارگاہ عالم میں اپنے وجود تک کو اس ماہ میں صرف کر دیا اور سنگ میل بن گئے رہوئے منزل کے لیے!

امیر شریعتؒ اب کے بارہیل خانے سے رہا ہوئے تو یقین تھا کہ عمر رواں کا ماندہ حصہ سکونِ قلب، تنہائی اور یادِ الہی میں گزار دیں گے، صحت تمام جسم سے بنادت کر چکی تھی۔ خاص کر سکھر جیل کی چند ونوں کی "سی کلاس" خوراک نے رہا سہا بھرم بھی گنوا دیا تھا۔ انہیں ونوں عزیز بیٹی نے بھی اکثر اصرار کیا کہ آبا! اب آپ آرام کریں، تو بڑے جلال میں سر پایا:

بیٹی! تم یہ پسند کرتی ہو کہ تمہارا باپ چار پائی پڑا بیٹیاں رہ کر گزر کر



مرے، یہ پسند نہیں کرتی کہ میں حضورؐ کی ختم نبوت کے لیے جان

دے دوں؟

نقاہت، بڑھاپا اور بیماری کے باعث کچھ دن گھر میں آرام کیا۔ لیکن  
شعبہ روزنامہ والوں کے ہجوم میں آرام کہاں، دن بھر اخباریں جمتیں، ادیب پر  
بات چلا نکلی تو گفتگوں اسی پر بحث ہو رہی ہے۔ سیاسیات کی بات آگئی تو بڑے  
بڑوں کے سنیے اور بیڑے جا رہے ہیں۔ ان دنوں کراچی میں ملک، غلام محمد گورنر جنرل  
پاکستان کی بساط پر اپنی ضرورت کے ہرے کھڑے رہے۔ قتلہ لاہور اور کراچی میں  
اٹھاپٹ کا ایک لامتناہی سلسلہ جا رہی تھا۔ انہیں واقعات کی طرف اشارہ کرتے  
ہوئے کسی دوست نے سوال کیا: "شاہ جی! یہ سب کچھ کیا پورا ہا ہے؟"

بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"بھیا! کتنے بھونک رہے ہیں، جن کو رات بمل گیا ہے وہ کھا کر

سو گئے ہیں اور جن کو نہیں ملا وہ بھونک رہے ہیں۔"

اس پر تمام محفل کشت زعفران بن گئی۔

اسی طرح راقم ایک دن لاہور سے ملتان حاضر ہوا تو حسب معمول

پرے سے تپاک سے ملے۔ اھلاؤ سہلاؤ مرزا کے بند فرمایا:

"جاننا بڑا ایک کیبٹن پاکستان کی میں نے بھی بنائی ہے

اس میں ایک آدمی کی کئی ہمتی۔ تمہارے آسنے پر وہ نام

یا و آگیا۔ دیکھو، اگر ان لوگوں پر مشتمل کیبٹن بن جائے تو

کتنے دن چلے؟"



کیبندہ: ۱: مولانا ظفر علی خان

۲: مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

۳: علامہ عیاض اللہ المشرقی

۴: مولانا عبدالستار نیازی

۵: قاسم رضوی (حصید آباد وکن)

۶: غازی محمد منیر (اوکاڑہ)

۷: حافظ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری۔ (میرے آسنے پر جو نام یاد آیا)

مندرجہ بالا حضرات کی اکثریت اپنی انفرادی زندگی میں اجتناب و احتسابی کا مجسمہ رہی ہے۔ ان کے خلوس پر بھی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ گذشتہ بیسویں صدی کی تاریخ ان کے سیاسی و مذہبی کردار کو فخر و بہا بات کے دامن میں گروہ بیٹھے ہوئے ہے۔ یہی اجتماعی زندگی میں یہ لوگ اپنے چلن کے خلاف منظر ہر کرتے رہے۔ مولانا ظفر علی خان نے اتحاد و ملت بنانی، نظام عیاض اللہ المشرقی نے خد کسار تنظیم، مولانا مودودی نے جماعت اسلامی، ترتیب دی، اور مودودی یہ لوگ ان جماعتوں کے صدر یا دیگر بنے رہے اور کنگہ کیپٹی ہوئی اپنے وقت کی انتخاب کی، جیسے ہی جماعت کے اندر سے ان کے اس فعل پر کوئی معترض تھا، ہوا، تو پہلے ٹکر گئے، اس پر بھی بات نہ بنی تو جماعتی پالیسی سے انحراف کے پریم میں متعلقہ نمبر کو جماعت سے الگ کرنے کی کوشش کی، اس پر بھی اگر کچھ لوگوں نے متعلقہ ممبر کے موقف کو درست قرار دیا تو جماعت توڑتا کر رہ گئے وہ گئے۔ ان دنوں پاکستان کی حکومت کی عمر ڈوبتے سورج کی طرح ہر شام



غروب ہو رہی تھی۔ ایسے وقت میں امیر شریعت نے مندرجہ بالا تین مزاج حضرات پر مشتمل پاکستان کی گھریلو کمیٹی (کابینہ) ترتیب دے کر حکومت وقت پر ایک ایسا پھرنوٹ لکھا کہ طنز و مزاح کی دنیا میں یہ نشر ہمیشہ پیوست رہے گا۔

دھوپ کے سائے ڈھلنے اور ان محفلوں کے رسیا اپنی اپنی راہ لیتے، امیر شریعت مرثام کندھے پر چادر اور ہاتھ میں بید کا کھونٹا ایسے نسیمی دو اٹھانے پر آجیتے، یہاں روح اور جسم دونوں کا علاج ہوتا تھا۔ بزم ساطت اور شعروشاعری کا بازار نماز عشاء تک گرم رہتا۔

## مجلس تحفظ ختم نبوت کی صدارت

اسی سال (۱۳ اکتوبر) امیر شریعت کو اکثر اجاب کے اصرار پر ملتان کے ایک خصوصی اجلاس میں مجلس تحفظ ختم نبوت کا صدر منتخب کیا گیا، آپ نے صدر منتخب ہوتے ہی حسب ذیل بیان پریس کے نام جاری کیا:

”مسئلہ ختم نبوت جانِ اسلام اور روحِ قرآن ہے، اگر مسلمان عقیدہ ختم نبوت سے بال برابر اوجھڑا دھر ہو جائیں گے تو پھر نہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن باقی رہتا ہے اور نہ ہی خدا تعالیٰ کا وہ تقدس اور توحید باقی رہتی ہے، جن پر آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ختمی المرتبت تک تمام انبیاء علیہم السلام متفق ہیں۔“

مرزا ابیت اس روح پر اس جانِ قرآن اور جانِ اسلام پر فرقہ انہ ضرب ہے، میں اس کے استحصال کو ہر مسلمان کے لئے فرض



جاننا ہوں اور اپنی زندگی کی آخری بازی۔ پاکستان کے جسم میں یہ  
سیاسی نامور ہے۔ اگر حکومت نے اس کا اپریشن نہ کیا تو یہ نامور  
سارے جسم کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔

## مبتغین کو وصیت

تحفظ ختم نبوت کے تمام مبتغین کو امیر شریعت نے اپنے مکان کی بیٹھک  
میں بلا کر حسب ذیل وصیت فرمائی:

"عزیزو! اسلام کی تبلیغ کانٹوں کا تاج پہننے کے مترادف  
ہے، بدھرم نہ کرو گے مخالفت ہی مخالفت نظر آئیں گے، حتیٰ کہ ایسے  
ایسے مقامات سے گزر رہو گا اور مخالفت ہوگی جہاں تمہارا گمان بھی نہیں  
پہنچ سکتا۔ اگر تم اس عزم پر پکے اور پختہ رہے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔  
پھر فتوراً مسکرائے اور فرمایا، احزاب بظاہر کسی تحریک میں کامیاب نہیں  
ہوتے لیکن اس عزم کو لے کر اٹھنے اور ڈٹے رہنے تو نتیجہ یہ ہے کہ  
برسر اقتدار آنے والا ہر گروہ احزاب کے نام سے لڑتا ہے۔

۲۔ دعنا کرنے کے لیے جانے سے پہلے داعی سے کراہہ کبھی  
وصول نہ کرنا۔ اگر اتنا بھی کرو گے تو منہ کھانے کا، آنکھ شرمائے گی،  
حقاً بیان نہ ہوگا۔ (فرمایا) آمد و رفت کا کراہہ گھر سے لے کر چلنا۔ تقریر  
بیان کے بعد اگر داعی کچھ خدمت کرے تو اس کے سامنے شمارہ نہ  
گورنا۔ اور اگر کچھ بھی نہ دے تو اپنی زبان سے طلب بھی نہ کرنا، بلکہ



چھپنے سے ہنس مکھ واپس آجانا۔ (فریاد) ساری زندگی میرا یہی  
 عمل رہا ہے۔ بسبب کہیں جانا ہوتا تو میں تمہاری اماں سے پوچھنا  
 کرتا تھا کہ مجھے فلاں جگہ وقفہ کہتے جانا ہے کرایہ ہے یا اگر ہوتا  
 تو آمد و رفت کا خرچہ گھر سے لے کر چلتا۔

(فریاد) کچھ بھی خدمت نہ کرنے والا، اگر پھر بھی بلا لے اور  
 دعوت دید سے تو جانے سے انکار نہ کرنا۔ (فریاد) اب اگر کچھ اور  
 پہلی مرتبہ بد یہ، حق الخدمت وغیرہ نہ مل سکنے کے سبب جانے  
 سے رُک جاؤ گے تو لہجیت نہیں ہوگی بلکہ نفاذیت ہوگی، اور  
 داعی کے سامنے شمار کرنے سے روکنے میں یہ حکمت فرمائی ہو سکتا  
 ہے داعی غریب اور مفلس ہونے کے سبب حق الخدمت یا کرایہ  
 دہی، پورا نہ دے سکے۔ اس سے خود کو بھی تڑو دھوگا، اور داعی کے  
 دل میں ہوک اُٹھے گی۔ ہائے ایسے غریب تھا نہ، کہ کرایہ بھی نہ  
 دے سکا اور اس سے اس غریب کے دل سے ایک آہ نکلے گی۔  
 بلکہ یہ نصیحت یا درکھنا کہ غریب کی آہ اور دل دکھانے کے ہر پہلو  
 سے پرہیز کرنا۔ اگر ان باتوں پر عمل کرو گے تو اللہ اللہ کبھی بھوکے  
 نہیں رہو گے اور یہی باتیں دنیا و عقبہ کی فلاح و بہبود اور ترقی اور  
 عمر طبعی کا مددگار ثابت ہوں گی۔

## زیادہ سے اور علاج

انسان جب جوانی کے نشے میں ہوتا ہے تو اپنے جسم پر بھی رحم نہیں کھاتا،



اس دور کی غلطیاں اور نسیم سے، انہماکیاں جب بڑھاپے میں غلیم بغاوت، بلند کرتی ہیں تو انسان مختلف بیماریوں کا بہانہ کرتا ہے، حالانکہ ان بیماریوں کا موجب وہ خود ہوتا ہے۔ امیر شریعتؒ فرماتے ہیں:

”انسان کے اندر ایک مستقل سلطنت آباد ہے، دل اور

وماغ اس کے بادشاہ اور وزیر ہیں، جب یہ دونوں اپنی رعایا کو

تنگ کرتے ہیں تو آخر بغاوت کا احتمالی گڑھوگا! یہی ہیں سنے بھی

کیا ہے، میں نے اپنے جسم پر کوئی رحم نہیں کھایا، رات دن کاسٹرو،

سلسل دس دس ہیں ہیں گھنٹے تقریریں، بے وقت کی خوراک،

وہ بھی میران کی مرضی پر، یہاں سے فرصت ملی تو جیل خانہ، یہ

کوئی سال دو سال کا عمل نہیں، بلکہ میری زندگی کے چالیس سال

اسی دشت کی سیاحی میں گزرے ہیں۔ ان حالات میں اپنی صحت کا

نگہ نہیں کس پر کروں!“

۱۶ نومبر ۱۹۵۶ء کو ناز عثمان کے لئے گھر میں وضو کر رہے تھے کہ دائیں جانب

فالج کا ہلکا سا حملہ ہوا، ذیابیطس کی شکایت پیشتر سے چلی آ رہی تھی۔ فالج کے حملے

نے اس بیماری کو بھی تو انانی دے دی۔ حضرت امیر شریعتؒ کا اپنا بیان ہے کہ

”جب مجھ پر فالج کا حملہ ہوا تو تمام جسم بیماری سے مفلوم ہونے لگا۔ مجھے ایسا

محسوس ہوا، جیسے اب موت کا وقت قریب آگیا ہے۔ چنانچہ میں نے

کلمہ پڑھنا شروع کر دیا، اور چاند پانی پر جا کر لیٹ گیا، لیکن مقوڑی

دیر بعد بیماری کا اثر نائل ہو گیا۔“



پھر آپ بے اختیار روئے لگ پرٹے اور خوب روئے۔ اس دوران حضور

خاتم الانبیاءؐ کی یا و ذہن میں آئی اور یہ شرباً بار بار پڑھتے رہے

اس وقت تیرا مستی سے کیا حال ہوا ہو گا

جب تو نے یہ ساقی شیشے میں بھری ہو گی

## حج بیت اللہ کی دعوت

غلام شخصیت کا ہویا سلطنت کا اس کی رائے اور مذہب اپنے آقا کے محکوم ہوتے ہیں۔ قریباً ڈیڑھ سو سالہ برطانوی سامراج کی غلامی نے برصغیر کے مذاہب کو اپنی سیاسی ضرورت کے تابع رکھا۔ اسلام جیسا عظیم فطرتی مذہب بھی ایک وقت آیا کہ انگریزی حکمرانوں کا پابند ہو گیا۔ مثلاً حج اسلام کے پانچ ارکان میں سے ہے ایک مسلمان کو اللہ تعالیٰ ہمت دیتے ہیں کہ وہ حج بیت اللہ کے لیے جاسکے۔ لیکن انگریز بطورہ حاکم ملک اپنی سیاسی ضرورت کے تحت انہیں اس کی اجازت نہیں دیتا، جیسے کہ دوسری جنگ عظیم میں ہوا۔ اسلام فوٹو اتروانے کی ممانعت کرتا ہے، لیکن غیر ملکی قانون کہتا ہے کہ حج کی درخواست کے ساتھ فوٹو کا ہونا لازمی ہے۔ ایسی ہی کچھ پابندیاں تھیں کہ امیر شریعتؒ نے ہمیشہ حج بیت اللہ جانے سے پہلو تہی کی۔ حال تک بڑے بڑے رؤسا اور اُمراء نے دعوتیں دیں، لیکن طرح دیتے گئے، مگر اندر کی بات وہی تھی کہ جاؤں تو اللہ کے گھر کی زیارت کے لیے اور اجازت مانگیں فرنگی سے، یہ نہ تو میرا ضمیر گوارا رہتا ہے اور نہ ایمان اجازت دیتا ہے چنانچہ دسمبر ۱۹۵۴ء حاجی دین محمد صاحب نے امیر شریعتؒ کو حج بیت اللہ کیلئے دعوت دی



جو اس میں فرمایا :-

"عاجی صاحب! ارادہ تو ہے مگر چاہتا ہوں کہ گھر کے تمام افراد  
ساتھ چلیں، اور اس سفر میں کسی کی امدادی رقم شامل نہ ہو۔"  
اس پر حاجی صاحب نے کہا: "آپ کا ارادہ ہے کہ آپ گھر بار سمیت وہاں چلے  
جائیں اور پھر واپس نہ آئیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ سے اگر کوئی کام لینا ہوا تو ہے؟"  
اس پر امیر شریعت مسکرائے۔

## روحانی خدمت

منزل سے پیشتر کاروان منزل، سالانہ کاروان کو غبار کاروان میں پٹا  
چھوڑ کر الگ راہ اختیار کر لے تو امیر کاروان پر کیا گزرتی ہے؟ اس کا اندازہ وہی  
کر سکتا ہے جس کی کشتی طوفان میں ہو، اور پنوار موجوں کے تھپیڑوں سے ٹوٹ  
جائے، اور وہ بے دست و پا ہو کر رہ جائے۔

رہائی کے بعد رہنمایانِ احوالہ و سمیرم ۱۹۵۶ء کے دوسرے ہفتہ ملتان  
امیر شریعت کے مکان پر جمع ہوئے، تاکہ آئندہ کے لیے راہیں سوچ سکیں۔  
سین شہید سہروردی تحریک ختم نبوت کے دنوں احوالہ ہٹاؤں کے قریب آ  
چکے تھے۔ بنا بریں کچھ مہران کی رائے تھی کہ احوالہ کو سہروردی سے تعاون کر لینا  
چاہیے، اس پر نین دن کی بحث کے بعد یہ فیصلہ ٹھہرا کہ سہروردی پر اپنا  
موقف واضح کر دیا جائے، اگر وہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دلوانے کے مسئلے پر  
ہمارے فیصلے سے اتفاق کریں، تو جماعت اُن سے تعاون کے لیے تیار ہے۔



چنانچہ ورکنگ کمیٹی نے اس کام کے لیے شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین  
انصاری کو کراچی بھیجا۔

اجاب جواب کے منتظر تھے کہ ۲۱ دسمبر ۱۹۵۳ء کو اخبار است میں  
حسب ذیل خبر شائع ہوئی:

”کراچی، ۱۹ دسمبر۔ مجلس احرار کے سابق رہنما شیخ حسام الدین  
اور ماسٹر تاج الدین انصاری نے آج اعلان کیا ہے کہ انہوں  
نے جناح عوامی لیگ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں  
نے ایک بیان میں کہا ہے کہ وہ مسٹر سہروردی سے بات چیت  
کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ جناح عوامی لیگ میں شامل  
ہو کہ جمہوریت کی خدمت کر سکتے ہیں، وہ عوامی لیگ کے سیاسی  
نظریات سے متفق ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ملک کو مسٹر سہروردی  
کی خدمات کی ضرورت ہے، جو ایک تجربہ کار رہنما ہیں۔ جمہوریت  
کے قیام کے لئے انہوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔“

شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین نے کہا ہے  
کہ ان کا یہ اقدام پارٹی کے کسی فیصلے کا نتیجہ نہیں ہے۔

مجلس احرار ۱۹۳۹ء میں سیاسیات سے علیحدہ ہو چکی

ہے۔ انہوں نے اپنے دوستوں اور حامیوں سے اپیل کی ہے

کہ وہ عوامی لیگ میں شامل ہو کر پاکستان اور جمہوریت کے استحکام

کے لیے کام کریں۔ (روزنامہ ”تعمیر“ لاہور، ۲۱ دسمبر ۱۹۵۳ء)



اسی اخبار میں یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ حسین شہید سہروردی کو پاکستان کی  
یہ نہیں شامل کر لیا گیا ہے۔

اچانک ان رہنماؤں کے عوامی لیگ میں شامل ہونے کے اعلان نے  
یہ حلقوں کو پریشان کر دیا۔ نیز امیر شریعت نے بسبب یہ خبر پڑھی تو سرکپ کر بیٹھ  
تے، اور ایک سرواگہ کے ساتھ پنجابی زبان کے یہ دو سہے بار بار دہراتے رہے۔  
چھٹ کے میدان نس گئے جیہڑے کہندے سی مراں گے نال تیرے  
دین کا یہ دعویٰ تھا کہ ہم تیرے ساتھ مریں گے وہ لوگ میدان چھوڑ کر  
گئے

یاد رہی توڑ گئے پکریاں والے دو گھنٹ دو دو پد سے

یوں کا دو دو دو ہونے والے ٹنڈو گھنٹ دو دو کے لیے پارہ نہ توڑ گئے  
رہیقوں کی اس جہانی سے امیر شریعت کو جو روحانی صدمہ ہوا اس سے انہوں  
نے مدتوں محسوس کیا، اس سلسلے میں جب کوئی سوال کرتا تو ہلکی سی آہ کے ساتھ  
بب مسکرا دیتے۔

گھر پر لوگ بعد میں عوامی لیگ سے مایوس ہو کر دوبارہ مجلس احرار میں  
مل ہو گئے لیکن امیر شریعت کے دل میں تاہم واپس یہ کسک باقی رہی۔

1955

یہ سال بھی پاکستانی سیاستدانوں کے لیے انقلابی سال تھا۔ صوبائی  
اور مرکزی حکومتیں بھی و شام تبدیل ہو رہی تھیں، مسٹر محمد علی بوگرہ جنہیں امریکہ سے



بگوانہ پاکستان کے راج سلگھاسن پر بٹھا دیا گیا تھا، ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان  
 کے اٹارنہ ابرو پر رقص کماں تھے۔ اس سے پیشتر ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو ریڈیو پر  
 اعلان کیا گیا کہ پورے مغربی پاکستان کو ایک وحدت کی شکل دیدی جائے گی۔  
 خبر نے صوبائی سیاستدانوں میں کھلبلی مچا دی اور سمجھی کو اپنی لیڈری خطرے میں  
 نظر آنے لگی۔ چنانچہ ایسی افراتفری پیدا ہوئی، کہ حکمران لوگ اپنی کرسیوں کی حفاظت  
 میں عوام سے غافل ہو گئے۔ نتیجتاً ملک میں جرائم بڑھنے لگے، مجرم ضمیر لوگ  
 اور شہر کی عزت و آبرو کے ڈاکو بن گئے۔ یہی دن تھے کہ گجرات شہر میں حسین  
 نامی ایک عورت اپنی عزت کے ساتھ جان بھی گنوا بیٹھی۔ مظلوم اور معصوم  
 عورت کے سانحہ رات کے اندھیرے میں کیا کچھ ہوا؟ پھر اس کا قتل کیونکہ  
 ان سوالوں کے جواب میں قانون آج تک خاموش ہے۔

گجرات کا دل مٹی کے برتنوں کی طرح خوبصورت ہے، لیکن سوہنی  
 گھرے کی طرح دیربا کے درمیان فریب دے دیتا ہے۔

امیر شریعت کو جب اس واقعہ کی اطلاع اخبارات کے ذریعہ ملی تو کچھ  
 خاموش رہ کر فرمایا۔ "قانون اپنی ضرورت کے لیے چپ ہے، لیکن عصمت ماں  
 خاتون کا بے گناہ خون آج نہیں توکل ظالموں کی آپ نشانہ ہی کرے گا، اور  
 دامن جس پو حسین بنی کا خون چمک رہا ہے گجرات کے کوچہ و بازار میں رسوا ہو  
 حکومت کی اپنی پالیسی میں جب تضاد ہو، تو ملک کی دوسری جماعتیں  
 لے کر پورے ملک میں متعین کر سکتی ہیں۔"

پاکستان کے دانشوروں نے ۱۹۵۳ء کے بعد سے پورا امر شہر



کھا تھا، اس میں تماشائی کے علاوہ کوئی کردار بہتر نہیں تھا۔ حضرت امیر شریعت  
 بنی اجتماعات کے علاوہ کسی دوسرے جلسے میں شمولیت سے اجتناب کرتے رہے  
 بے بھی ان کی صحت، بیماری جو بڑھا چاہے کے دوش پر آگے بڑھ رہی تھی، اس کی  
 اذیت نہیں دیتی تھی۔ انہیں حالات میں ایک دوست نے سوال کیا: شاہ جی!

پا کو یہ مرض دوبا بیٹس اکب سے ہے؟۔ جواب میں کہا

"سکھر جیل سے اس مرض نے رفاقت شروع کی تھی، ادوات تک

سگت بھار رہے۔ خیال ہے کہ کم بخت موت تک ساتھ دے گا"

## شرکت حج کیپٹل پور

۱۹۵۳ء کے بعد تحریک مرزاہیت کو ہر پاکستانی نے سمجھ لیا تھا، اور اس کے  
 دو ساختہ نواذ جو فرنگی سانچے میں ڈھل کر حقیقت اسلام کی برابری کو دیکھتے  
 فسانہ ہو کر عوام کے سامنے آگئے تھے۔

ایک (مرزائی) عورت مسات اُمتہ الکریمہ کا نکاح کیپٹن نذیر (مسلمانوں  
 سے ہوا۔ اس انکشاف پر کہ عورت کا مذہب اسلام نہیں ہے کیپٹن نذیر احمد  
 نے اسے طلاق دے دی۔ اس پر عدالت میں مقدمہ چلا اور ۲ جون ۱۹۵۵ء کو  
 شیخ محمد اکبر و شرکت حج کیپٹل پور نے میاں محمد سلیم سول حج راولپنڈی کے  
 سابقہ فیصلے کی تصدیق کر دی، کہ قادیانی مسلمانوں کا فرقہ نہیں، اس لئے قادیانی  
 عورت کا نکاح مسلمان مرد سے نہیں ہو سکتا۔

گو اس سے پیشتر سشن حج بہاول پور اور سشن حج گورداسپور کے



فیصلے عوام میں آچکے تھے۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد ڈسٹرکٹ جج کیپٹل پور کے فیصلے نے  
۱۹۵۳ء کے واقعات کی تائید کر دی۔

حضرت امیر شریعت کو جیسا اس فیصلے کی اطلاع ملی تو خوشی میں آنسو نکل آئے  
اور اسی وقت شکرانہ کے چار نقل ادا کئے اور ساتھ ہی کہا:

”سو سنا کی، ایک لوہا کی، مہربانی گلاشتہ محنت سے ٹھکری ہے  
مرزا ایبٹ پر اس قدر ضرب کاہی نہ لگتی ہو، جس قدر کہ پہل پور سے کے  
ڈسٹرکٹ جج کے قلم سے مرزا ایبٹ کو قتل کر دیا ہے، کیونکہ یہ فیصلہ  
حکومت کے اپنے آدمی نے راجح الوقت قانون کے تحت دیا  
نہ ہے۔ اب میرے کہنے کی پابندی نہیں۔ حکومت خود سوچے کہ  
سشن جج کیپٹل پور کے اس فیصلے کے بعد مرزا ایبٹ کے متعلق  
اس کی کیا پالیسی ہے“

## دہائی کے بعد پہلی تقریر

مئی (۱۹۵۵ء) کے آخری پندرہ وارے میں سرفیروز خاں نون پنجاب  
وزارت عظمیٰ سے الگ کر دیے گئے تو حالات نے نئی کروٹ لی، پیشتر اس کے  
آنے والے کل کو حالات مزید بگڑ جائیں، مرکزی جماعت تختہ ختم نبوت  
۱۱ سے ۱۴ جون (۱۹۵۵ء) تک اپنا مرکزی اجلاس لاہور میں بلانے کا فیصلہ  
تحریک ختم نبوت کے دنوں مولانا داؤد غزنوی کی زعمیہ اجراء سے ملقا  
جماعت اسلامی کے لیڈر مولانا مودودی کا اس تحریک میں کردار، اجراء تھا اور



عوامی لیگ میں شمولیت سے عوام میں اکثر غلط فہمیاں پھیل رہی تھیں، ان کی وضاحت کے لیے لائل پور کا اجلاس بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

لائل پور میں ان دنوں دفعہ سوم کا انعقاد تھا، لہذا اجلاس میونسپل چارڈ سے باہر بیچلر کالونی میں رکھے گئے اور آخری دن امیر شریعت سے تقریر کی۔ تحریک ختم نبوت کے بعد امیر شریعت کی یہ پہلی تقریر تھی۔ عوام اور حکام دونوں کے کان اس تقریر کے منتظر تھے۔

اٹریٹ کے مشہور محبت وطن مسٹر ڈی ولیرہ کے متعلق یہ روایت ہے کہ ایک دفعہ تقریر کر رہے تھے اور پولیس نے انہیں دوران تقریر گرفتار کر لیا۔ دو سال کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔ وہ اپنی کا دن آیا تو پارٹی کو اطلاع دی کہ میں رہا ہو کر سیدھا اسی جگہ پہنچوں گا جہاں سے گرفتار کیا گیا تھا۔ لہذا آپ جلسے کا انتظام نہیں کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ہجوم منتظر تھا، مسٹر ڈی ولیرہ کار سے اترے اور جلسہ گاہ میں چلے گئے انہوں نے بغیر کسی تمہید کے کہا: "تو حضرات میں یہ عرض کر رہا تھا۔" گرفتاری کے وقت جہاں سے بات چھوڑی تھی، دو سال کے تعطل سے بات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔

حضرت امیر شریعت کچھ دن گھر میں سستانے، تازہ دم ہو کر نئے سفر کے لیے پھر نکل کھڑے ہوئے، تو سب سے پہلے آپ نے اہل لائل پور کو خطاب کیا۔ خطبہ سونے سے پہلے فرمایا:

"اٹلی کے مشہور فلاسفر سیرگیلیپو نے پہلے پہل یہ دعویٰ کیا کہ



بہیں دیکھ رہا ہوں زمین متحرک ہے، اس پر اُس وقت کے  
قانون دانوں نے اُسے مجرم قرار دے کر گرفتار کر لیا اور عدالت  
کے سامنے پیش کیا:

عدالت: کیا تم نے یہ کہا ہے کہ زمین متحرک ہے؟  
گلیلیو: ہاں! میں نے کہا ہے کہ زمین متحرک ہے۔

عدالت: تو پھر بطور سزا کے یہ زہر کا پیالہ پی لو!  
گلیلیو نے زہر کا پیالہ اٹھایا اور منہ کے قریب لے جا کر  
پھر زمین پر رکھ کر عدالت سے مخاطب ہوا۔

”اگر میں یہ کہہ دوں کہ زمین متحرک نہیں تو پھر؟“  
عدالت: تو پھر جا سکتے ہو۔

گلیلیو اٹھا اور عدالت کے دروازے تک جا کر پھر  
پلٹ کر کہنے لگا۔ ”مجھے تو اب بھی زمین متحرک معلوم ہوتی ہے“  
یہ کہا اور زہر کا پیالہ پی لیا اور امیر شریعت اس قہقہے پر مسکرائے اور  
فرمایا: ارشاد خداوندی ہے۔ ما کان محمد اباً احد  
من رجائکم والکن رسول اللہ وخاتم النبیین  
اور حدیث رسول اللہ: انا خاتم النبیین لانی بعدی  
کے بعد میں کیسے کہہ دوں کہ کوئی دوسرا نبی بھی آسکتا ہے،  
میری تو اب بھی یہی راستہ ہے کہ حضور خاتم الانبیاء ہیں اور ان  
کے بعد جو نبوت کا دعویٰ کرے گا میں اسے انسان بھی کہنے



کے لیے تیار نہیں۔ تمہارا قانون جو چاہے مجھے کرے، میں ار  
 پر بھی یہی کہوں گا کہ حضور خاتم النبیین ہیں، تمہارا قانون میرا  
 کیا بگاڑ سکتا ہے، اب رہ بھی کیا گیا ہے جو بگاڑ لو گے ہڈیوں کا  
 ایک ڈھانچہ ہے، میں پاستا ہوں کہ یہ بھی میاں کی عزت پر نثار  
 ہو جائے تو جان چھوٹے۔“

اس کے بعد آپ نے خطبہ منوہ پڑھنا اور فرمایا :

مجھے آپ سے تین باتیں کہنا ہیں۔ پہلی یہ کہ جس ہند  
 کو ہم لے کر بیٹھے ہیں، یہ کیا پیر ہے؟ مثال کے طور پر عرض  
 کرنا ہوں، کسی کے مکان کی چھت ٹپکنے لگی تو اس نے اپنے  
 مکان کو کچھلی طرف سے یسنا شروع کیا، جب لپ کر فانیس ہوئے  
 تو دیکھا کہ یہ تو ہمسایوں کا ہی مکان لپکا گیا ہے، یہ آج کی نئی  
 بات نہیں ہے، چودہ سو برس سے امت اس پر ڈٹی ہوئی  
 ہے۔ اس وقت دنیا کی آبادی میں مسلمان تقریباً پچھتر کروڑ ہیں  
 حضور کے عہد سے لے کر اس وقت تک کتنے بیونہر خاک  
 ہو گئے، ان میں کتنے صحابی، تابعی، ولی، غورث، قطیب،  
 فقیہ، امام اور بزرگ گزرے۔ تمام امت کے اولیاء لاکھوں  
 صحابہ سب اسی عقیدے پر ڈٹے رہے کہ حضور کے بعد  
 نبوت کسی کو نہیں ملی، کوئی ماں نہیں ہے جو نبی بنتی۔  
 اللہ ایک ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں، ہم سب اس کے



محتاج ہیں۔ یہ دنیاوی عقیدہ ہے، آمنہ کا بیٹا، عبداللہ کے گھر کا چاند  
 عبدالطلب کا پوتا، صدیق اکبر اور عمر ابن خطاب کا داماد، عثمان اور  
 علی کا خسر، حسنین کا نانا، فاطمہ کا ابا، بن کا نام مائی ہے محمد صلی اللہ  
 علیہ وسلم، جن کے بعد کوئی نبی نہیں آیا پھر کروڑ مسلمان اس وقت  
 اس عقیدے پر کھڑے ہیں اور انہوں نے پوپنڈ خاک ہو چکے ہیں،  
 صاحب فکر و عقل، علم و ہمت، صاحب فہم و فراست پیدا ہوئے  
 اور پوپنڈ خاک ہو گئے۔ وہ سب اسی عقیدے پر قائم رہے۔  
 اللہ نے فرمایا، تم نے آپ کو تمام آدمیوں کیلئے خوشخبری  
 سنائی اور ڈرائے والے بنا کر بھیجا ہے، اور فرمایا کہ اسے نبی  
 اعلان کرو کہ مسلمان، جہاں کہیں بھی ہوں اور جس زمانے میں  
 بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں، پوپنڈ پر، پوپنڈ پر، مشرق میں،  
 مغرب میں، نیچے اوپر، تخت السری میں، اعلان کر دیجئے، اسے نبی  
 (صلی اللہ علیہ وسلم) کہیں تم سب کی طرف پیغمبر بنا کر آیا ہوں، جی  
 چاہے، انا جی چاہے زمانہ یہ ہے اصل عقیدہ۔

اب اگر قرآن میں خاتم النبیین کی آیت نہ بھی ہوں تو بھی

یہ لفظ کافی تھا۔

عقیدہ عقیدے سے ہے، اور عقیدے کہتے ہیں بول کی گرہ کو۔

قرآن سینہ پر سینہ حضور سے صحابہ تک پڑھتے پڑھاتے، سینے

دراقت میں بنا ہے عقیدے سے کہے بشیر علی، نبی نہیں، ہوتا، ہوتا ہو



یا بھلا، اور عشق کا نام ہی عقیدہ ہے۔ نماز کی وقتیت دل میں  
 نہ ہو تو وضو کیوں کرے، توحید بڑی چیر ہے، لیکن ختم نبوت اگر  
 اس سے نکال دو تو یہ بھی کچھ نہیں رہتی۔ ماننے کو تو مکے کے لوگ  
 بھی خدا کو مانتے تھے، چاہے عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا  
 اور یہودی عزیز علیہ السلام کو خدا کا بیٹا، کیسے ہیں تین سوساٹھ  
 خدا رکھتے تھے اور ننگے ہو کر طواف کتبہ کرتے تھے۔

جب اللہ کی رحمت بخش میں آئی تو اللہ کے گھر میں پانچ  
 نکلا، کتبہ میں جھاڑو دی، اللہ کا نام پڑھ کر کیا اور فرمایا کہ تم جو لوگ بڑھ  
 چرٹھ کر ان کو خدا بنا تے ہو، یہ سب جھوٹے ہیں۔

نبوت کا مقام تو بہت ہی بڑا مقام ہے، اور اکبر بگڑ تو دیکھو  
 حیا کے مارے کبھی نگاہ نہیں اٹھی، یہ تو نبوت کی بات تھی، پیر سے  
 مرشد حضرت مولانا رائے پوری دس سال کے بعد ضلع سرگودھا میں  
 اپنے گھر آئے تو اپنی بڑی حقیقی ہمشیرہ کو نہ پہچانا، جب تک کہ  
 انہوں نے بات نہ کی۔ حضرت فرماتے تھے کہ بچپن ہی سے میں  
 نے انہیں نظر اٹھا کر نہیں دیکھا، یہ شرم و حیا کی بات ہے۔

ہم خدا کو جانتے ہی نہیں، محمد کو جانتے ہیں۔ ابو جہل  
 صدیق اکبر کے پاس آیا اور کہا کبھی کوئی آسمان پر گیا ہے۔  
 صدیق اکبر نے فرمایا، نہیں! ابو جہل نے کہا، تیرا باپ کہتا ہے میں  
 وہاں سے ہوا آیا ہوں! صدیق اکبر نے فرمایا، تو وہ سچ کہتا ہے۔



اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا۔

تیرہ سال کی بات ہے، ایک آدمی کی وساطت سے  
مرزائی عرب شریف چلا گیا تھا اور مدینہ منورہ جا کر مرزا کی نبوت  
کی تبلیغ کی جس میں اس شخص کا نام نہیں لیتا جس کی وساطت سے  
مرزائی گیا۔ میں نے اس سے آج تک کلام نہیں کی اور نہ کروں گا  
یہ مرزائیوں کا تبلیغی نظام ہے۔

میں اکتوبر ۱۹۲۳ء میں رہا ہو کر امرتسر آیا تو معلوم ہوا مولوی  
نور احمد سرحدی نے قادیان میں جلسہ کیا۔ بہت سے علماء کرام آئے  
اور، عظمیٰ کے چلے گئے۔ تب سے ہم نے فکر کی کہ یہ انفرادی تبلیغ  
جماعتی تنظیم کے مقابلے میں کچھ نہیں، جماعت کا مقابلہ جماعت  
سے ہونا چاہیے۔

۱۹۳۱ء میں ہم نے سوچا، حضور علیہ السلام کی نبوت کو  
مٹانے کا نظام بن رہا ہے، تب سے جماعت بنی اور اس کا  
شعبہ تبلیغ مقرر ہوا، جس کا تعلق ملک کے سیاسی معاملات سے  
نہیں تھا۔

اسلام کی بنیاد مسئلہ ختم نبوت پر ہے، جب حضور نے فرمایا  
لا نبی بعدی، لا رسول بعدی ولا امت بعدکم  
فروع سے لے کر آج تک اور آج سے لے کر ہشر کے گرم ہونے  
تک کوئی نہیں جو عقیدہ بدلے، ہم اس کو لے کر اٹھے ہیں، اس کا



کسی ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔

بعض لوگوں کو شک ہے کہ ہم اس تحریک میں حکومت کے سامنے جھک گئے ہیں، ارے تم ہمیشہ انگریزوں کے سامنے جھکتے رہے ہو، تو ہم اگر مسلمان حکومت کے سامنے جھک گئے تو کیا ہوا۔ ارے۔ میرے اپنے میرا ساٹھ چھوڑ گئے تو میں کسی کو کیا کہوں، آپ کسی پارٹی میں چاہیں جائیں، لیکن ادھر بھی توجہ رکھیں۔ اگر آپ کی سمجھ میں میری بات نہیں آتی تو صرف اللہ سے ہی سمجھ لو، وہ والسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے لے کر پاکستان کی وزارت خارجہ تک جہاں رہا، قادیان نہیں چھوڑا۔ آپ کو سرکار کا ملازم ہو کر تحفظ ختم نبوت سے شرم کیوں آتی ہے؟ سود فوجی، عوامی لیگ میں یا مسلم لیگ میں، لیکن تمہاری جوانیوں کا صدقہ تحفظ ختم نبوت کی طرف بھی نگاہ لگم ڈالتے رہو۔

گفٹ کا پروگرام کوئی آج کا نہیں ہے، جب سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے، تب سے مسلمہ کذاب پیدا ہونے شروع ہوئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے سات ہزار حافظ قرآن صحابہ کو ختم نبوت کی خاطر شہید کروا دیا تھا۔

کہتے ہیں نتیجہ کچھ نہیں نکلا، ارے نتیجہ تو نہیں آیا۔ راولپنڈی کے سیشن جج کا فیصلہ تمہارے سامنے ہے۔

تحریک ختم نبوت میں جو کچھ ہوا، اس کا میں اکیلا



ذمہ دار ہوں، تمام ذمہ داری میرے سر ہے، اور قیامت تک  
 اس مسئلہ پر جس قدر لوگ مرے گئے اُس کی ذمہ داری بھی میرے  
 سر سے گئی۔ اسی میں موودوی نہیں ہوں کہ بددیانت ہو جاؤں  
 مجلس عمل کے اجلاس کراچی میں موودوی صاحب میرے زانو کے  
 ساتھ زانو ملائے بیٹھے تھے، یہ یزدیویشن میرے جانے سے پہلے  
 پاس ہو چکا تھا۔ میں کیا کروں کسی کی کتابوں کو اور لٹریچر کو۔

میں اس سے پہلے اجلاس میں نہیں گیا تھا۔ دوسرے دن  
 (میلانا) محمد علی میرے پاس آئے، اور کہا کہ آج تم چلو۔ میں نے کہا  
 جو پاس کرنا ہے کر لو میں عملی کروں گا۔ جب گیا تو داؤد غزنوی کے  
 پاس جا بیٹھا، موودوی بھی پاس بیٹھے تھے، انہوں نے مجھے اپنے  
 وہ ایسی طرف چنگوی، یزدیویشن پاس ہو چکا تھا، محمد علی (جلیل) میری  
 لڑکوں سے دستبردار ہے تھے اور میرا نام بھی لکھوایا، اُن کا نام بھی لکھا  
 آج وہ (موودوی) کہتے ہیں میں شریک میں شامل نہیں تھا۔ میں  
 کہتا ہوں شامل تھا۔ اگر موودوی شامل نہیں تھا تو میں اُن سے  
 حلقہ پیمانہ کا مطالبہ نہیں کرتا ہوں، بلکہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ  
 وہ اپنے لڑکوں کو سکھانے پر ہاتھ دیکھ کر اعلان کر دیں کہ میں شامل  
 نہیں تھا۔ ورنہ میں اعلان کرتا ہوں کہ میں ذمہ دار ہوں، میں شریک  
 میں شامل تھا۔ اسے جو شریک میں شامل تھا اُس نے سالی کافی  
 اور جو نہیں شامل اُس نے دو سال کافی۔ جب میں رہا ہونے لگا،



تو ڈیوڑھی میں آکر مو دووی نے کہا کہ جنہوں نے تقریریں کہیں وہ  
 نہ ہونے اور جنہوں نے فقط سر بلایا وہ پھینسے رہے یہ ہے  
 دیانت، ہزاروں شہید ہوئے، ماؤں کے سہاگ لٹے، کئی  
 یتیم ہوئے، کئی اجڑ گئے۔

آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے،

”اللہ! میں ذمہ دار ہوں، آج بھی ذمہ دار ہوں اور آئندہ کل کو بھی  
 ذمہ دار ہوں گا میں نے یہ سب کچھ نبر سے نبی کے نام کی خاطر کیا تھا۔

ہزاروں کو مروا کر کہہ دوں کہ میں شامل نہیں تھا، کیا یہی  
 دین ہے؟ کیا کروں ظلم کو اور اذیت کو، میرا کٹیجہ پھٹتا ہے، میں  
 بولنے پر آؤں تو اوصال کیوں رکھوں، ارے تم سے کافر گلیلیوی  
 اچھا تھا جس نے نہ ہر کا پیالہ پٹی لیا۔

جو ہوتا ہے ہوسے، اللہ تعالیٰ ہم سے غلط قدم نہ اٹھوائے

کیا جیل میں میں نے وہ بیان نہیں دیکھا یا جس پر سلطان احمد کے  
 دستخط موجود ہیں، جب کہا تو کہنے لگے یہ اصلاح کیلئے کیا تھا۔

مہر مولانا داؤد خاں کی بابت کہ وہ ٹیچر سے جیل میں ملے

تو اتنی ہی بات کہہ کے ختم کرنا ہوں، لعنتہ اللہ الا لکافین، وہ نیک

آدمی ہیں، خدا جانے کسی سیاسی مصروفیت کی وجہ سے مالک صاحب

(فیروز خان نون و ذیہ اعلیٰ مشرقی پاکستان) نے ان سے یہ کام لیا

ہے، اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔



خدا میری بھی لاج رکھے جو کیا ہے اور جو کر رہا ہوں اسی پر

قائم رکھے۔ آمین!

جلسہ رات سوا دو بجے ختم ہوا۔ حاضری ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی۔

اسی موضوع پر امیر شریعت نے سارے مغربی پاکستان میں تقریریں کیں، جس سے غلط فہمی کے بہت سے بادل چھٹ گئے، چنانچہ اسی طرح کا اجتماع گوجرانوالہ میں بھی ہوا۔ شہیرانوالہ باغ عوام سے بھرا ہوا تھا۔ جیسے ہی امیر شریعت تقریر کے لئے کھڑے ہوئے، منبر کی جانب سے کالی گٹھائیں اٹھیں۔ "یار بالیں پہ جو آیا تو قضا بھی آئی"۔ عوام کا اضطراب بڑھا۔ دو طوفان آئے سامنے کھڑے تھے بادل اور بخاری، دیکھیں کس کی جیت ہوتی ہے۔

امیر شریعت نے عوام سے سوال کیا۔

"کیوں بھئی کیا ارادے ہیں؟ اگر تو بارش سے ڈر کر بھاگ جانا ہو

تو ابھی کہہ دو۔ ورنہ بخاری تو کھڑا ہے، حالانکہ تیس اس وقت

بخارہ سے ہوں۔"

اس پر عوام نے بیک زبان کہا۔ "ہم بیٹھیں گے شاہ صاحب! بس پھر

کیا تھا، بارش بھی تو رہی تھی اور امیر شریعت بھی برس رہے تھے۔ ایک خاکار

امیر شریعت پر چھاتہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ آپ نے غصے میں کہا۔

"کتنے چھاتے لاؤ گے میاں! یہ جو سامنے انسانوں کا سمندر

ٹھا ٹھیں ماہ رہا ہے، ان میں جان نہیں؟ یا تو ان کے لئے

بھی چھاتے لاؤ، ورنہ بیٹھ جاؤ۔"



آخر سو سلا دھار پائشس کا پانی سوام کی کمر کزنک آن پہنچا۔ مگر اس پر بھی  
لوگ اسی طرح جتے رہے، جیسے کہ ان کے سروں پر چاند سے بٹھا دیے گئے ہوں جب  
سوام پانی میں تیرنے لگے تو امیر شریعت نے کہا:

”بس بھائی! اب میں آپ کا اور امتحان نہیں لیتا، یہی ایک

دیکھا دہر ہے گا میری زندگی کا“

انہیں دنوں مرید کے ضلع شیخوپورہ میں دوران تقریر کہا:

”اگرچہ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں، مگر اپنے مقصد کے لئے اب

بھی جوان ہوں“

اس سفر میں ایک قوم دار پولیس افسر نے سوال کیا: ”شاہ جی! اجازت ہو

تو ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں بیٹا! کیوں نہیں!“

”دو مری جانستوں کے سیاسی اور مذہبی رہنما آئے دن مختلف شہروں

میں آتے رہتے ہیں، مگر حکومت کی طرف سے ہمیں کوئی ایسی ہدایت نہیں ملتی کہ

ہم ان کو واپس کر دیں۔ لیکن جیسے ہی آپ کسی شہر میں پہنچتے ہیں، ایک دم سے تاروں

پہننے لگتا ہے، یہ کیوں ہا آپ سے ہر جہت سے کہا“

”بھائی! جب کوئی ایسٹریڈ گھر میں آجائے تو کوئی عورت اس سے

پر وہ نہیں کرتی۔ مگر جیسے ہی کوئی مرد آجائے تو تمام گھمبیریا

پر وہ پردہ کا شور مچ جاتا ہے“

اس پر متعلقہ افسر اپنا سامنے سے لے کر رہ گیا۔



## وصیت

مولانا محمد علی جان دھری جو ان دنوں مجلس تحفظ ختم نبوت کے ناظم اعلیٰ تھے، اور روز و شب سفر پر رہتے تھے، جیسے کہ اب بھی ہیں۔ مولانا کی اتھک مصروفیت دیکھ کر امیر شریعت نے انہیں وصیت کی اور ناراض ہوئے۔

”بھائی محمد علی تم میری ریس نہ کیا کرو، میرے پروردگار کی خاص رحمت ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ پانچ سات سال اس طرح چسلو گے اور پھر ختم ہو جاؤ گے، یا کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہو جاؤ گے، جبکہ مجھے چالیس برس ہو چکے ہیں سفر کرتے، اور میں نے اپنے جسم سے دنا نہیں کی، جس کی وجہ سے اب فرہ ہا ہوں۔“

## سیاسی انتقام

مسلم لیگ کی اندرونی کشمکش پاکستان کے عالمی وقار پر بھی اثر انداز ہوئی، یہ وقار ہر آن تبدیل ہونے والے واقعات کے ساتھ اس قدر اپنا اعتبار کھو بیٹھا کہ اپنی ساری سچائی کے باوجود غیر مالک ہیں پاکستان کی تجارتی سائیکل کو بھی نقصان پہنچا۔ محمد علی بوگرہ کے بعد یہ خود دھری محمد علی وزیر اعظم بنا دیے گئے۔ نئے وزیر اعظم مولانا ابوالاعلیٰ امروہو دوسری جماعت سے دلی لگاؤ رکھتے تھے، ان دنوں بھی پاکستان کی خارجہ پالیسی امریکہ اور برطانیہ کے ہاتھوں میں تھی۔ غیر ملکی سامراج تمام امور اپنی مرضی سے حل کر رہا تھا۔ اس طرح جماعت اسلامی اور خود دھری محمد علی کا گٹھ جوڑ بڑی آسانی سے بچھا آ رہا تھا۔ حضرت امیر شریعت نے اپنی حالیہ تقریروں میں جماعت اسلامی کے لیڈر کو



جس بڑی طرح تاڑا چوڑھری محمد علی نے، اگست کو اقتدار پر آئے ہی اس کا انتقام لینا شروع کر دیا۔ چنانچہ اگست ۱۹۵۵ء کو حضرت امیر شریعت سے ایک نوٹس کی تعمیل کرائی گئی:

”مہرستمبر کو آپ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ملتان کی عدالت میں حاضر ہوں،“

مولانا محمد علی جاندھری سے بھی اسی طرح کے نوٹس پر تعمیل کرائی گئی۔

ان احکام کی تعمیل کے سلسلے میں امیر شریعت جب عدالت میں گئے تو ڈسٹرکٹ

مجسٹریٹ نے صرف اتنا کہا کہ آپ اپنی تقریروں کا لہجہ نرم رکھیں، اور بس!

امیر شریعت نے مسکراتے ہوئے یہ حکم سنا اور عدالت سے باہر چلے آئے،

کاروان سزیت بدستور چلتا رہا۔ لیکن جولائی ۱۹۵۶ء میں امیر شریعت کو

ملتان کی میونسپل حدود میں نظر بند کر دیا گیا۔

اس طرح امیر شریعت کی تمام مہرہیں سرگرمیاں کچھ وقت کے لئے رُک گئیں۔

یہ نظر بندی امیر شریعت کے لیے کارآمد ثابت ہوئی کہ ان دنوں وہ اپنی

دیباہی کے غلط رجحان میں یکسوئی سے مصروف ہو گئے۔ لیکن وہ اپنے قرار کو چین کہاں!

وہ دیباہی میں اور دماغ حق کے راستے میں عائلی و پواروں کو توڑنے کی فکر میں۔

ان دنوں مرکزی اور وفاقی سیاست کے گھوڑے سے سرپٹ دوڑ رہے تھے

سکنہ دھڑا گورنر جنرل دین چکے تھے اور ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان کے وزیر

اعلیٰ۔ ان دنوں کے درمیان چوڑھری محمد علی کی وزارتتہ و درخاوندوں کے درمیان

بیوی کی طرح وقت گزار رہی تھی۔ اس کشمکش میں دم توڑتی ہوئی شریعت تم نبوت

کی صدائے بازگشت کبھی کبھار امیر شریعت کی تقریروں سے سنائی دیتی رہی۔ اقتدار



پسند سیاستدان اس سے بھی غافل نہیں تھے۔ چنانچہ ۳۱ اپریل ۱۹۵۶ء کو کونسل نینوال  
(ضلع ملتان) کی ایک تقریر کی بنا پر امیر شریعت<sup>7</sup> کو سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۱ کے تحت  
گرفتار کر لیا گیا، اور اسی روز نواب زادہ عبدالرحیم ڈیوٹی مجسٹریٹ ملتان نے تین ہزار  
روپے کی ضمانت پر آپ کو رہا کر دیا۔

یہ مقدمہ جو دھری غلام مرتضیٰ کی عدالت میں ۲ جولائی کو شروع ہونا تھا، مگر  
ملتان میں نظر بندی کے باعث امیر شریعت<sup>7</sup> عدالت میں حاضری سے قاصر رہے۔  
یہ مقدمہ ہندو شروع نہیں ہوا تھا کہ ۲۹ جون ۱۹۵۶ء کو سیفٹی ایکٹ کی  
دفعہ ۲۱ کے تحت دوسری گرفتاری کے وارنٹ بھی آن پہنچے۔ یہ گرفتاری جلال پور  
پیر والا (ضلع ملتان) میں ۵-۱۰ مارچ ۱۹۵۶ء کی درمیانی رات کی ایک تقریر کی بنا پر  
عمل میں آئی۔ یہ مقدمہ رابعہ محمد ایوب کی عدالت میں شروع ہوا۔ امیر شریعت<sup>7</sup> اپنی  
پیرائہ سالی، بیواری اور جون کے پتے ہونے موسم میں مقدمہ تاریخ پر احاطہ عدالت  
سے باہر جا بیٹھے اور مشافقان دیدہ دن بھر ان کے گرد جمع رہتے۔

امیر شریعت<sup>7</sup> کی نظر بندی اور گرفتاریوں کے خلاف سہارے پاکستان میں  
اجتہاجی اجتماع ہوئے، اخبارات نے نوٹ لکھے، جلسوں میں مختلف سیاسی اور مذہبی  
جماعتوں نے رہائی کا مطالبہ کیا۔

اسی دور میں مرکزی مجلس تحفظ ختم نبوت<sup>7</sup> نے امیر شریعت<sup>7</sup> کی سرپرستی میں  
روزنامہ "نوائے پاکستان" کو از سر نو چلانے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر امیر شریعت<sup>7</sup>  
نے حسب ذیل الفاظ میں اس اخبار کا خیر مقدم کیا۔

"نوائے پاکستان" میں عزائم و مقاصد کو لے کر اپنا دور جدید شروع



کر رہا ہے۔ میں ان اعتراضات و مقاصد کی کامیابی کے لیے بارگاہِ  
رب العزت میں دعا کرتا ہوں۔

ہمیں ملک کے سیاسی بکھیروں میں الجھنے اور پھنسنے کی  
ضرورت نہیں۔ ہمارے پیش نظر صرف ایک ہی موقفت ہونا  
چاہیے اور وہ حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا  
تحقق۔ اس کے علاوہ جو باتیں ملحوظ رکھنی ضروری ہیں۔ وہ  
پاکستان کی عمومی خدمت اور جمہور المسلمین کو ان گمراہیوں سے  
ترکانا ہے جو ان کے عقائد و اعمال میں جڑ بکڑ چکی ہیں۔

ان الفاظ کے ساتھ میں "لو اتے پاکستان" کی کامیابی

کے لیے دعا گو ہوں۔"

یہ ۳ جولائی ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے۔

## رہنمائی

پابندیوں کے سرکاری انتظام کو لاہور مائی کورٹ میں اس وقت کے تحت

پہنچایا گیا،

"اسلامی منکیت کے کسی باشندے کی نقل و حرکت پر پابندی  
عائد نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اسے کسی خاص علاقہ میں پابند  
کیا جاسکتا ہے۔"

ابنذا عدالت عالیہ حکومت کے نام نوٹس جاری کر کے ہر دو



بہتاؤں (مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا محمد علی جالندھری)

کی نقل و حرکت پر سے پابندی اٹھانے کے احکام جاری کرے۔

باقی گورنمنٹ میں اس مقدمے کی پیروی کے لئے میاں محمود علی قصوی پٹنہ وکریٹ

کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مقدمہ ابھی ابتدائی مراحل میں تھا کہ ۳۱ جولائی ۱۹۵۶ء

کے اخبارات میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی۔

”ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان نے امیر شریعت سید

عطاء اللہ شاہ بخاری پر عائد کردہ تمام پابندیاں اٹھالیں۔ حکام نے یہ

قدم حضرت امیر شریعت کی خرابی صحت کی بنا پر اٹھایا ہے۔

لیکن مقدمات پر دستور قائم رہے۔

ان دنوں امیر شریعت کی صحت خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ راستہ کو اکثر

بے زبانی رہتی۔ بھوک کی کمی، اختلاج قلب اور تنخیر کی بھی شکایت تھی۔ اس

موقع پر اکثر احباب صحت کے بارے میں پوچھتے تو بڑی سادگی سے فرماتے:

”بھائی! اب طبیعت ہی نہیں ہے، حال کیا بتاؤں؟ کل جگر

مراد آبادی کی غزل ان کے بیانس میں پڑھی تو تین شعر ہو گئے تھے۔

وہ اٹھنا ہوا اک دھواں اول اول

وہ بچھتی سی چنگاریاں آخر آخر

قیامت کا طوفان وہ صحرا میں اول

غبارِ رہ کارواں آخر آخر

پہن میں عشاق کا مسجود اول



گیارہ گل مہناں آخر آخرا

ایمر شریعت کی صحت مندرجہ بالا اشعار سے واضح ہے۔  
ایمر شریعت کا ان دنوں لاہور آنے کا ارادہ تھا تا کہ طبعی مشورہ لیا جاسکے، لیکن  
نظر بندی کے علاوہ جلال پور پیر والا اور خانیوال کے مقدمات راستہ روکے ہوئے تھے۔

## مخلوط انتخاب

سیاسات میں جھوٹ بولنا، فریب دینا اور فریب کھانا، کسی قانون کی زد میں  
نہیں آتا۔ سبائٹوں کی ساری زندگی انہیں پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے گزر جاتی ہے  
اس راستے میں دادی خامدہ بھی ہے اور لالہ وگلی کی بزم آریاں بھی۔

سیاست میں ضرورت کے لیے حرام کو حلال قرار دے لینا بھی مجرم نہیں۔

۱۹۴۷ء سے پیشتر کے سیاسی موڑ پر نظر فرمائی جائے، تو ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ اگر ملکی ضرورت  
کے باعث پیشتر کے مسلمانوں کے لیے درست تھا تو رجعت پسند اور ٹوٹی مسلمانوں  
کے لیے غم قائل۔ انگریز حکمران آخر الذکر طبقہ کی پشت پناہ تھے مخلوط انتخاب  
کے ذریعے ہندو مسلمان اتحاد کی دیواروں کو استوار کرنا ان کے نزدیک سوار کے  
گوشت کو سلال قرار دینے کے مترادف تھا اور ایسا مسلمان مسلم بیگ کے نزدیک  
بھی گردن زونی تھا جنہوں نے آزادی وطن کے لیے مخلوط طرز انتخاب کا سلوگن  
(SALOGAN) دیا۔ تقسیم ملک کے بعد سر حسین شہید سہروردی نے بطور وزیر اعظم  
پاکستان جب فیڈرلسٹ مسلمانوں کے مٹنے کا بھوٹا نوالہ خود کھانا چاہا اور پاکستان میں  
مخلوط انتخاب رائج کرنے میں اپنے کو حق بجانب قرار دیا تو وہ لوگ جن کے نزدیک



گزرے ہوئے کل، یہ نعرہ جرم تھا، آج وہی سہروردی کے ہمنوا تھے۔ کیوں کہ  
آج انہیں اس کی ضرورت تھی۔

شہید سہروردی نے یہ نعرہ مشرقی پاکستان کے غیر مسلموں کے دوش حاصل  
کرنے کے لیے لگایا تھا، لیکن مغربی پاکستان کی سیاست بالکل جدا تھی۔ ۱۹۵۳ء  
کی مرزائی اور مسلمان کشمکش نے عوام کے دلوں میں پریشانی ڈال دیا کہ ۱۹۵۰ء کے  
انتخاب میں چونکہ آٹھ مرزائی رٹری طرح ناکام رہے تھے، حالانکہ مسلم لیگ نے انہیں  
اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا۔

اب مخلوط انتخاب کے ذریعے انہیں اسمبلی میں لانے کے لیے چور و رازہ  
کھونا گیا ہے، یہ بحث سارے ملک میں جاری تھی کہ اجزا رٹری رہناؤں کا ایک  
وفد علامہ بشیر الابرار اسمبلی کی قیادت میں پاکستان کے دورے پر آیا۔

ملتان کے معزز شہریوں کے علاوہ مجلس تحفظ ختم نبوت نے بھی انہیں  
استقبالیہ دیا۔ اس موقع پر حضرت امیر تریبیت نے مترجم کے ذریعہ وفد کے لیڈر  
سے گفتگو کی، اور اجزا رٹری کی آزادی کے لیے لڑنے والے مجاہدین کو خراج تحسین  
پیش کیا، نیز اجزا رٹری رہناؤں کی درازی عمر کے لیے دعا کی۔

مقتدہ ہندوستان میں انگریزی دور اقتدار میں غلام ہندوستانیوں پر تشدد کا  
ذکر کرتے ہوئے اقوام لیڈر پنپا کی مختلف سیاسی جہلوں کا وضاحت سے ذکر کیا، اور  
قادیانیوں کی غیر ملکی سرگرمیوں سے بھی اجزا رٹری رہناؤں کو خبردار کیا۔

لاہور میں آمد

حالات کی ناسازگاری جسمانی کمزوری اور دائمی پریشانی کے باعث امیر تریبیت



پران دنوں فالج کا ایک اور ہلکا سا حملہ ہوا، جس کے اثرات گودیرپا نہیں تھے تاہم پریشان کن ضرور تھے، اس کے نتیجے میں امیر شریعت نے لاہور آنے کا فیصلہ کیا چنانچہ پابندیاں ختم ہوتے ہی اگست کے پہلے پندرہ صواڑے میں بذریعہ کار بغرض علاج لاہور تشریف لے آئے اور حاجی دین محمد کے ہاں ٹھہرے۔

گو بیماری کی وجہ سے بے حد کمزور تھے، مگر زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ملنے والوں کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتے۔ اس دوران آپ نے دوستوں سے معذرت کے انداز میں کہا:

”بیماری کے متواتر حملوں اور نفسی کی وجہ سے میں اکثر اجاب

کے خطوط کا جواب بھی نہیں دے سکا۔ لہذا میں ان تمام اجاب کا

مسنون ہوں جو میری بہانہ پرسی کے دوران خطوط لکھتے رہے،

ان تمام کو میری صحت کے لئے دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ

مجھے اسلام کی مزید خدمت کے لیے تندرستی عنایت فرمائے۔“

مٹان کے حکیم عطار، لٹڈ مرلیض اور مرض دونوں سے آشنائی کے بعد

علاج کے عادی ہیں۔ امیر شریعت سے انہیں دلی لگاؤ تھا۔ حکیم صاحب کی طبیعت

کی پاکیزگی کی وجہ سے امیر شریعت بھی ان کے معترف تھے۔ لیکن ”مرض برصھا گیا

جوں جوں دوا کی“ تو دوستوں کے اصرار پر لاہور آگئے۔ یہاں سب سے پہلے

شفار الملک حکیم اجیں خان مرحوم کے پوتے حکیم نبی جہاں سدید کا علاج شروع کیا

ابک ہفتہ علاج سے جب وجہ۔۔۔ افاتہ نہ ہوا، تو

ڈاکٹر کرنل محمد ضیاء اللہ کا علاج شروع کیا۔ ایک روز امیر شریعت نے ڈاکٹر سے



سوال کیا :

”آپ کی تشخیص نے مرض سے متعلق کیا فتویٰ دیا ہے“

کرنل ضیاء اللہ نے یاس ونا امید کی کے بچے میں کہا،

”شاہ جی! اب آپ اپنا کوڑھ ختم کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے

آپ کو دو سو سال کی زندگی عطا کی تھی، جسے آپ نے پچاس سالوں

میں ختم کر لیا۔ اب تو کوشش ہی ہے“

مشافہ فطرت نے حضرت امیر شریعتؒ کو کچھ اس انداز سے سنوارا تھا کہ وہ

جہاں بیٹھ جاتے، بہاریں اُن کے قدم لیتیں، کئی پنہیں اُن کے زپنے وچوڑ میں لٹھیں۔

وہ مسکراتے تو آسمان سے بجلیاں کودتیں، اُن کی پیشانی پر نعل آجاتا، تو سلاطین

کانپ اٹھتیں۔ ستارے رات بھر اپنی قندیلیں روشن کر کے اُن کی محفل میں بیٹھتے

سادت سمجھتے۔ ویرانوں میں اگر وہ شمعوں فرود آ کر تے، تو پروانے وہاں بھی

آجود ہوتے سہ

عین بے پروا کو اپنی بیٹے حسب اپنی کے لیے

ہوں اگر شہروں سے بن پائے تو شہر اچھے کہ بن

اپنی لاہور کو حسب اطلاع ہوئی کہ امیر شریعتؒ بغرض علاج یہاں آئے

ہیں، تو دن بھر اجباب کی آمد و رفت سے ایک میلہ سا لگا رہتا، گو مرض کے لیے یہ

ہجوم سفید نہیں تھا، لیکن مریض محبت کے ہاتھوں چمورتھا کہ دوست اور دشمن کا

استقبال کرے، آنر ڈاکٹر کے مشورے پر عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت چھرا

لیا گیا جیسے جیسے مرض سنبھال لیتی گئی، مریض آپ سے آپ سنبھلتا چلا گیا۔ حضرت



مولانا احمد علی رُوزانہ عصر کے بعد تشریف لاتے، اور امیر شریعتؒ کے دل پر کافی دیر تک ہاتھ رکھ کر دم کرتے۔ اس دوران امیر شریعتؒ کا گریبان کھلا رہتا۔ نماز عصر کے بعد جو مجلس لگتی ان میں شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا ابوالحسنات، مظفر علی شمسی اور ان کے علاوہ شعراء کرام، ادیب صحافی اور کاروباری حضرات کا ہجوم بھی رہتا۔

اسی طرح کی ایک مجلس میں مولانا ابوالحسنات نے سوال کیا :-

”شاہ جی! آپ کو میٹھا زیادہ پسند ہے یا نمک؟“

امیر شریعتؒ: ”جو چیز میرے ذہب کو پسند ہو“

مولانا ابوالحسنات: ”ذہب کہ تو جو چیز میٹھا زیادہ پسند ہے“

امیر شریعتؒ: ”اگر میٹھا پسند ہوتا تو پہاڑ نمک کے نہ بناتے ہوتے“

اس پر تمام مجلس میں تمغہ پلندہ ہوا۔ ایک دوسری مجلس میں سوال ہوا۔

”پرودہ اسلام میں کیوں راجھ ہے؟“

امیر شریعتؒ نے غصہ سے جواب دیا کہ فرمایا :-

”میاں بیوی کے درمیان محبت کو مزید بڑھانے کے

لیو پرودہ راجھ کیا گیا ہے۔ اگر بے حجابی عام رواج پکڑ جاتی تو

میاں بیوی کے درمیان محبت کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا۔“

معلوم محترم حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ (امیر شریعتؒ کے مرشد)

ان دنوں لاہور ہی میں تشریف فرما تھے۔ انہیں جب اطلاع ہوئی تو ٹھنکے کے لیے

خود تشریف لائے جو پیر اور مرید کے مابین کافی دیر مجلس رہی۔ حضرت لاہوریؒ بھی



اس مجلس میں موجود تھے۔ امیر شریعت نے دونوں حضرات سے دعا کے لیے درخواست کی، تو حضرت راستے پوری نے فرمایا: "آپ کے لیے دعا نہیں کریں گے شاہ جی! تو اورد کس کے لیے کریں گے؟ آپ تو ہمدست اپنے اخوت کا سرمایہ ہیں؟" یہ سن کر امیر شریعت زار و قطار رونے لگے، اور کافی دیر تک روتے رہے۔ اس دوران کی یہ مجلس آنسوؤں کے طوفان میں بہہ گئی۔

شیخ پورہ کے کچھ دوست ملنے آئے تو ان سے گفتگو طویل ہو گئی۔ اس دوران حضرت الفد شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کا ذکر آگیا، تو امیر شریعت نے رقت انگیز لہجے میں کہا:

"مولانا سید نور شاہ صاحب اپنے دور کے بہت بڑے

محسن تھے اور ان کی زندگی اسلاف کی حدیثی جاگتی تصویر تھی۔"

اس گفتگو کا رخ مڑ کر جب شیعہ و سنی مناقشات کی طرف آیا تو امیر شریعت نے

نے ایک آہ بھر کر کہا:

"قوم کن راستوں پر چلی نکلی ہے، جب میں ایسی باتیں سننا

ہوں تو رات رات بھر سوچتا ہوں، کہ آخر کیا بنے گا؟ کیونکہ

اس ملک کا اور خود مسلمانوں کا فائدہ ان کے باہمی اتحاد میں

ہے، اور پھر اسلامی نظریات بھی ہم تکمیل ہو سکتے ہیں۔"

ایک دن مولانا ابوالحسنات نے یہ تحریک تحقیق ختم نہایت کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"شاہ جی! لوگ بھی عجیب ہیں، ایسی ایسی غزلیں کہتے ہیں

کہ جن کا یہ مطلع درست ہوتا ہے، یہ مغلط ہے۔ ایک دوست نے مجھ سے



سوال کیا، حضرت! یہ درست ہے کہ عطاء اللہ شاہ نے حکومت سے روپیہ لے کر تحریک ختم نبوت کو ختم کیا ہے؟ تو میں نے غصے میں اس سے کہا۔ "بیوقوف! تیرے جیسے لوگوں نے تو مجھے ان نیک لوگوں سے برگشتہ کیا ہوا تھا۔ جب میں ان کے نزدیک ہوا، تو انہیں دین کی خدمت کرنے میں بہت مخلص پایا۔ باقی یہی تحریک ختم نبوت، تو وہ میری رہنمائی میں چل رہی تھی۔ اگر کوئی بات ہوتی تو میرے علم میں ہوتی۔ یہی روپیہ لینے کی بات، تو مجھے یاد ہے ایک دفعہ سکھر جیل میں شاہ جی کا داماد (سید وکیل احمد شاہ) میرے سامنے انہیں ملنے آیا، اور اس نے گھر کی پریشان حالی کا ذکر کیا تو شاہ جی سٹے حاجی دین محمد صاحب کی طرف رقعہ لکھا، کہ رقعہ ہذا کو دو عہدہ روپیہ قرض دے دیں۔ انشاء اللہ رہا ہو گا آپ کو ادا کروں گا۔ ان واقعات کی موجودگی میں میں تمہاری بات پر کیسے یقین کر لوں۔ اس پر عرض بہت شرمسار ہوا۔

مولانا ابوالحسنات کی زبان سے یہ سارا کچھ سن کر امیر شریعت نے ایک آہ بھری اور فرمایا  
 سے "زائد تنگہ نظر سے بھٹے کافر جاننا  
 اور کافر یہ سمجھنا سپہ مسلمان ہوں ہیں"  
 اس شعر پر مولانا ابوالحسنات نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 "بسمان اللہ! کیا تعریف ہوتی ہے تمہاری۔"  
 اس پر محفل کے تمام لوگ بے اختیار ہنس پڑے۔



## حفیظہ جالندھری

انہیں محفلوں میں ایک دن حفیظہ جالندھری بھی اکٹھا ہوئے اور دیر تک اپنے اشعار سے امیر شریعتؒ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں رہے لیکن اس روز امیر شریعتؒ کو جس قدر ہزار اور پریشان دیکھا، اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شکن آلود پیشانی پر غصے کے ہزاروں نقشے ابھر کر پھر سے ہوئے وہ یہاں موجوں کی طرح طوفان بپا کرنے لگے۔

اصول کے معاملے میں امیر شریعتؒ جب بگڑ جاتے تو دوست کو بھی دشمن بنا لیتے لیکن اخلاق کے بازار میں ان کے ہاں جو سودا تھا، اس کے لیے وہ دونوں میں امتیاز نہیں کرتے تھے۔ مگر حفیظہ جالندھری سے اس روز کی جیسے اعتنائی حیرت انگیز تھی۔ غصے میں کہا "حفیظہ صاحب! آپ اپنے ارادوں میں نہ پہلے کا مہیا بھرتے ہیں نہ آئندہ، انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ بہتر ہے کہ آپ مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کریں۔"

امیر شریعتؒ نے یہ مختصر جملے سنا ہی محفل کا مزہ کر کے گئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ سوال دونوں سے بھی گڑ بگڑا ہوا تھا ہی دلائل تھا کہ حفیظہ صاحب اکٹھے کر چکے تھے۔ "شاہنامہ اسلام" کی پہلی جلد طبع ہو کر حسب پانڈہ میں آئی، تو امیر شریعتؒ ان دونوں تحریک شاہنامہ "سول" میں مصروف تھے۔ شاہنامہ اسلام کو پہلی بار منظور کیا گیا تھا، اور اندازہ بھی خوب تھا، جسے مصنف کے زیر نگرانی سے مزید جلا ویدی تھی۔ امیر شریعتؒ کو شاہنامہ کا یہ طریقہ پسند آیا، اور وہ "شاہنامہ اسلام" کے



مطالعہ کے لئے مسلم نوجوانوں کو دعوت دینے لگے۔ اس کے دورِ تکمل ہوئے  
 اول کتاب مذکور کا پہلا ایڈیشن ہفتوں ہفتوں ہر گز، اور مصنف کا نام  
 پنجاب کی فضاؤں میں تیرنے لگا۔ دوسرا یہ کہ امیر شریعت اور حقیقت صاحب کے  
 درمیان قرابت داری کو غنیمت جان کر فرنگی حکمرانوں کے لکھنؤ نے امیر شریعت کو  
 رام کرنے کے لیے مفید سمجھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کھلڈی اپنی بازی میں مات کھا گیا۔  
 لیکن کوشش تو دل ناتواں نے خوب کی۔

مذکورہ بالا واقعات کی ساری عمارت قیاس یا گمان پر نہیں بلکہ امیر شریعت  
 کے اپنے یقین پر استوار ہے۔ ورنہ محنت اور اصول کی دنیا میں پرورش پانے والا  
 انسان بیت کی دیوار پر اپنے دعویٰ کا اعلان نہیں کر سکتا۔

## مولانا حبیب الرحمن کا انتقال

احباب کی آمدورفت کے باعث مجالس گرم تھیں۔ حاجی دین محمد کامکان  
 ایہوں، شاعروں، سیاسی رہنماؤں اور مذہبی لوگوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ امیر شریعت  
 بیماری سے نجات کے لیے دل پہلا سنبھلے ہوئے تھے۔ اس طریقے سے مرلیش  
 اپنے مرض سے آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہے تھے کہ ۲۴ ستمبر ۱۹۵۶ء کو بھارت  
 ریڈیو پر مولانا حبیب الرحمن اور عبدالحق کے انتقال کی خبر سنی۔ امیر شریعت پر اس خبر کو  
 اس تیزی سے اثر ہوا، جیسے پھول پر غیر موسم کا ہونا ہے اور اس کی تمام پتیاں جھڑک  
 کر جاتی ہیں۔

جماعتی زندگی کے علاوہ مولانا حبیب الرحمن کو امیر شریعت بھائی کہا کرتے تھے، اور یہ



رشتہ دونوں حضرات کے گھروں تک جا پہنچا تھا۔

مولانا حبیب الرحمن کی موت ایک قافلہ سالار کی موت تھی۔ شہر پیشہ،  
حریت کارروان زندگی کی مہار تھا۔ جب میدان کارزار میں پہنچا، تو برطانوی  
سامراج کا دل دہل جاتا۔ ان کی رہنمائی میں مجلس احوار نے کئی اہم فیصلے کیے۔  
جنہیں تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گی۔

مولانا کی موت کی خبر سن کر امیر شریعت دن بھر خاموش رہے اور کبھی  
کہتا ایک آہ سرد کے ساتھ اپنی اس خاموشی کو توڑ کر فرماتے،  
ایک اچھے رفیق، مونس و غم خواہ اور سراپا ایثار ساتھی کی جدائی  
نے میرے سینے میں ایک اور زخم کا اضافہ کر دیا ہے۔“

## ایک غلط فہم

سیاسی رہنماؤں کو اخبارات میں اپنے نام شائع کرانے کی عام پیاری سی  
لیکن امیر شریعت اخبارات میں بیان دینے سے ہمیشہ اجتناب کرتے، اگر  
کہیں نام نگاروں کے ترشے میں آجاتے تو انہیں بڑی حکمت عملی سے ٹال  
دیتے۔ حالانکہ بعض دفعہ ان کی ذات سے متعلق بہت سی غلط سادہ شبہی  
شائع ہوتی رہیں، لیکن وہ انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ مگر شیخ  
صام الدین اور سٹراچ الدین کے عوامی لیگس میں چلنے جانے پر بہت سی  
سبب بنیاد خبریں تراشی جانی گئیں، اور ان دنوں عوامی لیگ پاکستان میں غلط  
انتخاب کی حافی تھی، جس کے باعث عوامی لیگ ختم نبوت کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔



چنانچہ جیسے ہی یہ بے بنیاد خبر اخبارات میں شائع ہوئی کہ  
 "امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ صاحب بخاری کو وزیر اعظم  
 پاکستان جناب حسین شہید سہروردی نے عوامی لیگ میں شمولیت کی  
 دعوت دی ہے، اور راولپنڈی روانہ ہونے سے قبل وزیر اعظم  
 نے حضرت شاہ صاحب کو گورنمنٹ ہاؤس میں ملاقات کیلئے  
 بلایا ہے۔"

حضرت امیر شریعت کو جب اس خبر کی خبر ملتی تو فرمایا:  
 "ما معلوم اس اخبار نے میرے متعلق ایسی بے بنیاد خبر کیوں شائع  
 کی، جبکہ میں مدت ہوئی ان سیاسی پھیڑوں سے الگ تعلق ہو  
 چکا ہوں، اور نہ ہی میں اپنی نجی مجلسوں میں سیاسی گفتگو کو  
 پسند کرتا ہوں۔ پھر عوامی لیگ، جو کہ مخلوط انتخاب کو پاکستان کی  
 بقا کے لیے بہتر سمجھتی ہے، اور میں اسے مسئلہ ختم نبوت کے لیے  
 زہر قاتل سمجھتا ہوں۔"

## مقدمات کی واپسی

مولانا حبیب الرحمن کی موت کے صدمے نے امیر شریعت کی طبیعت پر  
 خاصا اثر کیا تھا، اس سے ذرا سنبھالا گیا تو قریباً تین ماہ لاہور میں گزار کر اپنے معالج  
 ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ کی اجازت سے ۱۳ نومبر ۱۹۵۶ء کو ملتان واپس چلے گئے۔  
 ان دنوں بیماری میں قدرے افاقہ تھا اور گھر سے نکل کر سلیمی دواخانہ پر



آپ بیٹھے۔ اجاب بھی یہیں آجاتے، نماز مغرب تک محفل جمتی۔

۱۵ نومبر ۱۹۵۶ء کو اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومت مغربی پاکستان

نے حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر وارڈ کر دیا۔ تمام مقدمات واپس لے لیے

ہیں، اور اس کے ساتھ ہی دوسری پابندیاں بھی اٹھالی ہیں۔

اس خبر کو پڑھ کر امیر شریعت کو حکومت کے خلاف سخت غصہ آیا اور برہم

ہو کر اخبارات کو حسب ذیل بیان دیا :

”حکومت نے صرف میرے مقدمات اور میری پابندیاں

اٹھا کر میری سخت توہین کی ہے۔ حکومت کے اس اقدام سے

مجھے بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ میری پوری زندگی میں ایسی کوئی مثال

نہیں ملتی کہ حکومت نے مجھے جیل بھیج دیا ہو اور میرے ساتھی جیل سے باہر

رہیں یا میرے ساتھی توجیل کی تنگ تار پاک کوٹھڑیوں میں محسوس ہوں اور میں اکیلا

جیل سے رہا ہو جاؤں۔ یہ بات میری جماعت کی تاریخ اور روایت

کے خلاف ہے کہ حکومت صرف میرے مقدمات واپس لے لے،

اور مجھ پر عائد کردہ پابندیاں اٹھائے، لیکن میرے تمام ساتھی

طرح طرح کے مقدمات میں جکڑے رہیں۔

یہ کیا مذاق ہے کہ جن تقاریر کی بنا پر ہم سب پر پابندیاں عائد

کی گئیں اور مقدمات دائر کئے گئے۔ انہیں تقاریر کی بنا پر جماعت کے

رفقاء تو بدستور معتوب رہیں اور صرف مجھے آزاد کر دیا جائے،

حکومت کے اس اقدام سے میری جس قدر بے عزتی ہوئی ہے



انتی بے عزتی کبھی نہیں ہوتی۔ اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے کہ خانیوال کے مقدمے میں ہم سب ایک ہی جرم کی یادداشت میں مانوڑتے، اس کا عنوان تھا "مرکارہ بنام سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ"۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس مقدمے سے صرف نچھ خارج کر دیا گیا ہے اور میرے باقی ساتھیوں کو جڈا جڈا کر کے ان کے خلاف مقدمات دائر کر دیے گئے ہیں۔

ایک مقدمہ کو مختلف مقدمات میں تبدیل کرنے میں ادب اب حکومت کی نیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔"

### مولانا ظفر علی خان

۲۶ نومبر ۱۹۵۹ء کی یہ خبر جب اخبارات میں آئی کہ مولانا ظفر علی خان وفات پا گئے ہیں تو امیر شریعت کے دل پر ایک چوٹ سی پڑی، کچھ دیر خاموش رہ کر فرمایا۔

"تاریخ ماضی کی ایک اور دیوار گر گئی!"

خلافت تحریک کے دنوں میں امیر شریعت صرف زمیندار اہتمام ہی پر مہم کرتے تھے، اور اسی سے متاثر ہو کر وہ سیاسی میدان میں آئے، اس تعلق سے امیر شریعت کے دل میں مولانا ظفر علی خان کے لیے بے پناہ احترام تھا، پھر دونوں ایک ہی ڈگر پر چلنے لگے جیل خانوں کی اکثریتیں مشترک گزریں۔ اسی محبت اور تعلق کی بنا پر ۱۹۳۴ء کو جب قادیان میں احرار کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا، تو امیر شریعت نے اس کی صدارت کے لیے مولانا ظفر علی خان کا نام پیش کیا لیکن



مولانا حبیب الرحمن کی رائے تھی کہ اس کی صدارت امیر شریعت کریں، اس پر حاشی  
نکرا رہی۔ آخر مولانا حبیب الرحمن نے لدھیانہ سے امیر شریعت کے نام پیغام بھیجا  
کہ — "میرا حکم ہے کہ قادیان کانفرنس کی صدارت

آپ کریں، بس!"

اس حکم پر تسلیم خم کر دیا گیا۔ تاریخ کا یہی وہ موڑ ہے جہاں مولانا ظفر علی خان  
محس احرار سے علیحدہ ہو گئے، آگے چل کر دونوں رہنما سر راہ ملتے تو رہے، لیکن یہ  
ملاقات صرف زبان اور نگاہوں کی ہوتی۔ دل دونوں کے روٹھے رہے۔ ۱۹۵۳ء  
میں جب امیر شریعت تخریک ختم نبوت کے سلسلے میں کراچی جانے سے پیشتر لاہور میں  
آخری تقریر کرنے دہلی روانہ سے آئے، تو مولانا ظفر علی خان کو بھی وہاں لایا گیا۔ ان  
دونوں مولانا ظفر علی خان کی صحت جواب دے چکی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں رعشہ  
طاری تھا۔ دونوں رہنما جب آمنے سامنے آئے تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو تیر  
رہے تھے۔

ایک ہی راستے کے دو مسافر، ایک ہی منزل کے دو راہی، جب انہیں  
واقعات نے ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیا، تو دونوں اپنی اپنی تاریخ بنانے میں  
مصروف ہو گئے۔ برس ہا برس کے بعد جب دونوں ایک دوسرے سے ملے  
تو تاریخ مکمل ہو چکی تھی۔ مورخ نے دونوں کے آنسو تاریخ کے دامن میں گرو دیئے  
کہ لیے محفوظ کر لیے۔

مولانا ظفر علی خان کی موت کا سن کر امیر شریعت نے دل برداشتہ ہو کر کہا

"کچھ دوست زندگی میں ساتھ چھوڑ گئے، اور کچھ کو موت چاٹ گئی"



اب میں تنہا رہ گیا ہوں، دیکھیں اب میری باری کب آتی ہے،  
 امیر شریعت نے یہ فقرے اس انداز سے کہے کہ اجاب کی آنکھیں بھی نمناک  
 ہو گئیں۔

یہ سال بھی گزر گیا، اور اس سال کے واقعات بھی۔ امیر شریعت کی عمر اس  
 سال کے اختتام تک سنیسٹھ سال ہو چکی تھی۔ اس دوران کے واقعات تاریخ کی  
 مسلسل زنجیر بنتے جا رہے تھے، اور اس زنجیر کی ایک ایک کڑی دیانتدار مورخ  
 کے مستقبل کا ایسا سرمایہ تھی، جس کے ضائع ہو جانے پر تاریخ کے ادھوڑے  
 رہ جائے گا ڈر ہے۔

## حضرت لاہوری کا فتویٰ

موردی جماعت کی اکثر تحریریں آئین اسلام سے انحراف کرتی ہیں۔ اسی  
 طرح کی ایک تحریر خطبات موردی میں درج ہے، جس سے توہین کعبہ کا پہلا  
 نکلنا تھا۔ جب حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے اس تحریر کا محاسبہ کیا، تو  
 اس جماعت کے کابن بے قابو ہو کر جواب کی تلاش میں مصروف ہو گئے اتفاق سے  
 انہیں دنوں حضرت امیر شریعت کا اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ سواطع الالہام  
 شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک شعر تھا

ز کاف کعبہ تا کاف کراچی

سرا سر کفر و کفر دون کفر

اس شعر کی آمد کاپس منظر ۱۹۵۱ء کا وہ زمانہ ہے، جب پاکستان کی



صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے درمیان کھینچاٹانی اور حقیقت کا سلسلہ جاری تھا،  
حضرت امیر شریعت نے اس غیر آئینی ہاتھ پائی کا ذکر احباب کی محفل میں کرتے  
ہوئے کہا:

”تم ایک پاکستان کو روکتے ہو، باقی مسلمان ممالک کا کیا  
حال ہے، سب کے سب ایک دوسرے سے بدتر ہیں۔ کونسی  
جگہ ہے جہاں ملعون انگریزوں نے اپنا کام نہیں کیا۔ اُس نے  
مسلمانوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، اور آج تو وہیں بھی یا امریکہ ہے یا  
یورپا نیہ۔ بہر حال ملوکیت ہے، اسلام وہاں بھی نہیں۔ اور میں تو  
بلا خوف کہتا ہوں کہ کعبہ سے کراچی تک ہر جگہ قانون کفر ہی  
مسلط ہے۔ کہلاتے تو سب مسلمان ہیں مگر کہیں انگریز کے ٹوٹی،  
اور کہیں تک زمان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں کہ جس محسن انسانیت  
کی جوٹیوں کے صفے میں ان عیاشوں کو حکومتیں ملیں، عین وقت  
پر اسی کو فراموش کر بیٹھے اور پھر اپنے مخصوص جلال امیر انداز کے  
مندرجہ بالا شعر پڑھا۔“

اور اس شعر کو خانیوال کے ایک نوزائیدہ وکیل جس کا مودودی جماعت کے  
تعلق تھا، اپنے لیڈر کی تحریر کے جواب میں لکھ کر مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں  
بھیج دیا کہ مودودی پر تو آپ نے اعتراض کیا، مگر اس شعر کے متعلق آپ کی کب  
رائے ہے، غباثت یہ کی کہ یہ نہیں بتایا کہ یہ شعر کس کا ہے۔

اس تحریر کے جواب میں حضرت لاہوری نے فرمایا کہ یہ بھی کوئی مودودی



پھوٹا بھائی ہے اور گمراہ ہے۔“ حضرت لاہوری کا یہ جواب اور اپنا سوال دونوں  
روزنامہ کوہستان لاہور میں شائع کر دیا۔

امیر شریعت نے جب یہ سارا کچھ پڑھا تو اسی وقت حضرت لاہوری کو  
حسب ذیل خط لکھا:-

”مکرمی و محترمی حضرت مولانا احمد علی صاحب زید مجدہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

روزنامہ کوہستان لاہور میں میں نے دو خط پڑھے ہیں، ایک میں  
میرے کسی شعر پر اعتراض ہے اور دوسرے میں آپ کا فتویٰ۔

میرے وہم میں عیبی ذمہ کا یہ پہلو نہیں تھا۔ چونکہ آپ فرماتے ہیں  
کہ شعر سے ذمہ کا پہلو نکلتا ہے، آپ کے ارشاد۔ کہ بعد میں اس  
شعر کی کوئی تاویل کرنا نہیں چاہتا، اور استغفر اللہ پڑھتا ہوں،  
آپ ہی میرے حق میں دعا کریں، اللہ مجھے معاف کرے۔

ہاں! ایک عرض ہے کہ آپ نے اپنے خط میں مجھے موذودی  
کا چھوٹا بھائی قرار دیا ہے۔ مولانا! آپ مجھے تقریباً تیس چالیس  
بیس سے جانتے ہیں۔ آپ نے کبھی مجھ کو جھوٹ بولتے دیکھا یا  
سنا؟ یہاں تک اپنے متعلق مجھے خود یاد پڑتا ہے جھوٹ بولنے  
کا نام نہ بولے کبھی نہیں ہوا۔ آپ نے مجھے موذودی صاحب کا  
چھوٹا بھائی کیسے کہہ دیا؟

چھوٹے بھائی کے نام سے آپ واپس سے لیجئے شعر میں نے



قلمزن کر دیا۔

محتاج دُعا

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

ملتان۔ ۵ جمادی الثانی ۱۳۷۷ھ

اس کے جواب میں حضرت لاہوریؒ نے امیر شریعتؒ کو حسب ذیل خط لکھا

”مخدومی و مکرچی!

حاتی حق و باطنی باطل امام المجاہدین حضرت مولانا

سید عطاء اللہ شاہ صاحب زیدۃ برکاتہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ کئی دن سے والہ نامہ کے ثروت سے مشرف

ہو چکا تھا، بے حد عظیم فرصت ہونے کے باعث ارسال

جواب میں تاخیر ہوئی۔ آپ کی حق پرستی کی آپ کو مبارکباد

دیتا ہوں، کہ آپ نے اس شعر کو جو مفہوم توہینِ بیعت الحرام ہو

سکتا تھا، میری گرفت پر اسے اپنے دیوان سے قلمزن کر دیا ہے۔

آپ یہی بلند پایہ، شہرہ آفاق اور قبولِ عوام و خواص

شخصیت کا اپنے ایک مہوم شعر کو قلمزن کرنے سے اہل حق کے

دلوں میں آپ کی عزت نسبتاً زیادہ بڑھ گئی ہے۔ آپ نے اپنے

خط میں دوسری چیز یہ تحریر فرمائی ہے کہ میں نے آپ کو موودودی کا

چھوٹا بھائی قرار دیا ہے۔ اس شعر سے قطع نظر کر کے اصلیت

یہ ہے کہ آپ کے پاؤں مبارک میں جو چھوٹا ہے میرے دل میں

اُس کی اتنی عزت ہے کہ موودودی صاحب کے وجود کی بھی



اتنی نہیں ہے، چونکہ موڈووی صاحب نے ہمارے نام اسلاف  
 کی توہین کی ہے، جن میں مفسرین، مجددین، صوفیائے کرام، صحابہ کرام  
 حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں چھوڑا۔ اسی لیے  
 مجھے اس سے بے حد نفرت ہے۔ خدا اُسے اس گمراہی کے  
 گڑھے سے نکالے۔

میں نے آپ کے متعلق جس عقیدت کا اظہار کیا ہے،  
 وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر سلامت رکھے،  
 اور بدستور سابق حق و صداقت کا جعندہ آپ کے ہاتھ میں رہے،  
 اور آپ کی جماعت آپ کے جعندے کے سائے میں ہمیشہ  
 کامیاب و باہر اور ہے۔ آمین یا اللہ العالمین

احمد علی - امیر انجمن خدام الدین لاہور

۱۹ جنوری ۱۹۵۶ء

## پولیس کی نگرانی

بیماری کے باعث امیر شریعت اس قابل نہیں رہے تھے کہ پہلے کی طرح  
 سفر کرتے۔ نفاہت نے ہر طرح کی سرگرمیوں سے معذور کر دیا تھا۔ البتہ دوستوں  
 کے اصرار پر کبھی کبھار مقامی جلسوں میں آ بیٹھتے تھے چنانچہ اسی طرح کے ایک  
 اجتماع میں جو تحقیقاتی نمونہ کے تحت ہوا، تشریف لائے۔ پاؤں میں درد تھا  
 طوٹا کر با جلسہ گاہ میں پہنچ گئے، صدارت نے جی کی اور چند منٹ تھریو بھی، اس



میں کہا۔

”عزیزو! اب میرے میں وہ جان نہیں رہی کہ تمہیں  
گھنٹوں بٹھائے رکھوں، اب تو چراغ سحر ہوں، اس ٹمٹماتے  
ہوتے ویسے کی لو میں چند گھنٹوں بیٹھ کر اگر تمہیں زندگی کا کوئی نشان  
مل سکتا ہے تو اسے تلاش کر لو۔“

اس حالت میں بھی پولیس میرا پیچھا نہیں چھوڑتی، دن  
رات چوروں کی طرح میری نگرانی کرتی رہتی ہے۔ مگر سی، آئی، ڈی کا  
لبوہ کی طرف کوئی دھیان نہیں، حالانکہ وہاں سے یہ خبریں  
آ رہی ہیں کہ مرزا محمود نے اپنا سرمایہ ہندوستان منتقل کرنا شروع  
کر دیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مرزا محمود کی خواہش کے مطابق  
اسے ہندوستان ہی بھیجا جائے، تاکہ پاکستان کی سالمیت  
کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

جب یہودیوں کو جرمن سے نکالا گیا اور عربوں کو بے خانہ  
کر کے یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا جانے لگا تو ہم دیوانوں  
کی جماعت نے اس وقت ہندوستان اور دیگر ممالک اسلامیہ  
کے مسلمانوں کو خبردار کیا تھا کہ انہیں وہاں آباد ہونے سے  
روکا جائے۔ بہا دی یہ آواز ایک غلام ملک کی جماعت کی آواز  
تھی اور انگریزی مظالم کا تختہ، مشرق جماعت کی پیکل تھی، جو نہ  
تے سنتی اور نہ ہی کسی دوسرے مسلمان ملک سے، اب وہی اسرائیل



حکومت اور وہی یہودی مشرق وسطیٰ کے لیے سلطان کا پھوٹا ثابِت

ہو رہے ہیں۔

اسی طرح آج پھر بڑھتا ہوتا ہوں کہ بلوہ کی خبر لو، بلوہ کا وجود

پاکستان میں اسرائیل سے زیادہ خطرناک ہے۔ تمہیں میری نگرانی

تو کرنی آتی ہے، لیکن بلوہ میں مرزا محمود کی اپنی عدالتیں اور اپنا

نظام حکومت ہے، یہ تمہیں کیوں دکھائی نہیں دیتا؟ میرا وجود

جو صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے، یہ تمہاری نظریں کھٹکتا ہے

اور بلوہ جو پاکستان میں ایک ریاست کی حیثیت اختیار

کرنا جا رہا ہے، تمہیں دکھائی ہی نہیں دیتا، مملکت در مملکت کا

وجود آخر کیوں برداشت کیا جا رہا ہے۔ تمہاری یہ عقلت ایک

دن بڑے نتائج پیدا کرے گی۔

## صحیح النسب

لاہور میں علاج سے مایوس ہو کر طتان والسی پر حکیم حنیف اللہ خلیف الرشید

حکیم عطاء اللہ خان کے زیر علاج رہے۔ حکیم حنیف اللہ قرآن کریم اور دوسرے

دینی علوم سے فارغ ہیں۔ گھر کے قریب ہونے کی وجہ سے بھی ان سے قرابت

زیادہ نہی۔ شب و روز انہیں کے ہاں بیٹھتا رہتی۔

حکیم حنیف اللہ کا کہنا ہے کہ شاہ جی کی بیماری اس قدر بڑھ چکی تھی کہ

اس کے لیے قیمتی دواؤں کی ضرورت تھی جس کا میں منتقل نہیں تھا۔ شاہ جی سے



اس کے پیسے مانگتے ہوئے بھی عام محسوس ہوتی تھی۔ اسی پریشانی میں تھا کہ ایک رات خواب میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی میں نے دیکھا کہ حضور کے ایک جانب شاہ جی ہیں اور دوسری طرف ایک برفی پوش عورت بیٹھی ہے صبح کی نماز سے فارغ ہو کر اس خواب کی تعبیر تلاش کرنے لگا۔ مجھے اس فن پر ملکہ ہے۔

پریشانی اس پر تھی کہ خاتم الانبیاء کسے دوبارہ عورت کون ہو سکتی ہے، آخر تعبیر سے یہ پتہ چلا کہ برفی پوش عورت شاہ جی کی بیوی تھی۔

اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ ایک تو شاہ جی کا خاندان (میاں بیوی) عالی نسب بیتد ہیں۔ دوسرا یہ کہ مجھے علاج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کے بعد میں نے بلا جھجک شاہ جی کا علاج کیا، اور قیمتی سے قیمتی دوائیاں استعمال کرائیں۔ بہاروں میں وہ گزندگی گزارنے والا انسان جب خزاں کے پیٹھے میں آتا ہے، تو ہر موسم کا نشیب و فراز اس کے جسم کی حرارت کو اکسانا ہے، مگر ارد گرد کے کانٹے اس کی ساری شہمی کو کرا کر دیتے ہیں۔

حضرت امیر ٹرےٹ اپنے پیچھے جن راہوں کو چھوڑ کر آئے تھے، ان کے ایک ایک موڑ پر آندوؤں کے ہزاروں ہجوم ان کے ساتھ تھے، لیکن جس موڑ پر وہ آج کھڑے ہیں وہاں تناؤں کے جنازے اٹھتے نظر آ رہے تھے۔ یا بوسیوں اور نامراد یوں نے انہیں اس بازار کی بے کار جنس بنا دیا تھا، جس کا اقرار وہ خود اپنے معالج کے سامنے کرتے ہیں۔

”حکیم صاحب! میں فالج اور ذیابیطس کا مریض نہیں



ہوں۔ اصل یہ ہے کہ میری محفلیں اجر گئی ہیں، دیکھیے اشعار  
عظیم آبادی کیا کہہ گئے ہیں۔

کانٹوں میں گھرا ہوا ہے چاروں طرف سے پھول  
پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے!

ملکی حالات، حکمران طبقہ سے بائوسی، دوستوں کی بے وفائی، بیماری،  
اور بڑھاپا، ان تمام کے پیش نظر امیر تریپٹ نے اپنی انجمن اپنے گھر سجھالی تھی،  
اور حسب ذیل تحریریں اس محفل میں نمایاں نظر آتی تھیں۔

۱: حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم - اذا  
وسد الاهدال الى غير اهلها فانظر انساغة  
رجب حكومت نا اہل لوگوں کے سپرد ہو، تو قیامت کا انتظار کریں  
(رواہ البخاری)

۲: ہیر وارث شاہ کے چند اشعار (پنجابی)

- ۱- پگھا کھنڈتے کچھروا ہویا رکھ رنڈا اگھنیا ساک کراونے نوں
- ۲- اونہاں زہرے واسطے سد آمد اسگوں آیا سی زہر دھانے نوں
- ۳- ہتھیں اپنی زہر سپر لونی چکھا چوڑ چپٹ کراونے نوں
- ۴- سرہوں ڈھک کوڑیاں کول رکھی دانے ککڑاں پاسکاونے نوں
- ۵- گدڑ کچراں نے جمدار ہویا اٹھ چلیا بارغ لگاونے نوں
- ۶- ہیری کاغذی باندر ملّاح بنیا انہاں گھلیا پور لنگھاونے نوں



۷۔ راکھا مال دادھارہ وی رکھیونے پورہ سدیا کھوج لگانے نوں

۸۔ راکھا جواں سے ڈھیر دا گدھا ہو یا اتہاں گھلے جوت لکھا ونے نوں

۹۔ (توجہ) اہ بھٹو کے آدمی کو پھینسی اور کھیر کی رکھو امی د سے دی اور جس کی

اپنی بیوی فوت ہو چکی تھی، اُس کو کسی کے رشتہ کیلئے بھیجا گیا۔

۱۰۔ جسے زہر کے علاج کے لیے لائے تھے، وہ خود زہر ثابت ہوا، گویا

یہ کام انہوں نے اپنے ہاتھ سے کیا

۱۱۔ اپنے گھر کی بربادی کے لیے انتظام آپ کیا۔

۱۲۔ کیرٹے مکوڑوں کے پاس مسروں کا ڈھیر لگا دیا، اور مرغیوں کے

سامنے دانے خشک کرنے کے لیے ڈال دیے۔

۱۳۔ گیدڑ کو خوبوڑوں پر نگہبان کر دیا اور اونٹ کو کہہ کہ توباع

لگانے جا۔

۱۴۔ کاغذ کی بیڑی بنا کر بندہ کو طاح بنا دیا، اور اندھے سے کہا کہ تم جاؤ

اسے کنارے پر پھوڑ آؤ۔

۱۵۔ خزانے کی نگہداری کے لیے چور کو مقرر کیا اور چور ہی سے کہا

کہ تم چور کی تلاش کرو۔

۱۶۔ دھان کے ڈھیر پر گدھے کو رکھو والا کر دیا اور ماہینے کو خط

لکھوانے بھیجا۔

۱۷۔ وارث شاہ نے یہ بات خدا جانے اپنے دور کے حاکموں سے کہی ہو

یا نہ، لیکن امیر شریعت نے وارث شاہ کے اشرار سے اپنے دور کے حاکموں



پر ایسی پستی کہی کہ امیر شریعت کی ذہانت کی داد دے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔  
 انہوں نے وارث شاہ کے اشعار کو کہے وقت پر استعمال کیا جب کہ پاکستان  
 کے حکمران جوتیوں میں وال بانٹے رہے تھے، اور اپنے اقتدار کی کڑبھوں کے  
 لیے وطن عزیز کو سوا کر رہے تھے۔

جب کوئی دوست گھرا کر پاکستان کے موجودہ حالات پوچھتا تو امیر شریعت  
 ان تحریروں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے: "بھائی! یہ پڑھ لو! — بس یہی  
 کچھ ہو رہا ہے"

## شیعہ سنی فساد

۵ قید سے آزاد ہوتا ہے جب کوئی محکوم اگر  
 پھر سزا دیتی ہے اس کو حکمران کی ساجھی  
 ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے بعد ہر اقتدار لوگ اتحاد بین المسلمین  
 کو پریشان کرنے کی تجویزیں کرنے لگے۔

شیعہ، اہل سنت والجماعت، اہل حدیث، بریلوی یا دیوبندی کا باہم مل  
 بیٹھنا پاکستان کی زندگی میں پہلا واقعہ ہے۔ ۱۹۵۳ء میں یہ تمام فرقے پیغمبر اسلام کی  
 ابرو کے لیے بیسنہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے تھے، اور یہ امیر شریعت کے خلوص کی  
 زندہ مثال تھی کہ انہوں نے آگ اور پانی کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا لیکن حکومت کے  
 اپنے مستقبل کے لیے یہ اتحاد سود مند نہیں تھا۔

چنانچہ اگست ۱۹۵۶ء کو مغربی پاکستان کے اکثر شہروں میں شیعہ سنی فساد



ہوتے، ان دنوں مرکز پر جنرل سکندر مرزا جو عقیدہ شیعہ تھے، اور مغربی پاکستان میں ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ تھے جو سکندر مرزا کے سیاسی فریڈ تھے۔ انہوں نے سکندر مرزا کی خوشنودی کے لیے مغربی پاکستان کے تمام ڈپٹی گورنروں کو ہدایت بھیجی کہ شیعہ فرقہ کو مذہبی آزادی ہے، وہ جہاں مناسب سمجھیں محرم کے لیے لائسنس حاصل کر سکتے ہیں۔ اس حکمنامے کا اگلا لکشاف لاہور کے شیعہ رہنما قیصر مصطفیٰ ایڈووکیٹ نے اپنے ایک بیان میں کیا جو ۱۵ ستمبر ۱۹۵۷ء کے اخبارات میں شائع ہوا۔

اس فساد سے امیر شریعت اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کا اندازہ حسب ذیل تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۲۷ اگست ۱۹۵۷ء کو ملتان کے قریب ایک بستی رکنڈ اسرگاندہ میں کی۔

”ملک کے مختلف حصوں میں شیعہ سنی فساد کی اطلاع نے مجھے بے حد دکھ پہنچایا ہے۔ مسلمانوں نے معمولی باتوں پر اپنے بھائیوں کا خون بہا دیا، اور میری چالیس برس کی اتحاد و اتفاق کی کوششوں کو برباد کر دیا۔

شیعہ سنی تنازعات کی اصل جڑ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حقے خلیفہ کیوں ہوئے؟ پہلے خلیفہ کیوں نہ بنائے گئے؟ شیعہ سنی تنازعات، تعزیر و بیئزہ کی رسوم ان کے آئینہ یا سلف کا عمل یا قول نہیں ہے، یہ ایک رسم ہے، جیسے کہ سنی مسلمانوں میں کئی ایک رسمیں رائج ہو چکی ہیں۔

میں کل سے یہاں بیٹھا ہوں، لیکن آپ نے مجھے پہلے



تقریر کا موقف نہیں دیا۔ کیا یہ میری بے عزتی نہیں ہے مجھ سے پہلے  
 مولانا عبدالستار نے تقریر کی، وہ انصاری ہیں۔ ہمارے ناظم  
 اعلیٰ اراکین ہیں، اور میں اپنی بیعت کا فرد ہوں، سید اور ہاشمی  
 ہوں۔ مجھ سے قبل ان لوگوں کو وقت دیا گیا ہے جو ہندوؤں سے  
 مسلمان بنے۔ کیا یہ آل رسول کی توہین نہیں ہے —  
 رجمع پر اس وقت سکوت طاری تھا، آپ نے سامعین سے  
 جواب طلب کیا۔ جمع کے اس سکوت کو اور اپنے سوالوں کا

خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا

آخر میں تقریر کرنا میری بے عزتی نہیں۔ مولانا عبدالستار  
 تقریر کر رہے تھے۔ میں نے کہا، اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو میں  
 تقریر شروع کروں، تو مولانا عبدالستار نے کہا۔ اگر آپ پہلے  
 تقریر کریں گے تو آپ کے بعد میں کون پوچھے گا۔ ڈائریٹر لیت  
 نے جمع سے سوال کیا، کیا یہ عزت ہے یا بے عزتی؟ بعد میں  
 آنا بے عزتی کی دلیل نہیں۔

معراج کی رات تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا حضرت  
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں نماز ادا کرنا بھی میرے  
 دعوے کی دلیل ہے۔ ان انبیاء کرام میں سے حضرت رسول کریم  
 صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخر میں مبعوث ہوئے، کیا یہ رسول کریم  
 کی عزت ہے یا (معاذ اللہ) آپ کی بے عزتی؟



مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا  
کے آخری نبی ہیں، اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس  
نسبت سے چاہیے تو یہ تھا کہ جس طرح نبوت کا خاتمہ خاندانِ ہاشم  
پر ہوا، خلافت کا خاتمہ بھی ہاشمی خاندان پر ہو۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ سید الانبیاء پر  
نبوت ختم ہوئی، اور حضرت علیؑ پر خلافت۔ حضرت رسول کریم  
نبوت کے خاتم ہوئے اور حضرت علیؑ خلافت کے خاتم۔ اس کے بعد  
سلطنت اور بادشاہت شروع ہو گئی۔ بادشاہ اچھے بھی ہوتے  
ہیں اور برے بھی۔

یہ اورد بات ہے، میں چونکہ اولادِ علیؑ ہوں، اس لیے  
خواہش کروں گا، کہ میرے ابا کو پہلی خلافت دیتی، یا اس وقت  
میں ہوتا تو خود اپنے لیے خلافت کی خواہش کرتا، جیسے سرسید  
سے کسی نے پوچھا تھا کہ اُس وقت اگر آپ ہوتے تو کیا کرتے؟  
تو سرسید نے جواب دیا کہ میں خود خلافت حاصل کرنے کی کوشش  
کرتا، لیکن اصل بات یہ ہے کہ خاتمِ خلافت کا اعزاز حضرت علیؑ کو  
دینا چاہیے۔

اگر سب مسلمان اسی عقیدے پر متفق ہو جائیں تو اختلاف  
کیا رہ جاتا ہے۔ یہ تعزیر اور جلوس تو معمولی باتیں ہیں، یہ کوئی  
دین نہیں مسلمانوں کو معمولی باتوں پر تو بہ نہ دینی چاہیے، لیکن



افسوس کہ یہی معمولی باتیں اب خوفناک صورت اختیار کر رہی ہیں  
 اور اب نوبت خون خرابے تک پہنچ گئی ہے۔ (آخر میں آپ نے  
 سکرائٹے ہوئے فرمایا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبوت نہیں۔ حضرت  
 علیؑ کے بعد کوئی شرافت نہیں اور اس جلسے میں میری تقریر کے بعد  
 کوئی تقریر نہیں۔

## ڈاک پرسنر

۲۷ جون ۱۹۵۷ء کو عدلیائی گورنر نے کریمینل لاء اینڈ منجمنٹ ایکٹ  
 (Criminal Law and Management act) بحریہ ۱۹۰۸ء کی  
 دفعہ ۱۶ کے تحت مجلس احرار کو عدالت قانون قرار دے دیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد  
 حکومت مغربی پاکستان نے حضرت ایمر ٹریبیٹ کی ذاتی ڈاک پرسنر بٹھا دیا۔ نیران کے  
 ٹیلی فون بھی سٹے جانے لگے۔ حکومت کی اس حرکت پر مغربی پاکستان اسمبلی کے بجٹ  
 سیشن میں ۲۴ ستمبر ۱۹۵۷ء کو مسلم لیگ پارٹی کے قائد سردار بہادر حسان نے  
 نکتہ استحقاق پیش کرتے ہوئے حکومت سے سوال کیا، جس کے جواب میں وزیر اعلیٰ  
 سردار عبدالرشید نے قائد حزب اختلاف کو یقین دلایا کہ حکومت ریڈیو، اخبار، اللہ شاہ  
 بخاری اور دوسرے سیاسی کارکنوں پر سے اس قسم کی پابندی ہٹا دے گا۔  
 بیماری کے باوجود کبھی کبھار حلقہ احباب کے اصرار پر صرف ضلع نمان کے  
 تبلیغی اجتماعات میں شرکت کرتے، لیکن معالج کے اصرار پر یہ سلسلہ بھی منقطع کر دیا۔



جسم ناتواں ہو چکا تھا، سفر کرتے بھی تو بادلِ نوحا سنا۔ مگر ۱۹۵۸ء کے شروع میں سفر سے مکمل اجتناب کیا۔ اب لے دے کر حکیم حنیف اللہ کا مطب تھاپا گھر کی چادر پوری نظر کی کمزوری اور جسم کی نفاہت کے باعث راستے میں کئی سہارے لینے پڑتے۔

## مجلسِ احرار کا احیاء

۱۹۴۹ء میں سیاسیات سے لا تعلق کے بعد امیر شریعت نے اپنے

کاہکوں سے کہہ دیا تھا کہ تم میں سے اگر کوئی ملکی معاملات میں دلچسپی لینا چاہے، تو مسلم لیگ میں شامل ہو جائے، اس اعلان کے بعد احرار کارکنوں نے مسلم لیگ میں شامل ہونا شروع کر دیا، لیکن لیگی رہنماؤں نے اپنے غیر مخلص ارادوں کے پیش نظر احرار کے خلوص کو مشتبہ نظر سے دیکھا اور ان کے لیے اپنے تمام دروازے بند کر دیے۔ اس عدم تعاون کا نتیجہ یہ ہوا کہ احرار رہنما اپنے فیصلے پر اذہم خود کرنے پر مجبور ہوئے۔ انہیں دونوں شیخ حسام الدین اور اسٹریٹاجی الدین عوامی لیگ سے الگ ہو کر اپنے پرانے گھر واپسی کے لیے سوچ رہے تھے کہ ۸ اگست ۱۹۵۸ء کو صوبائی وزیر اعلیٰ نواب مظفر علی قزلباش نے مجلس احرار پر سے تمام پابندیاں اٹھانے کا اعلان کر دیا۔

## صدر سکندر مرزا کی خواہش

اس سے پیشتر ۹ مئی ۱۹۵۸ء کو صدر پاکستان میجر جنرل سکندر مرزا ملتان

آئے تو انہوں نے حضرت امیر شریعت سے ملاقات کی خواہش کی۔ اس ملاقات



کے مہتمم شیدہ رہنما مظفر علی شمسی تھے۔ جب امیر شریعت کو اس کی اطلاع ہوئی،  
 کہ گیلانیوں کی دعوت کے موقع پر صدر مملکت مجھ سے ملنا چاہتے ہیں، اور اس  
 کے لیے شمسی صاحب امیر شریعت کو لینے آئے تو امیر شریعت نے اپنے مخصوص  
 انداز میں فرمایا:

"شمسی! تم میرے سزیز ہو، میں تمہارا حکم نہیں ٹال سکتا۔ لیکن  
 یہ سوچ لو کہ تم دونوں کو اپوزیشن کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔  
 سکندر مرزا ملک کے صدر ہیں اگر وہ فقیر کے جھونپڑے  
 میں آئیں، تو یہ ان کی حیثیت کے خلاف ہے، اور اگر نہیں  
 ملنے جاؤں تو اپنی عمر بھر کی کمائی برباد کر بیٹھوں گا۔ لہذا یہی بہتر  
 ہے کہ میری طرف سے معذرت کر دو۔"

ابھی اس پر بحث ہو رہی تھی کہ لاہور میں ڈاکٹر طحان صاحب پر قاتلانہ حملہ کی  
 اطلاع پہنچ گئی اور اس طرح سے یہ کہانی اوصوری رہ گئی۔

## مجلس احرار کا اجلاس

مجلس احرار پر سے پابندیاں ختم ہوتے ہی ۲۵ ستمبر ۱۹۵۸ء کو امیر شریعت  
 کے ودلت کدہ پر احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا، تاکہ جماعت پھر سے سیاسیات  
 میں دخل انداز ہو سکے۔ اس موقع پر امیر شریعت نے احرار رہنماؤں سے فرمایا:  
 "دوستو! آپ سب کو یہ حق ہے کہ جس طرح چاہیں اپنے  
 لیے فیصلہ کر لیں۔ لیکن اپنی بیماری اور ملک کے موجودہ حالات



کے پیشی نظریں نے اپنے لیے ۱۹۴۷ء میں جو فیصلہ کیا تھا،  
 اب بھی میں اسی پر قائم ہوں۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ پھر سے ان  
 بکھیروں میں الجھوں۔ لیکن میں آپ حضرات کو نہیں روکتا۔ میری  
 دعائیں بہر حال آپ کے ساتھ ہیں۔ مگر میری ایک ہی خواہش ہے  
 کہ حضور کی نبوت پر اس وقت جو ڈاکہ پڑ رہا ہے، آپ اس کا  
 خیال رکھیں۔ بس! میری یہی آرزو ہے۔ باقی آپ اپنے معاملات  
 میں آزاد ہیں۔“

## فوجی انقلاب

سیاسی جماعت ہو یا مذہبی، اگر اس کے کارکنوں میں خلوص، دیانت،  
 اور محنت کا جذبہ نہیں، تو وہ جماعت نہیں بلکہ ایک پھیر ہے۔

۱۹۴۷ء میں جو لوگ مسلم لیگ پر قابض ہوئے، ان میں اکثریت ایسے  
 لوگوں کی تھی، جن کے ہاں خلوص اور دیانت کا فقدان تھا، ورنہ مسلم لیگ  
 بلا شرکت غیر سے پاکستان پر پچاس سال تک حکمران رہ سکتی تھی۔

لوٹ مار، چھینا جھپٹی اور حکومت میں منگموں کی بندر بانٹ نے اس  
 جماعت کے کارکنوں کو بڑی طرح الجھایا کہ نونہ ایہ مملکت کا سانس اکھڑنے لگا  
 مغربی پاکستان میں نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ کی جنگ  
 اقتدار سے بڑھ کر مشرقی پاکستان کے مولوی فضل الحق اور حسین شہید سہروردی کی  
 کشمکش نے پاکستان کو ایسے موڑ پر لاکھڑا کیا کہ ملک کی تباہی پالیسی بھی بازیچہ اطفال



بن کر رہ گئی تھی۔ حکومت کے اندر وزراء کی اپنی کرسیوں کی حفاظت میں جماعتی وفاداریاں روز و شب مشکوک دکھائی دینے لگیں۔ اندر میں حالات قریب تھا کہ پاکستان اپنے ایک ہمسایہ ملک کی مذہبی کالونی بن جاتا۔ ۲۷ اور ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی درمیانی رات کو میجر جنرل سکندر مرزا کو حکومت سے الگ کر دیا گیا اور اُن کی جگہ ملک کے تمام اختیارات جنرل محمد ایوب خان نے سنبھال لیے۔ اس فوجی انقلاب سے متعلق حضرت امیر شریعتؒ سے جب ان کے اہل بیتؑ سے سوال کیا تو برحسہ فرمایا:

”سہ ٹیبل نے آٹھ چہانہ چمن سے اُٹھا لیا  
اپنی بلا سے بوم رہے یا ہٹا بسے  
باقی گیارہ سال پیشتر سے جس طرح جوتیوں میں دال بٹ  
رہی تھی، اُس کا نتیجہ یہی ہونا تھا۔“

دعا کرو یہ فوجی انقلاب پاکستان کے لیے بہتر ہو۔“

## احباب کی محفلیں

انسان بھی ایک کھلونا ہے۔ جب تک اس پر رنگ و روغن کی تلوہ آرابیاں رہتی ہیں، ہر باتھ اس کی تریباری کے لیے بڑھنا اور ہر آنکھ اس پر ابھتی ہے، لیکن جیسے ہی اس کا طمع اُترتا ہے، پھر نہ کوئی آنکھ ابھتی ہے اور نہ کوئی خریدار آتا ہے۔

امیر شریعتؒ جب تو اس کے زمانے کی ہوا میں اُن سے اٹھکیاں کرتے،



بہاویں اُن کے قدم لپٹیں، ان کی آواز کے زیرِ دم سے حکومتوں کے غرور و  
 زوال وابستہ ہے لیکن جب کچھ بھی نہ رہا، تو پھر گئی کے مور بھی سہارا نہ دیتے  
 سکتے۔ اپنے بیمار داری کو آئے گئے سما۔ آہ زمانہ کس قدر بے وفا ہے، ان  
 دنوں صرف گھر میں محفلیں بنتیں یا شام کے وقت حکیم صاحب کے ہاں۔ اسی  
 طرح کی ایک محفل میں فرمایا:

”میری دوستی اور دشمنی صرف ایک ہی دفتر ہوتی ہے۔ اس پر  
 ایک شہر بڑھا ہے

دل نیست کہوتر کہ پرو باز نشیند

از گوشہ باسے کہ پریدیم پریدیم

ما بخیر شما بہ سلامت!

بس اسے گزارہ کشتی سمجھئے یا دشمنی، میری طرف سے

دشمنی اتنا ہوتا ہے۔ الحمد للہ کہ میں نے آج تک نہ کسی سے متعلق

بڑا سوچا ہے اور نہ ہی بڑا کیا ہے۔ ہاں انگریز اور مرزائیوں کے

متعلق جہاں تک بس چلا بڑا سوچا اور کیا ہی۔“

ان پر مولانا لیسین نے کہا: ”یہ تو پھر جند ہے۔“

امیر شہزاد نے فرمایا،

”بہاؤ! جند نہیں میرا ایمان ہے۔ حدیث میں کیا پڑھا ہے، کہ

”مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ ڈکک نہیں کھاتا۔“

انہیں دنوں روزنامہ ”امروز“ (طرابلس) کے نامہ نگار نے امیر شہزاد سے



سے ملاقات کی۔ اس نے اپنے تاثر یوں بیان کیے ہیں۔

”ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے، مجھ سے امیر شریعت سید  
عطاء اللہ شاہ بخاری پر ایک مصور فحش تیار کرنے کو کہا گیا۔ میں ڈیڑھ روز  
کو لے کر محلہ ٹبی شیرزاں پہنچا۔ شاہ جی کا پتہ معلوم کیا، مسجد کے عقبہ،  
میں ایک کچا سا مکان جس کے باہر لٹیریکس لگا ہوا تھا۔ گلی کی طرف  
کھلنے والے کمرہ میں شاہ جی موڑوٹھے، وہ ان دنوں بیمار بستے،  
بیرو عافیہ تے پوچھ چوچکا، تو اپنا مدعا بیان کیا۔ شاہ جی بارہ سال  
گئے، کہا کہ اب زندگی کے آخری سانس گن رہا ہوں، اب  
تو آرام کرنے دو۔ اخبار کے کالم بھرنے کے لیے میرے ماضی  
کے بچے اُدھیرتے ہوئے پندرہ ناموش رہے، پھر کہا، ایک  
بات پوچھوں؟ میں نے کہا، ”ضرور، ارشاد فرمائیے،“ کہنے لگے  
”یہ جو پتلی ہے اس کا بادشاہ شیخ پتلی ہوگا۔ ران دنوں پتلی کی  
تباہی کے متعلق اخبارات میں خبریں آ رہی تھیں میں نے محسوس  
کیا کہ شاہ جی مجھے ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال رہے ہیں۔ اس پر  
میں نے انہیں پھر اپنے ڈھب کی بات کہہ دی، ”شاہ جی!  
آپ کب سے اس کراسٹے کے مکان میں رہ رہے ہیں؟“ فرمانے  
لگے۔ ”مہرم ۱۹ء میں بیمار آ گیا تھا، اب تالیہ میں پڑا ہوں۔“  
آپ نے کوئی مکان الاٹ نہیں کرایا؟ آپ کا کلیم تو ہے؟“  
جواب میں فرمایا۔ ”آپ مکان کی الاٹمنٹ کی باسٹا کرتے ہیں



جانے قبر کے لیے چند گز زمین ملے گی یا نہیں؟ ایک دفعہ ایک  
 مرکزی وزیر صاحب مجھ سے ملنے ملتان تشریف لائے، انہوں نے  
 بھی فرمایا تھا کہ اگر میں انہیں کہوں تو وہ مجھے مکان، آلات کرا  
 دیں گے، اور ساتھ ہی یہ ارشاد بھی فرما گئے کہ فلاں تاریخ کو  
 فلاں صاحب ملتان سے گزر رہے ہیں، اُن سے مل لینا، میں نے  
 پوچھا، پھر شاہ جی! آپ نے اُن سے ملاقات کی؟ کہا، نہیں بالکل  
 میرے پاس کافی اچکن اور قراقرمی ٹوپی نہیں تھی۔  
 "شاہ جی! آپ کو ذیابیطس کی شکایت کب سے ہے؟"  
 جواب دیا۔ "یہ مرض سکھڑیل میں میرے ساتھ آگیا تھا۔ ابھی تک  
 سنگت نبھانا ہے۔"

"ان دنوں جب کہ آپ اس قدر بیمار ہیں، اور پیلیک  
 لائف سے بھی ریٹائر ہو چکے ہیں، کبھی ویرینہ رفقا، میں سے  
 کوئی ملنے آیا ہے؟" جواب میں مسکرائے اور کہا، "بیٹا! جیت تک  
 یہ گتیا زبان بھونکتی تھی، سارا برصغیر بند و پاک ارادت مند تھا۔  
 اس نے بھونکتا چھوڑ دیا ہے تو کسی کو پتہ ہی نہیں رہا کہ میں کہاں  
 ہوں۔ ہاں ویرینہ میں سے ایک آدمی کو چھوڑ باقی میرے ہاں  
 آہی جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایبٹ آباد سے ایک دوست ملنے  
 آئے، انہوں نے ایبٹ آباد جانے پر اصرار کیا، میں نے انکار  
 کر دیا۔" میں نے کہا، "شاہ جی! آپ اُن کے ہاں پہلے جاتے،



ایبٹ آباد صحت، افزا مقام ہے۔ ملتان کی گرمی میں آپ کیوں  
 تڑپ رہے ہیں؟ جواب دیا، بیٹا! اب عمر کی اُس سطح پر آگیا  
 ہوں کہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کتنے لوگ میرے پاؤں آتے ہیں،  
 ساری عمر لوگوں کی مہمانی میں گزار دی۔ اب میزبان بن کر بھی دیکھنا  
 چاہتا ہوں۔“

میں نے دیکھا کہ شاہ جی اب کھلنے لگے ہیں۔ چنانچہ کاغذ  
 پینل ہنسی والی تاکہ یادداشت کے لیے کچھ لکھ لوں، شاہ جی  
 نے میری تیاری دیکھی، تو انہوں نے بات روک لی۔ میں نے  
 ایک اور سوال کر دیا، جواب میں کہا، اخبار والوں سے ڈر  
 لگتا ہے۔ آپ لوگ اکثر واقعات مسخ کر دیتے ہیں۔ پھر غلط  
 بیان دوسرے سے منسوب کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا  
 عبدالمجید سالک مرحوم کا ایک واقعہ بھی سنایا۔ یعنی ایک دفعہ  
 سالک مرحوم نے یو۔ پی کے ایک جلسے کی تقریر میرے نام سے  
 منسوب کر کے اپنے اخبار ”انقلاب“ میں چھاپ دی۔ جب لانک  
 میں نے یو۔ پی میں کوئی ایسی تقریر نہیں کی تھی۔ جب اُن سے اس  
 غلط تقریر کی شکایت کی تو انہوں نے خاطر خواہ جواب نہ دیا۔  
 اس پر میں نے ۲۵ سال تک سالک صاحب سے بات  
 نہیں کی۔

ایک دن صوفی تبسم مجھے پطرس بخاری کے پاؤں دعوت



پوسے گئے۔ پطرس نے مجھے مدعو کیا تھا۔ اس دعوت میں  
 سالک بھی شریک تھے، وہاں ہم دونوں کی صلح کرائی گئی۔ سالک  
 نے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”آپ نے میرے بچے پر جس تباہ  
 کر کے رکھ دیے ہیں“

یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے شاہ جی کے چہرے پر غم کی  
 پریچھاڑیاں پھیل گئیں، ایک لمبی سانس لی پھر کہا۔ ”سب پار کہتے  
 پھرتے جاتے ہیں۔ ایک دن میں بھی اُن میں جا بلوں گا۔“  
 ”پطرس بخاری کے مکان پر ہم چاروں ساعتی ماضی  
 فسانے بیٹھے سنا رہے۔ نماز کا وقت ہو گیا تو میں نے  
 پطرس سے کہا، ”آپ سید ہیں، قرآن پاک آپ کے گھر میں اُترا  
 آپ بھی نماز پڑھیں تو کتنی بُری بات ہے۔“ پطرس نے یہ  
 سن کر سالک مرحوم کو آواز دی، ”سالک! اٹھو، شاہ جی ہمیں  
 زبردستی جنت میں لے جائیں گے۔“

شاہ جی نے سالک مرحوم کا ایک اور واقعہ سنایا، فرمانے  
 لگے۔ ”بے حاجی مولا بخش سمر کے مکان پر تھا۔ نماز مغرب کے  
 بعد وہ وہیں مصروف تھا کہ سالک اور حمید لاپوری وہاں پہنچ  
 گئے۔ سالک نے مجھے و طیفہ پڑھتے دیکھ کر یہ شعر پڑھا۔“

بر زبان تسبیح در دل گاؤ خمر  
 این چنین تسبیح کہ دارد اثر



جب درود سے فارغ ہوا تو کہا۔ "میں یقیناً تم دونوں کے  
خیال میں نہیں تھا۔"

دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ شاہ جی بیٹھے بیٹھے تنک گئے  
تھے، اٹھے اور یہ شعر پڑھا۔

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں  
پراخوں کا دھواں دیکھنا نہ جائے

اور پھر اندر چلے گئے۔ اس ملاقات کے بعد مجھے شاہ جی سے  
باتیں کرنے کا ہسکا پڑ گیا۔ اب میری تقریباً ہفتہ میں ایک آدھ  
یار ضرور شاہ جی سے ملنے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ہر  
ملاقات میں شاہ جی سے میں نے اخبار کے رپورٹر کی حیثیت سے  
سوال پوچھے۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد میں نے ایک مختصر فیچر  
لکھ مارا۔ جب وہ شائع ہوا، تو کچھ مخالفوں نے اسے مسخ  
کر کے اپنے اخبار میں نقل کیا۔ اس فیچر میں راقم نے اپنے ان  
جذبات کا اظہار کیا تھا۔

جس مجاہد اور خطیب اعظم نے ملک کی آزادی کے لیے  
اتنی لمبی عمر انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی، اور ساتھ ساتھ دین  
کی خدمت بھی کی، وہ کرائے کے مکان میں رہ رہا ہے۔ حکومت  
اور سوسائٹی نے ان کی خدمات کی قدر نہیں کی۔ "شاہ صاحب  
ناراض ہو گئے، بہر کیف ان کی ناراضگی عارضی تھی۔ ایک دن



فرمانے لگے۔ "بیٹا! میں اپنوں سے ناراض ہوتا ہوں، تمہاری  
 نیت پر شک نہیں کرتا، تم نے تو میرے حق میں اچھا نہیں کیا۔"  
 میں نے دیکھا کہ شاہ جی نے مجھے معاف کر دیا ہے تو ملاقاتوں  
 کا سلسلہ پھر شروع کر دیا، چنانچہ ایک دن خود ہی فرمانے لگے۔  
 "ایک دفعہ وہی جیل میں مولانا ابوالکلام آزاد ڈاکٹر آصف علی،  
 ڈاکٹر انصاری اور میں اکٹھے ہو گئے۔ مولانا آزاد چائے کے بڑے  
 ریاضے۔ ایک صبح بڑے اہتمام سے چائے تیار کر کے مجھے  
 پلائی۔ میں چائے پی چکا، تو مولانا نے داوطلب نظروں سے  
 پوچھا۔ "شاہ جی! چائے کیسی بنی؟" میں نے کہا۔ "حضرت ایک  
 کمی رہ گئی۔" مولانا ایسے بھٹائے جیسے دماغ پر بجلی گری ہو، پوچھا  
 "وہ کیا میرے بھائی؟" میں نے کہا۔ "اس میں دوپٹی زعفران  
 کی بھی ہونی چاہیے تھی۔" "ہاں میرے بھائی! آپ تو اضافے کی  
 بات کرتے ہیں۔ اچھا میرے بھائی! کل آپ کو زعفران پلاؤں گا۔"  
 چنانچہ دوسرے روز مولانا نے جیل کے ایک ملازم کو پانچ روپے  
 دے کر زعفران منگوایا اور مجھے زعفران پلائی۔

ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمن کے ہمراہ مولانا آزاد سے  
 ملنے گیا۔ استفادہ کے لیے چند آیات تفسیر کے لیے پیش کیں۔  
 مولانا نے اپنے انداز میں ان کی تفسیر بیان کی۔ ہم بہت متاثر  
 ہوئے، تو میں نے کہا۔ "مولانا! خدا آپ کو بہت عمر نصیب کرے۔"



مولانا نے کہا، "نہیں میرے بھائی! تقوٰۃ ہی ہو تو قرینے کی ہو۔"

ایک دفعہ میں میرٹھ کے جلسے میں تقریر کر رہا تھا، پر شوتم

داس سٹرن صدر کانگریس بھی جلسے میں موجود تھے۔ انہوں نے

کہا، "شاہ جی! تلاوت قرآن پاک کریں تاکہ آتما کو سکون ہو۔"

پھر میں نے اس جلسے میں ساڑھے آٹھ گھنٹے تقریر کی۔ صبح

قریب آگئی تو یہ شعر پڑھ کر شیخ سے اُتر آیا۔

سے شیب وصال بہت کم ہے آسماں سے لہو

کہ جوڑے سے کوئی ٹکڑا شیب چڑائی کا

ایک دفعہ میں نے لاہور موچی دروازہ کے باہر تقریر

کرتے ہوئے کہا، "میں سکاؤٹس سے کہتا ہوں کہ وہ مفلسی اور

بیکاری کے مسئلے کو حل کرے۔ جو حکومتیں اس مسئلہ کو حل نہیں

کرتیں، یہ مسئلہ ان حکومتوں کو حل کر دیا کرتا ہے۔" اس تقریر میں

یہ بھی کہا کہ "استبداد کی چکی کا دستہ گورے کے ہاتھ میں ہو یا

کالے کے ہاتھ میں، چکی وہی رہتی ہے، اور میں اس چکی کو توڑ

دینا چاہتا ہوں۔"

۱۹۳۱ء میں میں نے مسئلہ میراث پر ملک بھر میں تقریریں

کیں، جن کا رد عمل یہ ہوا کہ آریہ سماج و چھو والی شاد عالم لاہور

میں ہندوؤں کے ایک اجتماع میں کماری ودیا واتی نے کھڑے

ہو کر وراثت کا مطالبہ کر دیا۔ ڈی اے وی کالج کے پرنسپل



پھیل داس جلسے کے صدر تھے۔ کماری ودیاوتی نے کہا۔ "اگر آپ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو وراثت میں سے حصہ نہیں دیں گے تو ہم مسلمان ہو جائیں گی۔"

اس پر صدر جلسہ نے کہا۔ "ہمارے لیے یہ مشکل ہے کیونکہ ہم دُور جا کر شادیاں کرتے ہیں، لہذا جا بجا اور منتقل نہیں ہو سکتی۔" اس پر کماری ودیاوتی نے کہا۔ "آپ جگر گوشہ کو بیاہ کر دُور بھیج دیتے ہیں، لیکن زمین کے ٹکڑے منتقل نہیں کر سکتے۔" میری ان تقریروں سے ہندوؤں میں کافی دیر پہلی رہی۔

۳۲-۱۹۳۱ء میں تحریک کشمیر کے دنوں میں میں نے جس موثر انداز میں ریاستی عوام کے لیے کام کیا، اس سے متاثر ہو کر گولی مینر کا نفرنس لندن میں وزیر ہند نے کہا تھا کہ "ہندوستان میں ایک ایسی سحر بیان شخصیت موجود ہے جو بیک وقت دو حکومتوں کے نظام کو معطل کر کے رکھ دیتی ہے۔"

"بیٹیا! زندگی کے کٹھن واقعات ہیں جو تمہیں سناؤں۔ تم جب آجاتے ہو تو کتاب زندگی کا ایک ایک ورق سامنے آجاتا ہے۔ اب اتنی ہمت بھی نہیں کہ ان اوراق کو اُلٹوں؟"

## لندن آنے کی دعوت

ضابطہ حیات کی طرح اصولی آدمی بھی ایک آئین ہے، جسے انسان



احساس کے سائچے میں ڈھالنا ہے، اگر یہ سائچہ ٹوٹا جائے تو آدمیت  
واعداد ہو جاتی ہے۔

۱۹۵۰ء کے آخر میں انٹرنیشنل بیسین مشن لندن سے سیکرٹری راولپنڈی  
نے حضرت امیر شریعت اور حضرت مولانا لاہوری کو لندن آنے کی دعوت دی،  
اور اس کے لیے تمام امکانی سہولتیں بہم پہنچانے کا وعدہ کیا، یہاں تک کہ  
خود انجمن کے افراد بھی لندن سے دونوں حضرات کی خدمت میں حاضر ہوئے۔  
لیکن حضرت امیر شریعت نے ان حضرات کی درخواست کے جواب میں فرمایا۔

بھائی! اول تو میں اپنی صحت کے پیش نظر اس سفر کے وقت ہی

نہیں ہوں۔ اگر ہوتا بھی تو جس (انگریز) نے ڈیڑھ سو برس میرے

ملک کو غلام رکھا، اس کا خون چوسا، اور جاتی دفعہ فتنہ و فساد کا ایسا

تخم چھوڑ گئے کہ ہر صغیر پاک و ہند کے انسانوں کے ماہر کبھی

اس قائم ہو ہی نہیں سکتا۔

دوسرا میں نے اپنی زندگی کے قریب پچاس برس ان کی

مخالفت کی ہے، اس بنا پر میرا ضمیر اس ملک میں جتنے کی

اجازت نہیں دیتا۔

اس پر ان لوگوں نے مزید اصرار کیا، تو فرمایا:

”بھائی! میں اصول کہ آدمی ہوں، اور اسی اصول پر زندگی

کے چالیس برس گزارے ہیں۔“

حضرت لاہوری کو جبکہ امیر شریعت کی اس رائے اور فیصلے کا علم ہوا، تو



انہوں نے بھی اسی قسم کا جواب دیا۔

## ارضی کی پیش کش

مٹان کے ڈپٹی کمشنر ممتاز مسعود نے اپنے ایک قریبی دوست کی وساطت سے امیر شریعت سے ملنے کی خواہش کی۔ اس کے امیر شریعت سے بھی کمرے مرام تھے۔ اس بھروسے پر متعلقہ شخص نے ڈپٹی کمشنر سے وعدہ کر لیا کہ وہ امیر شریعت کو کسی دن ان کے پاس لے آئے گا۔ پھر پانچ اُس نے امیر شریعت سے ڈپٹی کمشنر کی خواہش کا اظہار کیا تو فرمایا کہ کسی دن چلیں گے۔ آخر اتوار کا دن مقرر ہوا، امیر شریعت حسب وعدہ ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پہنچے مگر ممتاز مسعود بڑے خوش ہوئے اور امیر شریعت کی آمد پر اپنے کمرے کو خاص انداز سے آراستہ کیا، امیر شریعت جیسے ہی کار سے اترے، ڈپٹی کمشنر پذیرائی کے لیے آگے بڑھے۔ کمرے میں بیٹھتے ہی ہمہ اقسام مشروبات سامنے لائے گئے۔ لیکن امیر شریعت نے فرمایا :-

”بھائی! میرے لیے تو سادہ اور ٹنڈا پانی منگوا دو، بڑی مہربانی ہوگی۔“

ڈپٹی کمشنر نے باصرہ کہا۔ ”یہ سارا کچھ بھی تو سادہ ہے“ اس پر امیر شریعت

نے کہا:

”اس سادگی پر مجھے غالب کا یہ شعر یاد آ گیا ہے

اس سادگی پر کون نہ مر جائے اسے خدا!

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں



میز مشروبات سے سجاہ کھی ہے، مساعرو میںنا کا ساساں بانڈھ

لیا ہے، اور ابھی یہ سارا کچھ سادہ ہے، سبحان اللہ!

کچھ دیر اور صبر کی باتیں کرنے کے بعد فرمایا،

”آپ کا حکم نامہ بلا تو سوچا، چلو اسی بہانے اپنا ایک کام ہی کرنا آؤں“

اس فقرے سے ڈپٹی کمشنر کو گمان ہوا کہ شاہ جی کوئی ذاتی بات کہنے لگے

ہیں۔ چنانچہ بڑی بیٹانی سے ڈی، سی نے کہا، ”فرمائیے!“

امیر شریعت نے چند کاغذات نکال کر ان کے سامنے رکھے اور کہا:

”سارے مغربی پاکستان میں تحفظ ختم نبوت کے دساتر

حکومت نے واگزار کر دیے ہیں، لیکن ملتان کا دفتر ہنوز سر مبر

ہے، اگر آپ یہ دفتر کھولنے کی اجازت دیدیں تو میں ممنون ہوں گا“

اس کے جواب میں ڈی، سی نے کہا ”شاہ جی! یہ کام تو صوبائی حکومت کی

پالیسی سے تعلق رکھتا ہے۔ البتہ میرے بس میں تو یہ ہے کہ میں آپ کو چھ سات

مربعے اراضی دے سکتا ہوں، اور اس میں ٹیوب ویل کا انتظام بھی کر سکتا ہوں“

اس پر امیر شریعت مسکرائے، اور فرمایا،

”مختار صاحب! میں اپنی ذات کے لیے حاضر نہیں ہوا۔ باقی ہے

آپ کے مربعے اور اس کی پیشکش تو اس کے لیے شکر ہے!“

یہ کہا اور وہاں سے چلے آئے۔ یہ اگست ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔

دعائے صحت کے لیے

۱۹۴۰ء میں امیر شریعت کے معالج حکیم حنیف اللہ نے حج بیت اللہ کا



ارادہ کیا، اور اُس کے لیے درخواست دی۔ امیر شریعتؒ کو جب اس کا علم ہوا  
تو حکیم صاحب سے کہا:

"جب آپ حضورؐ سے روکنا تھا تو صلی اللہ علیہ وسلم کے  
روضہ اطہر پر حاضر ہوں تو میرا سلام عرض کریں اور میری صحت  
کے لیے دعا کی درخواست کریں"

حکیم صنیف اللہ اس پر خاموش رہے، لیکن امیر شریعتؒ نے انہیں دنوں دنوں کے  
والد حکیم عطاء اللہ خان سے اس بات کا ذکر کیا، تو بڑے حکیم صاحب نے کہا:  
"شاہ جی! گذشتہ دنوں میں نے آپ کی یہ درخواست خاتم الانبیاءؐ  
کی خدمت میں پیش کر دی ہے"

امیر شریعتؒ۔ (تعجب سے) "وہ کیسے؟"

حکیم صاحب: "مجھے کچھ دنوں حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت  
نصیب ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ سروید کا ٹنڈا کے گرد ایک  
حلقہ بیٹھا ہے، میں بھی اُس میں شامل ہوں۔ میں نے حضورؐ کی  
خدمت میں عرض کیا، "یا عطاء اللہ شاہ بخاری کی وصیت کے لیے  
دعا فرمائیں" مگر حضورؐ نے دعا کے لیے ہاتھ نہیں اٹھائے، بلکہ

ایک کاغذ کی طرف اشارہ کیا، جس پر لفظ "صحت" لکھا تھا۔"

امیر شریعتؒ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور حکیم صنیف اللہ سے آکر کہا۔

"آپ نے تو میری درخواست حضورؐ کی خدمت میں لے جانے

کی حاجی نہیں بھیجی تھی، مگر بڑے حکیم صاحب نے یہ کام کر بھی دیا۔"



یہ کہہ کر تمام واقعہ بیان کر دیا۔

والد صاحب کا خواب سن کر حکیم حنیف اللہ نے اس کا ذکر اپنے استاد  
حضرت مولانا عبدالرؤف سے کیا، جس سے انہوں نے حدیث اور فقہ پڑھی تھی۔  
انہوں نے فرمایا، "اس خواب کی یہ تعبیر نہیں جو شاہ جی سمجھے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ شاہ جی کو  
روحانی صحت ہوگی یعنی ان کے وصال کا وقت قریب آ گیا ہے، لیکن مصلحتاً  
امیر شریعت کو یہ تعبیر نہیں بتائی گئی تھی۔"

## شعرو شاعری

۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۹ء تک امیر شریعت امرتسر میں زیر تعلیم رہے، انہیں  
دلوں — شعرو شاعری کا ذوق بھی اُبھرا، اور اس کے لیے مولوی محمد دین جن کا  
شخص شریب تھا، کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اس ذوق کی تکمیل کرتے رہے  
اور اپنا تخلص "ندیم" بنوایا۔ کبھی کبھار مولوی محمد دین غریب انہیں کوئی مصرعہ  
دے دیتے کہ اس پر گرہ لگاؤ۔ چنانچہ ایک دفعہ مصرعہ طرح دیا کہ  
ع "دہ آنکھوں میں موجود اور چشم جہراں"  
اس مصرع پر امیر شریعت نے یوں گرہ لگائی ہے۔  
"دہ آنکھوں میں موجود اور چشم جہراں  
ادھر ڈھونڈتی ہے ادھر ڈھونڈتی ہے"  
اس گرہ پر مولوی محمد دین غریب بہت خوش ہوئے۔

عمر رواں کے ساتھ ساتھ جب کبھی طبیعت موزوں پاتے، فارسی



اور اردو میں شعر کہتے۔ پنا پنچہ ان کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ۱۹۵۵ء میں  
”سواطع الالہام“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

گرتی ہوئی دیوار کی طرح امیر شریعت کی صحت کو بڑے سہارے دیئے  
جاتے رہے، لیکن پھول اپنی بہاریں ضائع کر چکا تھا، اب گھر میں محفلیں قائم  
ہوئیں، اجاب صبح و شام جمع رہتے، اور شعر و شاعری کا دربار لگتا۔ ان محفلوں  
میں جو لوگ شریک ہوئے، ان میں فیض احمد فیض، صوفی تقسم، علامہ طبیب اللہ  
گورداسپوری، مولانا عبدالرشید نسیم (جو اخبارات میں علامہ طاہر کے نام سے  
معروف تھے) عبدالحمید عزم اور سائغر صدیقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اسی دوران حکیم صاحب نے ایک ن سوال کیا۔ ”شاہ جی! ایسا لگتا ہے

جیسے آپ قوم سے یالوس ہو چکے ہیں۔“ جواب میں ایک سرد آہ کے ساتھ فرمایا:

”آپ، طبیب، ہو کر ایسا سوال کرتے ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں  
سکرات کا عالم طاری ہو جائے، تو آپ مریض کی زندگی سے  
یالوس نہیں ہو جائیں گے؟ بس! یہی حال قوم کا ہے،  
اس سے یالوس نہ ہو جاؤں تو اور کیا؟“

اگر کوئی ان دنوں گھرا کر پوچھتا۔ ”شاہ جی! کیسی طبیعت ہے؟“ تو جواب یہ  
اکثر یہ دو شعر پڑھتے۔

نہ جانے لوگ کیوں ہنستے ہیں میرے چاکہ اماں پر

جنوں میں جیسا ہونا چاہیے ویسا گریباں ہے



یا — بے دلی ہائے تمنا، کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق  
بے کسی ہائے تمنا، کہ نہ دُنیا ہے نہ دین !

## ایک نامہ نگار سے !

روزنامہ "کوہستان" (ملتان) کا نامہ نگار انہیں حالات میں ملاقات کیجئے  
حاضر ہوا، اور اس نے واپسی پر حسب ذیل تاثرات ۸ ستمبر ۱۹۵۶ء کے "کوہستان"  
میں اس طرح بیان کیے :

"میں شاہ جی کو ملنے اُن کے مکان پر پہنچا، تو وہ کسی کام سے  
باہر گئی میں کھڑے تھے، علیک سلیک ہوئی اور ہم بیٹھک میں جا  
بیٹھے۔ انہوں نے چار پائی کا سہارا لے کر زمین پر دھرنا مار لیا،  
اور میں بھی اُن کی تقلید میں اسی طرح بیٹھ گیا۔ بیٹھک میں ایک  
چام پائی، ایک الماری اور چند کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ میں نے  
شاہ جی سے اُن کی صحت کے بارے میں پوچھا، تو کہنے لگے  
کہ ذیابیطس کے ساتھ فالج کی بھی شکایت زور پکڑ رہی ہے  
ذیابیطس کی شکایت پہلے بھی تھی، لیکن ۱۹۵۳ء میں جیل گیا تو  
بیماری زور پکڑ گئی۔ ۱۹۵۶ء سے آج تک اسی چار پائی پر پڑا ہوا  
ہوں۔ پھر کہنے لگے۔ آج آپ کا اخبار پڑھ رہا تھا، ایک خبر تھی  
اگر روس نے امریکہ کے کسی حلیف ملک پر ایکٹ پھینکا تو روس  
پر ایکٹوں کی بارش کر دی جائے گی۔ ارے! ان کم بختوں سے



کوئی پوچھے کہ تم موت کا علاج کر رہے ہو، زندگی کا علاج کرو غالب  
 شاہ جی کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کا یہ شعر پڑھا ہے  
 ہاں کھائی تو مست فریب، ہستی  
 ہر چند کہیں ہے کہ نہیں ہے

اس کے بعد سر نکڑ کر بیٹھے رہے۔ بیسی نے بات کرنا چاہی، تو  
 کہنے لگے، دعا کرو قبر کے لیے زمین نصیب ہو جائے، رہنے  
 کے لیے گھر تو نہیں ملا، متعدد بار قرعہ اندازی میں حصہ لیا  
 لیکن قرعہ نہیں نکلا۔ ۶۱۹۲۸ سے اسی کراڑے کے مکان میں  
 رہ رہا ہوں۔ ہندوستان میں دو مکان چھوڑے تھے۔ یہاں آکر  
 کچھ بھی نہیں ملا، اور نہ ہی بیسی نے کوشش کی ہے۔ کلیم منظور  
 ہو گیا ہے، قرعہ اندازی میں کچھ ملا نہیں۔ اب نقد معاوضے کی  
 اس لگائے بیٹھا ہوں شائد مل جائے۔

ایک زمانہ تھا کہ شاہ صاحب کے گرد ہر وقت پیچھے قدموں کا  
 ہجوم رہتا تھا، اب زور بیان ختم ہو گیا تو سب اجباب دور ہو  
 گئے ہیں۔ اب صرف وہ دیہاتی رہنے آتے ہیں جو ان کے مرید  
 ہیں اور ان سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ کچھ اجباب ساون  
 کے بادلوں کی طرح چھوٹ گئے اور کچھ اللہ کو پیارے ہو گئے جو  
 باقی رہ گئے وہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ہو لیے۔ اب شاہ جی  
 اور بڑھاپے کا یا رانہ رہ گیا ہے وہ بھی نہ جانے کب ٹوٹ جائے گا



## فالج کا دوسرا بڑا حملہ

۲ جنوری ۱۹۶۱ء کو فالج کا دوسرا بڑا حملہ ہوا، تو اس سے رہی سہی صحت بھی برباد ہو گئی۔ پیشتر کبھی کبھار اگر معالج کے مطالب تک چلے بھی جاتے تھے، تو اس جتنے نے وہ ہمت بھی پھین لی۔ اب تو گھر کی چار دیواری کے سوا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، معالج خود مریض کے ہاں آتے، ان دنوں امیر نثر لیت نے حکیم عبداللہ خان سے کہا:

”آپ کے زیر علاج اس لیے نہیں ہوں کہ آپ بڑے قابل حکیم ہیں، بلکہ اس لیے ہوں کہ آپ بہت نیک آدمی ہیں۔ شاید آپ کی نیکی کی وجہ سے میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔“

ایسا لگتا ہے کہ امیر نثر لیت اس قلم کے بعد اپنی روحانیت سے محسوس کر چکے تھے کہ آخری وقت آن پہنچا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے ہر تیار دار سے کچھ شجیبہ سی گفت گو کرتے، مولانا لینین نے ایک دفعہ کہا: ”شاہ جی! بیماری کے دنوں میں بھی چہرے کی سُرخی نہیں گئی، ہلکی سی سگر اہٹ سے فرمایا:

”یہ سُرخی تو میرے مرنے کے بعد بھی رہے گی۔ یہ ہمارے خاندان

کی ریبتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی عارض کی سُرخی نہیں جاتی۔“

## فالج کا آخری حملہ

۶ اپریل ۱۹۶۱ء کو فالج کا تیسرا شدید حملہ ہوا، جس کا اثر زبان اور گلے پر پڑا۔



اس حملے نے تمام احباب کو پریشان کر دیا۔ اکثر فہروں میں تو امیر شریعت کی موت کی خبر بھی مشہور ہو گئی۔ اخبارات کے دفاتر سے ٹیلی فون اور برقی پیغامات کے ذریعے اس خبر کی تحقیق اور دریافت ہونے لگی۔ لیکن چند گھنٹوں کے بعد طبیعت نے ذرا سنبھالا لیا تو احباب کو ثیریت کی اطلاع دی گئی۔ بسکن اس حملے سے امیر شریعت کی زبان گفت گو سے عاری ہو گئی، گلابند ہو چکا تھا، بڑی مشکل سے آواز سمجھ میں آتی تھی، وہ بھی کان منہ کے سامنے لگانے پر انہیں دنوں لاہور سے دوسرے احباب کے علاوہ شیخ حسام الدین بیار پرسی کے لیے ملتان آئے تو امیر شریعت نے شیخ صاحب کے کان میں کہا۔

”میری زندگی میں مجھے اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ عطاء اللہ فیہ بان بھی تیری نہیں میری ہے، میں جب چاہوں، اسے چھین بھی سکتا ہوں۔“

## ماہنامہ ”تبصرہ“ کا بخاری نمبر

امیر شریعت کے اس شدید حملے کے باعث جہاں ان سے سیاسی اور مذہبی اختلافات رکھنے والوں کو پریشانی ہوئی، وہاں ملک کے اخبارات نے بھی نوٹ لکھے اور امیر شریعت کی قومی اور ملی خدمات کے پیش نظر حکومت پاکستان کو ان کی تیمارداری کی طرف متوجہ کیا۔ اس ضمن میں جون ۱۹۶۱ء میں، ماہنامہ ”تبصرہ“ لاہور نے اپنا بخاری نمبر نکالا، جس میں یو تصغیر کے تمام اہل قلم نے امیر شریعت کو نظم و نثر کے ذریعے سراج تحسین ادا کیا، جن میں



مولانا غلام رسول قہر، دیوان سنگھ مفتون، مولانا نصر اللہ خاں عزیز، احسان دانش،  
 علامہ لطیف النور، احمد ندیم قاسمی، قاری محمد طیب، مہتمم دارالعلوم دیوبند، حافظ علی بہادر  
 (مبئی) ان کے علاوہ اس عظیم نمبر کے لیے آندھرا پردیش (بھارت) کے گورنر لالہ  
 نسیم سین سچر کا خط بھی قابل مطالعہ ہے :

راج بنوں - حیدرآباد، ۹ اپریل ۱۹۶۱ء

پیارے نثری غلام نبی صاحب جانتا جی آداب عرض،

آپ کا گرامی نامہ ملا، یاد آوری کا شکریہ !

آپ نے شکوہ کیا ہے کہ میں نے آپ کے پہلے خط کا جواب نہیں دیا۔  
 لیکن مجھے تو آپ کا اور کوئی خط ملا ہی نہیں۔ صرف زیر جواب خط ہی  
 مجھ تک پہنچا ہے، اور اب شاید آپ کے خاص نمبر کے لیے میرا  
 پیغام بعد از وقت ہوگا۔

جہاں تک سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا تعلق ہے، وہ ان

پندرہ خوف شخصیتوں میں سے ہیں، جن کے لیے میرا دل بے پناہ

احترام کے جذبات سے معمور رہا ہے۔

میں جب ان سے پہلی بار متعارف ہوا تھا تو میرا تڑپتا

کہ شاہ جی شمع حریت کے سرفروش پروانے اور جدوجہد آزادی کے

جانتا سپاہی ہیں۔ جرأت، ذہانت اور تبحر علمی کے ساتھ ساتھ خدائے

انہیں فصاحت و بلاغت کے تلیاب جوہر سے بھی نوازا ہے۔

جب ہم ان کی تقاریر سن کر نئے تھے تو ہمدردی و ملی آرزو ہوتی



کہ شاہ صاحب موتی بکھیر رہے ہیں اور ہم قلب و نظر کو اُن سے منور  
 کرتے ہیں۔ وہ سامعین کو مسحور کرنا جانتے تھے، کوئی نہیں کہہ سکتا تھا  
 کہ اُن کی تقریر کب ختم ہو۔ کیونکہ نہ تو شاہ صاحب کے ہاں متنوع  
 مضامین کی کمی ہوتی اور نہ اُن کی جسمانی تھکاوٹ و شہری سلسلہ تقریر میں  
 حائل ہوتی۔ شاہ جی جیسے بہادر انسان جو انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے  
 حامل ہیں، ہمارے دلی احترام کے مستحق ہیں۔

میں صدقِ دل سے دعا گو ہوں کہ خدا شاہ جی کو جو بقیہ نا ایک  
 ناقابلِ تسخیر شخصیت کے مالک ہیں، صحتِ کاملہ عطا فرمائے، اور تاویہ  
 سلامت رکھے کہ ایسے نادر روزگار لوگ بار بار پیدا نہیں ہوتے۔

آپ کا مخلص : بھیم سین سپر

نیشنل پبلسٹیسیٹل

دستِ فطرت انسان کو جب عقلِ کامل سے نوازا کر کارگاہِ عالم میں چھوڑتا ہے  
 تو آسمانی سے زمین تک کی ہر شے اُس کے قدموں میں ہوتی ہے، پھر کبھی تو انا ہو کر  
 انسان ناتوانوں کی بے بسی کا تماشا کرتا ہے اور کبھی خود اپنے زوال کی کہانی گلیوں کے  
 سڑوں پر بیان کرتا پھرتا ہے، یہی قانونِ فطرت ہے۔ عروج و زوال کی اسی نشان کا  
 مصنف انسان خود ہی ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ تو انا تھے، جوانی اور صحت اُن کی بلائیں لیتی۔ گلے کی  
 حلاوت، زبان کا طرزِ تکلم اُن کے غلام رہے۔ جب وہ سلطنت کے ظلم و جور کی



دھجیاں بکھیرنے اور بُغاوت کا علم لے کر پہاڑوں کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دیتے، تو وہ پانی پانی ہو کر اُن کے ساتھ بہہ نکلتے۔ سمندروں کو آواز دیتے تو اُن کی گہرائیاں اُبھر کر سامنے آجاتیں۔ رات کی سیاہی اور دن کے اُجالے انہیں اپنے جلو میں لے کر چلتے۔ جس آواز کی ہیبت سے ایوانِ برطانیہ لرز جایا کرتے تھے، جب اُس کا کام ختم ہو گیا اور اس کے سورج کی پرچھائیاں ڈھلنے لگیں تو فضا میں گنگنائیں،

دو بٹے سورج کو وقتِ شام دیکھ

حسنِ والے حسن کا انجام دیکھ

فالج کے اس حملے نے ملک بھر میں تشویش پیدا کر دی اور احباب نے فیصلہ کیا کہ امیرِ شریعت کو نشتر ہسپتال میں داخل کر دیا جائے، لیکن امیرِ شریعت کو جب اس فیصلہ کا پتہ چلا تو فرمایا:

”آپ لوگ مجھے فاسق اور قاجروں کے ہاتھوں میں

سوئپ رہے ہیں“

وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے، مگر اس کے باوجود مارچ کے آخری دنوں انہیں نشتر ہسپتال (ملتان) میں داخل کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے اپنی ذمہ داری کو پوری طرح نبھایا۔ انہیں دنوں صدرِ مملکت فیض مارشل محمد ایوب خان نے ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر عالمگیر کو ہدایت بھیجی، کہ

”حضرت شاہ صاحب کی صحت کا خیال کریں، اور اُن کے

علاج پر پوری ذمہ داری سے توجہ دیں۔ اگر پاکستان کے باہر سے

بھی کسی معالج کی یا دوا کی ضرورت محسوس ہو، تو فوراً اور آمد کریں،



نیز اس کا بل میرے نام گورنمنٹ ہاؤس بھیج دیں۔“

امیر شریعتؒ کے دوسرے بڑے لڑکے سید عطار المحسن کے علاوہ مولانا  
ذہین احمد خان (یہ مولانا گل شیر کے قریبی عزیز ہیں) اور ایک رضا کار عتلام محمد  
دیکھ بھالی کے لیے ان دنوں ہسپتال میں رہے۔ یہاں ہر روز مغربی پاکستان سے  
آنے والے تیمار داروں کا ہجوم رہتا۔

بیماری کے دنوں امیر شریعتؒ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی ہمیشہ کھڑی رکھتے۔  
بعض دوستوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا :

”میں نے تمام عمر توجید پر وعظ کیا ہے، اور عمر کے آخری حصے میں  
بھی اس تصور کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔“

ہسپتال میں امیر شریعتؒ کی دیکھ بھالی کے انچارج ڈاکٹر بشیر احمد نے ایک  
دن ایسا ٹیکہ لگا دیا جس کے باعث نبضیں ڈوبنے لگیں، دل بلٹھنے لگا، بڑھتے بڑھتے  
یہ تکلیف اس حد تک بڑھی کہ امیر شریعتؒ کو اپنی موت کا گمان ہونے لگا، اور انہوں نے  
اپنے خادم مولانا ذہین احمد خان سے فرمایا ،

”اس ٹیکے سے میرا کام ہو چکا ہے، لہذا آپ گواہ رہیں۔“

دیہ کہہ کر آپ نے تین دفعہ کلمہ شہادت، تین دفعہ ”لائی بعدی“ کی  
دریث پڑھی، اور اس کا ترجمہ کیا، نیز فرمایا، تمام دوستوں سے میرا  
سلام کہنا اور کہنا کہ دین کا کام بہر حال کرتے رہیں۔“

یہ تکلیف نماز عصر سے شروع ہو کر ساری رات رہی، لیکن ہسپتال کے انچارج کو اس  
واقعہ کی اطلاع رات ایک بجے دی گئی، جیسے ہی انہوں نے آکر امیر شریعتؒ کی



حالت دیکھی کہ چہرے کی رنگت سیاہ پڑ چکی ہے اور پاؤں پرورم آگیا ہے تو انہوں نے زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا، اور غصے میں کہا جب یہ حالت تھی تو مجھے کیوں اطلاع نہ دی۔ اس پر دونوں ڈاکٹروں کے درمیان انگریزی میں کافی دیر تلخ کلامی مہی، جس کا مفہوم یہ تھا کہ امیر شریعت کو یہ ٹیکہ کیوں لگایا گیا؟ آخر رات اڑھائی بجے دوسرا ٹیکہ لگایا تو صبح ہونے تک طبیعت سنبھلی۔

کچھ دنوں بعد ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ شاہ جی تھوڑی دیر کے لیے اپنے کمرے سے باہر تفریح کیا کریں، اس ہدایت پر بڑی مشکل سے آمادہ ہوئے۔ حالانکہ چل نہیں سکتے تھے، لیکن جیسے ہی صحن میں ٹہلنے لگے، گردن اُونچی کر لی اور چھاتی تان کر نہ مایا:

”عمر بھر دشمنوں کے سامنے سر اُونچا کر کے چلتا رہا ہوں لیکن آج اگر دشمنوں کو پتہ چل گیا کہ میں بیماری کے باعث کمزور ہو گیا ہوں، تو وہ خوش ہوں گے، اس لیے نقاہرت کے باوجود میں چھاتی تان کر کھنا چاہتا ہوں تاکہ دشمن سمجھے کہ بخدا ہی ابھی زندہ ہے۔“

ہسپتال میں بعض دفعہ کافی دیر تک بیہوشی رہتی، لیکن تیمارداروں کو اور خادموں کو تاکید تھی کہ ”مجھے نماز کا وقت اور رخ بتا دیا کریں“

ذیابیطس کی وجہ سے کثرت بول کا عارضہ تھا، مگر اس کے باوجود وضو کر کے نماز پڑھتے رہے یا پھر کبھی کبھار تمیم کر لیتے، مگر نماز نہیں چھوڑی، البتہ خادموں کو کہتے بتانی پڑتی تھیں:

ہسپتال میں مولانا یسین نے سوال کیا: شاہ جی! حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی



عمر اس وقت اسی نوے سال کے قریب ہے اور حضرت لاہوری کی عمر بھی آپ سے زیادہ ہے لیکن آپ بہت جلد کمزور ہو گئے ہیں۔ جواب میں فرمایا :  
 "بھائی! ان لوگوں کے گھر آباد ہیں اور میں اپنا گھر  
 اتر اہوا دیکھ رہا ہوں۔ یہی صدمہ مجھے موت کے قریب کر رہا ہے"

اپریل کے آخری دن تھے کہ سید سبط حسن (سابق ایڈیٹر سہفت روزہ "میل و نہار"

لاہور) بمعہ چند اصحاب کے عیادت کے لیے ہسپتال آئے۔ تعارف کے بعد ایک  
 نوجوان نے کہا۔ "شاہ جی! میرا نام ذوالفقار علی ہے اور میں پطرس بخاری کا بھائی  
 ہوں۔" امیر شریعت یہ نام سنتے ہی بے اختیار رونے لگے، اور اس قدر روئے کہ  
 تمام محفل ان کے ساتھ رونے لگ پڑی۔ سید سبط حسن کی بیوی نے اپنا تعارف کرایا  
 تو وہ بھی امیر شریعت کے کسی دوست کی لڑکی نکلی۔ اس پر وہ سچی بے اختیار امیر شریعت  
 سے لپٹ گئی۔ آخر محفل شعر و شاعری میں منتقل ہو گئی۔

ماہِ چ کے کچھ دن اور ہی کا ابتدائی حصہ گزار کر امیر شریعت ہسپتال سے  
 واپس گھر آ گئے، لیکن بیماری سے کوئی افادہ نہ ہوا۔

## وفا کے وقت

ہسپتال سے واپسی کے بعد ملک بھر میں بالخصوص پھیل گئی۔ دلوں میں  
 کئی قسم کے دُسو سے اُبھرے۔ برصغیر کا عظیم خطیب، کروڑوں انسانوں کے  
 دلوں کا حکمران زندگی کے اس موڑ پر آن پہنچا، جہاں زندگی مستعار ملتی ہے۔ بسکھی  
 موت سے کوئی سودا نہیں کیا جاسکتا۔ اس مقام پر پاکستان کے اخبارات نے



برسرِ بھیت کی صحت پر عوام اور حکومت دونوں کو متوجہ کیا۔ مساجد میں دعائیں مانگی گئیں  
 عادت کے مسلمانوں نے بھی امیر شریعت کی صحت کے لیے دعائیں مانگیں، ان  
 لوں کے اخبارات کے اقتباس حسبِ ذیل ہیں۔

”بہرِ نوا استخلاصِ وطن کے عظیم کارنامے کی انجام دہی سے  
 عہدہ برآہو نے والوں میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک  
 ممتاز مقام کے حامل خطیب ہیں۔ ان کی سیاست اور ان کے کام  
 میں غلطیوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اور پھر انبیاء کے سوا  
 کون ہے جو غلطیوں سے متبراہو؟ لیکن شاہ جی کی جرات، قربانی،  
 ایثار اور اسلام دوستی سے انکار ممکن نہیں، اور ان کی ساحرانہ  
 خطابت نے باطل کے خلاف لڑنے کا جو اولہ ملتِ اسلامیہ میں  
 پیدا کیا، اس کی قدر افزائی شرطِ نجات کے مترادف ہے۔“

برصغیر کے یہ خطیب ایک عرصے سے علیل ہیں، مرض بھی ایسا  
 ہے جو اعضاء ہی کو شل نہیں کرتا، اعصاب، ذہن اور دل کو بھی داؤن  
 کر سکتا ہے۔ پچھلے دنوں سے مرض میں شدید اضافہ ہوا ہے، ہم  
 سب کو اپنے خالقِ حقیقی سے اس عظیم انسان کی زندگی کی بھیک  
 مانگنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ انہیں عمرِ خضر عطا فرمائے۔“

ہفت روزہ ”المنیر“ لائل پور

”یہ خبر کئی ماہ سے عوامی حلقوں کی پریشانی کا موجب بنی

ہوتی ہے کہ امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب



بخاری سحت بیمار ہیں۔ ان کی زبان میں جس کی سحر طرازی کی کبھی  
سے زمانے میں دھوم تھی، لکنٹ پیدا ہو چکی ہے، اور ایسا لگتا ہے  
جیسے خدا نخواستہ چراغ آخر شب میں چند لمحوں کا ہمان ہو۔

حضرت شاہ صاحب کے سیاسی نظریات سے اختلاف  
کیا جاسکتا ہے، لیکن اتنی بات تو ان کے دشمن بھی تسلیم کرنے پر  
مجبور ہیں کہ ان کی ذات جدوجہد آزادی کی تاریخ کا ایک روشن  
باب ہے، انہوں نے اپنے طرز فکر کے مطابق ملک کو آزاد  
کرانے کے لیے ایک عمر قید و بند میں بسر کی، اور اس راستے میں ہر  
مضہبت کا خذہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ قادیانیت کے خلاف  
ان کا جہاد بالسان تو بالخصوص اُمت پر ایک عظیم احسان ہے۔  
ایسے لوگ روز بروز پیدا نہیں ہوتے۔ پاکستانی قوم کا فرض ہے کہ  
وہ بیماری کے زمانے میں اس بطل جلیل کے علاج معالجے کیلئے  
ہر طرح کے ذرائع اور وسائل فراہم کرے، بعد میں کہتے افسوس  
کہنے سے کیا فائدہ؟ اب وقت ہے کہ حکومت اور شاہ جی کے  
معتقدین اور دوسرے عوامی حلقے اپنا فرض ادا کریں۔  
ہمارے ساتھ بعد از پیرارہ ہے سچا محفل میں  
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لئے۔“

روزنامہ "امروز" لاہور

”امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی علالت کے تازہ



حالات سے جذبات کی دنیا میں ایک طلسم برپا کر دیا ہے، ان پر  
 فالج کا ایسا حملہ ہوا کہ ان کی قوت گویائی متاثر ہو چکی ہے۔ معایہ خیال ہوتا ہے  
 کہ اس سٹیبل ہزار داستان کی بیروت تو سیاہی کشمکش نے پہلے ہی چھپیں  
 لی تھی، با دوسرے الفاظ میں مفلوج کر دی تھی۔

انڈیا پاکستان کے دو بہترین خطیب ہیں، کاش انہذا گزشتہ پھر ان کی  
 تقریر ہو، اور اس میں کبھی تازہ و قطار روئیں اور کبھی بے اختیار ہنسیں۔  
 قرآن میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے۔ اے اللہ! میری  
 زبان کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ لیں۔

معلوم نہیں حضرت شاہ صاحب نے کبھی یہ دعا مانگی تھی یا  
 نہیں۔ مگر اللہ نے ان کی زبان میں یہ طاقت ضرور عطا فرمائی تھی کہ  
 دشمنوں کا مجمع بھی تقریریں کر دے اور ہو جاتا تھا۔ پاکستان و ہند کی آزادی کے  
 لیے ان کے طوفانِ یاد و دل سے اور ان کی خطبہاں نہ فتوحاتِ تاریخ کے  
 عنقادات میں زہریں حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔

کلام میں عیب سہرا، جہاں چاہتے دلا بیٹے، جہاں چاہتے  
 ہنسنا دیتے۔ بسا اوقات ان کی تقریر کا سلسلہ مؤذن کے نعرہ تکبیر  
 پر ہی ختم ہوتا تھا۔ لیکن مجال ہے کہ ہزار ہا حاضرین میں سے کوئی اٹھ  
 جائے یا اونگھ جائے۔

ایسا عدیم المناہی خطیب پاکستان میں خاموش زندگی گزار رہا  
 ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے ہم جیسے عقیدتمندوں اور رفیقوں کیلئے



یہی حقیقت کافی دردناک ہے کہ ان کے مرض میں کوئی افیو  
 نہیں ہوا، اور وہ ہسپتال سے باہر آئے ہیں۔

اگر اہم دلی کی گھرائیوں سے ڈعا مانگیں کہ اسے پروردگار کا  
 اپنے جیب کے صندوق میں حضرت شاہ صاحب کو صحت عطا  
 فرما، اور ہماری یہ قسم پوری ہو کر دے کہ ایک بار پھر ان کی منہایت  
 سے ملت میں نئی زندگی آئے۔

روزنامہ "انجم" کراچی

### پچھرا لہور میں

حالات سے پریشان ہو کر جون کے ابتدائی ہفتے میں امیر ثر لیت کے پچھرا  
 لہور میں لایا گیا۔ اب کے وہ مالکان سلطان فونڈر می کے ہاں ہوں ٹاؤن بلاک  
 بی کوٹھی نمبر 4 میں ٹھہرائے گئے۔ لہور میں ان کے علاج کے لیے ڈاکٹر  
 الگ بورڈ تجویز ہوئے۔ مینیکل بورڈ ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ، ڈاکٹر مجید یوسف پر  
 مشتمل تھا، جبکہ اطباء کے بورڈ میں سب ذیل لوگ شامل تھے، حکیم محمد حسن شترشی،  
 حکیم نیر واسطی، حکیم نبی احمد سویدار پونا حکیم اجمل نماں، حکیم شیدائی اور حکیم محمد اسماعیل  
 بگڑالواں والے۔

یہ سب معالج مشورے سے علاج کرتے رہے، ان دنوں امیر ثر لیت کی  
 بیمار داری کے لیے ان کا لڑکا سید عطاء الحسن پاس رہا، کبھی کبھار امیر ثر لیت کے  
 حرم محمد نغم اور دوسرے بچے بھی آتے رہے۔



امیر شریعتؒ ۱۹۲۱ء میں پہلی دفعہ لاہور انجانے عالم دین کی حیثیت سے آئے تھے اور ۱۹۴۱ء میں جب آخری بار لاہور لائے گئے تو سارا لاہور ان کو دیکھنے آٹا آیا، اور کیوں نہ آتا جبکہ امیر شریعتؒ نے لاہور کے سامنے اپنا دل اٹک کر رکھ دیا تھا۔ جوانی کی بہادری سے موت کی پرچھائیں تک وہ انہیں کے لیے سارا کچھ کہتے سنتے رہے۔ اہل لاہور نے بھی امیر شریعتؒ سے محبت و رفاقت اور عداوت کرنے میں کوئی کسر اٹھانا نہیں رکھی تھی۔ بنا بریں امیر شریعتؒ اہل لاہور کو کوڑ کہا کرتے تھے۔

ان دنوں ماڈل ٹاؤن کی اس کوشی میں عوام کے علاوہ سیاسی رہنماؤں، صحافیوں، ادیبوں، شاعروں اور کاروباری لوگوں کی آمد آمد سے شب و روز ایک پھیر لگی رہتی۔ امیر شریعتؒ سب کو پہچانتے تھے، لیکن بات نہیں کر سکتے تھے، لوگ آتے روکنا چاہ پائی کے نزدیک کھڑے ہو کر زیارت کرتے اور چلے جاتے، فارسی کے مشہور شاعر علامہ محمد حسین عسکریؒ بھی انہیں دنوں امیر شریعتؒ کو ملنے آئے مگر حالات، دلچسپ کر رہے اختیار کہہ اٹھتے تھے

برق و رعد آسودہ بستر شدہ

مشعل جو آلہ سناکتر شدہ

نماز

ان حالات میں بھی نماز سے غافل نہیں رہتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ان پرخاص نوازش تھی۔ حالانکہ بول نہیں سکتے تھے، لیکن عین نماز کے وقت اگر کوئی اس پاس



نہ بھی ہوتا تو کسی چیز سے زمین پر کھڑکا کر دیتے تھے۔ اس آواز سے اہل خانہ فوراً  
حاضر ہوتے تو امیر شریعت ہاتھ کے اشارے سے اسے انہیں نماز کے لیے کہتے، اور  
نماز باجماعت ہوتی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ نماز کے دوران ان پر ہوشی طاری ہو جاتی  
اور ان کے صاحبزادے عطاء الحسن انہیں دوبارہ نماز ٹوٹانے کو کہتے۔

انہیں دنوں کا ذکر ہے کہ سرگودھا کے مفتی محمد شفیع امیر شریعت سے ملنے  
آئے، ان کو بھٹی کے مالک مولانا محمد اکرم (مالک سلطان فونڈاری) نے مفتی صاحب سے  
گزارش کی۔

”حضرت ابیہ فرمایا کہ شاہ جی اس حالت میں نماز پڑھتے ہیں اور  
اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ نماز میں بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ غصہ زیم  
عطاء الحسن شاہ جی پر زور دیتے ہیں کہ وہ اپنی نماز ٹوٹائیں،“  
اس مفتی صاحب نے فرمایا:

”نہ میرے عزیز! شاہ جی کی بے ہوشی کی نمازیں ہماری

ہوشمندی کی نمازوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں“

اس کے بعد پھر بھی انہیں نماز ٹوٹانے کو نہیں کہا گیا۔

مولانا پیر محمد جالندھری نے آٹے تو دوران گفتگو ان کے منہ سے مولانا

مفتی محمد حسن کی موت کی خبر نکل گئی، اور یہ بات امیر شریعت نے بھی سنی لی، حالانکہ

وہ کافی فاصلے پر بیٹھ بایں کر رہے تھے۔ ان کو اشارے سے بتایا اور کاغذ

پنسل مانگی، اس پر لکھا: ”یہ میرے آسنا“ اور پھر سب سے اٹھیا اور دسے ٹاکس

پڑھے، اور کافی دیر تک روکتے رہے۔



اس طرح کے لیل و نہار میں قریباً ڈیڑھ ماہ گزار کر امیر شریعت کے حرم  
 حرم کے ارشاد پر امیر شریعت کو جولائی کے آخری دنوں میں واپس لایا گیا، اول  
 اکثر کرنل ضیاء اللہ کی تجویز کردہ ادویات کا استعمال ہوتا رہا۔ لیکن مرض مزید  
 سے قدر غالب آچکا تھا کہ ڈاکٹروں اور حکماء کے تمام نسخے بیکار ہو گئے۔ اس  
 روح سے عقل انسانی جب اپنی رائے پر بات کھا چکی تو اب قدرت کے فیصلے کا  
 نظارہ باقی تھا۔

ماضی کی پچاس سالہ تاریخ کا معمار، افواج آزادی وطن کا سپہ سالار،  
 اس کی گھن گرج میں شیروں کا سا وقار، گھنار میں بجلی کا سا کردار، چلن میں پہاڑوں  
 کی بندھی، مقصدوں میں سیاروں کا جلو اور جذبات میں سمندروں کے طوفان  
 لے کر سلطنتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانے والا آج چار پائی پر بے حس و  
 نرکت پڑے اپنے خالق کے فیصلے کا منتظر ہے۔

## انتقال

لاہور سے ملتان پہنچنے کے پچیس روز بعد ۲۱ اگست رات اڑھائی بجے  
 اچانک طبیعت خراب ہو گئی اور سانس اکھڑنے لگی، بچی شروع ہو گئی، گھس میں  
 پریشانی بڑھی اور موت کے سائے ناچنے لگے۔ یہی منجوس خیر نسیم صبح گواہی ملتان  
 بھر میں لے آئی کہ امیر شریعت انتقال کر گئے۔ تمام شہر دیدار کو ان کے گھر آن  
 پہنچا، لیکن ہنوز گل و بلبل کا رشتہ قائم تھا، اور امیر شریعت آخری سانس گن  
 رہے تھے حکیم عطاء اللہ خان اور ان کے بیٹے بھی اپنی آخری پونجی آزمانے کو



آموچو وہ ہوئے، لیکن وہ بھی اپنے آنسوؤں میں الجھ کے رہ گئے۔ امیر شریعت  
 اس وقت بے ہوشی کے عالم میں تھے، اور سانس رک رک کر آ رہی تھی  
 سورج غم آلود چہرے سے تمام دن اس ماتم میں شریک رہا، اور اپنے ڈھلے  
 سائے کو گل کے ماتم میں شرکت کے لیے چھوڑ کر مغرب کی چادر میں بجا چھپا بیٹھا  
 نئے لالہ دگل کا سا لباس پہن لیا، موذن مغرب کی اذان کے لیے اٹھا کہ چھوڑ  
 بچپن منٹ پر تیرھنیر کا عظیم خطیب زندگی کے قریباً بہتر برس گزار کر اس جہانِ فنا  
 سے رخصت ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، سے

ادا کر کے فرض اپنی خدمات کا سحر دم وہ جاگا ہوا رات کا  
 ابد کے نگر کو روانہ ہوا مکمل سفر کا فائدہ ہوا  
 (اعلام)

## موت کی خبر

ریڈیو پاکستان نے یہ خبر رات پونے آٹھ بجے نشر کی۔ لیکن جہاں دل کی  
 نازیں پیوست تھیں، وہاں صبح سے اضطراب تھا، لاسکی کی تصدیق نے دل کی  
 دھڑکنوں کی رفتار مزید تیز کر دی۔ عشاق ہجوم در ہجوم محبوب کی آخری دید کو  
 آنسوؤں کا نذرانہ لے کر گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ کراچی سے پشاور تک  
 کے لوگ قصبات سے دیہات تک کے عوام جنازہ سے میں شرکت کے لئے آئے

## جنازہ

۲۲ اگست نمازِ ظہر کے بعد امیر شریعت کا جنازہ اٹھانے کا اعلان



اُس دن کا آفتاب اپنے ساتھ تاریخ کا ایسا المیہ لے کر طلوع ہوا، کہ نہ صرف سلطنتیں ہی اس کے غم میں ڈوب گئیں، بلکہ جراثیم انسانی اذیتوں کا ایوانی کا چراغ بھی ہمیشہ کے لیے بج ہو گیا۔

عظیم خلافت کا فرمانروا اپنی تمام رعایاں پیٹ کر جہان بے مروت سے رُخ موڑ چکا تھا۔ وقت کے نشیب و فراز جس کے تڑموں کی چاپ کے منتظر رہتے، آج اُس کی رُوح فریب کھڑی اپنے مہالوں کی منتظر تھی۔ دھوپ کے سائے مکانوں کی دیواروں سے اتر کر نگلی اور بازاروں میں مہالوں کو ادیکھتے بھٹال میں مصروف ہو گئے۔

کراچی سے پشاور تک کے لوگوں کو ریل گاڑیاں اور ہوائی جہاز جہاز سے یہاں شرکت کے لیے تیز رفتاری سے ملنا پہنچا رہے تھے۔ دیہاتیوں کی ٹولیاں اپنے مرشد کے جہاز سے کے لیے پہنچ رہی تھیں۔ تاکے، لادیاں، سائیکل سبھی مصروف تھے، کہ ان پر انسانوں کا گلہ نہ رہ جائے کہ وہ وقت کے عظیم انسان کی آخری رسم میں شامل نہ ہو سکے۔

نماز ٹہر کے بعد جب اس مردِ درویش کا جنازہ محلہ ٹبی شہر خاں سے اٹھا گیا، تو دو لاکھ انسانوں کا سمنہ اس کے گروٹھ ٹھیس مار رہا تھا۔ جنازہ کے ساتھ لمبے لمبے بالن باندھ دیے گئے، تاکہ کوئی ہاتھ اس سعادت سے محروم نہ رہ جائے، تاہم ہزاروں سوگواروں کو یہ شکایت تھی۔

جنازہ جیسے جیسے اپنی منزل کی طرف بڑھتا گیا، ہجوم درہجوم لوگ اس میں شامل ہوتے گئے، کپہری روڈ سے گزرتا ہوا یہ مانتی جلوس چار بجے کے قریب



ایمرن کالج کی گراؤنڈ میں پہنچا اور نماز جنازہ کی صفیں درست ہونے لگیں۔ تاریخ  
ماضی اپنی شہادت لے کر آن پہنچی۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی نماز جنازہ کے بعد اس کے دامن میں امیر شریعت  
رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ کا نوہرا واقعہ تھا۔ ورنہ اس سے پیشتر اس قدر مجرم  
کسی درویش کے جنازہ میں نہیں دیکھا گیا۔

نماز عصر سے ذرا پہلے حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ ان کے  
فرزند اکبر سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری نے پڑھائی۔

## آخری آرام گاہ

ملتان کو اس کے بڑھاپے سے اسے اپنی تاریخ کی یادداشتوں سے بھی محروم کر دیا  
ہے، ہاں اس قدر یاد پڑتا ہے کہ اس شہر کا تاریخی قلعہ جسے آج قاسم باغ کا نام دیا جا  
رہا ہے، صدیوں پیشتر راجہ داہرنے تعمیر کیا تھا، اور آج یہ قلعہ اہل ملتان کی عظیم تفریح گاہ  
ہے۔ دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے سے ہی جانتے ہیں کہ تاریخ کے اس  
بوسیدہ دامن پر کیا گزری اور کیا بیتی۔ کاش اگر قی ہوتی دیواروں کے منہ میں  
زبان ہوتی اور وہ چیخ چیخ کر اپنی بے بسی کا ماتم کرتیں، لیکن بے آسرا اور لاڈل  
سکارت اپنی بخت اپنے معاروں کے ساتھ ہی رخصت کر چکی ہے۔ گو اس کے  
سینے پر حضرت پیر ہاؤل الحق اور حضرت شاہ رکن عالم رحمۃ اللہ علیہ کے مزارات  
مرتبہ امتنان ہیں، مگر اس اندھیرنگری میں نیکی اپنا منہ چھپائے ایک طرف بیٹھ گئی  
تا کہ غلامتنگری کے اسباب چھپا کر نہ پڑیں زمانہ جناب محسوس نہ کرے۔



حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی آخری آرام گاہ کا سوال جب احباب کے سامنے آیا تو کشتہ ملتان مسٹری اسے قریشی نے اطلاع دی کہ اتا گورنر مغربی پاکستان نواب امیر محمد خان نے مجھے ہدایت کی ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی تدفین کے لیے جو جگہ طلب کی جائے، اس سے انکار نہ کریں، اس پر احباب کی رائے ٹھہری کہ حضرت امیر شریعت کی آخری آرام گاہ کے لیے قلعہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں اور اپنے اس فیصلے سے کشتہ ملتان کو آگاہ کر دیا گیا، اور انہوں نے ایک گھنٹے کے اندر متعلقہ کاغذات مکمل کر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ہاتھ بھیج دیئے۔ البتہ ایک شرط عائد کر دی کہ حضرت شاہ صاحب کے علاوہ دوسری کوئی قبر وہاں نہیں بنے گی۔ مگر جیسے ہی حضرت امیر شریعت کے حرم محترم کو اس کی اطلاع ہوئی، انہوں نے اس شرط کے علاوہ بھی امیر شریعت کو قلعہ میں دفن کرنے کی نصیحت کی، نیز کہا:

”جو شخص عمر بھر حکومت کے کسی اعزاز کا احسان مسترد

نہیں ہوا، اُسے حاکمیت کی اجازت سے حاصل کر وہ جب تک پر

دفن کرے اُس کی روح کو حدیث پہنچانا بہتر نہیں۔“

اس بنا پر نماز جنازہ سے فراغت کے بعد حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کا

جسدِ خاکی دولا کر سے زائد انسانوں کے کندھوں پر اپنی آخری آرام گاہ کی طرف

روانہ ہوا۔ چند قدموں کا اور فاصلہ طے کر کے بھاگدی قبرستان کے ابتدائی گوشے پر

امیو سہیل کمیٹی کے دیئے ہوئے وسیع خطہ اراضی کو امیر شریعت کا خانہ دانی قبرستان

قرار دے کر شوریج کی آخری کرنوں کے دیکھتے دیکھتے لاکھوں انسانوں کے



آنسوؤں سے بھگی ہوئی سینکڑوں من مٹی تلے لحد میں اُتر دیا گیا۔

محمدؐ کی سیرت کا پیتا مہر

خدا کے سند پیہ سٹھانا ہوا

بڑی منزلیں کر کے طے حسم کی

بڑی رہ چلتا چلتا ہوا

نہایت اہم سوچ میں کھو گیا

گھڑی دو گھڑی کے لیے سو گیا (عدم)

مغلی زمانہ واؤں کے زوال کے ساتھ ۱۶۵۹ء کو جب ہندوستان کے

تخت پر فرنگی عروج انگریٹیاں لینے لگا، اور آہستہ آہستہ یہ سورج وقت کے

تمام ستاروں کو بات دے کر اپنی چمک کے سنگھاسن پر آبیٹھا تو شیخ و برہمن

کی تسبیح کے تمام دانے ٹوٹ کر اُس کے قدموں میں آن کر سے۔ ہندوستان کا

تخت طاؤس اور کوہ نور میرے کی چمک دونوں غلامی کی زنجیر میں جکڑے گئے

یونین جیک کی آرائیں لال قلعے کی چھت پر چڑھ کر گنگا و بن کے پوتھیا بیوں میں

زہر گھولنے لگیں، مسجد کی آرائیں کلیساؤں کی آواز میں دب کر رہ گئیں۔ ایوان

فرنگی کا ایک ایک قانون حجازی قافلے کے نقش پاپرا پٹی نئی عمارت استوار

کرنے لگا تو ایوان کی ایک نگاہ اٹھی، جس نے خون جگر کی آمیزش سے اس قدر

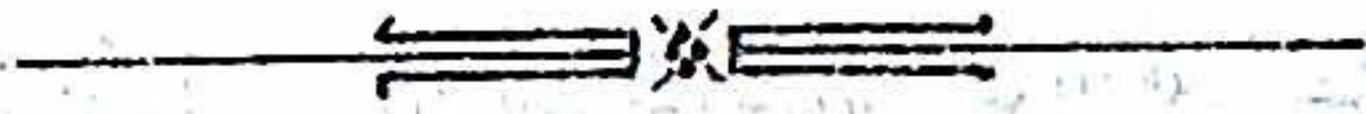
آنسو بہائے کہ شاہِ ہندوستان رو پڑا، اور یہ آنسو حضرت شاہ ولی اللہ کے آنسو

تھے، انہیں آنسوؤں سے پھر ۱۸۵۷ء کے کبھی محمود الحسن نے جنم لیا، اور

کبھی قاسم نانوتوی کی پیدائش ہوئی۔ عبید اللہ سندھی اور حسین احمد دہنی بھی اسی کوکھ کے



لعل محققہ محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان، مفتی کفایت اللہ،  
اور احمد سعید بھی اس قافلے میں شامل ہوئے گئے، تا آنکہ اس زنجیر کی آخری کڑی  
حضرت امیر شریعت (سید عطاء اللہ شاہ بخاری) رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ زنجیر ایک ایک  
کڑی سمیت ۲۱ اگست ۱۹۴۱ء شام چھ بج کر پچپن منٹ کو اپنی تاریخ تکمیل کر گئی۔  
خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را





# اخبارات

۲۲ اگست صبح کے اخبارات جب پاکستانی عوام کے ہاتھوں میں پہنچے تو ان کے عقوہ اولیٰ پر سیاہ حاشیے تھے۔ ملکی صحافت نے قافلہ ہائے حریت کے بہاؤ پیوستہ کو آئینہ خراج عقیدت پیش کیا اور ملک کے قلم کاروں نے امیر شریعت کی موت کو ملکی اور ملی نقصان قرار دے کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

## روزنامہ جنگ کے اچھے

"خوبیہ ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری رقی پاک و ہند کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ قوم ایک منظر ہر بنا سے محروم ہو گئی ہے، لیکن ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ انہوں نے قوم کو آزاد کرانے اور ملک کو ترقی کے منازل تک پہنچانے کے لیے ناکام کام کیا ہے، وہ دوسروں کے لیے مشعل ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔"

## روزنامہ "اعتماد" لاہور

"وہ شاعر اور خطیب اچھے گویا جس سے ہر لمحہ صدقہ نسیانہ آراوی کا ذکر گریباں آئے اور جو صلیب بڑھا سٹے لکھا۔ دنیا سے خطا سنت کہ اس پر ناز بیٹھا، اور اس پر ہر لمحہ صدقہ نسیانہ لکھا، وقت لے لیا، لیکن وہ صرف خطیب نہیں تھا، بلکہ شاعر، خطیب اور دانشور بھی تھا۔"



## روزنامہ "کوہستان" لاہور

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرنگی استبداد کے خلافت اُس وقت  
علم بغاوت بلند کیا تھا، جب سلطنتِ برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔  
اور آزادی کی خواہش ایک دیوانے کا خواب سمجھی جاتی تھی۔"

ہمیں شاہ صاحب کے طریق کار سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن  
کوئی بھی اُن کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتا۔ آنے والی نسلیں جب برصغیر پاک و  
ہند کی آزادی کی تاریخ کے پکھرے ہوئے اوراق اکٹھا کریں گی تو اُس وقت سید  
عطاء اللہ شاہ بخاری کو فراموش نہیں کر سکیں گی۔"

## روزنامہ "وفاق" لائپزور

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات ایک روایات کے انجام کا اعلان ہے  
وہ روایات کی پیداوار تھے، جس میں اعجازِ گرمی آواز کے ساتھ آدمی اور آدمی کے  
درمیان رشتہ گردانا جاتا تھا، انسانی رشتے کے اس تصور نے خطابت کو جنم دیا۔  
جسے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ  
بخاری ہندی مسلمانوں کے ایک پھر پور دور میں پیدا ہوئے تھے۔ اس دور میں  
فد اور رہنماؤں کے ہوتے ہوئے انہوں نے اس طرح ایک منفرد مقام پیدا کیا  
کہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو سیاسی زندگی سے مربوط کرنے کی کوشش کی اور خطابت کو  
طریقِ اظہار کے طور پر اپنایا، جو مسلمانوں کی مذہبی زندگی اور سیاسی زندگی دونوں  
میں ایک مقبول اور مؤثر طریقِ اظہار کا مرتبہ رکھتی تھی۔"



## روزنامے "عوام" لائسپور

"سید عطار اللہ شاہ بخاری کی وفات ایک بڑا بلی حد منہ ہے۔ آج ہر پاکستانی کو غمگس ہو رہا ہے کہ شاہ جی کی وفات سے جو خطا پیدا ہو اسے، وہ کبھی پر نہیں ہو سکے گا۔"

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے  
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر

## ہفت روزہ "نیل و تہار" لاہور

"مردم جب یہ کہتے کہ میری تین چوتھائی زندگی ریل میں اور ایک چوتھائی جیل میں گزری، تو حقیقت بھی یہی ہوتی تھی، وہ محض ایک سیاسی رہنما نہ تھے، ایک مکمل شخصیت تھے۔ مجاہد بھی اور رند بھی، جس طرح لاکھوں کے مجمع میں گرجتے، اسی طرح اجاب کی محفل میں چہکتے۔ بذلہ سنجی اور خوش گفتاری سے ہر ایک کا دل مٹھی میں رکھتے۔ شعر و ادب کا مذاق نہایت پاکیزہ رکھتے تھے۔ محبت و مروت، اخلاص، ایثار، رواداری اور دوست داری کا پیکر تھے۔ اور یہ صفات اب نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔"

## ہفت روزہ "اقدام" لاہور

"سید عطار اللہ شاہ بخاری اردو اور پنجابی کے بے مثل خطیب تھے، انہوں نے اپنی فصاحت اور بلاغت، خطابت اور علم کلام کی تلوں کے دلانے انگریز



شاہی قلعے پر مرکز کیے تھے۔ انہیں اختلافات عقیدہ کے علاوہ احمدیوں (مرزاہوں) سے غیبیانی کد کی بڑی وجہ بنتی کہ بانی سلسلہ نے انگریزی سلطنت کو ابر رحمت قرار دے رکھا تھا۔ اس وجہ سے انگریزی استعمار اور احمدیت (مرزاہیت) دو ایسے نشانے تھے جن پر شاہ صاحب نے ہمیشہ گولہ باری جامی رکھی اور دونوں کو خاصہ نقصان پہنچایا۔“



### ہفت روزہ "قذیل" لاہور

”سید عطاء اللہ شاہ بخاری اپنے اللہ کو پیار سے ہو گئے۔ شاہ صاحب ایک سحر بیان، شعلہ فعال اور آزادی وطن کے ایک جرّار سپاہی تھے ان کی تمام زندگی قومی خدمت میں گزری، زندگی کے آخری ایام میں ان پر سلاج کے کئی حملے ہوئے، پھر ملتان میں وہ ایک ایسے بوسیدہ مکان میں رہائش پذیر تھے جو فالج کے مریض کی رہائش کے بالکل ناقابل تھا۔ شاہ صاحب انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ بڑے حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ صدر پاکستان کو جب ان کی آخری بیماری کا علم ہوا، تو انہوں نے ماہرین کو ہدایت کی، کہ وہ شاہ صاحب کے علاج میں خاص دلچسپی لیں لیکن سادھی کوششیں سب سے کار ثابت ہوئیں، اور آخری وقت ان پہنچا۔“



### ہفت روزہ "ایشیا" لاہور

”قیام پاکستان کے بعد شاہ صاحب عملاً سیاست سے کنارہ کش



ہو گئے تھے، لیکن ترکیب ختم نبوت کے دوران وہ پھر اسلام کی آبرو بچانے کے لیے میدان میں اتر آئے تھے۔ شاہ صاحب ایسی جامع کمالی شخصیتیں روز بروز پیدا نہیں ہوتیں۔ افسوس ہے کہ پڑانے باوہ کش ایک ایک کر کے اس مظلوم سستی سے اٹھتے جاتے ہیں، اور کوئی ان کی جگہ پر کرنے والا نظر نہیں آتا۔

### ○ ہفت روزہ "خدا م الدین" لاہور

"۲۱ اگست ۱۹۴۱ء کو یہ جگر خراش خبر سادے ملک نے انتہائی رنج و ملنق سے سنی کہ ملک کے بایہ ناز فرزند بطل جلیل، مجاہد اعظم، جنگ آزادی کے شہرولی رہنما، محبت و محبوب اولیاء اللہ، شمع ختم نبوت کا پروانہ، امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے۔  
انا للہ وانا الیہ راجعون"

### ○ ہفت روزہ "الاعتماد" لاہور

"شاہ صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے، ان کی موت تنہا ایک شخص کی موت نہیں، ایک عہد ایک دور اور ایک جماعت کی موت ہے، جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت مضطرب دل لے کر آئے تھے، اور یہ آواز برصغیر پاک و ہند اور عالم اسلام کے ہر سانحہ پر بے اختیار بلند ہوتی تھی۔"



## پنجاب یونیورسٹی کا اردو مجلہ "شور" ستمبر ۱۹۶۱ء

"راک دیا اور بچھا....."

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے  
 المیہ اس لیے کہ نئی نسل یہ تو جانتی ہے کہ برک سے برطانوی پارلیمنٹ میں کیا کچھ  
 کہا۔ انہیں یہ تو معلوم ہے کہ روم میں انطوائی نے کس طرح اپنی خطابت سے  
 بروٹس کے اقتدار کا تختہ اُٹا دیا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ شاہ صاحب نماز عشاء  
 کے بعد تقریر شروع کرنے تھے اور ہزاروں سامعین رات بھر بیٹھنے کے بعد  
 فجر کی نماز ان کی امامت میں پڑھا کرتے تھے۔ ان کی خطابت کا سحر راہ چلنے  
 لوگوں کو کھینچ کر جیسے گاہ میں لے آیا کرتا تھا۔

یہ آواز کا جادو اس لیے تاریخی حیثیت اختیار نہ کر سکا کہ انطوائی کی طرح  
 انہیں کوئی شیکسپیر نہ ملا، اور پھر اس لیے بھی کہ بعد میں ان کا سیاسی مسلک  
 انہیں مسلم لیگ سے دور لے گیا، اور وہ تحریک حصول پاکستان سے کٹ گئے۔  
 وہ غلط راستے پر بھٹے یا نہیں، مگر اس اختلاف کے باوجود ان کی دیانت، خلوص  
 اور بے غرضی شبہ سے بالاتر تھی۔

ان کی درویشی اہل بصیرت کے لیے آج بھی چراغِ راہ ہے۔"



پہشت روزہ "لاہور" لاہور۔ (مرزا بیٹ کا ترجمان)

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات دراصل سابق علاقہ پنجاب کے  
 رجوانی نصیحت کے ماہر ایسے شعلہ بیان مقرر کی وفات ہے جس کا



بدلی شاید ہی پیدا ہو سکے۔“



## ماہنامہ ”تبرہ“ لاہور

۱۱ اگست کی شام تاریخ عالم کا ایک مستقل عنوان بن گئی، جب حضرت امیر شریعت (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس جہان فانی کی بے اعتنائیوں سے اکتا کر عالم جاودانی کی راہ لی، اور اپنے گریبان کی پریشان و مہجیاں لیے اُس سفر پر چل دیے جہاں نہ کوئی موڑ آتا ہے اور نہ کوئی سنگ میل، اور نہ ہی کوئی منزل کی رہنمائی کرتا ہے۔ اُس راہ کی ہر شے اُن کے لیے اجنبی ہو گی۔ لیکن شاہ جی کسی کے لیے غیر نہیں ہوں گے، وہ اس جہان کی بھی ہر مخلوق کے لیے جاننے پہچاننے ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور حاضری سے پیشتر یقیناً وہ سب کا سلام لیں گے، اور حسرت مٹا بیٹا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دُوحِ پاک کو فرشتوں کے دوش پر عرضِ کوثر پر بلائیں گے، تاکہ زندگی کے طویل سفر کی تنگ کان سے دل کو تسکین ہو سکے۔ ایسے لوگوں سے ایسا ہی سلوک ہوتا ہے۔ **مَنْ يَجْزِيهِمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ** رہم ان کے اعمال کا بہت اچھا بدلہ دیں گے



## تشریح

سابق صدر پاکستان فیڈل مارشل محمد ایوب خان

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات حسرت آیات پر تجھے بے حد صدمہ ہوا ہے



شاہ صاحب جنگِ آزادی کے زبردست مجاہد تھے۔ قدرت نے آپ کو عسکر و  
فصاحت کی نعمتیں ودیعت کی تھیں۔ موت نے ہم سے ایک عظیم شخصیت چھین  
لی ہے۔“

### مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

یہ بڑی غمناک خبر ہے۔ آج مسلمان ایک بہت بڑی شخصیت سے عسکر و  
ہو گئے ہیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اپنے وقت کے بہت بڑے خطیب تھے، بلکہ  
یہ کہتا بالکل درست ہو گا کہ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ ان کی  
وفات نے ایک بہت بڑی جگہ خالی کر دی ہے۔“

### شیخ نسام الدین

”امیر شریعت کی خطابت نے چالیس برس تک نیم پر عظیم کے عوام کو باعزم  
اور مسلمانوں کو بالخصوص محرک کیا۔ ان کے اندر لڑنے اور ملک کو آزاد کرانے کا جذبہ  
پیدا کرنے میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ آج ان کی موت سے جو جگہ خالی ہوئی ہے  
وہ صدیوں تک پر نہیں ہو سکے گی۔“

### مولانا غلام رسول قہر

”سید عطاء اللہ شاہ بخاری اسلام اور آزادی کے عظیم مجاہد تھے۔ ان کی پوری زندگی  
پر خلوص قربانیوں کا ایک مرقع ہے کہ خود ان کے بلند مرتبت رفیقوں میں ان کی مثال  
شاید ہی ملے۔“



## احمد ندیم قاسمی

”سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے انتقالی کے ساتھ برصغیر پاک و ہند کی تحریک آزادی کا وہ زندگی افروز اور دلاویز باب ختم ہو گیا، جس میں آزادی کی خاطر جسمانی اور روحانی صعوبتیں سہہ عبادت کا درجہ اختیار کر گیا تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا وہ دگرگامی اس مقدس جدوجہد کا مجسم نشان تھا۔“



## مولانا داؤد غزنوی

”شاہ صاحب بہادر سپاہی، مخلص دوست اور انتھک ورکر تھے۔ ان کی موت سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے، اس کے پُر ہونے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“



## مولانا مظہر علی اظہر

”امیر شریعت نے اپنی زندگی میں ہی اس قاہر و جابر استعمار کا خاتمہ پاک و ہند کی سرزمین میں دیکھ لیا، جو اس کی جنگ آزادی کا مطمح نظر تھا۔ وہ جس عزم کو لے کر ۱۹۱۹ء میں میدان عمل میں آیا تھا، اس نے ۱۹۴۷ء میں بحکم الہی اسے کامیاب دیکھا۔ اللہ تعالیٰ اس بطل حریت کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔“



## مولانا اختر شام الحق

”مجھے شاہ صاحب کی وفات سے بچھری ہوئی ہے، ان کی موت برصغیر



پاک و ہند بیکہ سار سے عالم اسلام کے مسلمانوں کے لیے نقصانِ عظیم ہے۔

### مولانا مفتی محمد شفیع (کراچی)

"مولانا کی وفات سے علماء کی صف میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ عرصہ تک پُر نہ ہو سکے گا۔ ہم آپ کے غم میں پورے طور پر شریک ہیں۔"

### تاج الدین انصاری

"چالیس برس تک جس کی شعلہ زبانیوں نے مسلمانوں کو گرہ لایا، وہ آج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خانوش ہو گیا۔ یہ صرف ایک خطیب، ایک عالم، ایک دوست اور ایک بزرگ کی موت ہی نہیں، بلکہ ایک دور، ایک تاریخ کی موت ہے۔"

### سید مرتضیٰ علی شمسی

"مسلمانوں کے ہر مکتب خیالی کو حضرت شاہ صاحب کی موت نے رنج پہنچایا ہے، اور اس عظیم شخصیت کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ صدیوں تک پُر نہ ہو سکے گا۔"

### حافظ حبیب اللہ والس چیئرمین کراچی میونسپلٹی کا پوریشن

"مجھے شاہ صاحب کی وفات پر رولی دکھ ہوا ہے، مہتمم نے برطانوی استعمار کے خلاف جنگ آزادی میں زبردست حصہ لیا تھا۔"



## مولانا کوثر نیازی

”سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے سیاسی نظریات سے اختلاف ممکن ہے،  
لیکن اس بات سے کوئی شدید سے شدید مخالفت بھی انکار نہیں کر سکتا کہ برصغیر  
پاک و ہند کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ان کی زندگی ایک روشن باب کی حیثیت  
رکھتی ہے۔ ان کے جانے سے خطابت، سیاست اور مذہب کی دنیا میں ایک  
ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے، جسے قحط الرجال کے اس دور میں پر کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔“





# لباس، خوراک اور عادات

انسان، انسان سے راہِ حیات پر سفر کے دوران راستے میں ہی اختلاف نہیں کرتا، بلکہ اُس کی ہر ادا اور پسند جداگانہ ہے۔ اس چوراہے پر انسان اپنے ذوق کا تنہا مالک ہے۔ اسی طرح حضرت امیرِ شریعت (رحمۃ اللہ علیہ) نے بحیثیت انسان اپنی انفرادیت کو قائم رکھا۔

## لباس

اوانلی جوانی میں جب آپ بہار سے پنجاب آئے تو تنگ موری کی بہاری طرز کی شرعی شلوار، گھٹنوں تک گول آستین کا لمبا کرتہ، سبز رنگ کی پگڑی اور پاؤں میں سرخ بہاری قسم کی جوتی پہن رکھی تھی، پھر جیسے جیسے پنجابی طرز تمدن قبول کرتے گئے لباس میں تبدیلی آتی گئی، اسی طرح کبھی تہبند اور کبھی کھدر کی شلوار پہنتے۔ طالبِ علمی کے زمانے میں سر پنگی اور کھدر کا نیلے رنگ کا تہبند عام استعمال کرتے تھے۔ آگے چل کر کھلی آستین کا کھدر کا لمبا کرتہ عموماً شتری رنگ کا پہنتے تھے۔ اس نسبت سے ان کے زمانے کا کھدر اس قدر مقبول ہوا کہ بخاری کھدر کے نام سے مشہور ہو گیا۔ موسمِ سرما میں کھدر کا لمبا شیروانی ناکوٹ، اس پر کبھی کبھار کاپلی گرم عبا پہنتے، سر پر اناڑک طرز کی ٹوپی پہنتے۔

احرارِ کافرنسوں میں شمولیت کے وقت سیاہی مائل سرخ رنگ کا کرتہ پہنتے

جو احرار و رضا کاروں کا امتیازی نشان تھا۔



ابتداء (۱۹۲۱ء) میں ہاتھ میں موٹا ڈنڈا رکھتے تھے، اس نسبت سے ایک عرصے تک عوام میں "بجاری ڈنڈے والا" مشہور رہے، لیکن جب چودھری افضل حق رحمۃ اللہ علیہ نے پنجاب اسمبلی سے مسلمانوں کے لیے تلوار رکھنے کا عام قانون منظور کرایا تو امیر شریعت نے ڈنڈے کی بجائے تلوار پکڑ لی۔ ۱۹۳۱ء میں جب مجلس احرار نے اپنے رضاکاروں کے لیے کلہاڑی کو اپنا جماعتی نشان قرار دیا تو درم واپس سے کچھ عرصہ پیشتر تک ہاتھ میں کلہاڑی رکھتے رہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں بید کا کھونٹا بطور سہارا رکھے رہے۔

### خوراک :-

گھر پرستے تو عموماً چنے کی دال کو دوسرے کھانوں پر ترجیح دیتے، سفر کے دوران خوراک میزبان کی مرضی پر چھوڑ دیتے، سفارش پر کبھی کھانا نہیں کھوایا۔ ساوھے چاول زیادہ مرغوب تھے، لیکن درو گروہ کے باعث بہت کم استعمال کرتے تھے، بعض درہاتوں میں پیاز اور باسی روٹی "لیکن لسی" کے ساتھ بھی پسند کرتے، لیکن جسم ہلکی ہونے کے باعث لسی انہیں نقصان دہ تھی، اس لیے گا۔ تھے کے گوشت سے ہمیشہ اجتناب رہا۔ مرغن غذاؤں سے نفرت نہیں تھی، لیکن پسند نہیں کرتے تھے۔ میزبان کو اکثر اس پر ڈانٹ دیا کرتے تھے۔

جلسوں یا کانفرنسوں کے موقع پر صرف ایک کھانا پکانے کی تاکید کرتے۔ سبز لویوں میں شلجم، سرسوں کا ساگ اور گھیا شوق سے کھاتے۔ میٹھی اشیا خاص کر حلوہ مرغوب نہیں تھا۔ فرمایا کرتے، یہ مولویوں کے منہ پر سینٹ کا کام دیتا ہے یعنی حلوہ خور مولویوں کے منہ سے حق بات نہیں نکلی سکتی۔



پھلوں میں آم سے زیادہ مجبستا بنتی اور خرپوزہ بہت کم کھاتے تھے۔  
 امیر شریعت کی رائے میں خرپوزہ کے بکثرت استعمال سے گلے پر بڑا اثر پڑتا ہے، جب  
 کبھی آواز دُوب جاتی تو کچا امرود یا امرود کے پتے اُبال کر اُن کا پانی استعمال کرتے۔

## عادات :

انسانی عادات قہریک سچیا نہیں چھوڑتیں لیکن حضرت امیر شریعت کو اپنی  
 قوت ارادی (WILL POWER) کی وجہ سے اپنی عادات پر خاصا دستا بوتا تھا  
 لیکن عام عادات جو اُن کی جڑ و زندگی بن چکی تھیں، اُن کے ہاتھوں مجبور تھے۔ مثلاً  
 جیل میں ہوں یا ریل میں، نماز صبح سے پیشتر چائے بغیر و وڈھ کے ضرور پیتے چت پنچ  
 چائے کا سامان دستود، مٹی کا تیل، بہترین چائے کی پتی، چینی، نمک، فنجان،  
 اور ایک چھوٹا پتج (سفری بکس میں ہمیشہ ساتھ رہتا کبھی کبھار شہروں میں اگر اچھی چائے  
 نایاب ہو جاتی، تو دیہاتوں کے سفر میں اس کو تلاش کرنے جو اکثر مل جاتی۔

یوں تو ہر نماز کے بعد وظیفہ کرتے، لیکن نماز فجر کے بعد قریباً ایک گھنٹہ اس  
 کے لیے الگ بیٹھنے۔ پان کھانے کی سخت عادت ہو گئی تھی، لیکن بغیر قبا کو کے کھانے۔  
 بازار میں چلتے پھرتے نہیں، گھر میں یا تقریر سے پیشتر اس کا سامان بھی چائے کی طرح کبھی  
 الگ نہیں ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کرتے اور نماز عصر تک سوتے۔

تقریر کی رات کھانا نہیں کھاتے تھے بلکہ نماز عصر کے بعد چائے کے دسترخوان  
 پر بیٹھتے تو اس کے ساتھ نمک پا رہے یا کوئی دوسری نمکین شے استعمال کرتے، اگر  
 تقریر کا ارادہ نہ ہو، تو ہر شام کھانا کھا کر سو جاتے۔ پھر لاکھ کوشش کرو، تقریر پر آمادہ  
 نہیں ہوتے تھے۔ اس رات عشاء کی نماز بھی دیر سے پڑھتے۔



حضرت امیر شریعت (رحمۃ اللہ علیہ) کا دل نہ جانے خالی کائنات نے کس مٹی سے بنایا تھا کہ اس کے کسی گوشے میں نعت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر جاندار سے محبت کرنے خصوصاً خوبصورت انسان ہو کہ جو ان کی نگاہِ کرم کا مرکز ہوتا تھا۔ ایک دفعہ کسی گاؤں سے تانگے پہ بیلو سے اسٹیشن تک آنا تھا، اس کے گھوڑے پر جو نظر پڑی کہ گردن لابی، چوڑے سٹم، فریب بدن، دم زمین تک، بس پھر کیا تھا، تمام راستہ کوچوان سے اس گھوڑے کی نسل پر گفتگو کرتے رہے۔ چھ میل کا فاصلہ طے کر کے منزل پر پہنچے تو گھوڑے کا منہ چوما، تھکی لگائی، اور کوچوان کو کراسے کے علاوہ پانچ روپے زائد دے دیے کہ گھوڑے کو دانہ کھلا دے۔

ایک زمانہ میں کبوتروں سے بھی عشق ہوا، لیکن اس کی عمر مختصر ہی۔ اس دور میں نیکیل شوق کے لیے افغانستان سے اس کما رہی تک اچھی نسل کے کبوتر حضرت امیر شریعتؒ کو تحفہ میں ملے۔ لیکن جب ان سے ثابت ہوئے تو نشان تک مٹا دیا۔

عمر کے آخری حصے میں گھر میں مرغیاں بھی رکھیں، اچھے شعر کی داد دینے میں نیکیل نہیں تھے۔ حالانکہ خود اردو اور فارسی کے بہترین شاعر تھے، تدم تخلص کرتے تھے، شاعر عموماً دوسرے شاعر کے کلام پر داد دینے میں فراخ دل نہیں ہوتا، لیکن حضرت امیر شریعتؒ کی عالی حوصلگی پر متحدہ ہندوستان کے اکثر معروف شعراء انہیں اپنا کلام سنانے میں فخر محسوس کرتے، اور جس شعر پر امیر شریعتؒ داد دیتے وہ اردو ادب میں سنبھل جاتا تھا۔ زندگی بھر انگریز اور مرزائی کے علاوہ کسی کو اپنا ذاتی دشمن نہیں سمجھا، اور اگر اٹھوٹی طور پر کسی سے بگاڑ ہو گیا تو پھر اس میں منافقت نہیں ہوتی تھی۔ دشمن دشمن ہے اور دوست دوست۔ دوست کے عیب کی پردہ دری گناہ سمجھتا، آنکھوں دیکھتے



اور کانوں سن کر بھی مسکرا دیتے۔ ہزار اختلاف کے باوجود اگر کوئی گھر آجاتا تو ایسا بڑا ڈر کرنے کہ اس پر اختلاف کا گمان تک نہ گزرتا۔

تصویر اور آواز :- ۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ حضرت امیر شریعتؒ کی تصویر اخبارات میں شائع ہوئی۔ ممبئی کانگریس میں سر جی ناٹھو کی تقریر سن رہے تھے کہ کیمرے کی آنکھ نے انہیں غافل پلا کر چوری کر لیا۔ اور پھر یہی تصویر متحدہ ہندوستان کے ہفت روزہ انگریزی اخبار "ممبئی کرانیکل" اور "نامہ امرت بازاہ پتریکا" میں شائع ہوئی۔ دوسری تصویر ڈھم "کے جلیانہ میں کیمرے کے کیپٹن عبدالرشید کے ساتھ ان کے اصرار پر جگالی نوجوانوں نے اتاری، جو ملاقات کے لیے آئے تھے۔

امیر شریعتؒ بذات خود تصویر کے خلاف تھے، اس کے باوجود ان کی تصویریں گا ہے بگا ہے دیکھنے میں آئیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ ان میں ان کی رضا شامل نہ تھی۔ ۱۹۳۵ء میں ملتان کے مشہور عکاس خواجہ خیری بشیر احمد نے چوک حسین آباد میں جب اپنا رنگا رنگ خانہ ترتیب دیا تو کسی بہانے حضرت امیر شریعتؒ کو وہاں لے گیا۔ چودھری بشیر احمد کے والد ڈاکٹر جم بخش مرحوم کی تصویر آویزاں تھی۔ مرحوم اگرچہ حضرت امیر شریعتؒ کے مرید نہیں تھے، پھر بھی انہیں حضرت امیر شریعتؒ سے بڑی عقیدت تھی، حضرت امیر شریعتؒ کی نظر بے اختیار ان پر جا پڑی، اور بڑا تک تصویر کو دیکھتے رہے۔ اس موقع پر کیمرہ میں نے بڑی حکمت سے کیمرہ کو تصویر کی پناہ میں رکھ کر وقت کا تین کر دیا تھا اچانک ٹپک کی آواز پر امیر شریعتؒ چونک پڑے، اور بڑی حیرت سے پوچھا، "یہ کیا؟" آخر انہیں پتہ چل گیا کہ میری تصویر اتار لی گئی ہے۔ اس پر سخت ناراض ہوئے، اور توڑ توڑ سے وعدہ لیا، یا تو اسے ضائع کر دینا، یا عام نہ کرنا۔ لیکن اس کے باوجود یہ



تصویر راقم کے ہاتھ آگئی، اور یہ وہی تصویر ہے جو اخبارات میں عام شائع ہوتی رہتی ہے۔ اس پر حضرت امیر شریعتؒ جب کبھی فوٹو گرافر سے ملتے تو اسے میرے آڈر کہہ کر پکارتے۔

۱۹۵۷ء میں راقم نے روزنامہ "آزاد" کے لیے حضرت امیر شریعتؒ کی تصویر بنانا چاہی، لیکن انہیں پتہ چل گیا اور اس قدر بگڑے کہ دو سال تک تم سے بات نہیں کی۔  
 ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۴ء میں مظفر گڑھ کے ڈپٹی کمشنر مسعود مسعود موجودہ ایڈمنسٹریٹر محکمہ اوقاف کی خواہش پر مولانا محمد الحسینی نے ایک اجلاس میں ٹیپ بیکارڈنگا دیا، تاکہ امیر شریعتؒ کی تقریر بیکارڈ کی جاسکے۔ اس جلسے کی صدارت بھی ڈپٹی کمشنر ہی کر رہے تھے، اور ٹیپ بیکارڈنگ بھی انہیں کا تھا۔ ان دنوں مسعود مسعود شاید واحد آدمی تھے جن کے پاس یہ آلہ تھا۔ مسعود مسعود باوجود سرکاری گزٹڈ آفیسر ہونے کے ہمیشہ کھوپڑی پوش رہے اور ہمیں یہی وجہ تھی کہ امیر شریعتؒ نے ہمیشہ ان سے محبت کی۔

تقریب سے دوسرے دن انہوں نے امیر شریعتؒ کو پلاسٹک پر بٹایا، اور دوسرے کمرے میں تقریر کا ریکارڈنگا دیا۔ امیر شریعتؒ نے اپنی آواز پہچان لی اور بڑے جبران ہوا، جب انہیں اس نئی ایجاد کا علم ہوا، تو اسے بڑا پسند کیا۔ اس پر گھر میں آکر کہا:

"آج جینا نے اپنی تقریر سننی ہے، میں بہت اچھا بول لیتا ہوں"

یہ کہہ کر استغفر اللہ پڑھا اور روئے لگا گئے۔

حقیقتہً سیاسی اختلافات کے علاوہ مذہبی عقائد میں بھی امیر شریعتؒ سے اختلاف

کیا گیا، ان کے جذبہ توحید کے پیش نظر ان پر غیر مقلد ہونے کا الزام بھی لگایا گیا، مگر اس

میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ وہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہم کی مقلد تھے۔



ابتداء میں حضرت پیر ہنر علی شاہ گولڑوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے فریڈ پوسٹے، ان کے انتقال پر  
حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری (رحمۃ اللہ علیہ) کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا اور خادم  
واپس حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اس واضح حقیقت کے باوجود برصغیر کے مخصوص عوام نے انہیں ایک  
طرف اگر اپنا سیاسی حریف خیال کیا، تو دوسری طرف صحیح عقیدے پر بھی یقین تھے  
کیا۔ عوام کی انہیں باتوں پر حضرت امیر شریعتؒ نے فرمایا تھا:-

”ایک وقت آئے گا کہ تم ہماری قبروں پر  
آکر روؤ گے اور کہو گے کہ تمہیں لوگ  
سچے تھے“

—————



# سرخ زمین ملتان سے!



اسے شہر ہنشاہوں کی بستی اولیادوں کے پیارا  
ہر خزاں کے دور میں قائم رہی تیری بہار  
تو شہیدوں کی ہے مٹی تو امانت دار ہے  
آج پھر پہلو میں تیرے ہے عطا اللہ شاہ  
ہاں کہ وہ باغی رہا برطانوی سرکار کا  
ہے یہی دار و رسین نے آزمایا تھا جسے  
یہ خزانہ دفن کرتے ہیں تمہاری خاک میں  
یہ امانت قوم کی اور سید احرار ہے  
دیکھنا ضائع نہ ہو جائے وطن کا بانگین  
قبر کی مٹی سے کہہ دو، لحد کو آواز دو

ڈرتے ڈرتے پر ہے تیرے دھرتی پروردگار  
تیرے دامن میں ہیں اب بھی نیک بندوں کے مزار  
تیری اک تابیر کچھ ہے اور تیرا اک کردار ہے  
جو امیر وقت تھا ڈرتے تھے جس سے کجگاہ  
وہ محافظ تھا وقت و تار احمد مختار کا  
آئین افرنک نے باغی بسایا تھا جسے  
تا کہ یہ محفوظ رہے ہمارے زمین پاک میں  
حشر تک ہے تجھ میں یہ، تو اس کی پوکیدار ہے  
دارغ تک آسنے نہ پائے اور نہ ہو میلہ کفن  
با ادب آئیں فرشتے روک دیں حشرات کو

پاک رہنا چاہیے حشر تک تیرا نمبر  
سو رہا ہے تیرے دامن پر شریعت کا امیر





102

رحمۃ اللہ علیہ

# حیات امیر شریعت



گذشتہ ربع صدی کی سپاسی اور مذہبی تحریکات کے

پسے منظر میں

حضرت امیر شریعت سید عطار اللہ شاہ بخاری (رحمۃ اللہ علیہ)

کے پہلے مکملے اور مستند

سوانح حیات